بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظم — آذر ریاض

مدیرہ اعزازی — امت الصبور

فلم ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظم و غزل

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

مستقل سلسلے

فروری 2017
جلد 31 شمارہ 6
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۰۱ بی، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع کا فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
سرد مزاج موسم کا ہو یا انسانوں کا، طبیعت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سرد موسم خوش گواری اور سرخوشی کی کیفیت طاری کرتا ہے اور سرد مزاج لوگوں کا ساتھ بے زار کر دیتا ہے۔
اللہ کا شکر ہے کہ کراچی کے لوگوں کی دعائیں قبول ہوئیں۔ خاموشی سے برستے روئی کے گالوں نے فلک بوس پہاڑوں کو سفید لباس پہنایا اور وہ بادل جو جھلک دکھا کر غائب ہو جاتے تھے، بہت سالوں بعد برسے تو سردی نے اپنا رنگ جمایا اور کراچی والوں نے بہت سالوں بعد سرد موسم کا لطف اٹھایا۔
یخ بستہ ہواؤں میں سرما کی نرم دھوپ میں بیٹھ کر کینو کھانا اور طویل راتوں میں کافی، مونگ پھلی اور چلغوزوں کا لطف اٹھانا کہ یہ موسم سرما کی سوغاتیں ہیں مگر یہ اور بات ہے کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے انہیں ہماری پہنچ سے دور کر دیا ہے۔
جب راتیں طویل ہوں اور چاروں طرف خاموشی ہو تو مطالعے کا لطف بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ موسم سرما میں لحاف میں دبک کر شعاع کا لطف اٹھائیں۔ یہ آپ کی دسترس میں ہے۔

اس شمارے میں،

- فرزانہ کھرل کا مکمل ناول۔ پیار کا دوسرا شہر،
- نایاب جیلانی، ام ایمان قاضی، فرح بخاری اور شبانہ شوکت کے ناولٹ،
- سمیرا حمید، قانتہ رابعہ، ام اقصیٰ، عندلیب زہرا اور نور دیا نور کے افسانے،
- صائمہ اکرم چوہدری اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- مقبول ترین شخصیت جنید جمشید کی یادیں، باتیں،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کا سلسلہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- خط آپ کے، آئینہ خانے میں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا ہر شمارہ ہمارے لیے خاص شمارہ ہوتا ہے، جسے ہم پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ ہم اپنی محنت میں کس حد تک کامیاب ہیں۔ یہ ہمیں ضرور بتائیے گا۔

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہوگا حق کیونکر ادا تیرا

جچتا نہیں نظروں میں یاں خلعتِ سلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

تُو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط ان کو
جو رنج و مصیبت میں کرتے ہیں گلہ تیرا

آفاق میں پھیلے گی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا تیرا

مولانا الطاف حسین حالی

جو دل میں نصب ہے، حمد و ثنا کا آئینہ
اسی کا عکس ہے ارض و سما کا آئینہ

خدا کا ذکر ہے عشق محمدؐ کی دلیل
اور اُن کا عشق ہے قربِ خدا کا آئینہ

زمانہ آپؐ کے ایثارِ بے مثال کا عکس
صحابہؓ آپؐ کے، مہر و وفا کا آئینہ

مہک رہی ہیں جہاں آیتوں کی تفسیریں
وہ جبلِ نور ہے غارِ حرا کا آئینہ

سلیم اشک ندامت سے دُھلتا جاتا ہے
ہے سامنے مرے، دستِ دُعا کا آئینہ

سلیم کوثر

ادارہ

بیماریوں کی اقسام ان کے علاج کا بیان

لغوی تعریف : لغت میں طب کے معنی جسمانی و ذہنی علاج اور دوا دارو کے ہیں۔ کوئی ایسی بیماری نہیں جس کا علاج اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا نہ فرمایا ہو۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ "اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کی شفا (اور علاج دوا) نازل فرمائی ہے۔" (صحیح بخاری۔ 5678)

لہٰذا جب کوئی شخص بیمار ہو جائے تو علاج کروانا سنت ہے۔ یہ توکل کے خلاف نہیں بلکہ اسباب اختیار کرنا توکل کے عین مطابق ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "اللہ کے بندو! دوا دارو کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے موت اور بڑھاپے کے سوا ہر بیماری کی شفا پیدا کی ہے۔" (مسند احمد 4/278)

بیماری کی اقسام اور ان کا علاج : بیماری کی دو قسمیں ہیں۔

دل کی بیماریاں، جیسے شک و شبہ، شہوت اور کفر و عناد کی بیماریاں۔

بدنی بیماریاں۔

دل کی بیماریوں کا علاج صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات سے ہو سکتا ہے کیونکہ ان بیماریوں کے اسباب و علاج کی معرفت صرف رسولوں کے ذریعے ہی سے ممکن ہے۔ قرآن مجید نے ان بیماریوں کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے، جیسے "ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بیماری میں مزید کر دیا۔" (البقرہ 2-10)

"یعنی ان کے دلوں میں کفر و نفاق کی بیماری ہے جو اصلاح نہ کرنے پر بڑھتی ہی گئی۔"

بدنی بیماریوں کا علاج دو طرح سے کیا جاتا ہے۔ اولاً بذریعہ غذا، جبکہ دوسری قسم کے علاج کے لیے بیماری کے اسباب، اور ان کو دور کرنے کے لیے مناسب دوا کے لیے غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔

طب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہر دو قسم کی بیماریوں کا شافی علاج موجود ہے، البتہ اسباب کے موافق علاج کے لیے حاذق اور تجربہ کار طبیب کی خدمات حاصل کرنا مستحسن امر ہے۔

حاذق طبیب کی پہچان : علاج کے لیے موثر دوا کا انتخاب بے حد ضروری ہے کیونکہ ہر بیماری اپنی مناسب دوا ہی سے باذن اللہ دور ہوتی ہے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ "ہر بیماری کی دوا ہے۔ جب بیماری کے موافق دوا مریض کو مل جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے صحت یاب ہو جاتا ہے۔" (صحیح مسلم۔ 2204) بیماری کی نوعیت کے مطابق مناسب دوا صرف تجربہ کار، عقل مند اور صحیح طبیب ہی دے سکتا ہے۔

صحیح حکیم کی پہچان کے لیے حافظ ابن قیم رحمتہ اللہ نے متعدد امور ذکر کیے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

اچھا حکیم وہ ہے جو بیماری کی نوعیت کو سمجھ سکے۔

بیماری کے سبب کو معلوم کر سکے۔

مریض کی بدنی قوت کا اندازہ لگا سکے کیونکہ اگر مریض کی قوت مرض پر غالب آ سکتی ہو تو پھر دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مریض کی طبعی حالت کو جان سکے کہ وہ گرم مزاج ہے یا خشک، تر وغیرہ؟

سال بھر کے موسم کے مطابق دوا اختیار کر سکے کیونکہ بعض موسم خاص امراض کے علاج کے لیے مفید نہیں ہوتے 'مثلاً" آپریشن کے لیے سخت گرمی کا موسم۔

مریض کے علاقے کی آب و ہوا کا خیال رکھے۔

دوا کی قوت کی پہچان رکھتا ہو۔

سائیڈ ایفکٹ (دوا کے مضر اثرات) سے واقف ہونا۔

صرف بیماری کا علاج ہی مقصود نہ ہو بلکہ دوسرے کسی بھی مرض سے بچاؤ بھی کرے۔

صرف حلال دوا سے علاج کرے۔

طبی اور روحانی علاج کرے۔

مریض کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش آئے۔

موجودہ صحت کی حفاظت 'ضائع ہونے والی قوت کے حصول 'بیماری کو حسب طاقت کم کرنے اور ادنیٰ مصلحت کی خاطر اعلیٰ مصلحت کو نہ چھوڑنے والا طبیب۔

طب نبوی کے چند ہربل ٹانک : طب نبوی میں چند ادویات ایسی ہیں جو بہت سی بیماریوں کا شافی علاج ہیں 'البتہ ان کے استعمال کے لیے مریض کی طبعی حالت 'بیماری کے اسباب و علل اور دیگر اسباب کو مدنظر رکھنے کے لیے حاذق طبیب کی خدمات حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

شہد : ارشاد باری تعالیٰ ہے : "ان کے پیٹوں سے مختلف رنگ کا مشروب (شہد) نکلتا ہے 'اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔" (النحل 16-69)

"زم زم : ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے زم زم کو جس (نیک) مقصد اور نیت سے پیا جائے یہ اسی کے لیے موثر ہو جاتا ہے۔" (ابن ماجہ 3062)

کلونجی : رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے "سیاہ دانے (کلونجی) میں موت کے سوا ہر بیماری کی شفا ہے۔" (صحیح بخاری۔ 5688)

طب سے متعلق احکام و مسائل

اللہ نے ہر بیماری کی شفا (حاصل کرنے کے لیے دوا) نازل کی ہے۔ حضرت اسامہ بن شریک (ثعلبی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'انہوں نے فرمایا:

" میں (مجلس میں) موجود تھا جب اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کر رہے تھے : کیا فلاں کام کرنے میں ہم پر گناہ ہے؟ کیا فلاں کام کرنے میں ہم پر گناہ ہے؟

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا :

" اللہ کے بندو! اللہ نے حرج (تنگی) کو دور کر دیا ہے مگر جس نے اپنے بھائی کی عزت میں سے ایک حصہ کاٹ لیا' یہی ہے جس نے گناہ کیا۔"

انہوں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہمیں اس بات سے گناہ ہو گا کہ ہم (بیماری سے شفا کے لیے) دوا (استعمال) نہ کریں؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "اللہ کے بندو! (شفا کے لیے) دوا (استعمال) کیا کرو' اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جو بیماری بنائی ہے' اس کی شفا (کے لیے دوا) بھی بنائی ہے' سوائے شدید بڑھاپے کے۔"

انہوں نے کہا "اللہ کے رسول! بندے کو سب سے بہتر چیز کیا عطا ہوئی ہے؟"

"فرمایا : اچھا اخلاق۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق کا مظہر ہے کہ آپ اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کے نامناسب رویے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔

2۔ اسلام کے احکام انسانی فطرت کے مطابق ہیں' اس لیے ان میں ایک طرح کی سہولت موجود ہے۔

3۔ عزت میں سے حصہ کاٹنے کا مطلب ہے کہ اس کی آبروریزی کی' یا ایسا کام کیا' یا ایسی بات کہی جس سے اس کی عزت میں فرق آئے۔

4۔ بیماری کا علاج کرانا بھی جائز اسباب میں سے ہے

جنہیں اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

5۔ ہر بیماری کا علاج موجود ہے' یہ انسان کی محنت' سمجھ اور توجہ پر مبنی ہے کہ مریض کی بیماری کو سمجھے اور مناسب دوا کا انتخاب کرے۔

6۔ بچپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپا' اللہ کا بنایا ہوا مستقل نظام ہے' اس لیے یہ اپنے وقت پر آتا ہی ہے۔ انسان کو جوانی کی قوتوں سے محروم ہونے سے پہلے نیکیاں کر لینی چاہئیں تاکہ بڑھاپے میں حسرت و ندامت نہ ہو۔

7۔ خوش اخلاقی انسان کی ایسی خوبی ہے۔ جس سے دنیا میں بھی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی' اس لیے یہ اللہ کا عظیم احسان ہے۔

پرہیز کا بیان

حضرت ام منذر سلمیٰ بنت قیس انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے کہا : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیماری کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاں نیم پختہ کھجوروں کے خوشے (رسی سے) لٹک رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے لے لے کر (کھجوریں) کھا رہے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی کھانے کے لیے کچھ کھجوریں لے لیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"علی! رک جاؤ۔ تم ابھی (بیماری سے اٹھے ہو' اس لیے) کمزور ہو۔"

ام منذر رضی اللہ عنہا نے فرمایا : میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چقندر اور جو پکائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"علی! اس میں سے کھاؤ یہ تمہارے لیے زیادہ مفید ہے۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ بیمار کو خوراک میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ بیمار کو چاہیے کہ وہ چیز کھائے جو اس کے لیے مفید ہو اور اس چیز سے پرہیز کرے جو اس بیماری میں نقصان دہ ہو۔

2۔ بیماری کے بعد زود ہضم اور غذائیت والی خوراک استعمال کرنی چاہیے۔

حضرت صہیب (بن سنان رومی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا : میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے روٹی اور کھجوریں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آیئے! تناول کیجئے۔"

میں نے کھجوریں کھانا شروع کر دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم کھجوریں کھا رہے ہو' حالانکہ تمہاری آنکھ دکھتی ہے۔"

میں نے کہا "میں دوسری طرف سے چبا رہا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیے۔

فوائد و مسائل :

1۔ مہمان کو کھانے کی پیش کش کی جائے تو اسے چاہیے کہ تکلف نہ کرے' قبول کر لے ہاں! اگر اس کی ضرورت نہیں ہے تو اور بات ہے۔

2۔ بیمار کو کھانے پینے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

3۔ بزرگ شخصیت سے بھی مزاح کی بات کی جا سکتی ہے بشرطیکہ ادب و احترام کی حدود سے تجاوز نہ ہو۔

بیمار کو کھانے پر مجبور نہ کریں

حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"اپنے مریضوں کو کھانے پینے پر مجبور نہ کیا کرو' انہیں اللہ تعالیٰ کھلاتا اور پلاتا ہے۔" (بیہقی)

فوائد و مسائل :

1۔ مریض کے لیے صحت مند انسان والی غذا مفید نہیں ہوتی' اس لیے انہیں بھاری غذا نہ دی جائے۔

2۔ اگر مریض کی طبیعت کھانے پینے پر آمادہ نہ ہو تو سختی نہ کی جائے کیونکہ زبردستی کھلائی ہوئی غذا فائدے کی بجائے نقصان پہنچاتی ہے۔

3۔ مناسب ترغیب کے ذریعے سے ہلکی پھلکی زود ہضم غذا دی جاسکتی ہے تاکہ قوت قائم رہے۔

4۔ "اللہ تعالیٰ مریض کو کھلاتا پلاتا ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں تندرست آدمی کی طرح کھانے پینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تلبینہ کا بیان

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جب کسی کو بخار ہوتا تو آپ تلبینہ تیار کرنے کا حکم دیتے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔" اس سے غم زدہ انسان کے دل کو سہارا ملتا ہے۔ اور بیمار کے دل سے رنج کو اس طرح دور کرتا ہے جس طرح کوئی عورت پانی کے ذریعے سے اپنے چہرے سے میل کچیل دور کرتی ہے۔" (ترمذی)

مفید چیز

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ناپسندیدہ مفید چیز تلبینہ (حریرہ) کو اپناؤ۔"

ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جب کوئی بیمار ہو جاتا تو (حریرہ کی) ہنڈیا آگ پر چڑھی رہتی حتیٰ کہ (اس کا معاملہ) کسی ایک طرف لگ جاتا" یعنی وہ فوت ہو جاتا یا شفایاب۔

فوائد و مسائل:

1۔ تلبینہ کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔ "وہ ایک رقیق کھانا ہے جو آٹے یا چھان (آٹے کی بھوسی) سے بنایا جاتا ہے۔ اس میں بعض اوقات شہد بھی ڈالا جاتا ہے۔" (النہایۃ، مادہ "تلبین")

2۔ نواب وحید الزماں خاں نے اس کا ترجمہ "حریرہ" کیا ہے۔ انہوں نے اس کی وضاحت یوں کی ہے "حساء وہ کھانا ہے جو آٹے، پانی اور روغن سے بنایا جاتا ہے۔ اس میں کبھی شیرینی بھی ڈالتے ہیں اور کبھی شہد، کبھی آٹے کے بدلے آٹے کا چھان ڈالتے ہیں اس کو تلبینہ کہتے ہیں اور ہندی میں حریرہ مشہور ہے۔" (ترجمہ سنن ابن ماجہ حاشیہ حدیث ہذا)

فیروز اللغات اردو میں "حریرہ" کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں "میٹھی اور گاڑھی چیز، جو میدے کو کھانڈ میں گھول کر پکائی جاتی ہے۔"

3۔ تلبینہ کی ترغیب دیگر صحیح احادیث میں بھی موجود ہے۔

کالا دانہ (کلونجی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کالے دانے میں سام کے سوا ہر مرض کی شفا ہے۔"

سام کا مطلب موت ہے اور کالا دانہ کلونجی ہے۔

کلونجی کے استعمال کا طریقہ

حضرت خالد بن سعد رحمتہ اللہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔

ہم لوگ سفر میں تھے۔ ہمارے ساتھ حضرت غالب بن ابجر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ راستے میں بیمار ہو گئے۔ ہم لوگ مدینہ پہنچے تو وہ (اس وقت بھی) بیمار تھے۔ حضرت ابن ابی عتیق رحمتہ اللہ (عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمن بن ابی بکر) ان کی بیمار پرسی کے لیے آئے تو ہم سے فرمایا۔

"تم یہ کالا دانہ (کلونجی) استعمال کرو۔ اس کے پانچ سات دانے لے کر پیس لو، پھر زیتون کے تیل میں ملا کر ان کی ناک میں چند قطرے اس طرف اور چند قطرے اس طرف (نتھنوں میں) ڈالو کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

”یہ کالا دانہ ہر بیماری کی شفا ہے، سوائے اس کے کہ سام (ہی مقدر) ہو۔“

میں نے کہا ”سام کیا ہے؟“

انہوں نے فرمایا ”موت۔“

فوائد و مسائل:

1۔ بیمار کی بیمار پرسی کرتے وقت اگر بیماری کا کوئی مجرب علاج معلوم ہو تو مریض کے لواحقین کو بتا دینا درست ہے، تاہم غیر مجرب دوا کا مشورہ نہیں دینا چاہیے۔

2۔ علاج کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہ ناک میں دوائی ڈالنا بھی ہے۔

3۔ کلونجی کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔ امام ابن قیم رحمتہ اللہ نے ”زاد المعاد“ میں اختصار کے ساتھ کافی فوائد ذکر کیے ہیں۔ ڈاکٹر خالد غزنوی نے طب نبوی کے موضوع پر اپنی تصنیفات میں اس پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کتابوں کا مطالعہ مفید ہے۔

شفا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”دو شفا والی چیزیں اختیار کرو۔ شہد اور قرآن۔“

فوائد و مسائل:

قرآن سے جسمانی بیماریاں بھی دور ہوتی ہیں، جیسے سانپ کے ڈسے ہوئے مریض کو سورۃ فاتحہ کا دم کرنے سے شفا ہو گئی تھی۔

کھمبی اور عجوہ کھجور

حضرت ابو سعید خدری اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کھمبی من کی قسم سے ہے۔ اس کا پانی آنکھ کے لیے شفا ہے۔ عجوہ کھجور جنت سے ہے اور یہ جن کے اثر (یا جنون) سے شفا دیتی ہے۔“ (مسند احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ من اس قدرتی خوراک کا نام ہے جو بنی اسرائیل پر نازل کی گئی تھی۔ وہ میٹھے دانوں کی شکل میں ہوتی تھی۔ وہ لوگ حسب ضرورت لے کر استعمال کر لیتے تھے۔

2۔ کھمبی کو من اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہ بھی بلا مشقت حاصل ہو جاتی ہے۔ کھمبی کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے بعض قابل استعمال ہیں اور بعض نقصان دہ۔ ”کماۃ“ مفید قسموں میں سے ایک ہے۔ آج کل مفید اقسام کی کھمبی خود اگائی جاتی ہے جو غذا میں استعمال ہوتی ہے۔

3۔ کھمبی کا پانی آنکھ کے امراض کے لیے استعمال کرنے کے بارے میں بعض علماء نے کہا ہے کہ اسے دوسری دوا میں ملا کر استعمال کرنا چاہیے، مثلاً ”اثمد“ سرمے میں کھمبی کا پانی ملا کر گوندھ لیا جائے، پھر اسے آنکھ میں لگایا جائے۔ بعض علماء کی رائے میں اس کا پانی نکال کر صرف وہی استعمال کیا جائے۔ (زاد المعاد) صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اطباء کے مشورے سے آنکھ کی مختلف بیماریوں میں الگ الگ مناسب طریقے سے استعمال کیا جائے۔

4۔ عجوہ کے بارے میں اسی مفہوم کی ایک حدیث صحیح بخاری میں ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔ ”جو شخص صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھائے، اس دن اسے زہر یا جادو سے کوئی (تکلیف یا) نقصان نہیں ہو گا۔“ (صحیح البخاری۔ 5768)

جنید جمشید

شاہین رشید

صحافت کی فیلڈ سے وابستہ ہونے کے بعد بہت سی نامور شخصیات سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہوا اور ان سے انٹرویو کرنے کا بھی۔۔۔ ان ہی میں معروف شخصیت جنید جمشید بھی تھے۔ ان سے ملاقات تو نہ ہوئی' البتہ فون پر بات چیت بھی ہوتی تھی اور انٹرویو بھی کیا۔

برسوں پہلے ان کی بیگم عائشہ اور جنید جمشید کا انٹرویو کیا تھا' ہمارا ایک مشہور سلسلہ تھا۔ "مشہور تو ہم بھی ہیں۔" اس میں ہم نامور شخصیات کی بیگمات سے انٹرویو کرتے تھے اور اس مشہور سلسلے میں ہم نے "عائشہ جنید" کا انٹرویو کیا تھا اور جنید جمشید صاحب سے بھی گاہے بہ گاہے بات ہوتی تھی۔ "کچھ یادیں' کچھ باتیں" ضبط تحریر میں لا رہے ہیں۔ آپ بھی پڑھیے۔ اللہ تعالیٰ جنید جمشید کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین)

"گلوکاری سے نام کمایا۔ پیسہ بھی۔۔۔ پھر دین کی طرف آگئے' اچانک یہ تبدیلی کیسے آئی؟"

"دیکھیں جی۔۔۔ جب اللہ کی ہدایت کسی بندے کے لیے آجائے' وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور اچانک تبدیلی نہیں آتی۔ انسان آہستہ آہستہ ہی راغب ہوتا ہے۔ پہلے رائے ونڈ نہیں جاتا تھا۔ پھر رائے ونڈ جانے لگا۔ اچھا لگا' وہاں ایک بات سے بہت متاثر ہوا۔ نماز کی ادائیگی نے بہت متاثر کیا کہ نماز کی ادائیگی کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ پھر دین کی باتوں نے دل پہ اثر کیا اور سچ پوچھیں تو مولانا طارق جمیل کی رہنمائی میرے بہت کام آئی۔"

"لوگ دین کی طرف راغب ہوتے ہیں تو دنیا کی نعمتوں سے اور آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم کر لیتے ہیں۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا؟"

"اس لیے کہ ہمارا مذہب یہ نہیں کہتا کہ آپ گوشہ نشینی اختیار کر لیں۔ ہمارا مذہب اسلام' اسلام کے دائرے میں رہ کر سب کچھ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ دنیا کو تسخیر کرنے کا حکم جو رب دیتا ہے وہ اپنی مخلوق کو گوشہ نشینی کے لیے کیسے کہہ سکتا ہے؟"

"تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کو ہی اسلام کی طرف راغب کرنا مشکل کام ہے؟"

"بہت مشکل کام ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کو کیا مسلمان کرنا۔۔۔ بات تو ٹھیک ہے' لیکن ہم مسلمان اسلام کی بہت سی باتوں سے ناواقف ہیں۔ ہمیں ان باتوں سے واقف کرانا ہے اور اس کام میں ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو ہم تو ان کے ادنیٰ خادم ہیں۔"

"آپ نے "جیو" ٹی وی سے دینی معلومات پر مبنی پروگرام شروع کیا تھا۔ اس کا کیا رسپانس ملا؟"

"بہت اچھا رسپانس ملا تھا' کیونکہ ہمارے یہاں چاہے معلومات عامہ ہو یا دینی معلومات ہوں ایسے پروگرام ٹی وی پہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ ہیں نہیں تو غلط نہ ہو گا' تو اس لحاظ سے ہمیں اس پروگرام کا بہت اچھا رسپانس ملا تھا۔"

"اس پروگرام کو ہم بھی دیکھتے تھے اور اس بات کا مجھے شدت سے اندازہ ہوا کہ لوگوں میں دینی معلومات کی بہت کمی ہے۔ ایسا آپ نے بھی محسوس کیا تھا؟"

"بالکل کیا تھا۔۔۔ مطالعے کی کمی تھی' دینی معلومات کی کمی نظر آئی تھی۔ لیکن اگر ایسے پروگرام پیش کیے جاتے رہے تو لوگوں کو بہت فائدہ ہو گا۔"

"آپ نے کہا کہ علم کی کمی ہے۔ کیا اسی وجہ سے ہم بے راہ روی کا شکار ہیں؟"

"بالکل۔۔۔ مذہب سے دوری' معلومات کا نہ ہونا۔

ان باتوں کا نتیجہ ہی بے راہ روی ہے۔ جب تک ہم اپنے مذہب کو نہیں سمجھیں گے' اچھے انسان کیسے بنیں گے۔"

"اس میں قصور کس کا ہے' اساتذہ کا؟ والدین کا یا اسکول میں پڑھائے جانے والے نصاب کا؟"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ اساتذہ' والدین اور نصاب تینوں کا قصور ہے۔ نصاب تو ہم اور آپ ہی بناتے ہیں۔ ہم اور آپ اگر اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ مگر ہم تو صرف ڈیوٹی دیتے ہیں یا پھر صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ اجتماعی سوچ کا فقدان ہے۔ اگر ہم سب یہ ارادہ کرلیں کہ اللہ کے دین کو سیکھنے کے لیے جس قربانی کی ضرورت ہو گی ہم دیں گے تو اللہ تعالیٰ خود آپ کی مدد فرمائے گا۔"

"آپ تبلیغ پہ جاتے ہیں۔ زیادہ اثر کون لیتا ہے' بچے یا بڑے؟"

"دونوں ہی لیتے ہیں' لیکن بچے اثر بھی لیتے ہیں اور سیکھتے بھی ہیں اور جلدی سیکھتے ہیں اور بڑے بھی جنہیں مذہب کے بارے میں معلومات نہیں ہوتیں' ہماری باتوں کو غور سے سنتے ہیں اور عمل پیرا بھی ہوتے ہیں۔"

"دین کی طرف تو آپ کچھ عرصہ قبل ہی راغب ہوئے۔ گلوکاری نے آپ کو شہرت دی۔ ویسے بچپن کا کیا خواب تھا کہ بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟"

"جی... بچپن میں تو بچے' بہت کچھ سوچتے ہیں کہ یہ بنیں گے' وہ بنیں گے۔ جوں جوں انسان یا بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کی سوچ میں فرق آتا جاتا ہے' تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔"

"مگر عموماً" بچے اپنے بڑوں کو فالو کرتے ہیں۔ جیسے گھر میں کوئی ڈاکٹر یا انجینئر ہے یا بینکر ہے یا فورس میں ہے تو بچے بھی اسی طرف راغب ہوتے ہیں۔ آپ کے ساتھ کچھ ایسا تھا؟"

"یہ بہت اچھا سوال کیا آپ نے... واقعی بچے اپنے بڑوں کو فالو کرتے ہیں۔ میرے والد جمشید اکبر خان پاکستان ایئر فورس میں گروپ کیپٹن تھے اور اس عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی وردی اور ان کی عزت دیکھ کر میرا بھی دل چاہتا تھا کہ میں ایئر فورس میں جاؤں اور والد جیسی عزت پاؤں۔"

"اچھا تو پائلٹ بننا چاہتے تھے؟"

"جی... پائلٹ اور وہ بھی "ایف 16 طیارے" کا پائلٹ' بس جنون کی حد تک شوق تھا۔ مگر میری بدقسمتی کہ میں پائلٹ نہ بن سکا۔ کیونکہ میری بینائی دور کی کمزور ہو چکی تھی اور اس کا پتا مجھے جب چلا جب میں نے کلیئر ہونے کے لیے ٹیسٹ دیے تھے۔"

"افسوس تو بہت ہوا ہو گا؟"

"ایسا ویسا... کتنے دن کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ پھر والد صاحب کے کہنے پر ہی لاہور کی انجینئرنگ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور مکینیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور پاک فضائیہ میں بطور کنٹریکٹر (سویلین) کے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ یوں پاک فضائیہ میں جانے کی خواہش کسی حد تک پوری ہو گئی۔ لیکن جب میوزک کی طرف آگیا تو پھر جاب کو بھی خیرباد کہہ دیا... فوراً" نہیں' جب اللہ نے عروج دینا شروع کیا۔"

"گلوکار تو پیدائشی ہوتا ہے۔ آپ پر کب انکشاف ہوا کہ آپ میں یا آپ کے گلے میں سُر ہے؟"

"یہ خود انکشاف نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ کے اردگرد کے لوگ احساس دلاتے ہیں کہ آپ کے گلے میں سُر ہے۔ سُر والا ہمیشہ کچھ نہ کچھ گنگناتا رہتا ہے۔ تو مجھے بھی دوستوں نے احساس دلایا کہ میں گا سکتا ہوں اور لوگ مجھے "راک اسٹار" کہتے تھے۔ کالج' یونی ورسٹی کی مختلف تقریبات میں جب حصہ لینا شروع کیا تو لوگ مجھے بہت شوق سے سننے لگے تھے۔"

"میوزک گروپ بنانے کا خیال کیسے آیا؟"

"ان دنوں میوزک گروپ بنانے کا جیسے لوگوں کو کریز تھا۔ تو ہم دوستوں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم بھی ایک میوزک گروپ بنالیں۔ تب وائٹل سائن کے روحیل حیات اور شہزاد احسن نے مجھے لیڈ سنگر کی حیثیت سے اپنے ساتھ شامل کرلیا اور یوں ہمارا گروپ ملک کے اندر اور ملک سے باہر اپنی پرفارمنس

کی وجہ سے مشہور ہوتا چلا گیا۔"

"آپ اس بات کو مانتے ہیں کہ جب اللہ نے کسی انسان کو شہرت، عزت اور دولت دینی ہوتی ہے تو وہ اس سے ایسا کام ضرور کرواتا ہے تاکہ اسے یہ سب کچھ مل جائے۔"

"جی... بالکل مانتا ہوں۔ کیونکہ سب کچھ اوپر والا ہی کرتا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو انسان ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا۔ قسمت مجھ پر مہربان ہوئی اور میرا "دل دل پاکستان" اتنا زیادہ مقبول ہوا کہ پھر یہی قومی نغمہ میری پہچان بن گیا۔ یہ ہماری ایک البم کا گانا تھا۔"

"اس وقت کیا تاثرات تھے؟"

"جو تاثرات تھے انہیں لفظوں میں تو بیان کیا جا ہی نہیں سکتا۔ اس گانے نے یا قومی نغمے نے مجھے راتوں رات شہرت کی بلندیوں پہ پہنچا دیا اور آپ دیکھیے گا کہ میری یہی پہچان ہمیشہ رہے گی۔"

"آپ شاید ان چند خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ہیں کہ جنہوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس میں فائدہ ہی ہوا۔ ترقی ہی ملی۔ آپ اتفاق کریں گے اس بات سے...؟"

"بالکل اتفاق کروں گا کہ اللہ کا کرم مجھ پر ہمیشہ رہا۔ ہاں میں پائلٹ نہیں بن سکا اور اس وقت کا میرا رونا اور افسوس کرنا شاید اللہ کو اتنا پسند آیا کہ اس کے بعد میں نے جو کام کیا مجھے ترقی و کامیابی ہی ملی۔ مثلاً" میں نے بڑی کامیابی کے ساتھ انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ پھر جب میوزک میں آیا تب اللہ نے بہت کامیابی دی اور جب اللہ کی راہ پر نکلا تو بھی اللہ نے بہت نوازا۔ تو میں تو جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔"

"جنید جمشید جب میوزک کی دنیا میں تھے، جب اللہ نے انہیں عروج دیا تھا، تب بھی ان کا لہجہ نرم اور گفتگو شائستہ ہوتی تھی اور جب دین کے راستے پر نکلے تب بھی ان کا یہی انداز تھا۔ جنید جمشید تین ستمبر 1964ء میں پیدا ہوئے اور 7 دسمبر 2016ء میں وفات پائی۔ حکومت پاکستان نے انہیں ان کی زندگی میں ہی تمغہ امتیاز اور تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا اور انہیں لکس اسٹائل ایوارڈ بھی ملا۔"

اللہ جنید جمشید کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت میں اعلا مقام دے۔ (آمین)

دستک دستک دستک

شاہین رشید

سنیتا مارشل

"ہیلو… کیسی ہیں؟" سنیتا مارشل سے کبھی کبھی ہیلو ہائے ہو جاتی ہے۔

"جی… ٹھیک۔"

"کیا مصروفیات ہیں… اور کتنے عرصے کے بعد ڈراموں میں واپسی ہوئی ہے؟"

"مصروفیات تو ماشاء اللہ کافی ہیں اور ویسے تو شادی کے بعد میں نے کافی کام کیا ہے۔ البتہ بچوں کی وجہ سے تھوڑا گیپ آیا… تقریباً" سات سال "کے بعد اب میں باقاعدہ اس فیلڈ میں آئی ہوں۔ اب گیپ نہیں دوں گی۔"

"گڈ… ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں آپ کے؟"

"دو… ماشاء اللہ سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔"

"دو بچے اور اتنی فٹ… ایکسرسائز کرتی ہیں کیا؟"

"دیکھیں… ہماری فیلڈ ایسی ہے کہ ہمیں فٹ رہنا پڑتا ہے… لیکن یہ اسمارٹنس مجھے ورثے میں ملی ہے۔ ہماری فیملی میں سارے ہی بہت دبلے پتلے ہیں۔ اس لیے پیٹ بھر کر مزے سے کھاتی ہوں کہ مجھے پتا ہے، میں نے موٹا نہیں ہونا۔ مگر مزے کی بات بتاؤں جب میری بیٹی پیدا ہوئی تو میرا وزن کافی بڑھ گیا تھا۔ مگر تھوڑی سی ڈائیٹ کرنے سے واپس اپنی جگہ آ گئی… اور ایکسرسائز تو میں اپنے آپ کو فٹ رکھنے کے لیے کبھی کبھار کر لیتی ہوں۔"

"کھانا مزے سے کھاتی ہوں، آپ نے کہا… تو کیا کیا پسند ہے۔ اپنے انگریزی کھانے یا پاکستانی دیسی کھانے…"

"اپنے انگریزی سے کیا مراد ہے۔ اپنے دیسی کھانے کہیں… مجھے نہاری بہت پسند ہے۔ پلاؤ میری کمزوری ہے… اور چاولوں سے بنی ہوئی تمام ڈشز مجھے بہت پسند ہیں اور آپ نے پوچھا تھا کہ فٹ کیسے رہتی ہوں تو یہ بھی بتادوں کہ مجھے گھریلو ٹوٹکوں پہ بہت بھروسا ہے، اس لیے ان ہی پہ بھروسا کرتی ہوں۔"

"اب جبکہ آپ باقاعدہ آ گئی ہیں انڈسٹری میں تو کیا فلم میں بھی کام کریں گی؟"

"جی… بالکل کروں گی… لیکن اس کے لیے میری بھی کچھ شرائط ہوں گی… کہ میں بولڈ کردار اور آئٹم سونگ نہیں کروں گی۔ میں آرٹ مووِیز کی طرح کی کوئی مووی کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہیرو… کون ہونا چاہیے؟"

ہنستے ہنستے۔ "حسن" (میاں صاحب) میں اپنے شوہر حسن کے ساتھ دو سیریلز بھی کر چکی ہوں۔ فلم بھی ان ہی کے ساتھ کرنا چاہوں گی۔

"عموماً" ہمارے یہاں فنکارائیں اتفاقاً "آتی ہیں۔

آپ بھی اتفاقاً" آئیں؟"

"جی۔۔۔ بالکل اچانک اور اتفاقاً" آئی۔۔۔ میری بڑی بہن' ماڈل تھیں' ایک دن ان کا برائیڈل سیشن شیڈول تھا' مگر طبیعت کی خرابی کے باعث وہ نہیں جاسکیں' تو وہاں کے منتظمین نے مجھے کہا کہ آپ ان کی جگہ شوٹ کروالیں۔۔۔ یہ میرا پہلا فوٹو سیشن تھا۔۔۔ اور چونکہ اللہ نے مجھے اس فیلڈ میں لانا تھا' تو شوٹ اچھا ہو گیا۔۔۔ بس پھر تو آفرز کی جیسے لائن لگ گئی۔"

"معاوضہ بھی بہت اعلا ملا ہو گا؟"

"ارے نہیں۔۔۔ کوئی خاص نہیں۔۔۔ چونکہ اسٹوڈنٹ تھی تو اس وقت کے لحاظ سے پندرہ سو بھی میرے لیے ایک بڑا معاوضہ تھا۔۔۔ تو بس پندرہ سو کو انجوائے کیا۔۔۔ اور پھر جوں جوں کام کرتی گئی معاوضہ پرکشش ہوتا گیا۔"

"شہرت کا مزہ ہے؟"

"شہرت کا تو بہت مزہ ہے۔ جب لوگ آپ کو پہچان کر عزت دیتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے کہ اتنے لاکھوں' کروڑوں میں لوگ ہمیں ہمارے کام سے پہچان رہے ہیں۔۔۔ اور یہ ایک ایسی لت ہے کہ ہم چاہیں بھی تو اس سے چھٹکارا نہیں پاسکتے اور شوبز کو چھوڑ ہی نہیں سکتے۔"

"آپ نے ایک مسلمان سے شادی کی' کبھی پچھتاوا ہوا؟"

"نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور تب ہی شادی کی۔ بہت ہی اچھی اور ہیپی ازدواجی لائف گزار رہی ہوں۔ میرے بچے اور میرا شوہر میری زندگی ہیں۔"

"شوبز کی وجہ سے کبھی کبھی غلط نیوز بھی آجاتی ہیں۔ ایسا ہی ہے؟"

"جی۔۔۔ بالکل ایسا ہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ لوگ کسی کی ہیپی لائف سے خوش نہیں رہ سکتے۔ اس لیے غلط باتیں پھیلاتے رہتے ہیں۔"

"چلیں جی' اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے'

آمین۔"

یاسر عباس

(آر جے ایف ایم 101) فزیوتھراپسٹ

"کیا حال ہے جی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"ایف ایم اور آپ کی فزیو کیسی چل رہی ہے۔"

"بہترین۔۔۔ آپ سب کی دعاؤں سے۔۔۔"

"ماشاء اللہ آپ ایک کامیاب فزیوتھراپسٹ ہیں۔ ہر طرح کے مریضوں سے پالا پڑتا ہو گا۔ کوئی ایسا مریض بھی ملا جو بہت غریب تھا؟"

"جی۔۔۔ بالکل ملا۔۔۔ مگر میں بتانا نہیں چاہوں گا۔۔۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے ایسے مریضوں کی بہت دعائیں لگتی ہیں۔۔۔ بہت سے سفید پوش اور غریب لوگ ہوتے ہیں جو افورڈ نہیں کر سکتے۔ مگر میں پھر بھی "فزیوتھراپی" بہت ایمان داری اور جانفشانی کے ساتھ کرتا ہوں۔"

"گڈ۔۔۔"

"جی میں "نو پرافٹ نو لاس" کی بنیاد پر کام کرتا ہوں۔ پتا نہیں۔ اللہ کس کے حوالے سے اور کس کی دعاؤں سے رزق دے رہا ہے۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ لوگوں نے کام کروالیا... کہا بعد میں لے جائیے گا اور پھر پیسے دیئے ہی نہیں؟"
ہنستے ہوئے۔ "بہت جگہ ایسا ہوتا ہے۔ مانگے مگر نہیں ملے تو سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں... اور اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے میری کسر پوری کر ہی دیتا ہے۔"
"کشش کیا ہے اس فیلڈ میں اور ریڈیو کی فیلڈ میں؟"
"دیکھیں انسان اسی شعبے میں آتا ہے جو اسے کام کے لحاظ سے اور مال کے لحاظ سے پرکشش لگتا ہے۔ فیزیوتھراپی میرا پروفیشن ہے۔ خدمت خلق ہے اور ریڈیو میرا شوق، میرا جنون ہے اور حکومت وہ ہی اچھی ہوتی ہے جو دلوں پہ راج کرے۔ لہٰذا... میں چاہتا ہوں کہ جب میں اس دنیا سے جاؤں تو لوگوں کی اکثریت یہ کہے کہ "یاسر عباس" ہمارے دلوں پہ حکومت کرتا تھا... اور ریڈیو میں کشش یہ ہے کہ لوگ بنا دیکھے آپ سے محبت کرتے ہیں اور یہ تعلق بڑا خوب صورت تعلق ہے۔"
"کیا ریڈیو اسی ذوق و شوق کے ساتھ سنا جاتا ہے، جس طرح کسی زمانے میں سنا جاتا تھا؟"
"جی میں آپ کو بتاؤں کہ چیزیں اسی وقت اپنی اہمیت کھوتی ہیں جب ان پر توجہ نہ دی جائے۔ ریڈیو اگر چند کاموں کے لیے محدود رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ اب اس کا استعمال اب صرف اتنا ہی رہ گیا ہے کہ "خبریں سن لیں لائٹ نہیں ہے تو کمنٹری سن لیں اور دوران ڈرائیونگ گانے سن لیں۔"
"کافی ایف ایم چینل کھل گئے ہیں۔ کہیں اور جانے کا خیال آپ کو آیا؟"
"دیکھیں جی... بہتر تو یہی لگتا ہے کہ دوسرے آپ کو خود بلائیں، اب خود جا کر کہنا اچھا نہیں لگتا اور میں ایف ایم 101 میں بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ اس لیے کہیں اور جانے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔"

"ٹی وی سے کیا ناراضی ہے؟"

ہنستے ہوئے۔ "کوئی ناراضی نہیں ہے اور ایسا نہیں ہے کہ میں ٹی وی پہ نہیں گیا۔ سماء ٹی وی کے پروگرام "بنو سماء ٹی وی کی آواز" میں بہ حیثیت جج کے فرائض انجام دیے ہیں اور یہ اس دور کی بات ہے جب "مایا خان" میزبان ہوا کرتی تھیں اور تقریباً" تین سال میں نے جج کے فرائض انجام دیے۔۔۔ تو ایسا نہیں ہے کہ کیمروں سے میری دوستی نہیں ہے۔"

"کسی اور پروگرام یا ڈراموں کا دل نہیں چاہا؟"

"دل تو بہت چاہا۔۔۔ مگر سچ پوچھیں تو ہمارے یہاں "لابی سسٹم" بہت زیادہ ہے اور اسی وجہ سے بروقت چانس نہیں ملتا۔ یا مل پاتا۔ وہ چاہے کوئی اینکر ہو نیوز کاسٹر ہو یا ڈراما آرٹسٹ اور ویسے بھی یہ فل ٹائم جاب ہے اور میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ میں انتظار کر سکوں۔ مگر اگر اچھی آفر ہوئی تو انکار نہیں کروں گا۔"

"یاسر۔ کوئی ایسی شخصیت آپ کی زندگی میں ہے جس کے آپ بہت زیادہ شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آپ کا بہت ساتھ دیا۔"

"جی بالکل ہیں۔ ڈاکٹر فیصل یاسین صاحب جو میرے استاد بھی ہیں' انہوں نے فزیو تھراپی میں میری بہت اچھی تربیت اور ٹریننگ کی۔ جن کی وجہ سے میں آج ایک کامیاب فزیو تھراپسٹ ہوں۔"

علی گل پیر
(سائیں تو سائیں فیم)

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کیا نیا لا رہے ہیں؟"

"موودی تیری" کے ساتھ کچھ نیا لا رہا ہوں۔ ان شاء اللہ اس فیلڈ میں جلد واپسی ہوگی۔

"کیا ہوگا اس گانے اور ویڈیو میں؟"

"اس میں مجھے کئی سینئر گلوکاروں اور سینئرز کی سپورٹ حاصل ہے۔ اس گانے میں سب کی کلاس لی ہے۔ جو ہمارے ملک کو میلی نظر سے دیکھتے ہیں۔"

"یقیناً"۔۔۔ گانا تھوڑا آپ کے پہلے گانے سے مختلف ہوگا؟"

"مختلف۔۔۔؟ بلکہ بہت مختلف ہوگا۔۔۔ میرے پہلے والے گانوں سے۔ بہت مختلف اور آپ دیکھیے گا لوگوں کو ہمارا گانا بہت پسند آئے گا۔"

"ٹیم ورک ہوگا یا اکیلے؟"

"ٹیم ورک ہے۔۔۔ ایک بینڈ کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہوں اس گانے پر۔۔۔"

"چلیں بیسٹ آف لک۔"

سرورق کی شخصیت

ماڈل	ماہ نور
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خطوط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں
آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں
اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو ہمارے پیارے ملک کو اپنے
حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط گشن گڑھ سے ثوبیہ نور کا ہے، لکھتی ہیں

ہمارے ہاں شادیوں پر اکثر ایک گانا گایا جاتا ہے "خط لکھاں تے لکھ کے میں پاڑ دینی ہاں" تو میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ خط لکھنا کوئی بازیچہ اطفال تو ہے نہیں کہ بندہ کھیل کھیل میں لکھ دے پھر پھاڑ دے۔ مگر اب تجربے کے بعد احساس ہوا ہے کہ ان کا پوسٹ آفس بھی ہماری طرح دسترس سے دور ہو گا تو بے چاری خط جب پوسٹ نہیں کر سکتی تو غصے میں آکر پھاڑ دیتی ہو گی تو بس غصے میں آئے بنا ہم نے بھی ایسے ہی بہت سے خط پھاڑ ڈالے۔

میں "تم اور محبت" پڑھ کر سب سے زیادہ لطف اندوز ہوئے۔ بہت عرصہ بعد کھل کر ہنس لیا پھر رو بھی لیا۔ بہت خوب ایمل رضا، خدا کرے آپ کا قلم یونہی سرسبز و شاداب رہے اور جبران میاں کو بتایئے گا کہ وہ جو غریب راپنزل جیسے بالوں والی ہو گی وہ بس ان ہی "جوگی" ہو گی۔ ہانڈی روٹی کا وقت بال سلجھانے میں ہی لگ جانا ہے اور سارے رومانس کا بیڑا غرق۔

"شہرزاد" خوب صورت اضافہ، آغاز سے ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ منزل آسمان سے آگے ہے یقیناً "مزیدار سا ناول پڑھنے کو ملنے والا ہے۔

"کیپٹن صاحب" گھر آکر بھی کیپٹن ہی رہے۔ ان کی اصل میں تربیت ہی ایسی ہو چکی ہے کہ "جس پر بھی ڈالی بری نظر ڈالی۔" (آپ ذرا بری کاٹ کر "شک بھری" نظر لگا لیں ہم نے اس لیے نہیں لگائی کہ شاعر کا دل دکھے گا) ایک دھاگا باندھنا تھا۔ بے چاریوں نے، سارے گھر کو وخت میں تھوڑی ڈالنا تھا۔

"یادگار سین" میں سمیر صاحب کا بھیجا گیا اغوا کار نمبر ون بزدل تھا ایسے ہوتے ہیں اغوا حد ہے بھئی "شہرزنطا" کے لیے؟ کہیں، ذرا سی خطا یہ ہوئی کہ اکتوبر کا شمارہ لینے وقت پر نہ پہنچ سکے بعد میں ملا ہی نہیں۔

وین میں بیٹھ کر خط لکھ رہی ہوں

ج پیاری ثوبیہ! آپ پہلے تو یہ بتائیں کہ افسانے لکھنا کیوں چھوڑ دیے آپ مزاح پر توجہ دیں۔ آپ میں صلاحیت ہے جبران میاں راپنزل جیسے بالوں والی کو اتنی تلاش کے بعد ڈھونڈ کر لائیں گے تو اس سے ہنڈیا روٹی تو نہیں کرائیں گے نا.... خود چولھا جھونکیں گے یا پھر ملازم رکھیں گے۔

ویسے وین میں بیٹھ کر آپ کے خیالات کی روانی کا یہ عالم ہے تو اگر آپ ٹرین میں بیٹھ کر لکھتیں تو اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ خط کیسا ہوتا۔

کنیز فاطمہ نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

تین چار ماہ پہلے میں نے دو افسانے بھیجے تھے۔ عشق آتش اور انکم سپورٹ کے نام سے۔ پلیز ان کے بارے میں بتا دیں۔

ج پیاری کنیز! آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے۔ کوشش جاری رکھیں۔ انکم سپورٹ کے لیے معذرت.... عشق آتش ابھی پڑھی نہیں گئی۔

راحیلہ عالم نے کراچی سے شرکت کی ہے ، لکھتی ہیں

ٹائیٹل اچھا تھا ۔ ویسے آپس کی بات ہے کہ اگر شعاع اور خواتین پر صرف نام لکھا ہو اور سرورق پر کچھ نہ ہو تو بھی اس کے لاکھوں کروڑوں پرستار پھر بھی خریدیں گے ۔ آزما کر دیکھ لیجئے ۔ ہمیں اس تصویر کی وجہ سے ہی بڑی باتیں سننے کو ملتی ہیں ۔ لوگ کہتے ہیں ٹی وی دیکھتی نہیں ۔ تصویر سے میوزک سے بچتی ہیں مگر کیا کریں اللہ تعالیٰ معاف فرمائے ۔ دل سے بہت مجبور ہیں بہت محبت کرتے ہیں ۔ چھوڑ نہیں سکتے کبھی الٹا کرتے ہیں کبھی کور چڑھاتے ہیں ۔ فہرست پڑھی ، پہلی شعاع حمد و نعت دل میں اتر گئیں ۔

"پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں " تو جواب ہی نہیں ۔ نازیہ علی اور عدنان علی کا بندھن اچھا لگا جب مجھ سے ناتا جوڑا میں س ۔ ج ۔ پ کا پڑھ کر یہ افسوس ہوا کہ لڑکی کی ماں نے ہی جھگڑے شروع کیے حالانکہ ماؤں کو بہت سمجھ داری سے کام لینا چاہیے ۔ تاکہ ان کی بچیاں سکون سے رہ سکیں ۔

اب لڑکیوں کو میڈیا نے اتنا تیز کر دیا ہے کہ اب تو ساس سسر مظلوم اور دیور نند خاموشی کی تصویر نظر آتے ہیں ۔ پتا نہیں ایسی ساس اتنی عجیب نندیں کہاں پائی جاتی ہیں اور ایسی معصوم بہویں بھی نظر نہیں آتی ہیں ۔

" یادگار سین " عزہ خالد کا کچھ خاص پسند نہیں آیا ۔ پیال ساز میں بیچاری نگار کو تھپڑ مارنے پر اتنی بری طرح تھپتے ہوئے بتایا گیا لڑکیوں کو اس سے یہ سبق ملا ہو گا کہ اپنے کام سے کام ہی رکھنا چاہیے ایسے ویسوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے اور اس میں ہیروئن صاحبہ جوتوں اور چپلوں سے پیٹ رہی ہیں ۔

ثوبیہ جبیں گل کا " سوچنے کی بات " اچھا لگا ۔ حقیقت سے قریب تھا ۔ نایاب جیلانی کا " شہر خطا " بہت اچھا ناول ہے ۔ انادیہ کی حرکتیں پڑھ کر روح تک کانپ جاتی ہے ۔

ماورا خان کا " کمال ضبط " اچھا تھا صبر اور شکر کا سبق ۔ عفت سحر طاہر کا " خواب شیشے کا " بہت پیارا ناول ہے ۔ فوزیہ اشرف کا " فیصلہ " اچھا لگا واقعی بزرگ بہت سمجھ داری سے فیصلہ کرتے ہیں ۔

" نکی جئی ہاں " مصباح علی سید کا مکمل ناول بہت اچھا تھا ۔ ایمل رضا کا میں محبت اور تم بہت بہت بہترین ۔ ایمل رضا بہت اچھی رائٹر ہیں ربیعہ طارق کا افسانہ " صدقہ " پڑھ کر بہت دل دکھا ۔ کوثر خالد جڑانوالہ اور " ثمینہ اکرام " کراچی کے خط کی منتظر رہتی ہوں اللہ ثمینہ جی کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے ۔ کوثر جی کے خیالات بہت اچھے لگتے ہیں ۔

ج پیاری راحیلہ ! اتنا تفصیلی اور باریک بینی سے کیا گیا تبصرہ اچھا لگا ۔ ہم اپنی کسی قارئین کی کسی بھی بات کا برا نہیں مانتے ۔ چاہنے والوں کی باتوں کا کیا برا ماننا ۔ اور سرورق کے لیے صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی تبدیلی کے لیے وقت درکار ہوتا ہے ۔ ممکن ہے کہ کبھی آپ کی خواہش بھی پوری کر سکیں ۔

ریحانہ چوہدری نے مدوکے سے شرکت کی ہے

2 جنوری کو بھانجے کے ولیمہ سے واپسی پر بیٹے سے کہا کہ رحمان بک ڈپو سمبڑیال پر گاڑی کو ذرا بریک لگانا ۔ کہا تو انسپکٹر صاحب (ہسبنڈ جی) سے ڈرتے ڈرتے ہی تھا لیکن گاڑی بھی رک گئی اور بیٹا ایک منٹ میں ہی ڈائجسٹ کے ساتھ واپس آیا تو کتنی خوشی ہوئی بتا نہیں سکتی ۔ ٹائٹل پہ نظر دوڑائی ۔ بہت خوب صورت سرورق اور فیورٹ ماڈل جو ایک ماہ شعاع پہ تو دوسرے مہینے خواتین پہ نظر آتی ہیں ۔

ہمارا نام سروے میں شامل نہیں ۔

ہمیں خبر ہے سب تعبیریں ہاتھ نہ آتی پریاں ہیں
پھر بھی جاگتی آنکھوں دیکھے سپنے اچھے لگتے ہیں

بہرحال سروے بہت پسند آیا اور سروے کے شروع میں دیا گیا شعر تو بہت ہی اچھا لگا ۔ پہلے خط میں ہی اپنا نام دیکھتے ہوئے ناقابل بیان خوشی محسوس ہوئی ۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح پیاری اور ایمان افروز بندھن میں نازیہ علی اور عدنان علی کی باتیں بہت اچھی لگیں ۔

صائمہ جی اور شہزاد شہزادو نے قدموں کو اس طرح زنجیر کیا کہ اسے پڑھے بنا آگے بڑھا ہی نہیں گیا ۔

شازیہ الطاف ہاشمی کا افسانہ یہ رشتے یہ ناطے ایک جیتی جاگتی حقیقت جس سے آشنائی رشتوں کی تبدیلی کے بعد ہی ہوتی ہے ۔ عزہ خالد کے یادگار سین نے ذہن کو ہلکا پھلکا کر دیا ۔ بہت خوب صورت تحریر نے بہت محظوظ کیا ۔ ثوبیہ جبیں گل کا افسانہ بہترین لفظ لفظ بہترین پرکاری کے ساتھ گویا موتیوں سے تصویر بنائی گئی ہو بہت متاثر کن تھا ۔ شہر

خطابت اچھا لگا بہت بہترین ہے۔ ماوراخاں کی کمال ضبط واہ اسم بامعنی۔ خواب شیشے کا مکافات عمل شروع ہو گیا۔ رقص بسمل میں شکر ہے کہ کہانی کچھ آگے بڑھی۔ ایمل رضا کا "محبت میں اور تو" ناول پڑھا اور بس ڈائجسٹ رکھ دیا اب کچھ پڑھنے کے قابل نہیں رہی۔ کئی دفعہ روئی 'کئی دفعہ ہنسی۔ فوزیہ اشرف کا افسانہ بہت خوب صورت فیملی نزاکتوں کو بیان کرتی ہوئی حقیقت کی عکاسی تھا۔

ج پیاری ریحانہ! آپ یقین جانیں کہ ہم آپ لوگوں کی قیمتی رائے بہت محبت اور توجہ سے پڑھتے ہیں۔ خط شائع نہ ہو تو ملال نہ کیا کریں۔ ہماری مجبوریوں کو مد نظر رکھا کریں۔ رہی بات اشعار کی تو وہ شعبہ انچارج کی صوابدید پر ہے۔ ویسے ہمیں غم دوراں سے زیادہ غم جاناں والی شاعری اچھی لگتی ہے۔ دعاؤں کے لیے ممنون ہیں۔

فوزیہ ثمرٹ 'ثانیہ عمران اور آمنہ رئیس گجرات سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سرورق پازیب پہنی ماڈل اچھی لگی دسمبر ہمیشہ سے جانی دشمن کی طرح لگا جو کہ خاموشی سے وار کر جائے۔ آپ بھی دعا کیجئے گا میری امی صحت مند زندگی گزاریں۔ اور مجھے میرا ے۔ خواب شیشے کا نمیر آفندی تو بڑا بزدل نکلا۔ بدلے کے لیے ایک لڑکی کو استعمال کیا۔ مجھے تو لگتا ہے موحد ہی نجات دہندہ ہو گا مہماہ کے لیے۔

شعاع کا دوسرا ناولٹ یادگار سبق۔ مزاح سے بھرپور تحریر مگر مختصر کیوں 'افسانہ سمجھ کے پڑھ لیا حقیقت میں ایسی دیدہ دلیری لڑکیوں کو سوٹ نہیں کرتی۔ جس بابا ٹائپ ہیرو کی درگت بنائی تھی وجیہہ نے 'کہیں وہ ہمایوں سعید یا پھر فیصل قریشی تو نہیں تھا پس وہ دونوں اسکرین کی جان نہیں چھوڑ رہے۔ مکمل ناول ایمل رضا نے تو کمال ہی کر دیا۔ اس تحریر نے بے تحاشا ہنسایا ہے۔ قسم سے ایسی مزاحیہ تحریر ہر ماہ شامل کریں۔ ایمل رضا کی کیتھرین پاکستان کے کسی ایرے کی بی جمالو ہی لگی۔ اس تحریر کا میسج اچھا تھا۔ کام کوئی بھی ہے اسے حقیر نہ سمجھا جائے اور کام کرنے والوں کو۔ جملوں میں نوک جھونک اور ناک ناک کے ٹوکے (طنزیہ) باتیں تھیں۔ ہنس ہنس کر برا حال تھا۔

بندھن میں نازیہ علی سے ملاقات اچھی لگی۔

"کیسہ جاناں میں کون" ہائے سب نے کتنے اچھے جوابات دیے۔ کوثر خالد ماحول ہی انسان کو اچھا برا بناتا ہے۔ نوال گمن کا عمر سعید کے بارے میں لکھا پڑھ کر آنکھیں اشک بار ہوئیں۔ بہت اچھے طریقے سے انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

خط آپ کے 'کوثر صاحبہ میں کہاں چھاپے مار سکتی ہوں۔ یہ ہمت بھی آپ ہی کر لینا۔ میں تو زنجیروں میں جکڑی ہوں اور زنجیریں آسانی سے کہاں ٹوٹتی ہیں۔

تاریخ کے جھروکوں سے بھی اچھا تھا۔

جب تجھ سے ناتا س۔ ج۔ پ تمہاری عظمت کو سات سلام۔ جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ حقیقتاً "اس ماہ مزہ آیا ہے' واہ کیا جی دار خاتون ہیں آپ تھپڑ کا جواب مکے سے دیا 'دل خوش کیتا اے' جناب یہ مزاح کا تڑکا آپ نے خود لگایا تھا یا ادارے کا کمال ہے۔ میں نے تو تین چار بار اس کو پڑھا ہے اور داد دی ہے محترمہ کو شازی کہتی ہے میری طرف سے بھی سلام کہنا کہ ہم تو دن رات گھر کے لیے محنت کرتے ہیں۔

پھر بھی سر کے تاج جوتا اٹھانے میں تاخیر نہیں کرتے (محاورتاً "کہا ہے جوتے کا) سچ سمجھنے کی غلطی نہ کرنا۔

ج پیاری فوزیہ! آپ کی والدہ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحت کے ساتھ ان کا سایہ آپ کے سر پر سلامت رکھے۔ اور یہ مایوسی کی باتیں نہ سوچا کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دو جہانوں کی خوشیاں اور آسانیاں عطا فرمائے آپ ہنستی مسکراتی ہی اچھی لگتی ہیں۔

تبصرہ ہمیشہ کی طرح بے ساختہ اور جامع ہے اور رہا جوڑا ہے میں مزاح کا تڑکا ہم کیوں لگاتے۔ ہماری قارئین کسی سے کم ہیں کیا؟

سیدہ کلثوم نے لکی مروت کے پی کے سے لکھا ہے

ہماری ایجوکیشن ایم اے عربی ہے اور ساتھ عالمہ کا درجہ بھی حاصل ہے۔ لکھنا پڑھنا چونکہ بچپن سے ہمیں گھٹی میں پلایا گیا تھا اس لیے جیسے ہی اردو کو سیکھا۔ کتابیں پکڑیں اور جنون بن گیا۔ شعاع نے سخت ٹھیس پہنچائی دل کو کیونکہ ہم نے سب سے پہلے شعاع میں اپنا اظہار خیال بھیجا ایک بار نہیں 100 بار لیکن ہر بار ہمیں ناامید کیا گیا۔

شعور کی منزل سے بہت پہلے جب ہم (اردو سے ناواقف تھے) یعنی کہ ہماری مادری زبان تو پشتو ہے ہم کتابیں دیکھتے اور خوش ہوتے۔ بچپن سے اس بات کے دلدادہ تھے کہ ادب کی مجلسوں میں حاضر ہوں

شعاع اجنبیوں کے لیے چراغ

اور ادیبوں کے لیے سرتاج

شعاع نے اپنی لازوال تحریروں اور اپنے الفاظ کے موتیوں سے ہمیں مالامال کردیا۔ شعاع کی خاطر ہم نے کتنی تکالیف جھیلیں' وہ الگ داستان ہے' بہت مار کھائی ایک دو 10 نمبر کے چپل وہ بھی تپتی دھوپ سخت گرمی میں بڑے مزے سے کھاتے (واہ مزا آگیا) ہی ہی ہی۔

ج پیاری بندہ! سچ ہمیں یہ آپ کا پہلا خط ملا ہے۔ اور آپ کی یہ نادر و نایاب تشبیہات پڑھ کر تو دل باغ باغ ہو گیا۔ غالباً" یہ سب پشتو زبان کی ہیں۔ افسوس کہ ہم اتنی میٹھی زبان سے نابلد ہیں۔ دعاؤں کے لیے بہت ممنون ہیں۔ جگہ پانے کے لیے شکایت کا دفتر نہیں' تبصرہ ضروری ہے۔ اور ہاں آپ کا سروے اس وقت موصول ہوا' جب پرچے کو مارکیٹ میں آئے ہوئے بھی چار دن گزر چکے ہیں۔

امید ہے آئندہ کسی شمارے پر ایسا ہی معصومانہ اور بے ساختہ تبصرہ پڑھنے کو ملے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

اور یہ 100 بار اظہار خیال کس پتے پر بھیجا تھا۔ ہمیں تو ایک بار بھی آپ کا اظہار خیال موصول نہیں ہوا۔

طاہرہ عنایت نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

اس بار میں حال چال پوچھنے کے بجائے ڈائریکٹ اپنا بتاؤں گی۔ کہ اس بار شعاع کی وجہ سے جو ہتک میری ہوئی ہے۔ وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ میری پھپھو اتنے سال بعد امریکہ سے آئی ہیں.... ایسے ہی باتیں کرتے کرتے شعاع اٹھالیا۔ اور پہلا صفحہ ہی "رقص بسمل" کا نکلا۔ میری عزت کا فالودہ بنوانے کے لیے...!

پھپھو نے پڑھتے ہوئے مجھے دوبارہ دیکھا۔ اور پھر سرورق پر.... شاید رسالے کا نام پڑھنے کے لیے۔ رسالہ بند کرکے' تکیہ کے نیچے اور ڈانٹا میں بے حد شرمندہ ہوئی۔ جلدی سے خفت مٹانے کو "میری محبت اور تم" "نکی جئی ہاں" دونوں ہی آگے پیچھے لگے ہوئے ہیں نکال کر ان کے سامنے کیے۔ پھر کہیں جا کے میری عزت کا بہتا فالودہ جمی ہوئی سخت آئس کریم میں بدلا.... پھپھو بھی خوش ہوئیں۔

اس بار ایمل رضا کا "میں محبت اور تم" "مصباح علی کا" نکی جئی ہاں" دونوں ناولز نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ جیت جانے کے لیے اور میں فیصلہ نہیں کرپائی کہ کون سا جیتا۔

ٹائی پڑ گئی۔ ایمل اپنی مخصوص تشبیہات اور الفاظ سے دل میں سما گئیں تو مصباح.... اللہ جانے یہ کیا چیز ہے انتہائی موڈی.... جیسا موڈ ویسا ہی قلم جمالیا.... ویل ڈن ایمل' شاباش' مصباح خوش رہو۔

اس ماہ ناولٹ "شہر خطا" کچھ سو سو لگا' پچھلی قسط جیسا نہیں تھا' البتہ دوسرا ناولٹ عزہ خالدہ کا یادگار سبق' بہت زبردست' صدقہ' بہت بہترین اور سب افسانوں پر نمبر لے گیا۔ اس بار قارئین سے سروے بہت زبردست تھا۔ ممتاز یوسف اور کوثر خالد کے جوابات بہترین لگے تھے۔

ج پیاری طاہرہ! ہم ہر ممکن احتیاط کرتے ہیں اور ہمارا سٹر اس سلسلے میں بہت سخت ہے لیکن بھی بشر ہونے کے ناتے نظر چوک جاتی ہے اور اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ پرچا آنے کے بعد جب ہم نے دیکھا تو ہمیں بھی سخت کوفت ہوئی تھی۔ بہرحال آئندہ مزید احتیاط رکھیں گے۔

تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ امتل آپ کی پھپھو کو سلام کہہ رہی ہیں۔

چوک سرور شہید سے بنت حوا لکھتی ہیں

آج کل کہانیوں میں' ہر چیز دکھائی جاتی ہے معمولات وغیرہ۔ مگر افسوس کہ نماز مفقود ہے۔ کیا ہو گیا ہے ہماری مصنفین کو۔ قارئین' کہانیوں کو بہت فالو کرتی ہیں۔ جب "جنت کے پتے" کی پردے والی لائنیں پڑھتی ہوں تو بے اختیار ہاتھ اپنے چہرے پہ جاتا ہے' پردے کی تجدید ہوتی ہے۔ یاد دہانی ہوتی ہے کہ میں بھی کرتی ہوں مجھے بھی کرنا چاہیے.... ایک دن "نمل" پڑھنے لگی۔ وہاں نماز کا ذکر آیا تو مجھے خیال آیا ابھی میں نے بھی نماز پڑھنی ہے۔ تو چاہیے کہ کہانیوں میں ہیروئین کے معمولات میں کم از کم نماز کو تو دکھانا چاہیے پلیز اداؤں کے بجائے دعاؤں کی اہمیت پر زور دیں۔ قسمت تو دعاؤں سے بدلتی ہے۔

ج بنت حوا! کسی بھی بات کی تکرار اور بے محل نصیحت و تبلیغ اثر کھو دیتی ہے۔ ہم کہانیوں میں اخلاقیات کا خیال رکھتے ہیں اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی پیغام یا سبق ہو لیکن ڈائریکٹ تقریر نہیں بلکہ قارئین خود اس کہانی کو پڑھ کر اخذ کریں' ویسے آپ کا خط پڑھ کر ہمیں سچ مچ حیرت ہوئی ہے کیا پرچے میں مزید تبلیغ و نصیحت کی گنجائش ہے؟

تسنیم کوثر نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

جنوری کا شعاع پڑھ کر تو دل باغ باغ ہو گیا ۔ تمام افسانے ناول ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ خاص کر صائمہ اکرم کا شہرزاد۔ واللہ کیا دلربا خوب صورت ترین دلنشین انداز میں لکھا ہے۔

اور عزہ خالد کا یادگار سین بہت خوب "خواب شیشے کا" عفت سحر طاہر کے ناول نے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے اچھا لگا۔ مصباح علی سید کے ناول "نکی جئی ہاں" نے تو بہت مزا دیا اتنا پر بہار بلکہ ذائقہ دار ناول نے دل خوش کر دیا۔ "میں محبت اور تم" ایمل رضا کے ناول نے نہایت معذرت کے ساتھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ویسے ایمل بہترین رائٹر ہیں۔ شہر خطا اچھا لیکن مشکل ترین ناول ہے۔ نہایت دھیان اور سوچ کر پڑھنا پڑتا ہے عنایہ۔ بیہ دیا ناموں کا ہیر پھیر اللہ توبہ دماغ کھپانے والا ناول سردرد کر دیتا ہے۔ باقی افسانوں میں شازیہ الطاف کا "یہ رشتے ناتے" بالکل حقیقت سے قریب تھا بہت اچھا لگا۔ فوزیہ اشرف کا فیصلہ بھی بے حد شاندار افسانہ تھا۔

باتوں سے خوشبو آئے اور پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر دل کو سکون ملتا ہے۔

ج پیاری تسنیم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

مریم فاطمہ ایبٹ آباد سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں

آپی آج تقریباً نو سال بعد دوبارہ قلم اٹھایا ہے۔ خط بڑی مشکل سے پوسٹ کروا رہی ہوں۔ کیونکہ جس کسی کو خط پوسٹ کرنے کا کہا تو وہ اتنی حیرانگی سے دیکھے گا جیسے ہم انسان نہیں (ایلین) ہوں۔ آنکھوں سے یہ الفاظ ادا ہو رہے ہوتے ہیں کہ بی بی پاگل ہو "آج کل کون خط لکھتا ہے۔ اب ان کو کون بتائے کہ ہم غالب کے متاثرین میں سے ہیں۔ آپی میری الماری (کپڑوں کی) اور گھر میں ہے جو نہیں دوسری کوئی۔ ساری ان ڈائجسٹ سے بھری پڑی ہے ۔وجہ آدھا درجن نندیں اور ان کے بچے ہیں۔ مائیں بغیر پوچھے ڈائجسٹ لے جاتی ہیں' واپس نہیں دیتیں اور اگر واپس آجائے تو بچوں نے اس کا کیا حشر کیا ہوتا ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔ میاں صاحب سے اکثر اس بات پر لڑائی ہوتی ہے کہ ان کو الماری میں کیوں رکھا ہے۔ مجھے آپ کی تمام رائٹرز بہت اچھی لگتی ہیں سب ہی اپنی جگہ بہت اچھا لکھتی ہیں نئی پرانی تمام رائٹرز۔ آپی! مکمل وہ واحد کہانی ہے جو کہ میں ہر ماہ پڑھتی ہوں اس کے علاوہ نبیلہ عزیز کی "رقص بسمل" بھی۔ نبیلہ! اللہ آپ کی پریشانیاں ختم کرے۔ آپی آسیہ رزاقی ہمارے شہر میں کہاں رہتی ہیں اگر اجازت دیں تو ایڈریس بھیجیں اتنی اچھی رائٹر ہمارے قریب ہیں اور ان سے ملاقات نہ ہونا ہمارے لیے باعث شرم ہے۔ آپی سائرہ رضا' نمرہ اور سمیرا یہ وہ ہیرے ہیں جو ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے' پلیز ان سے کہیں کہ وہ ہمیں نہ چھوڑیں۔ نعیمہ ناز' راشدہ رفعت' اور ثمینہ عظمت سے ناول اور مکمل ناول لکھوائیں اور زہرہ ممتاز سے میرا خیال ہے کہ یہ اچھا لکھ سکتی ہیں۔

ج پیاری مریم! خواتین اور شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ پرچا ہر ماہ نہیں پڑھتیں البتہ ہر ماہ خریدتی ضرور ہیں۔ اور وجہ اس کی آپ کی بڑی بہو ہونے کے ناتے مصروفیت ہے۔ ہم آپ سے یہ کہیں گے کہ پرچا آپ بے شک پورا نہ پڑھیں لیکن سلسلہ وار ناولوں کی اقساط ہر ماہ ضرور پڑھ لیا کریں تاکہ ہم آپ کی رائے جان سکیں۔ آسیہ رزاقی کے لیے آپ اپنا فون نمبر بھجوا دیں۔ ہم آسیہ صاحبہ کو دے دیں گے۔ وہ خود آپ کو اپنا ایڈریس دے دیں گی۔

بشریٰ گوندل لکھتی ہیں

کیا حال ہے، ہم اسٹوڈنٹس تو سردی سے جمے پڑے ہیں بلکہ یوں کہیں کہ یونیورسٹی کھلنے کے خوف سے بالکل منجمد ہو گئے۔ میں قائداعظم یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں اور اسلام آباد کی سردی..... اف..... ہڈیاں بھی لگتا ہے قراقرم بن چکی ہیں۔ اس بار خط لکھنے کی اصل وجہ مصباح علی ہیں۔ میں نے اوپر تلے کئی رسالوں میں ان کے ناول پڑھے۔ میں ان کی فین بن گئی اور وہ میری فیورٹ بن گئی ہیں۔ انہوں نے اپنے قلم سے یہ ثابت کیا کہ وہ بڑی رائٹر ہیں مدیرہ کی رشتہ دار نہیں۔ خوب صورت انداز تحریر سنجیدہ 'مزاح' برجستہ بے ساختہ..... سلسلے وار ناول صائمہ آپی کا شہرزاد۔ ایک سحر کی طرح لگا۔ اف ٹرین کا منظر اور ہوا سے لڑکھڑا کے گرنا۔ اف جھرجھری آگئی۔ کافی گہری کہانی لگ رہی ہے۔ "خواب شیشے کا" عفت سحر کا سلسلے وار ناول بنا تجسس کے بھی توجہ پا گیا۔ کرداروں کے نام البتہ خاصے مشکل ہیں۔

"کیہ جاناں میں کون" میں نوال افضل گھمن کا تبصرہ جامع مختصر اور بہترین تھا۔ رشک حبیبہ کو شادی مبارک ہو اور رقص بسمل کے لیے اللہ کا واسطہ۔

ج پیاری بشریٰ! یہ آپ لوگوں نے کیوں کر فرض کر لیا ہے کہ خط طویل ہے تو پڑھا نہیں جائے گا۔ ہماری ہمت کو داد دیں کہ بارہ فل اسکیپ صفحات کا خط بھی بخوشی پڑھ لیتے ہیں مگر شائع ہونے کی جو شرائط ہیں ان پر ہم سختی سے عمل کرتے ہیں۔

بشریٰ آپ ہمیں آئندہ خط لکھیں تو اپنے شہر کا نام ضرور لکھیں۔

عمل نے ٹنڈو آدم سے لکھا ہے

جنوری کے شعاع کا ٹائٹل بہتر تھا مجھے پائل بہت پیاری لگی۔ پہلی شعاع اور حمد و نعت پڑھی۔ پیاری باتیں تو ہوتی ہی بہت پیاری ہیں۔ سروے کے سوالوں کے جوابات اچھے لگے۔ انٹرویو میں بندھن میں نازیہ علی اور عدنان علی ہیں کافی انڈراسٹینڈنگ تھی اچھا لگا۔ "تجھ سے ناتا جوڑا" بھی ٹھیک تھا۔ "خواب شیشے کا" لو بھئی نمیرنے تو سب کے چھکے چھڑا دیے۔ انٹرسٹنگ ہے اسٹوری۔ "شہرزاد" اف... اف میں تو ویسے ہی سردی کے موسم میں مری میں ہی ہوتی ہوں (بھئی خیالوں میں) مجھے برفیلا سماں بہت پسند ہے اور اوپر سے میری پسندیدہ جگہ پر آپ نے اسٹوری لکھ دی۔ صائمہ! آپ بہت زبردست ناول لکھ رہی ہیں۔ ناولٹ میں "شہرخطا" کاشف بے چارہ مار دیا "دیا" نے۔ کہانی زبردست جارہی ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ "یادگار سبق" وجیہہ کی بہادری پسند آئی۔ مجھے بھی یہ چھچھورے لڑکے بہت برے لگتے ہیں۔ میں نے تو باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا ہے کاش میں بھی وجیہہ جتنی بہادر ہوتی مگر میں بہت بزدل ہوں۔ مکمل ناول میں "نکی جئی ہاں" بڑا ہی عجیب نام ہے اسٹوری ٹھیک تھی۔ افسانے اس بار سارے ہی بس ٹھیک تھے البتہ دل کو ایک بھی ناں لگا۔ "میں محبت اور تم" ہائے... بس مجھے یہ بتا دیں کہ ایمل رضا اور سمیرا حمید کہاں ملیں گی؟ مجھے نہیں لگتا وہ اس دیس میں اس دنیا میں رہتی ہیں کہیں پریوں کے دیس سے تو نہیں لے آئے آپ میری فیورٹ رائٹر ہیں یہ اتنی اچھی کہانیاں میں واقعی ہی ان سے ملنا چاہتی ہوں پلیز انٹرویو لے لیں ناں ان کا تصویر سمیت پلیز پلیز اتنے اچھے الفاظ کہاں سے لاتی ہیں آپ جگنو بورشے، برف سنڈریلا، سنو وائٹ، کارل اور اب یہ بھالو اف بہت نائس زبردست۔

ج پیاری عمل! دنیا اتنی بھی بری نہیں ہے، جتنا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا میں جہاں کچھ برے لوگ پائے جاتے ہیں وہاں بہت سارے اچھے لوگ بھی موجود ہیں اور ان ہی کے دم سے دنیا قائم ہے اور ڈرنا تو ویسے بھی اچھی بات نہیں۔ جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ خود کو مضبوط کریں کوئی بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ایمل رضا اور سمیرا حمید کی تحریریں پڑھ کر تو ہمیں بھی حیرانی ہوتی ہے یہ ان کی خداداد صلاحیت ہے اتنی کم عمری میں ایسا مشاہدہ الفاظ کا اتنا عمدہ انتخاب اور موضوعات کا ایسا تنوع بہت کم تخلیق کاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ خواتین ڈائجسٹ کو ہمیشہ بہترین رائٹرز کا ساتھ حاصل رہا ہے۔

نکی جئی ہاں کا مطلب ہے "چھوٹی سی ہاں"

اوکاڑہ سے ڈاکٹر طاہرہ جیلانی شریک محفل ہیں لکھا ہے

شہرخطا اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ ایسے شاہکار ناول ہی شعاع کے ساتھ وابستگی کا ذریعہ ہیں۔ تنقید یہ ہے کہ "رقص بسمل" بہت بے قاعدگی سے لکھا جارہا ہے۔ اگر رائٹر صاحبہ اپنے ذاتی مسائل کی وجہ سے نہیں لکھ پا رہیں تو ایک دو قسطوں میں ختم کردیں اس کو۔ میں نے اپنے نئے نویلے مجازی خدا کے نام خود ایک غزل لکھی ہے آپ سے درخواست ہے کہ شاعری سیکشن میں ضرور شائع کیجئے گا۔ کیونکہ میں نے ان کو چیلنج دیا ہے۔

ج محترمہ ڈاکٹر صاحبہ! آپ کی تعریف و تنقید کی تو خیر ہے۔ مگر یہ چیلنج والی بات... کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ یہ نظم ہمیں بھیجنے کے بجائے بالمشافہ ہی انہیں سنا دیتیں۔ دیکھیں! آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ اپنی مرہم پٹی خود کرلیں گی۔ ہم بیچارے غریب کہاں جائیں گے۔ ویسے بھی آپ کی شادی کو ابھی سال بھی نہیں گزرا۔ کم از کم ایک عشرہ تو گزرنے دیں پھر لکھئے گا۔

شازیہ الطاف ہاشمی نے شجاع آباد سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

شعاع اور خواتین ہر دفعہ ہی بہار کا پیغام لیے آتے

ہیں۔ ہمارے لفظوں کو آپ نے معتبر جانا۔ پتا نہیں کتنے لوگ ہیں سب' ہمارے دل میں بستے ہیں اور ان سب کو میں چائے پلانا چاہتی ہوں۔ بچوں کے اسکول کھل گئے ہیں۔ فاطمہ' آمنہ اسکول گئی ہیں۔ الطاف ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے ہی نکل جاتے ہیں اور پیچھے میں اکیلی بیٹھ کے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ خیر آپ نے کون سا جواب دینا ہے مجھے نہ دیں کسی اور کو دے دیں کیونکہ اگر میرا خط چھپا تو پھر افسانہ غائب ہو جائے گا اس لیے میں جواب کے بغیر ہی بھلی۔

ج شازیہ الطاف ہاشمی! ہم نے آپ کا پورا نام لکھا ہے۔ تاکہ آپ کی شکایت دور ہو جائے۔ آپ کی محبت کے لیے ممنون ہیں اور ہمارے دل میں بھی آپ کے لیے اتنی ہی محبت ہے۔ جہاں تک چائے کی بات ہے تو کبھی موقع ملا تو آپ کے پاس آئیں گے اور چائے بھی ضرور پئیں گے۔
دیکھیں' آپ کو یقین تھا کہ ہم آپ کو جواب نہیں دیں گے اور آپ کو جواب چاہیے بھی نہیں پھر بھی ہم نے آپ کا خط شائع کیا اور جواب بھی دے رہے ہیں۔

ناظمہ زیدی' چوک اعظم سے لکھتی ہیں

پیاری باتیں ماشاء اللہ آپ نے ایک بار بیماریوں اور علاج کے متعلق کچھ احادیث شائع کی تھیں پلیز اگر اس سلسلے میں کچھ اور بھی دیں تو مہربانی۔ "کیہ، جاناں میں کون" میں سب کے جواب اچھے لگے۔ ممناز یوسف جی' آپ کو بہنوں کی محفل میں مس کرتے ہیں۔ نادیہ علی کے جوابات اچھے لگے۔ صائمہ جی! آپ کا ناول اچھا ہو گا ہمیشہ کی طرح ہمیں یقین ہے۔ سیدھی سادی کہانیاں زیادہ اپیل کرتی ہیں بجائے فلسفے کے گوگل سے لی گئی معلومات ہمیں بھی پسند نہیں عزہ خالد اچھی کہانی تھی مزاحیہ سی۔ فریش کر دیا آپ نے تو "سوچنے کی بات" رائٹر کی سوچ بالکل درست تھی نہ جانے کیوں اپنوں کی جڑیں اپنے ہی کاٹتے ہیں۔ انجام تو سوچ لیا کریں کبھی.... "کمال ضبط" کمال کا ضبط تھا بھئی "خواب شیشے کا" آگے بڑھ رہا ہے آہستہ آہستہ بہت اچھا لگ رہا ہے یہ ناول مجھے تو دلچسپ "فیصلہ" اچھا افسانہ تھا اچھا سبق گڈ۔ ایمل رضا آپ کو کیا کہوں "نام ہی کافی ہے" زبردست ناول۔ بہنوں سے شکوہ ہے کسی نے بھی مجھے یاد نہ کیا؟ خاص طور پر کوثر خالد آپ نے' 'آپ سے تو کوئی دل کا رشتہ محسوس ہوتا ہے۔ ثناء مسکان میں متفق ہوں آپ کی بات سے سو فیصد۔

پیاری ناظمہ! شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ' خواتین اور شعاع کے معیار کا اندازہ تو آپ ہر مہینے اسے پڑھ کر لگا ہی لیتی ہوں گی۔ ہم تو بس اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اتنی اچھی لکھاری اور قاری بہنوں سے نوازا ہے۔
آپ کے دونوں افسانے قابل اشاعت ہیں۔ ان شاء اللہ باری آنے پر لگ جائیں گے۔ مگر یہ بات آپ اپنے شوہر' دوستوں اور رشتہ داروں کو ہر گز مت بتائیے گا۔
کہانی کس موضوع پر لکھی جا رہی ہے' یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر کہانی میں کچھ ایسے مسائل کو اٹھایا گیا ہے جن کی گہرائی میں جانا ضروری ہے تو بہتر ہے کہ اس موضوع کے متعلق معلومات بھی مہیا ہوں۔ اس کے لیے مطالعہ اور گوگل کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایبٹ آباد سے سحرش نور شریک محفل ہیں

سب سے پہلے شعاع آیا وہی پڑھا۔ بے حد دلچسپ لگا۔ سب سے پہلے نکی جی ہاں پر ہی دوڑ لگائی۔ میری فرمائش نوٹ کر لیں پلیز مصباح سے کہیں نکی جی ہاں کی سیریز بنا دیں جیسے سائرہ کی اور ثمو بخاری کی ہے۔
نایاب آپی کا "شہر خطا" پسند آ رہا ہے۔ عنادیہ کا رویہ بہت ہی عجیب ہے۔ کہانی جیسے جیسے بڑھ رہی ہے۔ ماضی کھل کر سامنے آ رہا ہے۔ ویسے نایاب آپی کے ناولز میں پیروں' تعویز دھاگے کا خاصا ذکر ہوتا ہے اور یہ ہیں بھی جیلانی' کسی پیر خاندان کی تو نہیں۔ افسانے اس بار کہانیوں کے اعتبار سے اچھے تھے۔ مگر ان میں افسانوی رنگ نہیں تھا۔

ویسے ایک بات اب شدت سے افسانوں میں دکھائی دے رہی ہے۔ یا تو بے تحاشہ منظر کشی ہو گی بلاوجہ کے لفظ کہانی سے عاری یا پھر سیدھی سپاٹ فارمولا سی کہانی۔ منظر اور کہانی ملا کر جو افسانہ تیار ہو اس کی بات ہی الگ ہے۔
ارے ہاں آپی' سلسلہ جب تجھ سے ناتا جوڑا.... ہاہاہا شدت سے ہنسی آئی۔ پلیز تصحیح کر دیں یہ لطیفہ تھا کہانی تھی یا حقیقت اف.... جو بھی تھیں البتہ بڑی ہی صاف گو خاتون تھیں۔ جیتی رہو یونہی۔ نادیہ علی کا بندھن اچھا لگا باقی تمام سلسلے جاندار تھے۔

ج پیاری سحرش! آپ کی فرمائش مصباح علی تک پہنچا رہے ہیں۔ ویسے ہم آپ سے متفق ہیں۔ مصباح میں

مزاح لکھنے کی صلاحیت ہے۔

ضروری نہیں کہ رائٹر کسی موضوع پر لکھے تو اس میں اس کا ذاتی تجربہ شامل ہو۔ ایک حساس انسان جو کچھ اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ محسوس کرتا ہے' اسے اپنی کہانیوں کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ نایاب جیلانی نے صرف تعویز گنڈوں پر نہیں اور موضوعات پر بھی لکھا ہے "ناتا جوڑا ہے" کی خاتون واقعی بہت دلچسپ اور صاف گو ہیں' ہمیں بھی ان کی سچائی نے متاثر کیا۔

صبا گل' حفصہ' رانی' عذرا' ثناء' آنسہ لکھتی ہیں

ہوش سنبھالا تو بڑی بہنوں کے ہاتھ میں شعاع اور خواتین دیکھا اور پڑھنا شروع کیا اور اس وقت سے اب تک رابطہ برقرار ہے۔ یعنی 12 سال ہوگئے۔ اب ہم کہانی ڈاؤن لوڈ کرتے ہیں کیونکہ یہاں پرچا ملتا نہیں پھر ہم ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہیں کیونکہ تین بہنیں شادی شدہ ہیں اور پھر فون پر وہ بحث کہ امی بھی سر پکڑ لیتی ہیں۔ مگر ہمارا تبصرہ ختم نہیں ہوتا اور اب تو دو تین کزن بھی شامل ہیں جنہیں ہم پڑھ کر سناتے ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جب صبا نے عمر جہانگیر کی ڈیتھ کے بارے میں پڑھا تو رونے لگی۔ جبکہ میری کزن تو باقاعدہ بے ہوش ہو گئی تھی اور وہ ایسے کہ جب اسے ہم کہانی سناتے۔ تو وہ رونے کی وجہ سے منہ کے ایسی زاویے بناتی کہ ہم اس پر بہت ہنستے اور مذاق اڑاتے پھر جب بجو اسے کہانی سنا رہی تھیں اور عمر جہانگیر کے موت کے بارے میں بتایا' اس وقت دونوں کچن میں جا رہی تھیں۔ جب بجو نے اس کی ہوں ہاں نہ پا کر پیچھے دیکھا تو آنسہ اوندھے منہ زمین پر۔

ڈاکٹر نے کہا ٹینشن لی ہے۔ ہاہاہا اور باقی کہانیاں اور سلسلے تو اس پر تو میرا دل چاہتا ہے خوب تبصرہ کروں۔ لیکن پھر وہی بات آپ کے صفحات۔

ج پیاری سی صبا' حفصہ' رانی' عذرا' ثناء' آنسہ! خط اس وقت شائع ہوتا ہے۔ جب شمارے پر جامع تبصرہ ہو۔ اور وہ بروقت ہمیں مل جائے۔ ہمارے صفحات محدود ضرور ہیں مگر ہم آپ لوگوں کے خطوط پڑھتے ضرور ہیں' خواہ وہ کتنی ہی تاخیر سے ملیں کیوں کہ آپ لوگوں کی آرا اور فرمائشوں کو مدنظر رکھ کر ہی پرچا ترتیب دیا جاتا ہے۔

آپ کی اردو تو کافی بہتر ہے۔ آپ کہانیاں بھیج دیں۔ پڑھ کر ہی پتا چلے گا کہ زبان کا مسئلہ ہے یا..... خط میں آپ نے کہانیوں پر تبصرہ نہیں کیا' آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

فائزہ بھٹی نے پتوکی سے لکھا ہے

آج کل شادیوں کا سیزن ہے نا تو ماڈل گرل مایوں مہندی کے فنکشن میں جانے کی تیاری کیے اچھی لگ رہی تھی۔

"کیسے جاناں میں کون" سب کے سوال دل چسپ تھے۔ ثمرو احمد بٹ پتوکی سے آپ نے لکھا 2012ء سے پڑھ رہے ہیں۔ جبکہ میں پچھلے دنوں ایک پرانا رسالہ پڑھ رہی تھیں۔ 2008ء یا 2007ء کا تھا اس میں بھی آپ کا ذکر تھا۔ (جواب کی منتظر) عائشہ انصاری اور حرا قریشی نے بھی بہت اچھا لکھا۔ "جب تجھ سے ناتا" اس بار تو بہن صاحبہ نے کچھ زیادہ ہی توقعات لگا رکھی تھیں اور خوب فکر کی تھیں سسرال والوں کی ان کی تو ساس کا بھی سلسلہ شامل ہونا چاہیے۔ "خواب شیشے کا" واہ نمیرہ آفندی کیا خوب بھگو کر ماری ہے۔۔۔

ج پیاری فائزہ! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ صفحات کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم آپ کا پورا خط شائع کرتے آپ کے سوال نمبر 1 اور 2 کا جواب ہے "ہاں" اور تیسرے کا جواب ہے "نہیں۔"

کوثر خالد نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

بھئی ہم نے نماز پنجگانہ کی کوشش کامیاب کرنا ہے۔ لہٰذا تبصرے مختصر کرنا پڑیں گے۔ پہلی شعاع ابد تک سلامت حمد و نعت کیا قافیے زبردست۔ نبی کی باتیں روشن روشن۔ تجھ سے ناتا ہنس ہنس کے برا حال۔ بیٹی بولی اسکول میں پڑھواؤں گی ٹیچرز کو۔ چھم پکار تو ہم بھی کرتے ہیں مگر اس طرح کی نہیں۔ ج نے خود لکھا ہے تو بھئی کمال ہے کمال شہرزاد ہماری پسندیدہ رائٹر۔ فسوں خیزی تو بہت ہے۔ شہر خطا' دردناک ہے۔ یادگار سبق عزہ خالد۔ واہ نہایت دلچسپ قلم' زور قلم اور..... غزلیات' دو شعر تو مجھ پر تھے۔

خیرات کیا وہ بھی جو موجود نہیں تھا
تو نے تہی دستوں کی سخاوت نہیں دیکھی

ج بھئی کوثر یہ کیا بات ہوئی۔ اگر ہر نماز کے لیے 30 منٹ مختص کر لیے جائیں تو ڈھائی گھنٹوں میں پانچوں نمازیں ادا ہوجائیں گی باقی کے 21 گھنٹوں میں آپ کے پاس 15 منٹ کا تبصرہ لکھنے کا وقت نہیں۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے
"حوض کوثر" مل گئی ہے۔ دوبارہ سے شکریہ۔

عالیہ راؤ نے ملتان سے لکھا ہے

ایک درخواست پیارے نبی کی پیاری باتیں میں زنا کے بارے میں احادیث و قرآنی آیات شائع کریں اور میرا خیال ہے ہمارے عہد حاضر کے شعراء کرام بھی اچھی حمد و نعت کہتے ہیں ان کو بھی موقع دیں مطلب نئے شعراء کا کلام شائع کریں۔ حصہ نظموں غزلوں میں فرزانہ نیناں اور دیگر شاعرات کا کلام بھی شامل کیا کریں۔ دو مرتبہ رس گلے ٹرائی کیے بھابی نے "موسم کے پکوان" میں۔ بس وہ سب ہی کچھ بنے مگر "رس گلے" نہیں بنے۔

خواب شیشے کا بہت خوب صورت ناول ہے۔ بھئی مجھے تو ویسے بھی رومانٹک ناول پسند ہیں۔ کوثر خالد جی میرے اگلے ناول کے ہیرو کا نام ربیع تمر ہے۔ تمام سلسلے اچھے ہیں۔ نعمان اعجاز اور صبا قمر کا انٹرویو کریں۔ ہو سکے تو علی وارث کو بھی لائیں۔

ایک وہی سابقہ فرمائش فرحت اشتیاق اور مریم عزیز سے کوئی بہت ہی رومانٹک ناول لکھوائیں۔ بے حد رومانٹک بارش میں بھیگتا ہوا۔ کوئل سی کوک سا، کسی گوری کی ہوک سا، گلاب سا، چاندنی رات سا پلیز مریم جی اور فرحت جی اور سائرہ رضا میں محو انتظار ہوں ابھی سے۔ میرے شہر کی میمونہ خورشید کہاں غائب ہیں پلیز ان سے کچھ لکھوائیں اور نبیلہ رمضان! ایک لڑکی ملتان میں رہتی ہے عالیہ راؤ، 25 دفعہ تمہاری کہانی ام ہانی والی پڑھ چکی ہے، نام میرے خیال میں مرگ وفا تھا مریم ساجد قسم سے آئی مس یو، یار بشریٰ گوندل کوئی ناراضی ہے؟ آجائیں (نئے لوگوں کو موقع بھی دیں) سدرہ سحر عمران کدھر ہو بھئی۔ نبیلہ ابر راجہ "ہائے" تمہارے ہیرو کا مجھے بے حد انتظار ہے بس سمجھو دھند میں کھڑے رہتے یہ کھڑی ہوں۔ آج ساگ ہی پکایا ہے قسم سے اگر وہ آگیا تو ساگ پراٹھے کے ساتھ کھلاؤں گی۔ یار مکھن والی روٹی کے علاوہ پراٹھے کے ساتھ بھی بہت لطف دیتا ہے ساگ۔ آزمائش شرط ہے۔

ج پیاری عالیہ! آپ کی کہانی ہم نے ایک دفعہ نہیں دو دفعہ پڑھی ہے اور ہم اپنی رائے پر قائم ہیں۔ حقیقت نگاری اور رومانس اپنی جگہ لیکن ہمیں پرچا ترتیب دیتے ہوئے بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ منٹو اور عصمت چغتائی اردو ادب کے بڑے نام ہیں لیکن ان کی بہت سی کہانیاں ہمارے پرچوں میں شائع نہیں ہو سکتیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے پرچے بڑی عمر کی خواتین کے ساتھ ساتھ کم عمر لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں لہٰذا ہمیں کہانیاں شائع کرتے ہوئے بہت محتاط رہنا ہوتا ہے۔ آپ جنوری کے شعاع میں ایمل رضا کی اور جنوری کے خواتین میں سمیرا حمید کی کہانی دیکھیں، دونوں کا موضوع محبت ہے لیکن محبت میں بھی ایک وقار اور رکھ رکھاؤ ہونا چاہیے۔

آپ اطمینان سے امتحان دیں، پھر کہانیاں لکھیں آپ یقیناً" بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔

آپ کی پسندیدہ مصنفین تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

ثمینہ اکرم علیاری کراچی سے لکھتی ہیں

نئے سال کا سروے پڑھ کر ذرا مزہ نہ آیا کیونکہ سروے کو مختصر کر دیا گیا تھا جس کا مجھے بہت دکھ ہوا.... اتنا اچھا سوال تھا کہ "گزرے سال کی کوئی میٹھی سی یاد" مگر یہ سوال تو سرے سے سروے میں موجود ہی نہ تھا۔ سروے کا سارا حسن برباد ہو گیا اس سوال کو حذف کرنے سے.... اس کی وجہ تو آپ ہی بتا سکیں گی ہمیں، آگے بڑھتے تو صائمہ اکرم چودھری کا ناول "شہرزاد" پڑھ کر ساری کوفت اور بے زاری رفوچکر ہو گئی۔ نئے سال کا خوب تحفہ دیا آپ نے۔ "شہرزاد" پہلی قسط سے ہی آؤٹ کلاس اسٹوری رہی۔ ابھی تو کرداروں کا تعارف ہی ہوا ہے۔ آگے چل کر بہت سپرہٹ ناول رہے گا۔ مکمل ناول میں مصباح علی سید کا ناول "نکی جئی ہاں" اچھا لگا جبکہ ایمل رضا کا ناول "میں، محبت اور تو" بھی بس ٹھیک ہی رہا۔ "خواب شیشے کا" نمیر آفندی نے آغا جان کا بدلہ مہماہ سے لیا۔ یہ کچھ اچھا نہیں لگا۔ کوثر خالد جی سلام عرض ہے۔ آپ نے اپنے سارے شعاع کے شمارے قربان کر دیے یتیم بچوں کی مدد کے لیے۔ اگر آپ کو شعاع ڈائجسٹ چاہئیں تو میں آپ کو اپنے سارے شعاع ڈائجسٹ تحفتاً" دے کر خوشی محسوس کروں گی، آپ کے جواب کا انتظار رہے گا اور ہاں ڈاک خرچ بھی میرے ذمے ہو گا.... میرے پاس تو ان کا وسیع ذخیرہ موجود ہے۔

ج پیاری ثمینہ! نئے سال کے سروے میں پیاری بیٹی

غنوی شامل نہ ہو سکیں اس کا ہمیں بھی بے حد افسوس ہے۔ سروے کا ایک سوال "میٹھی سی یاد" ہم نے حذف کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس سوال کا جواب بیشتر بہنوں نے تقریباً یکساں دیا تھا اور آپ جانتی ہیں کہ کسی بھی بات کی تکرار بیزاری اور اکتاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم چاہتے تھے کہ ہماری قارئین نے اتنی محنت سے سروے کے جوابات لکھے ہیں اور پھر ہمیں بھجوانے کی تکلیف کی ہے تو محدود صفحات میں زیادہ سے زیادہ نام شامل ہو جائیں۔

کوثر خالد تک آپ کی فراخ دلانہ پیشکش پہنچا رہے ہیں۔ ویسے آپ بھی کوثر خالد سے کم بڑے دل کی نہیں ہیں۔ اپنا اتنا قیمتی ذخیرہ دینے کو تیار ہیں اور ڈاک خرچ بھی اپنے ذمے لے رہی ہیں۔ واہ بھئی! ہماری قارئین کا جواب نہیں ہے، ہم ایسے ہی تو اپنی قارئین پر فخر نہیں کرتے۔

زندگی تنویر خلیل نے گاؤں پیْوار بالا پشاور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

خط کیا، گلہ نامہ سمجھیے۔ آٹھویں میں آپ کو پہلا افسانہ بھیجا تھا، ناقص سا اور ناقابل اشاعت بھی، پھر بھیجا "عشق موت کی سانس ہے" مگر وہ نویں کلاس میں نہیں بھیجا تھا، بلکہ تعلیم چھوڑنے کے بعد.... آٹھویں کے بعد قلم پہ پابندی لگی، کسی بدکرداری کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ بس لگ گئی۔ انسان اپنے خواہشات سے کیسے مجبوراً دستبردار ہوتا ہے، اب یقین ہو چلا ہے۔ تعلیم کسی کی جاگیر نہیں۔ ہم نے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا مگر کسی اسکول سے نہیں، بلکہ شعاع کرن وغیرہ سے۔ ہم کو احساس ہونے لگا ہے کہ ہم میں تخلیقی صلاحیت ہے۔ مگر یہاں سے جواب تو ملے....

اپنے درد، خواہشات کے لیے صرف رسائل نظر آئے کیونکہ آپ جانتی ہیں نا.... کہ ہم پٹھان اپنے فیصلوں میں کتنے کھردرے ہوتے ہیں۔

تحریری سفر تو شروع کیا ہے مگر پٹھان کو تو اور بھی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے نا.... کیونکہ یہاں لکھنا تو کیا بولنا تک محال ہے۔ "عشق موت کی سانس" اس لیے لکھی کہ میں بنت سحر نہیں ہوں، عمیرہ اور نمرہ، ہاشم ندیم یا ایمل نہیں ہوں۔

پشاور کے گاؤں پیْوار بالا کی پٹھان ہوں۔ پٹھان.... ان مٹ، ان دیکھے پابندیوں میں جکڑے۔ رات کا وقت ہے۔ سب سو رہے ہیں اور ہم لکھ رہے ہیں کہ لکھنا جنون ہے۔

ہمارے تحریری سفر میں کیا ساتھ دیں گی آپ؟ کیا ہم بھی عزت سے سانس لینے کے حق دار ہیں؟! التجا....
التجا.... اور پھر.... التجا....

ج تنویر! آپ کا تو نام ہی زندگی ہے اور زندگی تو اسی کا نام ہے۔ کچھ خوشیاں کچھ غم، کہیں پابندیاں کہیں آزادی اور صرف پٹھان ہی نہیں خواتین تو ہر جگہ بندشوں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہیں زیادہ ہی پابندیاں ہیں اور سچ پوچھیں تو پابندی نہ بھی ہو تو انسان اپنی تقدیر سے تو فرار نہیں حاصل کر سکتا۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کو آج بھی آواز اٹھانے کی اجازت نہیں۔ وہ بے چاریاں تو پروین شاکر کی طرح "سوچ کے پروں" کے کٹنے کا گلہ بھی نہیں کر سکتیں۔

تمہیں ہاشم ندیم اور عمیرہ بننے کی ضرورت بھی نہیں تمہیں اللہ نے الگ مزاج، سوچ اور شخصیت دی ہے۔

جو ذرہ جس جگہ ہے آفتاب ہے۔ آپ کی یہ بات اچھی لگی کہ ظلم خاموش نہیں رہنے دیتا۔ ظلم کسی بھی نوعیت اور کسی بھی روپ میں ہو اسے بحیثیت انسان قبول کرنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ انسان کے حوصلے، اس کی ہمت اور اس کے افضل ہونے کی توہین ہے۔ افسانہ کسی ہلکے پھلکے موضوع پر لکھیں۔

ہم آپ کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ آپ افسانہ لکھ کر بھجوائیں لیکن ایک شرط ہے کہ ناقابل اشاعت ہونے کی صورت میں دل برداشتہ نہ ہوں۔

بشریٰ ایمان بھکر سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

خط تو میں کافی دفعہ لکھ چکی مگر آپ لوگوں نے ان کو ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا آج جس اسٹوری نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا وہ ہے "شہر خطا" کا کردار انادیہ ہے حالانکہ آج کل میں اپنے ایم فل میں بہت مصروف ہوں، ساتھ جاب بھی تو ٹائم صرف سلسلے وار ناول کا ہی نکال پاتی ہوں، آج جب "انادیہ" کے بارے میں پڑھا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئی مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب کسی انسان پر ظلم ہوتا ہے تو اس کے اندر زہر بھر جاتا ہے مگر یہاں کا دستور ہے کہ ظلم کرنے والے کو تو کھلی چھوٹ دی جائے ہاں سہنے والا صبر کرے۔ یہی کچھ انادیہ

کے ساتھ ہوا بچپن سے اس کے اندر اتنا زہر بھر گیا پھر سونے پہ سہاگہ اس کی چچی نے کسر پوری کی۔ اس کی عزت نفس کو روند کر جوتے مارے جب "اناویہ" نے بدلہ لینے کی ٹھانی تو محترمہ رائٹر بھی اور ان کے ساتھ ساتھ ساری قارئین بھی دشمن بن گئیں۔ میری رائٹر سے درخواست ہے کہ اناویہ کے ساتھ کچھ برا نہ کریں کیونکہ جو کچھ وہ کر رہی ہے میں اس کو اس پر حق بجانب سمجھتی ہوں' پہلی غلطی اس کی ماں کی ہے کیونکہ جب کسی جانور کے بچے کو بھی زدوکوب کیا جائے تو وہ حملے کے لیے آجاتا ہے۔ کیسی ماں تھی جو بیٹی کے ساتھ ظلم دیکھتی رہی اور آگے نہیں بڑھی۔ "اناویہ" کا غصہ نفرت سب حق پر ہے۔ میں کہتی ہوں' کسی کو بھی "اناویہ" کے اس رویے پر اعتراض ہے تو خود کو اس کی جگہ پر رکھ کر دیکھے اگر وہ جادو ٹونے کی طرف گئی تو وہ قصوروار نہیں کیونکہ وہ اتنی ہرٹ ہو چکی تھی۔ غصہ نفرت اتنا اس کے اندر بھر چکا تھا۔ کوئی سمجھانے والا بھی نہیں تھا اور انسان اپنی تذلیل بھول نہیں سکتا نہ معاف کر سکتا ہے تو اس وقت اس کی دوست نے اس کو جو کہا' وہ بیچاری اس راستے پر چل پڑی "جب تجھ سے ناتا جوڑا" انتہائی فضول' جیسے دنیا کی ساری بہوئیں مظلوم' سسرال والے ظالم میں نے تو اپنے اردگرد آج تک اتنی مظلوم بہوئیں نہیں دیکھی یہاں پر بات ہوتی ہے کہ ساس نندیں جلاتی ہیں۔ میں نے بہوؤں کو ساس کو جلاتے دیکھا میری اپنی بھابھیاں جیسی ہیں خدا کی پناہ۔ آج کل کی عورتوں کی سائیکی ہے میاں مٹھی میں' ساس نندیں جائیں بھاڑ میں۔ نند تو ایک بھی برداشت نہیں' آج کل کی بہوئیں سٹار پلس والی ہیں۔ نرا ڈرامہ' جو اپنی کہانیاں لکھ کر بھیجتی ہیں خود نیک بی بیاں بن جاتی ہیں' میاں جی بھی اچھے۔ بری تو صرف ساس اور نند ہے اس ٹائم تو ساس اور نند بہت اچھی لگتی ہیں جب رشتے کے لیے جاتی ہیں۔ آگے پیچھے پھرتی نہیں تھکتیں' جب کام نکل گیا تو کون میں کون خدا کے لیے بند کریں فضول سلسلے کو۔ ساری مکاری' عورتوں کی مکاریاں ایک سے بڑھ کر ایک مکار عورت کی کہانی۔ اتنا تو مجھے پتا ہے خط ردی کی ٹوکری میں جائے گا مگر پھر بھی میں نے بھیج دیا۔
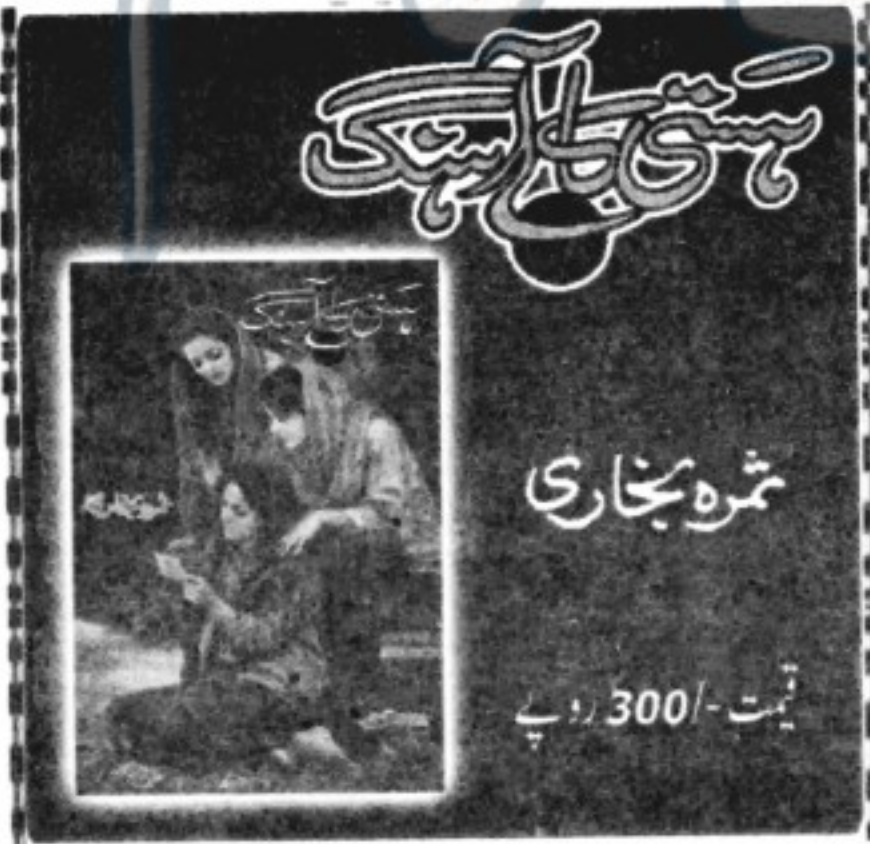
ج پیاری بشریٰ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے خط شائع نہ ہو سکے لیکن یہ محض آپ کی غلط فہمی تھی کہ آپ کا کوئی خط شائع ہی نہیں ہوگا اور اسی وجہ سے آپ نے لکھنا بند کر دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے خط ہمیں ملے ہی نہ ہوں یا تاخیر سے ملے ہوں۔ اس لیے شامل نہ ہو سکے ہوں۔ بہرحال..... عناویہ کے معاملے پر ہم آپ سے متفق ہیں۔ عناویہ اتنی قصوروار نہیں تھی جتنی اس کو سزا ملی۔ سیڑھیوں پر دال کے کنکر پھینکنا اتنی بڑی غلطی نہیں تھی کہ اس کو اتنی بری طرح پیٹا جاتا۔ نایاب اس کردار کے ساتھ انصاف نہ کر سکیں۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ہماری قارئین کا پسندیدہ سلسلہ ہے آپ کا نقطہ نظر بھی درست ہے کہیں بہو بن کر آنے والی لڑکی کی بھی غلطی ہو سکتی ہے لیکن دیکھا یہی گیا ہے کہ زیادہ تر بہو کے خلاف ساس' نندیں' جٹھانیاں مل کر محاذ بنا لیتی ہیں۔ جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح سب عورتیں مکار نہیں ہوتیں آپ بھی ایک عورت ہیں۔ آپ تو مکار نہیں ہیں۔ ہم جلد ساس' نندوں کے لیے بھی سلسلہ شروع کریں گے آپ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے گا۔

عفت سحر طاہر

تیز برستی بارش اور ساعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہر ماہ یونی ورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہر ماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی' آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں' تائی جان' مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں' ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

گیارہویں قسط

کمرے میں اعصاب شکن خاموشی پھیلی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس تباہ کن خبر پر فوری ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے تائی جان نے سینے پر دوہتڑ مارتے ہوئے آواز نکالی۔
"ہائے... قیامت آگئی ہمارے گھر پر... وہ کمینہ... بے غیرت کہاں ٹکرا گیا تمہیں۔"
تائی جان کی ہاہاکار آغا جان اور مبین صاحب کو حواس میں لے آئی۔
"کچھ فائدہ نہیں' بے کار ہے سب... اور بکواس بھی..." چھڑی پر ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔
"ارے میں کہتی ہوں رپورٹ کراؤ' اس بے غیرت' بے حمیت کے خلاف۔ زندہ درگور کروا سے..." تائی جان کے کوسنے اور بین جاری تھے۔
مبین صاحب اور آغا جان کے سامنے بھی حقیقت واضح تھی۔ مہپارہ کا ہاسپٹلائزڈ ہونا فراڈ تھا۔ یعنی کہ یہ کھیل واقعی نمیر آفندی کا تھا۔
"ڈاکٹر اور عملے کو رشوت دی گئی تھی۔ تب ہی تو یہ ڈراما کھیلا انہوں نے۔" مہپارہ سکتے کے عالم میں ساری کتھا سن رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بہن کی بربادی پر کیا ردعمل ظاہر کرے۔
"بھول جاؤ۔ بھول جاؤ اس سارے قصے کو مہپارہ' اور آگے دیکھو شادی طے ہے تمہاری اسی ہفتے میں۔"
آغا جان نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو مہپارہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
ہمارے بڑے بزرگ جب کسی کے ساتھ برا کرتے ہیں تو درحقیقت وہ اپنی اگلی نسل کے لیے گڑھے کھود رہے ہوتے ہیں۔
مال اور اولاد کو انسان کی آزمائش کہا گیا ہے۔ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی اولاد سزا کاٹتی ہے تو دل ان ہی بڑوں کا کٹتا ہے۔
"اس نے واقعی نکاح کیا ہے آغا جان...؟" مہپارہ نے سرخ ہوتی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور بھرآئے ہوئے لہجے میں بولی۔
"کوئی حیثیت نہیں ہے اس نکاح کی مہپارہ! تم بس خاموش رہو۔ چند دنوں بعد تمہاری شادی ہے۔" تائی جان متوحش زدہ سی بولیں۔ بس نہ چلتا تھا کہ مہپارہ کے ذہن سے یہ واقعہ ہی کھرچ ڈالتیں۔
"بھول جاؤ اس منحوس واقعہ کو مہپارہ! سمجھو ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔"
آغا جان نے دبنگ لہجے میں کہا تو وہ بے یقینی سے باری باری ماں اور دادا کو دیکھتے ہوئے بولی۔
"آپ لوگ مذاق سمجھ رہے ہیں اس بات کو؟"
"مذاق ہی تو ہے یہ سب... نہ ولی' نہ گواہان... نہ تمہاری مرضی شامل تھی اس نکاح میں... باطل ہے نکاح..." آغا جان نے درشتی سے کہا۔
مہپارہ کی آنکھیں ابل پڑیں وہ روتے ہوئے بولی۔
"جو بھی ہے آغا جان... مگر جب تک اس مسئلے کا حل نہیں نکلتا میں شادی نہیں کروں گی۔ نکاح پر نکاح..."
مبین صاحب کرسی پر ساکت و جامد بیٹھے تھے۔
بازی ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ پیادے نے خاموش کونے سے اٹھ کر جانے کیسے شہ مات دے دی تھی۔ وہ پیادہ... اس بساط پر جو بالکل بے وقعت اور حقیر تھا جس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ تھا۔ جسے بنا چال چلے سب پٹا ہوا سمجھ کر مطمئن تھے۔
"اسے سمجھاؤ صدیقہ! مزید دماغ خراب مت کرے ہمارا۔ بہت کچھ سہہ لیا آفندی ہاؤس نے۔ تھانے کا منہ بھی دیکھ لیا۔ اب برادری میں جو عزت بچی ہے' وہ بچی رہنے دو۔" آغا جان بڑے ضبط سے بولے اور مہپارہ پر ایک

نظر ڈال کر کمرے سے چلے گئے۔
مہاہ ماں سے لپٹ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ "آپ لوگ تو میری بات کو سمجھیں امی۔۔۔"
"میں کسی مفتی عالم سے پوچھتا ہوں۔ بنا مرضی کے زبردستی نکاح کی واقعی کوئی اہمیت نہیں ہوتی بیٹا۔"
مبین صاحب بڑی ہمت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار کر رو ئیں۔
مہاہ کے آنسو تھم سے گئے۔ باپ سے تو نظر ملانا بھی مشکل تھا۔
"امی۔۔۔" اس نے ملتجیانہ انداز میں کہتے ماں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامے۔
"آپ لوگ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اب یہ شادی نہیں کر سکتی۔ آپ ان لوگوں کو ابھی انکار کر دیں امی۔"
کہتے کہتے دل بری طرح کانپا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دن گن گن کر اس دن کا انتظار کیا تھا۔ مگر کیا۔۔۔
"اس دن کا" انتظار کیا تھا اس نے؟ اس کی تقدیر پلٹنے والا دن؟ طلال کے نام کو اس کی تقدیر کے کاغذ سے مٹا دینے والا دن؟
"دفع دور۔۔۔" تائی جان نے اپنے ہاتھوں سے مہاہ کے ہاتھ یوں جھٹکے جیسے کوئی بچھو تھام لیا ہو غلطی سے۔۔۔ پھر درشت لہجے میں بولیں۔ "کیا بکواس کر رہی ہو مہاہ۔ پہلے کیا کم ذلت دیکھی ہے ہم لوگوں نے جو اب تم بھی ہماری جگ ہنسائی کا انتظام کرنے لگی ہو۔"
اور مبین صاحب تو سر تھامے بیٹھے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زندگی اچانک کس موڑ پر لے آئی ہے۔
ملاحہ نے باپ کی بے بسی کو شدت سے محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔
"چھوڑ دو آپی۔۔۔ ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ نکاح نامہ تک تو نہیں ہے تمہارے پاس۔۔۔ کون سا نکاح' کیسا نکاح۔۔۔" وہ ملتجیانہ انداز میں مہاہ کو سمجھانے لگی۔
"مگر میں۔۔۔ میرا اللہ تو جانتا ہے ناکہ وہ نکاح ہوا تھا۔" وہ اذیت میں تھی۔
ہر ہر لفظ پر دل کٹتا تھا۔ وہ کیوں مانی؟ مر کیوں نہیں گئی ہاں کہتے اور نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے؟ مگر وہ نہیں جانتی تھی۔ انسان تب نہیں مرتا جب وہ مرنا چاہتا ہے۔ وہ تب مرتا ہے' جب اس کے دل میں کبھی نہ مرنے کی چاہ پیدا ہو جاتی ہے۔
"زبردستی کے نکاح کو باطل کہا گیا ہے مہو! میں فتویٰ بھی لے لیتا ہوں آج۔"
مبین صاحب اس سے زیادہ خود کو حوصلہ دے رہے تھے شاید۔ مہاہ کے لب کچھ کہنے کو پھڑپھڑائے۔
تائی جان اس کی بدلتی رنگت اور تاثرات دیکھ رہی تھیں۔ جی میں آتا تھا کہ مہاہ کے لبوں پر سختی سے ہاتھ رکھ دیں۔ تاکہ وہ کوئی اور صور نہ پھونک پائے۔
مگر اس نے بڑے زخمی اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ سر جھکائے۔۔۔ باپ سے نظریں ملائے۔ ان کی طرف دیکھے بنا۔
"لیکن اگر میں نے دلی رضامندی سے ہاں کی ہو تب اس نکاح کی کیا اہمیت ہو گی؟ ابو! یہ بھی پتا کیجئے گا۔"
کمرے میں ایک دھماکا سا ہوا تھا۔ مبین صاحب پھٹی نظروں سے بیٹی کو دیکھنے لگے۔ تائی جان تو گویا غش ہی کھا گئیں۔ ملاحہ نے لپک کر ان کو سنبھالا تھا۔ مہاہ پھر سے رونے لگی۔

☆ ☆ ☆

آغا جان کو ایک پل چین نہ پڑتا تھا۔ ان میں پہلے کا سا دم خم چاہے نہ رہا ہو مگر ان کا غصہ' تنفر اور زرنگار سے

نفرت کی شدت کم نہیں ہوئی تھی۔
ابھی بھی انہوں نے موحد کو اسٹڈی میں بلوایا تھا۔
"دیکھا تم نے موحد آفندی۔۔۔ خون کیسے اپنی اصلیت دکھاتا ہے۔ غلط کار ماں کا بیٹا بھی غلط کار ہی نکلا۔" ان کا دماغ ابل رہا تھا۔
موحد سینے پر ہاتھ لپیٹے کھڑا خاموشی اور بے تاثر چہرے کے ساتھ انہیں سن رہا تھا۔ وہ تھمے تو اس نے لب کھولے۔
"خون تو وہ آپ کے بیٹے کا ہے آغا جان۔۔۔ اور رہی اس کی ماں۔۔۔ تو وہ بھی شادی کے بعد آفندیز میں شامل ہو چکی تھی۔" پرسکون انداز میں کہتے ہوئے اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے تو آغا جان کا دماغ گھوم گیا۔
گھور کر اپنے منظور نظر پوتے کو ناگواری سے دیکھا۔ "کوئی بھی کوڑے کے ڈھیر سے کسی کو اٹھا لائے اور آفندی ہاؤس والوں سے رشتہ داری گانٹھنے کی کوشش کرے تو ہم اسے اپنا خون مان لیں؟"
"خیر۔۔۔" اس نے سر جھٹکا۔ "اس بات کی سچائی کے گواہ تو ماما اور پاپا بھی ہیں۔ وہ جب اپنے بھائی کی ڈیتھ کا سن کر گئے تو وہاں ان کا بیٹا بھی موجود تھا۔" وہ آزاد ماحول کا پروردہ تھا۔ ڈرے جھجکے بنا بات کرتا تھا۔
"مگر اس کی ہمت کیسے ہوئی اس قدر بے غیرتی دکھانے کی۔ ہمارے گھر کی عزت سے کھیلا ہے وہ۔ میں اسے زندہ گاڑ دوں گا۔" ان کے نتھنے پھول پچک رہے تھے۔ غصہ 'طیش' رگوں میں خون کی جگہ گویا لاوا دوڑ رہا تھا۔
"اب یہ سوچو کہ اس معاملے سے نپٹنا کیسے ہے۔ شادی طے ہے مہر کی اور وہ کسی صورت شادی پر راضی نہیں ہو رہی۔" وہ بے بسی سے بولے۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کہیں سے نمیر آفندی ان کے سامنے آجائے اور وہ اسے گولیوں سے بھون ڈالیں۔
"ایک بندہ جسے ہم میں سے نہ کوئی جانتا ہے' نہ اسے کبھی دیکھا ہے' اسے ہم کیسے ڈھونڈ سکتے ہیں۔" اس نے شانے اچکا کر بے چارگی ظاہر کی تھی۔
"مہو سے پوچھو۔ اس نے تو دیکھا ہو گا نا۔ مجھے تو شرم آتی ہے اس بچی کا سامنا کرتے ہوئے۔۔۔ اس بے شرم نے کہیں کا نہیں چھوڑا ہمیں۔ پہلے اس کی ماں ہماری رسوائی کا سامان بنی اب اس بے حمیت نے شب خون مارا ہے۔"
"جب تک اس کا پتا نہیں چل جاتا تب تک تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ شادی تو روکنی ہی پڑے گی۔ یہ بھی شکر ہے کہ نمیر آفندی نے اتنی عزت رکھ لی لڑکے والوں کے سامنے کہ مہاہ کو ایکسیڈنٹ کے بہانے سے واپس بھیجا۔ ورنہ وہ اتنی خوش دلی سے اسے قبول نہ کرتے۔"
آغا جان نے سخت نظروں سے پوتے کو دیکھا تو ان نظروں میں ہلکی سی ناپسندیدگی بھی تھی۔
"یعنی تمہیں اس قدر بے ہودگی میں بھی اس نا ہنجار کی "کچھ" اچھائی نظر آرہی ہے؟"
"جو دکھائی دے رہا ہے' اسی پر تبصرہ کر رہا ہوں میں۔ تین دنوں بعد تو اپنے گھر والے بھی لڑکی کو قبول نہیں کرتے' کجا سسرال والے۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔
"وہ کمینہ جانتا تھا کہ آیوں آپ اس شادی کی راہ میں روڑے اٹک جائیں گے۔ کبیر کو ساتھ لو اور پتا لگاؤ اس شخص کا موحد۔۔۔ مجھے وہ کسی بھی حال میں چاہیے۔"
وہ سرد لہجے میں بولے تو موحد کو ان کے ارادوں کا اچھی طرح اندازہ ہوا۔ اس نے گہری سانس بھری۔
"اوکے۔۔۔ میں مہر سے بھی انفارمیشن لیتا ہوں۔ کبیر کو تو تب ہی انوالو کروں گا جب مجھے خود سارے معاملے کا پتا ہو گا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا تو آغا جی گہری سانس لے کر رہ گئے۔ چوٹ اس بار سیدھی ان کے کلیجے پر لگی تھی جو بنا اجازت کسی کو اپنا ہاتھ بھی چھونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

☆ ☆ ☆

مہاہ خوب روئی، چیخی چلائی... مگر یہاں کون سا مہاہ آفندی کے پیارے بیٹھے تھے جو اس کی تکلیف پر تڑپ اٹھتے اور اب وہ سکتے کی کیفیت میں تھی۔

تو کیا اس کی اپنی "مرضی" ختم کردی گئی تھی؟ یعنی اپنی ہی زندگی کے کسی فیصلے کو کرنے کا اختیار کھو بیٹھی تھی وہ؟ ایسے میں اغوا کار عورت نے اسے سمجھایا۔

"کچھ عقل سے کام لے۔ کیوں مرد سے مقابلے پر اتری ہوئی ہے؟" مہاہ نے نفرت سے اسے دیکھا اور کڑوے لہجے میں بولی۔ "ایک کمزور لڑکی سے مقابلے پر وہ نامرد اترا ہوا ہے۔ اتنا ہی بدلہ لینے کا شوق تھا تو آفندی ہاؤس کے کسی مرد کو چنتا۔ پھر پتا چلتا اسے۔"

وہ جانتی تھی کہ کہیں نہ کہیں نمیر آفندی بیٹھا اس کی تمام باتیں سن رہا تھا۔ اس لیے جب تک ہمت رہی وہ یوں ہی للکار کر بولتی رہی۔ مگر اب... الٹی گنتی شروع ہوگئی تھی۔ اسے نکاح کا الٹی میٹم مل گیا تھا تو ذہن سنسنا اٹھا۔ ساری بہادری ختم ہوگئی۔

تب موقع دیکھ کر اس عورت نے اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو کہ صاحب تم سے نکاح کررہا ہے۔ بدلے کے لیے سہی۔ یہ سوچو کہ وہ بنا نکاح کیے تمہارے پاس چلا آتا تو تم کیا کرسکتی تھیں؟" وہ مدھم مگر پریقین انداز میں بول رہی تھی۔

"اب زبردستی کے نکاح کی واقعی کوئی حیثیت نہیں ہوتی... اور اس ناجائز نکاح کے بعد اگر وہ شوہر کی حیثیت سے تمہارے پاس آگیا تو؟"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر ذومعنی انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ مہاہ متوحش سی ہوگئی۔

اس نے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے مہاہ کی آنکھوں میں دیکھا اور رازدارانہ انداز میں بولی۔

"تم اچھی لڑکی ہو۔ میرا دل کررہا ہے کہ تمہیں کچھ عقل کی بات سمجھاؤں' اس نکاح کو تم ہی حلال شکل دے سکتی ہو... دلی رضامندی سے یہ نکاح کرکے۔" مہاہ کا دماغ سُن کیفیت میں تھا۔

"اللہ جانے تمہیں یہاں کب تک رہنا پڑے۔ واپس جانا نصیب ہو بھی یا نہیں۔ کہاں ناجائز رشتے کا بار اٹھاتی پھوگی۔" ذہنی وجذباتی شکست وریخت کے بعد مہاہ کو اس عورت کی کہی گئی باتیں تو سمجھ میں آئیں، مگر جو اس نے نہیں کہا وہ زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آیا۔

"یا اللہ! تو گواہ رہنا۔ میں زبردستی کے اس ناجائز رشتے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ میرے اللہ میں اس نکاح پر دل سے راضی ہوں۔ میں اپنی دلی رضا سے اس شخص کو قبول کرتی ہوں جس کا نام نمیر وقار آفندی ہے۔"

اس نے اپنی مرضی ورضا سے ایجاب وقبول کیا۔ اسے کرنا ہی تھا کہ صیاد نے آزادی کے سارے روزن بند کر دیے تھے۔ پنچھی ہتھیار نہ ڈالتا تو اور کیا کرتا؟

مہاہ بے دم ہوگئی۔

تائی جان کے بین اور کوسنے اونچے ہوگئے تو سہیل آفندی کی فیملی بھی افتاں وخیزاں مہاہ آفندی کے کمرے میں آگئی۔ سب کو اس گھر پر ٹوٹنے والی قیامت کا پتا چل گیا تھا۔ تزئین نے بے ساختہ حیرت وبے یقینی سے اپنے کھلے منہ پر ہاتھ رکھا۔

(توکیا مہماہ اور طلال کو میری نظر لگ گئی؟؟)

☆ ☆ ☆

طلال سکتے میں تھا۔
بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔وہ خود بھی پریشان اور الجھی ہوئی تھیں۔
"آفندی ہاؤس" سے فون آیا تھا۔ مہر کی چچی کا۔وہ شادی سے معذرت کررہی تھیں۔مہماہ نے انکار کردیا ہے شادی سے۔" ماما نے اسے بتایا مگر ایسے انداز میں جیسے خود اپنے منہ سے نکلنے والے لفظوں پر یقین نہ آرہا ہو۔
"آئی کانٹ بلیو ماما۔" (میں یقین نہیں کرسکتا)
طلال نے بے یقینی سے انہیں دیکھتے ہوئے گویا خود کلامی کی۔اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا وہ بھی یقین نہ کرتا۔
اب جبکہ وہ واپس آچکی تھی اور طلال کو ہی کیا دونوں گھرانوں کو یقین ہوگیا تھا کہ سب ٹھیک ہوگیا ہے۔اور شادی میں محض تین روز باقی تھے۔
وہ جب سے آئی تھی طلال اور اس کی فیملی سے نہ جاگتے ہوئے ملی اور نہ کوئی بات کی تھی۔ پھر بھی طلال نے سب کو سمجھالیا کہ وہ صدمے کی کیفیت میں ہے' شادی تک سب ٹھیک ہوجائے گا۔
مگر یہاں تو سارا معاملہ ہی الٹ ہوگیا تھا۔
"تم یقین مت کرو۔ کبھی مت کرنا۔ یہاں تمہارے باپ کی پگڑی اچھل رہی ہے اور تم اپنے یقین کو لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔"
ماما ذہنی خلفشار لیے اس پر برس پڑیں۔
وہ اب موبائل ہاتھ میں لیے تیزی سے مہماہ کو کال ملا رہا تھا۔
"میں نے کہا بھی تھا تم سے' اپنی بھابھی کی بات مان لو۔اس کی بہن اچھی خاصی تھی۔ مگر تم۔۔۔اف۔۔۔ میرے اللہ' سارے خاندان کو کارڈز بانٹ دیے۔دور کے مہمان کل سے آنا شروع ہوجائیں گے۔" وہ شدید پریشانی کے عالم میں ہیجانی انداز میں مسلسل کبھی ایک تو کبھی دوسری فکر میں مبتلا ہورہی تھیں۔
"شٹ۔" طلال شدید طیش کے عالم میں موبائل دیوار پر مارتے مارتے رہ گیا۔دوبار کال کاٹی گئی اور اس کے بعد موبائل آف آنے لگا تھا۔
"کس کو فون کررہے ہو؟" ماما نے وحشت زدہ ہوکر پوچھا۔
"مہماہ کو۔۔۔"
"یو ایڈیٹ۔۔۔ اپنے باپ کو فون کرو۔ اور انہیں بتاؤ کہ کیسے پورے خاندان میں ہماری انسلٹ ہونے والی ہے۔" وہ غصے سے چلائیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
"ماما پلیز' مجھے کنفرم تو کرنے دیں۔ تین دن رہ گئے ہیں شادی میں' ایسے میں ایک فون کال آتی ہے معذرت کی' تو کیا ہم شادی ملتوی کردیں گے؟"
وہ ابھی تک بے یقین تھا۔اسے یقین آنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ مگر وہ یونہی سر تھامے صوفے پر گر سی گئیں۔
سائرہ چچی نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف لفظوں میں ان تک معذرت اور مہماہ کا شادی سے انکار پہنچایا تھا۔اور یہ بھی کہ وہ ان تین دنوں میں طلال کے لیے کوئی بہتر فیصلہ کرلیں۔
"میں خود جاکر پتا کرتا ہوں۔" وہ تیزی سے باہر کی طرف بڑھا تھا۔
ماما ہمت کرکے اٹھیں۔یہ سب طلال کے پاپا کو سب سے پہلے بتانا ضروری تھا۔

"یا اللہ رحم.... کس کی نظر لگ گئی ہمارے گھر کی خوشیوں کو۔" وہ شوہر کو فون کرتے ہوئے صدمے کی کیفیت میں تھیں۔
کچن میں کھڑی 'کان ادھر ہی لگائے' سب سنتی بھابھی کا دل بلیوں اچھلا... اپنی بہن کا روشن مستقبل بالکل سامنے دکھائی دیا تھا۔ وہ موبائل پر ان کو کال ملا کر خوش خبری سنانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

وہ آفندی ہاؤس پہنچا تو کھلبلی سی مچ گئی۔ مہرماہ نے ملاحہ سے خبر ملتے ہی کمرہ مقفل کرلیا۔
"اسے کہو منہ چھپا کر مت بیٹھے۔ خود بتائے طلال کو انکار کی وجہ۔" تائی جان کا تو دل خراب ہو رہا تھا۔ رو رو کر سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔
انہیں پتا تھا خاندان بھر میں جو بے عزتی ہونے والی تھی۔ جو قہقہے ابھی لگے ہی نہیں تھے' وہ ان کی آواز بھی اپنی سماعت میں محسوس کر رہی تھیں۔ جس نکاح کو سب کھیل کہہ رہے تھے باطل کہہ رہے تھے۔ مہرماہ آفندی اسے حلال نکاح کا نام دے رہی تھی۔
"میرا دل مطمئن نہیں امی۔ میں خود کو گناہ گار محسوس کروں گی طلال سے نکاح کر کے۔"
آغا جان کا دماغ خود اس ساری صورت حال پر شل ہو گیا تھا۔ وہ سب جو مطمئن تھے کہ بس فتویٰ لے کر اس نکاح کو باطل قرار دے کر تین روز بعد طلال کے ساتھ مہرماہ کو رخصت کردیں گے۔ اب پھر سے پہلی سیڑھی پر آکھڑے ہوئے۔
"اسے چائے پلا کر ڈرائنگ روم سے ہی رخصت کردو کبیر۔"
آغا جان نے اسٹڈی روم سے حکم جاری کیا تھا۔ کبیر مؤدبانہ سر جھکا تا ڈرائنگ روم میں آیا تو پردے پر نظریں جمائے بیٹھا طلال بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر مہرماہ کے بجائے کبیر کو دیکھ کر امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ کبیر نے اس کا تاریک پڑتا چہرہ واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ مصافحہ کر کے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھتے دونوں ہی بے چینی کی کیفیت میں تھے۔
"میں مہرماہ سے ملنے آیا تھا۔ ضروری بات کرنی ہے اس سے۔" طلال نے سیدھے سبھاؤ کبیر ہی سے مدعا بیان کر دیا۔ جو عام حالات میں تو ہرگز نہ کرتا۔ مگر آفندی ہاؤس والوں نے تو حد ہی کر دی تھی۔ کوئی بھی طلال سے ملنے نہیں آیا تھا۔ الٹا کبیر کو "سفیر" بنا کر بھیج دیا۔ (تو ٹھیک ہے پھر سفیر ہی سہی)
"مجھے دیکھ کر بھی آپ کو حالات کی سمجھ نہیں آئی طلال صاحب...؟" کبیر نے سادگی سے کہا تو طلال بھڑک گیا۔
"میں وجہ ہی تو جاننے آیا ہوں ان حالات کی جو "ایک دم" سے بدلے ہیں۔"
"آپ کے گھر فون کر دیا گیا تھا۔ آپ کو علم تو ہی گیا ہو گا سر" وہ مؤدب ہو کر بولا۔ پھر لحہ بھر کے توقف کے بعد اضافہ کیا۔ "ابھی چائے آرہی ہے۔ اس کے بعد ہی آپ جا سکتے ہیں۔" صاف لفظوں میں "گیٹ آؤٹ کال" کبیر کے انداز کو سمجھتے ہوئے طلال کے اندر طیش کروٹیں لینے لگا۔
"اوہ... آئی سی..." وہ تلخی سے مسکرایا۔ "یعنی ان لوگوں میں سے کوئی بھی مجھ سے ملنا نہیں چاہتا۔"
"یہ لیں... چائے بھی آگئی۔"
ملازمہ چائے کی ٹرالی اندر لائی تو کبیر نے طلال کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ طلال اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تاثرات میں سرد مہری تھی۔

"چاہے تو اس گھر میں میں کسی "حیثیت" ہی سے رہوں گا۔ بتا دیناان سب کو۔"

وہ سرد لہجے میں کہتا ڈرائنگ روم سے نکل گیا تھا اور اس کے دکھ کو شدت سے محسوس کرتا کبیر کئی ثانیوں تک ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتا رہا۔

وہ آغا جان کو "رپورٹ" دینے جا رہا تھا کہ راستے میں مہرماہ کے کمرے کا دروازہ ایک دم سے کھلا۔ وہ عادتاً سیدھا چلتا گیا۔

"کبیر..." آنسوؤں میں ڈوبی نمکین سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ رک گیا۔ پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے۔

اسے لگا وہ اس چہرے کو اس قدر دکھی کیفیت میں کبھی دیکھنا نہیں چاہے گا۔

"کیا کہا اس نے؟" جانے ضبط و برداشت کی کن بلندیوں پر کھڑی وہ پوچھ رہی تھی۔

"آپ سے بات کرنے آئے تھے بی بی۔ آغا جان نے کہا چائے پلا کر رخصت کردو۔"

وہ یونہی رخ موڑے آہستہ آواز میں بولا۔

کبیر کا تو احساس جرم ہی نہ جاتا تھا۔ نہ وہ وہاں سے فیکٹری جاتا اور نہ مہرماہ کے ساتھ یہ حادثہ پیش آتا۔ وہ تو اس سے آنکھ ملانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

"ہم... اچھا کیا..." آنسوؤں میں ڈوبے لہجے میں کہہ کر اس نے دروازہ بند کرلیا تھا۔ لب بھینچے سر جھکائے آگے بڑھتے کبیر نے گھٹی گھٹی سی رونے کی آواز واضح سنی تو دل نئے سرے سے تاسف کا شکار ہونے لگا۔

☆ ☆ ☆
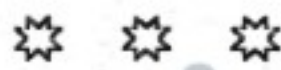
"شکر کرو طلال 'ان لوگوں میں تھوڑی سی انسانیت باقی تھی جو انہوں نے تین روز پہلے بتا دیا۔ اگر شادی کے روز انکار کرتے تو سوچو ہم کہاں کھڑے ہوتے۔" گھر میں کچہری سجی تھی۔ پاپا اسے سمجھا رہے تھے۔ اور وہ کسی صورت سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

"آپ ان لوگوں سے وجہ تو پوچھیں۔" وہ پاگل نظر آرہا تھا۔ دیوانہ... جیسے زندگی ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہو۔

"دماغ صحیح ہے تمہارا...؟ وہ لوگ صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ لڑکی ہی اس شادی پر راضی نہیں ہے تو اور کیا وجہ جاننا باقی رہ جاتی ہے۔" پاپا نے غصے سے کہا۔

"کرچکا ہوں اس کے باپ کو فون۔ اس نے بھی یہی کہا ہے کہ اس حادثے نے لڑکی کے ذہن پر برا اثر ڈالا ہے اور وہ کسی طور بھی شادی کے لیے راضی نہیں ہو رہی۔"

"تو ہم شادی کی تاریخ آگے کردیتے ہیں پاپا۔ اس میں کیا مسئلہ ہے؟" اسے امید کی ایک کرن نظر آئی تھی۔

"سب حل پیش کرچکا ہوں میں۔ مگر انہوں نے معذرت کرلی ہے کہ وہ یہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتے۔ نہ اب نہ آئندہ کبھی۔" وہ تلخی سے بولے۔

لاڈلے بیٹے کا خود سے بیگانہ انداز دیکھتے تھے تو دل نہیں کرتا تھا کہ اس کا دل توڑنے والی بات کریں۔ مگر فی الوقت تو اس کی ہر آس اور امید کو توڑنے میں ہی اس کی بہتری تھی۔

"آپ میری کنڈیشن نہیں سمجھ رہے پاپا۔ وہ لڑکی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ میں اس طرح اپنے خوابوں کو اجڑتے نہیں دیکھ سکتا۔" وہ اپنے بال نوچنے کو تھا۔

کوئی ایسے شخص سے پوچھے جسے بینائی دے کر واپس لے لی گئی ہو۔ طلال اس وقت ایسا ہی شخص تھا۔

"میں جانتا ہوں طلال اور اسی لیے تمہاری زندگی کے اس اہم فیصلے پر ہم دونوں میں سے کسی نے کوئی اعتراض

نہیں اٹھایا۔ مگر اب بات عزت پر بن آئی ہے مائی سن۔ تم وہاں گئے اور ان لوگوں کا رویہ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہو۔ اب اور کیا پوچھنا باقی رہ گیا ہے۔؟"

پاپا نے رسان سے سمجھایا تو وہ خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

"یہاں بیٹھو۔ اطمینان سے سوچو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں اور ہمارے ساتھ مل کر فیصلہ کرو۔ مہماہ کے علاوہ کسی بھی لڑکی کا نام لو۔ ہم اس بار بھی تمہاری پسند کو خوش دلی سے قبول کریں گے۔"

وہ بہت آرام سے کہتے طلال کو دنیا کے ظالم ترین انسان لگے۔ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھا کر وہ یقیناً" اس کی برین واشنگ شروع کرنے والے تھے۔ مگر جو بھی اسے مہماہ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنے کو کہتا وہ ظالم ہی تو تھا۔

طلال اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے سوچنے دیں پاپا۔ اپنی اس غیر یقینی بربادی کے بارے میں۔ اس ذلت کے بارے میں جو بنا کسی قصور کے میرے ماتھے پر مل دی گئی ہے اور اس انسلٹ کے بارے میں' جو آفندی ہاؤس والوں نے کی۔ مجھے وقت دیں سوچنے کا۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔" وہ بے بسی سے ہارے ہوئے انداز میں بولا تو انہوں نے اٹھ کر اسے شانوں سے تھام کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اور درشتی سے بولے۔

"بی اے مین (مرد بنو) شاندار ماضی پر رونے کے بجائے مستقبل کو شاندار بنانے کا سوچو۔ تم اب مہماہ آفندی سے آگے کا سوچو گے۔ اینڈ اٹس مائی آرڈر۔" (اور یہ میرا حکم ہے)

طلال نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھا۔ تو وہ دھیمے پڑ گئے۔

"انہوں نے ہمارے لیے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا طلال۔ اب اپنے باپ کی برسوں کی بنائی عزت تم ہی بچا سکتے ہو۔" اب کی بار اس کے کندھوں پر ان کی گرفت دوستانہ تھی۔ مگر ان کے لب و لہجے اور الفاظ سے جھلکتی قطعیت طلال اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ ان کا ہاتھ ہٹا تا وہاں سے تیز قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو بھی اپنے شانوں پر اپنے گھرانے کی عزت کا بار محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنی زندگی کا حتمی فیصلہ کر کے اپنے والدین کو بتانا تھا۔ بھابھی کی بہن۔۔؟

طلال نے اس وقت مہماہ سے سخت نفرت محسوس کی۔ اس کی زندگی کو اس دوراہے پر لا کر چھوڑ دینے والی وہی تھی۔

رات دھیرے دھیرے اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ نجانے کتنے گھنٹے گزر گئے۔ وہ شل ہوتے دماغ کے ساتھ اپنی اگلی زندگی کے بارے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کل تک اپنی زندگی میں وہ ہر بات مہماہ کے ساتھ' اس کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ آج اس خانے میں کسی خیالی پیکر کو رکھ کر سوچنا اسے موت لگ رہا تھا۔

(تو میں وہ فیصلہ کیوں نہ کروں جس سے چوٹ مہماہ آفندی کے دل کو بھی لگے) اس کا ذہن ہی نہیں' چوٹ کھائی انا بھی انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تو وہ بے اختیار اٹھ بیٹھا۔

اس کی آنکھوں میں چھائی صدمے اور بے یقینی کی کیفیت کی جگہ اب وحشت نے لے لی تھی۔

وحشت۔۔۔ جو سکون قلب حاصل کرنے کے لیے آدمی سے کچھ بھی کروا لیتی ہے۔ طلال بھی اب اس مقام پر تھا کہ "کچھ بھی" کرنے کو تیار تھا۔

اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ہاتھ مار کر تکیے کے پاس رکھا موبائل اٹھا کر کسی کو کال ملائی۔

آنکھوں میں پھیلتی سرخی اس کی بدترین ذہنی کیفیت کی غماز تھی۔ دوسری طرف سے فوراً" ہی کال اٹینڈ کر لی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

گئی۔

"طلال بول رہا ہوں۔ سارا معاملہ تم تک بھی پہنچ چکا ہوگا۔ مہماہ سے میری شادی نہیں ہو رہی۔ کیا تم اب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

(اور طوفان ٹھہرے ہوئے سمندروں کی تہ میں ہی ہوا کرتے ہیں)

دوسری طرف وہ اس قدر غیر متوقع پروپوزل پر دنگ رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

دروازے پر ہلکی سی دستک نے مہماہ کو بے زار کیا تھا۔ وہ الماری کا پٹ بند کرتی پلٹی۔

"آجاؤ۔" وہ اسی بے زاری سے بولی۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر موحد اندر داخل ہوا تھا۔

مہماہ نے لب بھینچے اور سینے پر بازو لپیٹ کر کھڑی ہو گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے بزبان خاموشی پوچھ رہی ہو۔ جی فرمایئے؟

مگر آنے والا تو گویا فرصت میں تھا۔

ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے' پنجوں کے بل خفیف سا اچکتا' وہ ناقدانہ نظروں سے اس کے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"ہم۔ نائس روم۔"

مہماہ نے کوفت محسوس کی۔ "میرے کمرے کی انٹیریر (آرائش) پر تو سیر حاصل گفتگو کرنے نہیں آئے ہو گے تم۔" مہماہ نے تلخی سے کہا تھا۔

موحد نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ "آیا نہیں۔۔۔ بھیجا گیا ہوں محترمہ۔" جتا کر بولا۔

"آغا جان سے کہہ دو کہ یہ چند دن گزر جانے دیں۔ پھر جو طوفان اٹھانا ہے اٹھالیں۔" وہ غصے سے بولی مگر برا ہو اس آواز کا جو باوجود ضبط کے عین موقع پر بھرا گئی۔

"نمیر تک پہنچنے کے لیے یہ انویسٹی گیشن بہت ضروری ہے مہر۔" موحد سنجیدہ ہوا۔

مہماہ تھک کر بستر کے کنارے پر ٹک گئی تو وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے آبیٹھا۔

"اب کیا فائدہ اس ساری بھاگ دوڑ کا موحد۔ جب میں زندگی کے کھیل سے ہی باہر کر دی گئی ہوں۔"

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی تو ایک آنسو پلک سے ٹوٹ کر رخسار پر ستارے کی مانند آن اٹکا۔

موحد نے نگاہ چرائی۔

"مجھے شروع سے بتاؤ مہماہ! تم ان میں سے کسی کو پہچانتی ہو؟ نمیر کو دیکھا تو ہوگا تم نے؟" کیا کہتا ہے وہ۔۔۔ محض نکاح کر کے تمہیں واپس چھوڑ جانا!! کچھ تو ڈیمانڈ ہوں گی اس کی؟" وہ تابڑ توڑ سوال کر رہا تھا۔ مہماہ شکستہ دلی سے بولی۔

"وہ اب کہاں ملے گا موحد۔۔۔؟ بلکہ وہ اب کبھی نہیں ملے گا۔" پھر اس نے خوف زدہ ہو کر جھرجھری سی لی۔

"اور اگر وہ نہ ملا تو۔۔۔؟" اس نے نم آنکھوں سے موحد کو دیکھا۔ "کیا میں ساری عمر اس قید میں جکڑی رہوں گی موحد؟"

وہ امید بھری نظروں سے پوچھ رہی تھی۔ موحد نے گہری سانس بھری۔

"وہ۔۔۔ ایک جانا پہچانا سا شخص تھا موحد جیسے اسے کہیں دیکھا ہو میں نے۔" نمیر آفندی کی شکل ذہن میں لاتے

ہوئے مہماہ الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ تو موحد نے چونک کر اسے دیکھا۔
"کیا مطلب۔۔۔ یعنی ملنے جلنے والوں میں سے کوئی ہے؟"
"نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بس یونہی۔۔۔ کچھ دیکھا ہوا چہرہ۔۔۔"
وہ مزید الجھی۔۔۔ پھر یک لخت ہی جیسے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کوئی دھند تھی جو ایک دم سے چھٹی تھی۔
"ہاں۔۔۔ میرے خیال میں مجھے یاد آگیا کہ وہ کون تھا۔" وہ بے اختیار سنسنی خیز انداز میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
موحد نے ایک ٹھہری ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔
وہ بغور اسی کو دیکھ رہی تھی۔ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اور میرے خیال میں تو تم بھی اس شخص کو جانتے ہو موحد آفندی۔"
چند لمحوں تک اسے دیکھنے کے بعد وہ ہلکا سا کھنکارتے ہوئے اٹھ کر مہماہ کے بالمقابل کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں دو نفوس کے ہوتے ہوئے بھی بے حد خاموشی تھی۔ بامعنی خاموشی۔

✵ ✵ ✵

طلال فریش ہو کر ناشتے کی میز پر آیا تو رات بھر کی بے خوابی اس کی سرخ آنکھوں اور مضمحل انداز سے ظاہر تھی۔
"میں تمہاری پسند کا ناشتا تیار کرنے ہی لگی تھی طلال۔" بھابی آج ضرورت سے زیادہ ہی خوش تھیں۔
ابھی چند لمحوں بعد ہی ان کی دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ اتنی افراتفری میں تو ان ہی کی بہن ملتی طلال کو شادی کے لیے۔
"ابھی بھوک نہیں ہے بھابی۔ رہنے دیں۔" اس نے انہیں وہیں روک دیا۔ وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔
ماما کا دل مضطرب ہوا۔ کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ جمائے کھڑا وہ کچھ کہنے یا نہ کہنے کی کشمکش میں گھرا تھا۔
"تھوڑا سا ہی کچھ کھالو طلال۔ رات کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تم نے۔" ماما نے تشویش سے کہا۔ مگر وہ باپ کی طرف متوجہ تھا۔
"میں نے فیصلہ کرلیا ہے پاپا۔" وہ بہت ہارے ہوئے انداز میں بولا تو اس کی دلی تکلیف کا احساس کر کے ماما کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔
بھابی سر اونچا کر کے تفاخرانہ بیٹھ گئیں۔ ان کی بہن کو ٹھکرانے والے کو سزا تو اچھی ملی تھی۔ مگر چلو۔ اب پچھتا کر لوٹا ہے تو اور بھی اچھی بات ہے۔ خوب قدر کرے گا میری بہن کی۔ وہ اندر ہی اندر محظوظ ہو رہی تھیں۔
وہ تینوں منتظر نظروں سے طلال کو دیکھنے لگے۔
"میں تزئین آفندی سے شادی کروں گا پاپا۔" اس نے گہری سانس لے کر کہتے ہوئے گویا بم ہی پھوڑ دیا تھا۔ وہ تینوں نفوس ہی بدک گئے۔
پاپا کے تاثرات فوراً ہی بدلے۔ درشت لہجے میں کہا۔
"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا؟"
ماما نے بے اختیار ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں ٹھنڈا رہنے کا اشارہ کیا تو وہ چپ ہو گئے۔
بھابی نے بے یقینی کے سمندر سے بمشکل نکلتے ہوئے تلخی بھرا طنز کیا۔
"تم نے تو شاید منت ہی مان لی ہے کہ اسی گھر کے داماد بنو گے۔" طلال نے سلگتی نظروں سے انہیں دیکھا اور چیخ

کر بولا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ آپ کے گھر کی نہیں مانی تھی منّت۔"

بھابی نے غصے سے سر جھٹکا تھا۔

ماما نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "ہوش کے ناخن لو طلال۔ وہ لوگ ایک بیٹی کے رشتے سے انکاری ہیں۔ دوسری کے لیے کیسے مانیں گے۔"

"آپ نے ایک نام پوچھا تھا۔ وہ میں نے بتادیا ہے ماما! آپ ان سے بات کریں۔ وہاں سے انکار نہیں ہوگا۔"

وہ ضبط سے کہہ کر پلٹ گیا۔

"طلال.... بات سنو میری۔" پاپا نے غصے سے آواز دی تھی۔ وہ ٹھہرا ضرور مگر پلٹا نہیں، محض چہرہ موڑ کر انہیں دیکھا۔

"اگر آپ کو اعتراض ہے تو پھر یہ شادی نہیں ہوگی پاپا۔" اس نے لحہ بھر کا توقف کیا اور پھر قطعیت سے بولا۔

"کبھی بھی نہیں۔"

وہ کہہ کر چلا گیا تھا۔ پاپا کو مزید غصہ آیا۔

"اس کا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔" وہ ماما سے بولے۔

"پتا کریں پاپا۔ ہو سکتا ہے طلال کی تزئین کے ساتھ بھی سیٹنگ ہو۔ یونہی تو اتنے کانفیڈینس سے نہیں کہہ رہا نا۔"

بھابی کی مسکراہٹ طنزیہ اور لہجہ آگ لگانے والا تھا۔ طلال نے تو ان کا دماغ ہی گھما دیا تھا۔ بھابی کو افسوس ہوا۔ ایسے ہی ماں، بہن کو پھر سے آس دلادی۔

ماما پاپا کو بہو کا انداز برداشت کرنا پڑا۔ طلال نے انہیں کوئی جواب دینے لائق چھوڑا ہی کب تھا۔

"میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں کیا کرنا چاہتا ہے یہ لڑکا۔" ماما نے شدید پریشانی کے عالم میں دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"میں بات کرتا ہوں آغا جان سے۔ مہاہ تو ذہنی ڈسٹربنس کی وجہ سے شادی سے انکار کر رہی ہے۔ ویسے تو انہیں طلال پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

پاپا اب ٹھنڈے دل و دماغ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ آفندی ہاؤس والوں کے رویّے نے انہیں بددل کردیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر ایک بار پھر ان کے دروازے پر جانے کے لیے راضی ہوگئے تھے۔

☆ ☆ ☆

تزئین پر تو شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ جب سے طلال کی کال آئی تھی۔ وہ بے یقینی کا شکار تھی۔

اف.... جس چاند کو چھونے کی اس کے دل میں محض حسرت تھی۔ وہ اس کے آنگن میں جگمگانے کو تھا۔

واہ اللہ.... تو بھی بڑا بے نیاز ہے۔ قدرت والا ہے۔ جب چاہے، جو چاہے سو کرے۔

اس نے فوری طور پر ماں کو جا کر اپنے تئیں خوش خبری سنائی۔ انہوں نے پھٹی نگاہوں سے بیٹی کا مسکراتا چہرہ دیکھا۔

"پاگل تو نہیں ہوگئی ہو تم۔ کل میں نے خود فون کرکے اس کی ماں تک مہاہ کے رشتے سے انکار پہنچایا ہے۔"

"تو کیا ہوا امی.... وہ مہاہ کا مسئلہ تھا۔ اسے نہیں کرنی شادی تو نہ کرے۔ ہم نے تھوڑی کہا ہے اسے انکار کرنے کو۔" وہ لاپروائی سے بولی۔ پھر دبے دبے جوش سے بولی۔

"طلال نے خود کہا ہے کہ اس کی پاما اب میرے لیے بات کرنے والی ہیں اور وہ اسی دن نکاح چاہتے ہیں جس روز طلال اور مہاہ کا طے تھا۔" وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔

سائرہ چچی جو بیٹی کو صلواتیں سنانے لگی تھیں' اس کے چہرے سے چھلکتے رنگوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔

"آپ کو بڑا شوق تھا کہ میں بھی کوئی لڑکا پسند کرلوں۔ دیکھ لیں' خود اللہ نے بھیج دیا میرے لیے۔۔۔ بس آپ ابو سے کہہ دیں کہ طلال کی ماما کو انکار نہیں کرنا۔"

وہ زیر و زبر ہوتی سانسوں کے ساتھ شرگیں انداز میں کہہ رہی تھی۔ سائرہ چچی چپ تھیں۔

انہیں فی الفور اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا کہ طلال کو تزئین بھی ویسے ہی پسند کرتی تھی جیسے کہ مہاہ۔۔۔ مہاہ کی شادی کے لیے بددلی اور بددماغی کا مظاہرہ کرنے والی تزئین اب پورے دل سے خوش دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ماں سے لپٹ گئی۔

"آپ لوگ آغا جان کو بھی منا لیجیے گا امی۔۔۔ پلیز۔ بس طلال۔" وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

جانے قدرت کیا رنگ دکھانے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اولین جھٹکے سے جلد ہی سنبھل گیا تھا۔

"میں۔۔۔ میں جانتا ہوں اسے؟ کون ہے وہ؟" وہ بے حد حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

"وہ شخص۔۔۔ جو اس روز ہماری گاڑی کا پیچھا کر رہا تھا اور گاڑی سے اپنی گاڑی بھی ٹکرائی اس نے۔ تم نے اسے جھاڑا بھی تھا۔"

وہ تیز تیز بتا رہی تھی۔ تنفس بے ترتیب اور نمی سے گلابی ہوتی آنکھیں۔

"ہاں۔۔۔ یاد ہے وہ واقعہ مگر وہ بندہ۔۔۔؟" وہ الجھا۔ "گاڑی تو کسی کی بھی ٹکرا سکتی ہے کسی کی گاڑی سے۔"

"نہیں وہ وہی تھا۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ وہ کسی سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ جانے کب سے وہ ہماری مصروفیات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ موقع کی تلاش میں تھا۔۔۔"

وہ ہذیانی انداز میں کہتی ہوئی آخر میں چیخ کر بولی اور خود پر سے قابو کھو کر رو پڑی۔

موحد کی آنکھوں میں تاسف ابھرا۔

اس لڑکی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا مگر قسمت جس نے آزمائش کے لیے مہاہ آفندی کو چنا اب کیا ہو سکتا تھا۔

"ریلیکس مہر۔ ایزی' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے نرمی سے اسے تسلی دی۔

"اب کچھ بھی' کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا موحد! میرے لیے تو کبھی بھی نہیں۔" وہ خود ترسی کے سے انداز میں بولی تھی۔ پھر دوپٹے سے رگڑ کر آنکھیں اور چہرہ صاف کیا۔

"جو یاد تھا وہ بتا دیا تمہیں۔ آغا جان کو بتا دینا اب اگر کچھ ہو گا تو بس یہی کہ وہ نمیر آفندی کو ڈھونڈ نکالیں۔۔۔ اور گولی مار دیں اسے میرے سامنے لا کر۔"

وہ بے حد تلخی سے بولی تو موحد نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر تاسف سے کہا۔

"یہی نسل در نسل دشمنی لے ڈوبی ہے تم لوگوں کو۔ نمیر آفندی بھی تو پھر تم لوگوں کا خون ہے نا۔ اس کے عمل پر پھر اعتراض کیسا؟"

"تمہارا خیال ہے کہ اس نے صحیح کیا جو بھی کیا؟" مہاہ نے صدمے سے پوچھا۔

"میں صرف حقیقت بتا رہا ہوں۔" وہ مختصراً بولا۔
"وہ صرف ہم لوگوں کو اذیت دینا چاہتا ہے اور بس۔"
مہاہ تھک کر بولی۔ موحد چند ثانیوں تک اسے دیکھنے کے بعد کمرے سے نکل گیا تھا۔
"آہ...... طلال...... کیسے لمحوں میں میری زندگی 'میرے ہاتھ کی لکیروں سے نکلے ہو تم۔"
وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

✡ ✡ ✡

طلال کے گھر سے آنے والا فون آغا جان کے موبائل پر آیا تھا۔ طلال کے والد کا مدعا جان کر آغا جان کو خفیف سا جھٹکا لگا۔
"مہاہ کا مسئلہ ہم سمجھتے ہیں آغا جان۔ وہ بچی واقعی ذہنی طور پر ڈسٹرب ہے۔ مگر ہمیں تو آپ کی سب ہی بچیاں ایک سی پیاری ہیں۔ تقدیر میں نہیں لکھا تھا کہ مہاہ ہماری بہو بنے۔ لیکن آپ کے گھرانے سے رشتہ جوڑنا ہمارے لیے باعث عزت ہے۔ سو آپ مہربانی کریں تو ہم اسی تاریخ کو طلال اور تزئین بیٹی کا نکاح کیے لیتے ہیں۔ خاندان میں آپ کی عزت بھی رہ جائے گی اور ہمارا پردہ بھی۔"
انہوں نے بہترین طریقے سے طلال کا مقدمہ آغا جان کے سامنے پیش کیا تھا۔
آغا جان نے ابتدائی جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے کھنکار کر گفتگو کا آغاز کیا تو وہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔

✡ ✡ ✡

"ملائکہ تو تڑپ رہی ہے وہاں سے پاکستان آنے کے لیے۔ میں نے ہی منع کیا۔ جب شادی ہی نہیں ہو رہی تو کیا فائدہ آنے کا۔ خواہ مخواہ اس کی سسرال تک باتیں جائیں گی۔ ابھی تو کہہ دیا کہ فی الحال شادی کینسل ہو گئی۔"
تائی جان افسردگی سے مہاہ کو بتا رہی تھیں جو مضمحل سی تکیے سے ٹیک لگائے سوگوار بیٹھی تھی۔ اس کا ماتم تو ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ آنکھ خشک بھی ہوتی تو دل رو تا رہتا۔
اسی وقت ملاحہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر آئی تو ماں کی آخری بات سن لی۔ اس کی رنگت فق تھی۔ وہ آ کر مہاہ کے پاس ڈھے سی گئی۔
تائی جان متوحش سی ہو گئیں۔ "تمہیں کیا ہوا...... سب خیر تو ہے نا؟"
اب تو ہر آہٹ پر دل ڈر سا جاتا تھا۔ ملاحہ نے حسرت اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ مہاہ کو دیکھا اور اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
"کیا ہوا ملاحہ...... بتا دو پلیز۔"
مہاہ کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔ سراسیمہ ہو کر بولی۔
"ملائکہ آپی کو آنے دیں امی۔ آغا جان نے نہ تو شادی کینسل کی ہے اور نہ ہی طلال بھائی کو جواب دیا ہے۔"
وہ بھیگے لہجے میں بولی تو نظریں مہاہ کی اڑی رنگت پر تھیں۔
"مگر میں اعتراض کا حق رکھتی ہوں۔ میں نے انکار کر دیا ہے اس شادی سے۔"
مہاہ کی گردن میں کوئی پھندا سا سخت ہونے لگا۔ وہی جانتی تھی کہ کس دل سے وہ یہ الفاظ کہتی تھی۔
"ہاں آپی...... تمہیں اعتراض تھا۔ مگر تزئین آپی کو تو کوئی اعتراض نہیں نا طلال بھائی سے شادی پر......" ملاحہ ضبط کھو کر بچوں کی طرح رو دی تھی۔
اور مہاہ...... اسے لگا اس کے بدن سے روح پرواز کرنے لگی ہو۔

"اللہ کی مار ان آستین کے سانپوں پر....."

تائی جان کے دل پہ ہاتھ پڑا۔ تو وہ تزئین اور سائرہ چچی کو کوسنے لگیں۔ ملاحہ ابھی بھی مہو کا ہاتھ تھامے رو رہی تھی۔ اور مہماہ سپید پڑتی رنگت کے ساتھ ساکت و جامد تھی..... جیسے کوئی بے روح جسم۔

☼ ☼ ☼

"آغا جان! کیا واقعی آپ نے طلال کا پروپوزل تزئین کے لیے قبول کر لیا ہے؟"

مبین آفندی کو شدید دھچکا لگا تھا۔ جبکہ سہیل آفندی بیوی کی سکھائی پٹی کے نتیجے میں چپکے ہو رہے۔

"بھئی آغا جان کے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔ کس کی مجال۔" انہوں نے بھائی کے سامنے سارا ملبہ آغا جان پر ڈال دیا۔

"تو..... کیا مسئلہ ہے اس میں؟" آغا جان نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے انہیں سخت نظروں سے دیکھا۔

"مہماہ اس سے شادی سے انکار کر چکی ہے' ایسے میں پھر سے اس کا اسی گھر کا داماد بننا....."

بات کرتے کرتے ان کی پیشانی چمک اٹھی تھی۔ آغا جان تند و تیز لہجے میں ان کی بات ہی کاٹ گئے۔

"انکار مہماہ نے کیا تھا۔ ہم نے نہیں مبین میاں! اور انکار کی وجہ مہماہ تھی طلال تو بے قصور تھا۔ پھر ہم کیوں اعتراض کریں اس سے رشتہ داری جوڑنے پر۔"

انہوں نے اپنے روایتی دبنگ لہجے میں کہا۔ تو مبین آفندی بہت کچھ زبان پر لاتے لاتے رہ گئے۔ کہ وہ ایک بیٹی کے باپ تھے۔ کیسے کہتے کہ مہماہ کی پسند تھا طلال۔ اس نے کون سا اپنی مرضی سے طلال کو چھوڑا تھا..... اب بہنوئی کی صورت اسے قبول کرنا اور اسی گھر میں ہوتے طلال سے سامنا کرنا مہماہ کے لیے ایک قیامت ہو گا۔ آغا جان اس جذباتیت سے کوسوں دور تھے۔

"بس اب مزید کوئی فضول اور نکما اعتراض اٹھا کر دنیا میں مزید تماشا مت بنانا۔ خاندان والوں کو یہی پتا ہے کہ مہماہ کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں۔ ایسے میں تزئین سے طلال کی شادی ہو جانا کوئی ایسی عجیب بات نہیں سب کے لیے۔" ہاتھ اٹھا کر تحکمانہ انداز میں بولے۔

"مہماہ کا بھی تو اس سارے قصے میں کوئی قصور نہیں آغا جان! وہ تو ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہی ہے۔" مبین بے چارگی سے بولے تھے۔

"نافرمان اولاد ہے تمہاری مبین آفندی۔ میں نے کہا تھا اسے' اپنی زبان بند رکھے اور چپ کر کے طلال کے ساتھ شادی کرا کے رخصت ہو جائے۔ مگر سارا اسلام تو جیسے ان لوگوں نے ہی پڑھا ہوا ہے۔ ہم تو گویا مسلمان ہیں ہی نہیں۔" آغا جان گرجے۔

"نکاح پر نکاح کیسے کر لیتی آغا جان۔ ایجاب و قبول کر لیا تو نکاح ہو گیا۔ چاہے کنڈیشن کیسی بھی تھی۔" وہ مدھم پڑ گئے۔ بیٹی کے ساتھ ہونے والے سانحے نے تو ان کی کمر ہی توڑ ڈالی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر۔ جس کے نصیب میں جو تھا وہ اسے مل گیا۔ اب میں زبان دے چکا ہوں طلال کے باپ کو۔ جس کو اعتراض ہے' وہ بے شک اس نکاح میں نہ بیٹھے۔"

وہ بڑی رکھائی اور کرختی سے کہہ رہے تھے۔ مبین آفندی دل مسوس کر اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ لیا آپ نے ساری عمر میرا بھائی' میری بھتیجیاں کرتے رہے آپ! آستین کے سانپ نکلے سب۔" تائی جان کو کسی پل چین نہ آتا تھا۔

مہپارہ کو تو چپ سی لگ گئی تھی یہ خبر سن کر۔ نہ بولی نہ آنسو بہائے۔ بس ساکت بیٹھی رہ گئی تھی وہ۔ تائی جان کی آنکھوں کے سامنے سے بیٹی کی شکل او جھل نہ ہوتی تھی۔ انہیں تو قدرت سے بھی شکوہ تھا۔

(ہم نے ایسے کون سے گناہ کیے تھے بھلا جن کی ایسی سزا مل رہی ہے؟) انہیں یاد نہیں پڑ تا تھا۔

جن کے دلوں پر مہر لگ جائے انہیں یاد کرنے پر بھی اپنے گناہ یاد نہیں آتے۔

"ان کا کیا قصور ہے بھلا آغا جان کا فیصلہ ہے یہ۔" وہ خود بہت مضطرب تھے۔ آغا جان کے اس فیصلے نے انہیں ذہنی طور پر منتشر کر دیا تھا۔

"تو وہ کون سا سنجھی کا کہاں ہیں۔ اگر تزئین کو اعتراض ہوتا تو وہ صاف کہتی۔ میں نہیں جانتی۔ کتنی منہ پھٹ ہے وہ۔۔۔ اور اس پھا پیھا کتنی سائرہ کو دیکھو۔ ذرا جو دید لحاظ رکھا ہو۔ وہ نہیں جانتی کہ مہپارہ اور طلال۔۔۔"

غصے سے تیز لہجے میں کہتے آخر میں ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

چند لمحوں تک وہ خاموش رہیں۔ پھر خود پر قابو پا کر تلخی سے بولیں۔

"ذرا سی شرم کر لیتے سائرہ اور سہیل۔ میری بچی کے جذبات کا خیال نہیں ہے انہیں۔ ایک ہی گھر میں رہتے اس طرح کی رشتہ داری گانٹھنا انہیں زیب دیتا تھا بھلا۔"

"اب کیا کیا جا سکتا ہے۔۔۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں بولے۔

"میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ مہو کو کچھ دنوں کے لیے ننھیال بھیج دیں۔"

صدیقہ بیگم کا دل چاہا او نچی آواز میں بین ڈالنا شروع کر دیں۔ کتنا ظلم ہو رہا تھا مہپارہ کے ساتھ۔ مگر یہی بات جب مہپارہ کے سامنے دہرائی گئی تو اس کی چپ کی مہر ٹوٹ گئی۔

"نہیں امی۔۔۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے او نچی آواز میں قطعیت سے کہا تھا۔

"یہاں رہ کے دل جلاؤ گی اپنا۔ کیسے دیکھو گی سارا تماشا۔ اس طلال کی اصلیت بھی دیکھ لی تم نے۔ اسے شرم نہ آئی یہ فیصلہ کرتے ہوئے۔" تائی جان نے واویلا کیا تھا۔

"جس نے جو بھی کیا امی! جب میری قسمت ہی ایسی لکھی تھی تو میں کسی کو کیا الزام دوں۔ وہ میرے لیے جوگ تو نہیں لے سکتا تھا نا۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں۔ یہاں رہ کر سب اپنی آنکھوں سے دیکھو گی تو تکلیف ہو گی۔۔۔ جوگ نہ لیتا مگر کچھ شرم کر لیتا۔ اسی گھر میں داماد بن کر آنا ضروری تھا کیا۔۔۔ وہ نہیں جانتا تمہیں کتنی تکلیف ہو گی۔"

تائی جان اس وقت صرف ماں بن کر سوچتی تھیں جب اپنے بچوں پر تکلیف آئی تھی۔

"اسے بھی تو میرے انکار سے تکلیف ہوئی ہے نا امی۔ وہ کون سا میرے انکار کے پیچھے کی وجہ جانتا ہے جو احساس کر کے کوئی فیصلہ کرتا۔ اسے تو کسی نے اصلیت بتائی ہی نہیں۔"

مہپارہ آنکھیں پونچھتے ہوئے پھیکے انداز میں مسکرائی تھی۔ تائی جان گہری آہ بھر کے رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

ملائکہ کو سارے حالات کی خبر تھی۔ مگر اب اس نئی "خوش خبری" نے تو اسے صدمے میں دھکیل دیا۔

"حد ہوتی ہے بے حسی کی امی۔ طلال کو تو چلو مہپارہ کے ساتھ ہوئے واقعہ کا علم نہیں۔ مگر ہمارے گھر میں تو سب جانتے ہیں کہ طلال اور مہپارہ کی پسند سے یہ شادی ہو رہی تھی۔" وہ رو دی۔

"یہاں کوئی کسی کا دل دکھنے کی پرواہ نہیں کرتا میری بچی۔ پتھر دل لوگ ہیں یہاں۔" انہوں نے آہ بھری۔

جب انسان پر خود پر بن آئے تو وہ فوراً "نفع و نقصان" چیک کرنے لگتا ہے۔ یہی بندہ خدا لوگوں کے ساتھ ہر حد

تک ظلم روا رکھتا ہے تب اسے اپنی پتھر دلی کا احساس نہیں ہوتا۔
"میں نہیں آرہی امی۔ دفع کریں ان لوگوں کو... آغا جان کے فیصلوں نے کبھی بھی ہمارے خاندان کو خوش نہیں رہنے دیا... ان ہی کا کیا مہماہ بھگت رہی ہے۔ انہی کا پوتا ہم سے بدلہ لے رہا ہے ان کی کرنی کا۔" وہ صاف گوئی سے کہہ رہی تھی۔
تائی جان کا فون تھاما ہاتھ لرزا۔
ایک دم سے زرنگار کی بھولی بسری خوب صورت شکل ان کی آنکھوں کے آگے آئی تھی۔
اور وہ آخری ملاقات... بارش کی وہ رات۔ بات مکمل کرکے فون رکھنے تک وہ اسی عجیب سی کیفیت کے حصار میں تھیں۔
انہیں وہ ڈرا سہما اور ماں کے پیچھے چھپا لڑکا یاد آیا۔ مگر یاد کرنے پر بھی وہ اس کے نقوش یاد نہیں کرپائی تھیں۔
اس روز اس گھر کے مکینوں نے عمیر وقار آفندی پر ترس یا رحم کی نگاہ ڈالی ہی کب تھی۔ جو اسے کوئی یاد رکھتا۔
اور اب تو اس نے اپنا ایسا تعارف کرایا تھا کہ تاعمر وہ آفندی ہاؤس والوں کو بھولنے والا نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا طلال... تھینک یو... تھینک یو سو مچ۔"
کل نکاح تھا... اور رات گہری تھی، جب غیر متوقع طور پر طلال نے تزئین کو کال کی۔ وہ تو ساتویں آسمان پر جا بیٹھی۔ اس کی آواز میں خمار سا اترنے لگا۔
"مہو نے انکار کیوں کیا تھا شادی سے تزئین؟" تزئین کے رومانوی خیالات میں ڈوبے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ طلال نے بڑے سرد لہجے میں پوچھا تھا۔
"یہ تو تم اس سے پوچھتے جس نے انکار کیا ہے۔" سنبھلتے ہوئے تزئین نے تیکھے انداز میں ناگواری سے کہا۔
"تم کیا چاہتی ہو، اب میں اسے کال کرکے اس سے پوچھوں؟" قدرے توقف کے بعد اس نے بڑے سکون سے پوچھا تو تزئین گڑبڑائی۔ تمام ناگواری ایک سیکنڈ میں ہرن ہوگئی۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا۔" فی الفور بولی۔
"تو پھر بتاؤ۔ مہو نے انکار کیوں کیا۔ کیا وجہ ہے اس انکار کے پیچھے۔ اس کی ذہنی کنڈیشن؟" تزئین کی تو جان پر بن آئی۔
اب اگر وہ مہماہ کو طلال کی نظروں میں یونہی مظلوم بنی رہنے دیتی تو امید واثق تھی کہ وہ آئندہ بھی اسے بے چاری ہی سمجھنے والا تھا۔ اس نے تیزی سے دماغ دوڑایا۔ اسے یہ لمحے قسمت سے "تحفتاً" ملے تھے۔ تزئین کو اچانک احساس ہوا۔
یہی وہ لمحے تھے جب وہ مہماہ کو طلال کے دماغ سے بھی نکال سکتی تھی۔ (زندگی سے تو وہ خود بخود ہی نکل گئی۔)
"جو لڑکی شادی سے محض تین دن پہلے انکار کردے اس کا محض دماغ تو خراب نہیں ہوسکتا طلال..."
وہ محتاط انداز میں بولی تو اگلے چند لمحوں تک دوسری طرف سے محض سانسوں کی آواز آتی رہی۔ اتنی دیر تزئین کا دل دھک دھک کرتا رہا۔
"مجھے نہیں پتا طلال... مگر جب مہماہ لاپتا تھی، تب موحد بھی یہاں نہیں تھا۔"
خوف سے تیزی کے ساتھ دھڑکتے دل سے تزئین نے جو منہ میں آیا، وہ روانی سے کہہ ہی دیا۔ طلال سے بولنا مشکل ہونے لگا۔

"وہ محبت کرتی تھی مجھ سے..." چند ثانیوں کے بعد وہ تیقن سے بولا۔ جیسے اسے تزئین کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

"کرتی ہو گی... مگر تب موحد نہیں آیا تھا تم دونوں کے درمیان طلال..." تزئین نے ڈھٹائی سے اپنی بنائی کہانی کو آگے بڑھایا تھا۔

"آئی ڈونٹ بلیو... میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔" وہ دکھ کے حصار میں تھا۔ بلکہ شاید بے یقینی زیادہ تھی۔

"اس نے کر دیا ہے ایسا طلال..." وہ زور دے کر بولی۔ پھر ذرا سی خفگی دکھائی۔

"کل ہمارا اسپیشل ڈے ہے طلال اور تم مجھ سے ہم دونوں کی باتیں کرنے کے بجائے کسی تیسرے فرد کو ڈسکس کر رہے ہو۔"

"میرا حق بنتا ہے یہ جاننا کہ کس وجہ سے مہاہ آفندی نے مجھے ریجیکٹ کیا ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

وہ یک لخت مہو سے مہاہ آفندی بن گئی تو تزئین کا دل پُرسکون ہونے لگا۔

"اس نے تمہیں نہیں اپنی قسمت کو ریجیکٹ کیا ہے طلال۔ مجھ سے پوچھو کہ تم کیا ہو میرے لیے... کتنی اہمیت ہے تمہاری۔ کتنی اسپیشل فیلنگز ہیں تمہارے لیے میری۔" وہ مخمور انداز میں کہہ رہی تھی۔ اسے یقین دلا رہی تھی۔

مگر طلال کا دل تو تب خوش ہوتا جب اس نے تزئین سے رومانس جھاڑنے کی خاطر کال کی ہوتی۔ اب تو جو حقیقت اسے پتا چلی تھی اس نے ذہن بالکل ہی ماؤف کر دیا تھا۔

"او کے... پھر بات کروں گا۔" اسی ذہنی انتشار کے باعث اس نے مزید کچھ کہے بنا کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔

اب وہ تو جس بھی ذہنی کیفیت کا شکار تھا۔ مگر تزئین سر تا پا جل کر رہ گئی۔ مہاہ آفندی سے منہ کی کھانے کے بعد بھی وہ اسی کے سوگ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے شکر ادا کیا ابھی طلال کو نمیر آفندی کے مہاہ سے زبردستی نکاح والے قصے کا علم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ تو وہ اسے مظلوم جان کر نمیر سے طلاق لینے تک مہاہ کے انتظار میں ہی بیٹھا رہتا۔ وہ جلتی کڑھتی سیدھی ماں کے کمرے میں آئی۔

"طلال کا فون تھا۔" بگڑے موڈ میں انہیں اطلاع دی۔ تو وہ فکر مند ہوئیں۔

"خیریت تو تھی؟"

"پوچھ رہا تھا مہو نے شادی سے انکار کیوں کیا۔" وہ کڑوے لہجے میں بولی۔

"تو بتا دیتیں نا... نکاح پر نکاح تو نہیں ہو سکتا نا۔" سائرہ چچی نے اطمینان سے کہا۔

"ہاں... بتا دیتی۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ "تاکہ وہ ساری ہمدردیاں مہاہ کے نام لگا دیتا اور نکل پڑتا نمیر آفندی کو ڈھونڈنے۔"

"اب وہ اس گھر کا داماد بننے والا ہے۔ کب تک اس سے یہ بات چھپائیں گے ہم۔" انہوں نے تفکر سے کہا۔ تو وہ جھلا کر بولی۔

"اب گھر کی ہر بات داماد کو پتا ہو یہ ضروری تو نہیں۔" پھر انہیں تاکید کی۔

"آپ سب سے کہہ دیں۔ کوئی بھی طلال کو یہ حقیقت نہیں بتائے گا کہ اغوا کے بعد نمیر نے زبردستی مہاہ سے نکاح کر لیا تھا۔"

"وہ تو اب ظاہر ہے کہنا ہی پڑے گا۔ پہلے تو اپنی عزت رکھنے کے لیے چھپایا تھا۔ اب اس رشتے کے لیے چھپانا پڑ رہا ہے۔"

وہ گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

٭ ٭ ٭

طلال کی فیملی مختصر سے لوگوں کے ساتھ نکاح کے لیے آفندی ہاؤس ہی آئی تھی۔ اس طرف سے بھی خاندان کے محض خاص لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

"میرے کپڑے بھی نکال دینا ملاحہ۔" مہاہ نے ناشتا کرتے ہوئے کہا تو ملاحہ چائے میں چینی ملانا بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

تائی جان نے تڑپ کر اس کی زرد پڑتی رنگت کو دیکھا۔

"کیوں خود کو امتحان میں ڈالتی ہو مہو۔"

"اچھا ہے نا۔ عادت ہو جائے گی۔ ابھی دنیا سے چھپنے کی کوشش کروں گی تو پھر کبھی سامنا نہیں کر پاؤں گی۔"

"لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے مہو۔"

"کرلینے دیں امی! اندر کی بات تو کوئی بھی نہیں جانتا سب کو پتا ہے میرا ایکسی ڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکی۔" وہ اندر سے چاہے مطمئن تھی یا نہیں۔ مگر ظاہر یہی کر رہی تھی کہ وہ پرسکون ہے۔

یہ تو مہاہ آفندی کا دل ہی جانتا تھا۔ قیامت تو طلال کے ساتھ شادی سے انکار کرتے ہی آ گئی تھی مگر اب طلال کا تزئین کے ساتھ شادی کرنا۔۔۔ پوری رات نہ اس کی آنکھ لگتی اور نہ خشک ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے یہ سب ایک ڈراؤنا خواب لگتا۔ اس نے اپنے مستقبل کو ہمیشہ طلال کے ساتھ سوچا تھا۔ اب تو آئندہ آنے والی زندگی ہی ایک سوالیہ نشان بن گئی تھی۔

اور اب وہ نکاح سے کچھ دیر پہلے ہی تیار ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ اللہ جانتا تھا' ہر ہر لمحے اس نے کیسے آنسو بہائے تھے۔

"میرے اللہ۔۔۔ مجھے ہمت عطا کر۔ میرے دل سے طلال کا خیال نکال دے۔ یا اللہ۔"

چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر سوجی آنکھوں کو تولیے سے تھپتھپا کر خشک کرنے تک وہ دل ہی دل میں محو مناجات رہی تھی۔ اسے کوریڈور میں ہی چچی نے روک لیا۔

اسے سر سے پاؤں تک ناقدانہ نظروں سے دیکھا تو وہ گھبرا سی گئی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" انہوں نے کچھ ایسے انداز سے پوچھا کہ مہو سناٹے میں آ گئی۔

"برا مت ماننا مہو۔ مگر باہر تزئین کے سارے سسرال والے بیٹھے ہیں۔ وہی جن سے تم نے ملنا اور بات کرنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ ابھی تم جاؤ گی تو نکاح کے موقع پر پرانے کھاتے کھل جائیں گے اور میرا خیال ہے کہ تم اس موقع کو خیریت سے گزر جانے دو۔"

وہ صاف لفظوں میں جو بات نہیں کہہ سکتی تھیں وہی گھما پھرا کر کہہ دی۔ یعنی وہ مہربانی فرما کر اپنے کمرے میں ہی رہے۔

"چچی جان... میں اسی لیے وہاں جا رہی ہوں' تاکہ کسی کو باتوں کا موقع نہ ملے۔" وہ خفت کے مارے رونے والی ہو گئی۔ بھلا شوق سے تھوڑی وہاں جا رہی تھی۔

"اس سے بہتر ہے کہ تم اپنے کمرے میں ہی ہو۔ اللہ ہی جانے بیٹا۔ تمہیں پتا تو ہے ہمارے گھر کو کسی کی نظر لگ چکی ہے پہلے ہی۔ اب بس خیریت سے میری بیٹی کا نکاح نپٹ جائے۔"

پہلے اسے رکھائی سے کہہ کر پھر انہوں نے یوں دلگرفتی کا مظاہرہ کیا کہ مہاہ کو پہلی بار چپ رہنے کم بولنے اور بظاہر بے وقوف دکھائی دینے والی سائرہ چچی کے اندر کی خود غرض عورت دکھائی دی۔

تیزی سے کوریڈور میں داخل ہوتے موحد نے چچی جان کی آخری ... بات سنی تھی اور خفت کے مارے (یا شاید تکلیف کے؟) مہاہ کا سپید پڑتا چہرہ بھی دیکھا۔

"مہاہ اندر نہیں بیٹھے گی۔ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے اس نے..." وہ تیز لہجے میں بولتا آگے آیا تو چچی جان سٹپٹا گئیں۔

"میں تو بس اسی کی فکر میں کہہ رہی تھی... بے عزتی ہو گی سب میں..."

"ہاں۔ فارگیٹ اٹ چچی جان۔ کس میں اتنی ہمت ہے کہ ہمارے گھر میں ہماری ہی انسلٹ کرے۔ تم چلو مہو... اور جیسے چاہو فنکشن اٹینڈ کرو۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"چچی جان شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میری زندگی تو برباد ہو ہی گئی۔ کہیں میری نحوست تزئین پر بھی نہ پڑ جائے۔"

وہ بڑے ضبط سے بولی تو آنکھیں شدتِ ضبط سے گلابی ہونے لگیں۔

"کم آن مہو..." وہ جھنجلایا۔

"ہنہ..." چچی جان سر جھٹکتی چلی گئیں۔ انہیں موحد کی بے جا مداخلت بالکل بھی پسند نہیں آئی تھی۔ مگر اس کے سامنے چلتی کس کی تھی بھلا۔

"میں تو صرف یہ سوچ کر نکاح میں شریک ہو رہی تھی کہ مجھ میں سب کا سامنا کرنے کا اعتماد پیدا ہو۔ میں کب تک چھپ چھپ کر لوگوں سے کٹ کر رہوں گی۔ طلال آخری بار نہیں پہلی بار داماد کی حیثیت سے یہاں آیا ہے اور آئندہ بھی آتا رہے گا۔ تو کیا میں تمام عمر اس سے چھپتی رہوں؟"

اس نے انگلی سے آنکھ کے آنسو کو جھٹکا تھا۔ موحد کو اس پر ترس آیا۔

"چلو آؤ تم۔۔۔" اس نے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے مہاہ کا ہاتھ تھاما اور باہر نکلا تھا۔
"موحد۔۔۔" وہ اس کی اچانک حرکت پر افتاں و خیزاں تھی۔
"چپ رہو۔ یوں ڈرو گی تو ساری دنیا ڈرائے گی تمہیں۔" وہ تقریباً اسے کھینچتے ہوئے ہال میں لایا جہاں نکاح کی سنّت ادا کی جا رہی تھی۔
دل پہ جبر کیے ذہنی انتشار پر بمشکل قابو پائے طلال نے پاپا کے ہاتھ کے دباؤ کو اپنے شانے پر محسوس کرتے ہوئے نکاح نامے پر جھک کر دستخط کرنے چاہے۔ ایک نظر۔۔۔ بس ایک نظر ہی بلا ارادہ سامنے اٹھی تھی اور طلال کے دل کی دنیا زیروزبر ہو گئی۔
وہ کچھ گھبرائی اور ہراساں سی موحد کے ہاتھ میں ہاتھ دیے اندر داخل ہوئی تھی۔ اسے لگا ارد گرد بالکل سناٹا چھا گیا ہو۔ وہ بنا اختیاری کوشش کے اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ تھے۔ (تو تزئین نے سچ کہا۔)
"جی۔۔۔ یہاں سائن کریں۔" رجسٹرار نے ایک بار پھر اس کی توجہ نکاح نامے کی طرف مبذول کرائی تو ایک چھناکے سے جیسے وہ ساکت منظر ٹوٹا۔
وہ ہارے ہوئے انداز میں نکاح نامے پر جھکا اور لگا تار جتنے سائن کہے گئے وہ کر دیے۔ در حقیقت اس کی دماغی نسیں تن گئی تھیں۔ خوشی تو اس شادی کی پہلے بھی نہ تھی، مگر مہاہ کو موحد کے ساتھ دیکھ کر تو اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ اسے بار بار خیال آرہا تھا۔
مہاہ نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس کی محض ذہنی حالت نہیں بلکہ نیت بھی خراب تھی۔
مہاہ تائی جان کے پاس بالکل ایک کونے میں جا بیٹھی۔ جو کچھ چچی جان نے کہہ دیا تھا اس کے بعد اس کے اعتماد کا گراف بری طرح کم ہوا تھا۔ اب وہ کسی کی بھی گفتگو کا موضوع بننے سے گھبرا رہی تھی۔
مہاہ اور اس کے گھر والوں نے تناؤ کے ماحول میں ہی اس تقریب میں شرکت کی تھی۔ نکاح کے بعد اٹھنے والا مبارک باد کا شور۔۔۔ سب کا اٹھ کر طلال کو گلے ملنا، مبارک دینا۔۔۔ مہاہ سر جھکائے ضبط کیے اپنا دھیان ملاحہ اور فرزین کی بے سروپا باتوں میں لگانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔
مگر اپنے دل پہ پاؤں رکھ کے چلنا آسان نہیں ہوا کرتا، ہاں دوسروں کا دل ہو تو انسان یہ کام بہت آسانی سے کر لیتا ہے۔ تزئین کو طلال کے ساتھ لا کر بٹھایا گیا تو جیسے جوڑی مکمل ہو گئی۔
مگر یہ۔۔۔ مہاہ کے حوصلے اس کی برداشت کی حد تھی۔ وہ ایک نظر ہی ان دونوں کو دیکھ پائی۔ اس کے بعد اس کی توانائی ختم ہو گئی تو وہ تیزی سے اٹھ کر ہال سے باہر نکل گئی۔
موحد آفندی نے اسے آنسو پونچھتے اپنے کمرے کی طرف تیزی سے جاتے دیکھا تو اس نے اپنے دل میں مہاہ آفندی کے لیے کچھ عجیب سے احساس کو ابھرتے محسوس کیا۔
طلال کے موڈ کو دیکھتے ہوئے اس کے پاپا نے جلدی رخصتی کا مطالبہ کیا تھا اور طلال۔۔۔ وہ شاید مزید برداشت کا مظاہرہ بھی کر لیتا، اگر مہو کو سامنے نہ دیکھ لیتا۔
وہ اس کی پہلی محبت تھی۔ پیار کا پہلا خواب۔۔۔ وہ خواب، جو شیشے کا ثابت ہوا تھا۔ یوں ٹوٹا کہ وہ کرچیاں بھی نہ سمیٹ پایا تھا۔ مگر تزئین آفندی کے تو دل کی دنیا کا عالم ہی بدلا ہوا تھا۔ اس کا دل بے حد سکون اور مسرت سے بھرا ہوا تھا۔
ساتھ بیٹھا شخص۔۔۔ جو اس کا خواب تھا، مگر جو کسی اور کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ آج قدرت نے بن مانگی دعا کی طرح اس کا نصیب بنا دیا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بہت متوازن تھیں اور لبوں پر حسین مسکراہٹ۔۔۔ وہ آج دلہن بنی

واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔
مہاہ نے اندھیرے کمرے کی کھڑکی سے بارات کو رخصت ہوتے دیکھا۔ اور طلال کی گاڑی میں بیٹھتی تزئین کو تو وہ تیزی سے پلٹ کر اپنے بستر پر جا بیٹھی۔۔۔ آج قیامت آہی گئی تھی۔۔۔ اور گزر بھی گئی۔ مہاہ نے تمام ماتم اندر دباتے ہوئے اس قیامت کا سامنا کر لیا۔ جسے آج سب نے شادی کا نام دیا تھا۔
آج مہاہ آفندی کے سارے خواب چکنا چور ہوئے تھے۔ وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے بے طرح رودی۔

☆ ☆ ☆

"طلال۔۔۔" وہ ابھی تک لاؤنج میں ٹی وی کے آگے براجمان تھا۔ ماما نے آکر اسے گھرکا۔
"سب سوگئے ہیں اور تم ابھی تک یہاں بیٹھے ہو۔ کمرے میں کیوں نہیں گئے؟" اس نے ایک نظر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی ان کا دل کاٹ گئیں۔ وہ بے اختیار اس کے پاس بیٹھ گئیں۔
"اب فیصلہ کیا ہے تو اس پر قائم بھی رہو طلال! مجھے یقین ہے کہ تزئین بھی تمہارے حق میں بہت اچھی ثابت ہوگی۔ اٹھو، جاؤ، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔"
"مجھے ابھی نیند نہیں آرہی ماما!" وہ پھر سے ٹی وی دیکھنے لگا۔
"طلال۔۔۔" وہ سناٹے میں رہ گئیں۔ "پہلے مہاہ نے تمہاری زندگی خراب کی۔ اب تم خود اپنی زندگی خراب کر رہے ہو؟"
وہ اسے جھڑک کر بولیں۔ اس ایک نام ہی کا تو سارا فساد تھا۔ مہاہ کے نام نے اس کی رگوں میں شرارے دوڑا دیے۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر مارا تھا۔

"وہ جہنم میں گئی مہاہ۔ میں کسی مہاہ کو نہیں جانتا۔" وہ غصے سے بولا تھا۔ ماما نے اس کے بازو پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔
"میرے بچے۔۔۔ میری جان! یہی تو سمجھا رہی ہوں تمہیں۔ اب اگر اللہ نے نئے سرے سے تمہیں زندگی کا سیٹ اپ بنانے کا موقع دیا ہے تو اسے خوشیوں سے بھر لو۔ ماضی کا ماتم کرنا دانش مندی نہیں ہے۔"
وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔ انہیں لگا کہ ان کی باتوں کا طلال پر تھوڑا بہت اثر ہوا ہے تو وہ دوبارہ نصیحت کرنے لگیں۔
"اگر تزئین نے تمہارے پروپوزل پر ہامی بھری ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ اس کے دل میں تمہارے لیے سافٹ کارنر موجود ہے طلال۔ اس کی قدر کرو اور باہمی اعتماد اور خوشیوں سے اپنی زندگی کو آباد کرو۔"
وہ ان کی کسی بھی بات کا جواب دیے بنا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹکا۔
صبح جب وہ لوگ نکاح کے لیے گئے تو کمرا بالکل سادہ تھا اور اب اس کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی۔ گلاب کے تازہ پھولوں سے کمرے کو بھر دیا گیا تھا۔ دیواروں پر بھی گلابوں سے دل بنائے گئے تھے اور بیڈ کے وسط میں لٹکتی لڑیوں کو بیڈ کے چاروں طرف پھیلا دیا گیا تھا اور بیڈ کے وسط میں چہرہ جھکائے بیٹھی تزئین۔
اس قدر غیر متوقع ماحول و منظر نے لحہ بھر کو طلال کے حواس شل کر دیے۔
اسے اس شادی کی قطعاً" کوئی خوشی نہیں تھی۔ تو پھر یہ سب" اس نے وحشت سے ادھر ادھر دیکھا۔
اسے لگا جیسے سب نے مل کر اس کی بربادی کا مذاق اڑایا ہو۔ مہاہ کے انکار کا مذاق۔۔۔ ان دونوں کے بچھڑنے کا مذاق۔۔۔ اشتعال کی تند و تیز لہر دل سے اٹھی اور دماغ تک گئی تو اس نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر بیڈ کے

اطراف لٹکتی گلابوں کی لڑیاں نوچ ڈالیں۔

"واٹ از دس ربش۔۔۔" وہ دیواروں پر بنے گلابوں کے دل کھرچ رہا تھا۔ہاتھ مار کر بستر پر پڑے گلابوں کی پتیاں قالین پر بکھیر دیں۔

"طلال۔۔۔" تزئین حق دق رہ گئی۔تمام شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر وہ جلدی سے اٹھی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔۔۔یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ اس کا بازو زبردستی تھامتی متحیر سی پوچھ رہی تھی۔

وہ بے اختیار ٹھٹکا۔رک کر اس پور پور سجی دلہن کو دیکھا۔جس کی خوب صورتی میں کوئی شک نہ تھا۔مگر وہ مہ ماہ نہ تھی۔طلال کی ذہنی رو پلٹی۔

"تم۔۔۔تم نے نظر لگائی ہے۔تم نے بددعا کی ہو گی ہمارے لیے۔" اس نے تزئین کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دانت پیس کر کہا اور اپنے بازو پر سے اس کا ہاتھ درشتی سے جھٹکا۔

تزئین کا دل جیسے اتھاہ گہرائی میں ڈوبا۔

"طلال۔۔۔"

"شٹ اپ۔۔۔جاؤ جا کر سو جاؤ اور دماغ خراب مت کرو میرا۔۔۔" وہ دبی آواز میں چیخا تھا۔یوں مضطرب و حواس باختہ وہ پاگل لگ رہا تھا۔

"میرا کیا قصور ہے اس سب میں طلال۔۔۔" تزئین کے تو مارے خوف اور پریشانی کے آنسو ہی بہہ نکلے۔اس نے ایسی صورت حال کے متعلق تو سوچا ہی نہ تھا۔

"تم پسند کرتی تھیں مجھے۔تم شادی کرنا چاہتی تھیں مجھ سے۔تم ہی نے منتیں مانی ہوں گی۔ہمیں بددعا دی ہو گی۔"

وہ حقارت سے کہہ رہا تھا۔تزئین کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔وہ انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"مگر یاد رکھو۔وہ مجھے نہیں ملی تو میں تمہیں نہیں ملوں گا۔" وہ درشتی سے کہتا کمرے سے ملحقہ دروازہ کھولتا بالکونی میں نکل گیا تھا۔سرد ہوا لحہ بھر کو اندر آئی پھر دروازہ بند ہو گیا۔

تزئین آفندی ساکت سی بے یقین نظروں سے بند دروازے کو دیکھتی بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

محض ایک منظر نے اسے پوری زندگی کی فلم کی کہانی بتا دی تھی۔

اور وہ رات جس کے وہ دو دنوں سے سہانے خواب بن رہی تھی۔وہ آئی بھی تو یوں کہ تزئین آفندی تہی داماں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔۔۔اور طلال سرد ترین موسم میں چھائی دھند سے بے پروا گہرے سانس بھرتا اپنے اندر کی تپش اور کھولتے لاوے کو سرد کرنے کی سعی کر رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سمیرا حمید

یہ شروع شروع کا عہد تھا جس پر وہ قائم رہی پھر اسے للکار آگیا اور جیسے کہ اس نے ساری زندگی غیرت نہیں کھائی تھی تو اب ایسے غیرت کھائی کہ اس کے عہد کی قسمیں کھائی جانے لگیں۔

وہ خاموش عورت تھی۔

اس کا شوہر اس سے عاجز رہا کرتا تھا۔ وہ اسے اتنا پسند نہیں کرتا تھا جتنا کہ کوئی بیوی چاہتی ہے کہ اسے پسند کیا جائے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اس سے اتنی محبت نہیں کرتا تھا جتنا کہ وہ چاہتی تھی۔ اتنی کہ وہ اپنی سہیلیوں کو نہ بتائے لیکن خود کو ہی بتا بتا کر خوش ہوتی رہے۔

عفاف ایک پر جلال انسان تھا۔ بہت نازک طبع اور مطلق العنان اتنا کہ وہ چاہتا تھا کہ اسے جن برتنوں میں کھانا دیا جائے وہ بھی اس کے سامنے مؤدب رہا کریں۔ وہ رکابی اٹھائے یا اس میں انگلیاں ڈال کر کھائے بس آواز نہ آئے۔ سماعت کا استعمال اس پر گراں گزرتا تھا یا وہ اپنی سماعت کو زحمت سے بچانا چاہتا تھا۔ جو بھی تھا وہ زیادہ بولتا اور بہت کم سنتا تھا اور وشمہ کو بس اتنی عادت تھی کہ وہ کچھ اچھا گنگنا لیتی تو اپنی کسی سہیلی کو بہانے سے بتا دیتی۔

رات میں کیا کیا خواب میں دیکھا یہ تو لازمی ہی۔

ایسی صورت میں جب ایک سننے سے بے زار تھا اور ایک بولنے پر مائل۔ دونوں میں ایک دوسرے کے لیے دلچسپی کیسے بڑھتی۔

وہ عفاف سے محبت کرتی تھی۔ ازبکستان کے نصیب میں لکھے سارے پانیوں اور طارم اخضر کی بلندیوں کی قسم کھا کر کہہ سکتی تھی کہ وہ اولین اور آخرین اپنے شوہر سے محبت کرتی تھی کیونکہ اس کی ماں اور اس کی بیاہی سہیلیوں نے بھی یہی کیا تھا۔ دلہن بنے اس کے کانوں میں جو سرگوشیاں کی گئی تھیں ان کا لب لباب بھی یہی تھا کہ اسے اپنے شوہر سے محبت کرنی ہے چاہے وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ دلدل کے پانی سا گاڑھا یا چوٹیوں کے کنکروں سا لڑکھڑاتا سا ہی کیوں نہ ہو۔ گرا دینے پر مائل اٹھا لینے میں متامل ہی کیوں نہ ہو، اسے اس سے محبت کرنی ہے۔

وشمہ اس سے محبت کر رہی تھی۔ بے شک ابھی تک وہ رکابی کو اس کے سامنے بنا آواز کے رکھنا نہیں سیکھی تھی اور کمرے میں ٹہلتے اس کے زیورات بج اٹھتے تھے جو وہ اپنے کپڑوں میں چھپائی پھرتی تھی۔

"یہ کیا بج رہا ہے۔" عفاف دھاڑتا۔

اس کا سانس رک سا جاتا۔ وہ ایسے زیورات کہاں سے لائے جو شور نہ کریں۔ جو اپنی موجودگی کا احساس نہ دلایا کریں، نہ چمک سے نہ کھنکھناہٹ سے۔ ابھی وہ صرف سولہ سال کی تھی۔ عفاف سے بہت محبت کرتی تھی لیکن اسے زیورات سے بھی محبت تھی۔ سولہ سال اس نے بیاہتا لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ اب اسے وہی کرنا تھا جو اس نے اتنا عرصہ دیکھا تھا۔ وہ گروہ نہ پہنتی جو دلہنوں نے کئی کئی سال پہنے رکھا تو پھر کیا پہنتی؟ خاموشی لیکن خاموشی تو صرف داناؤں کا حسن ہے نئی نویلی دلہنیں ایسے سنگھار نہیں کرتیں۔ لیکن.....

"عفاف! کتنا پیارا انسان ہے۔"

گھونگھٹ میں گھسی اس کی سہیلی عفاف کے قصیدے پڑھ رہی تھی اور وہ وہیں ایمان لے آئی کہ وہ محبت سے آگے جا کر کچھ کرے گی۔ عبادت کا لفظ وہ کفر

کے ڈر کی وجہ سے لے نہیں سکی۔ ورنہ کچھ کچھ یہی سوچ تھی اس کی۔

"عفاف" نام بھی تو کیسا دلکش تھا اس کا۔ پھر اور بھی دلکش لگا جب وہ اس کے قریب بیٹھ کر مسکرایا۔

"داغستان کی سرزمین کے پھول کو آج میں نے دیکھ لیا۔" عفاف نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔

وہ مسکرادی۔ تھوڑی آواز سے اور عفاف کا منہ بن گیا۔

"مجھے ہلبلیو پسند نہیں ہو شمہ! بس یہی یاد رکھنا۔"

نئی دلہن کے سامنے یہ بات کچھ ایسے انداز میں کی گئی کہ وہ بس رونے جیسی ہو گئی۔ لیکن دلہن بن کے وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بھی عفاف کے سامنے جسے وہ مسکرا مسکرا کر یہ بتانا چاہتی تھی کہ آسمان سے جب بادل سیاہ ہو کر برستے تھے تو اسے گدگدا جاتے تھے۔

صلیام گاؤں کے کھیتوں میں جو پھول لہلاتے ہیں وہ اب عفاف کی موجودگی میں سدا بہار رہنے والے ہیں۔

ماں کے ڈر سے جو لفظ اس کے دل میں مقیم رہے وہ اب عفاف کی ساعتوں کا سفر کرنے کا ارادہ

باندھ چکے ہیں.... لیکن عفاف تو.... وہ تو....

"میری سماعتیں پردہ پوش ہیں۔ تم خالی گھر میں بولو میرے کانوں میں نہیں۔"

دلہن نے سر اٹھا کر دیکھنا چاہا اس سے پہلے ہی اس کا گھونگھٹ جھٹک کر گرا دیا گیا۔

ٹھیک کہا گیا تھا۔ اس کی سماعتیں وشمہ کے لیے پردہ پوش تھیں۔ اسے خالی گھر میں ہی بولنا پڑا۔

عفاف سر کے اشاروں' آنکھ' ہاتھ کی جنبش سے اپنا مدعا بیان کیا کرتا۔ ایسے کہ واقعی اسے زبان ہلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ جیسے وہ بہرا بھی ہو اور وہ گونگا۔ اس نے زیورات پر دھاگے لپیٹ لیے اور پوشاکوں میں جڑے موتی نوچ ڈالے۔ ریشم کی سرسراہٹ کو اپنی مٹھیوں سے بھینچ لیا۔ ہاں سچ اس نے یہی کیا۔

صلیام کا گل داؤدی عفاف کے حکم پر منہ لپیٹ کر بیٹھ گیا۔

نئی دلہن نے محبت کے عہد کو تروتازہ رکھنے کی جان توڑ کوشش شروع کر دی....

عفاف ایک باغ کا رکھوالا تھا۔ وہاں وہ پرندوں کا شور کانوں میں روئی ڈالے بغیر سنتا تھا۔ پگڈنڈیوں پر بھاگتے گھوڑوں کے ٹاپوں کے قریب سے وہ گزر جاتا اور بھیڑوں کی رکھوالی کرتے گڈریوں کے ہونٹوں پر مچلتے گیتوں کو سنتا۔ کھیل تماشے میں مگن بچوں کے شور کی پروا کرتا' وہ گھر میں ایک وشمہ کو گونگا بنا دینے پر ہر صورت قادر تھا۔

عفاف کو اپنے بابا سے کچھ ایسی محبت تھی کہ وہ ہر روز ان کی قبر پر جاتا تھا۔ اس کے بابا کے نوادرات گھر میں ایسے موجود تھے جیسے وہ ابھی کچھ دیر کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔ بس ابھی واپس آنے والے ہیں اور اپنی مخصوص مردانہ چادر کی بکل مار کر قہوہ پینے والے ہیں۔ چھوٹی کھڑکی کے پاس رکھے بستر پر سو جائیں گے اور

بلوک کی شاعری کی کتاب کو اس وقت تک پڑھیں گے جب تک چراغ اپنی روشنی تمام کر دینے کا اعلان نہیں کر دے گا۔ اور پھر بچوں کی طرح گھٹنوں کو سر کے ساتھ جوڑ کر سو جائیں گے۔

وشمہ' عفاف کے بابا سے جلد ہی واقف ہو گئی۔ اتنی کہ اسے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ سات سال پہلے قبر کو اپنی قیام گاہ بنا چکے ہیں۔ عفاف جب اپنے بابا محترم کا ذکر کرتا تو راتیں اپنے خیمے دن کی روشنیوں میں گاڑنے لگتیں۔ اور زمین کی بلندی پر' پہاڑ کی سطح پر تعمیر مسجد سے اذان بلند ہونے لگتی۔

جتنے بابا محترم گھر میں موجود تھے اتنی ہی والدہ گھر سے غائب تھیں۔ جیسے ایک بال بھی اگر کنگھی میں پھنسا رہ گیا تو اسے بھی نکال کر کہیں دور پھینک دیا گیا تھا۔ پڑوس کی عورتوں نے جو اکثر اپنا سینا پرونا لے کر اس گھر کے برآمدے میں آ کر بیٹھ جاتی تھیں اسے بتا دیا کہ عفاف کی ماں کی آواز پہاڑوں کو سلام کرتی سننے والے کے کانوں تک آیا کرتی تھیں۔ وہ ایک خوف زدہ رہنے والے دل کے مالک مرد پر ایک للکار تھی۔ سرشام وہ کھانا پکانے میں اتنا واویلا کرتی کہ رزق کے لقموں کے صبر پر رشک آتا۔

"سزا وہ کھیتی ہے جو انگلوں کو بھی کاٹنی پڑتی ہے۔"

وشمہ اپنے ہاتھ کے زیور پر نئے رنگین دھاگے لپیٹ رہی تھی کہ وہ کچھ تو جاذب نظر لگیں۔ وہ خالی گھر میں عفاف کو خیالوں میں بٹھا کر اونچی آواز سے کلام کیا کرتی۔ وہ اس سے دن بھر کی باتیں کرتی' رات بھر کے خواب سناتی' سنے سنائے گیتوں سے چرائے کچھ اشعار وہ اپنی آواز میں پرو کر گنگنا دیتی۔

عفاف آتا تو وہ بس بے آواز مسکرا دیا کرتی۔ وہ بلوک کی شاعری کی کتاب پڑھتی اور چاہتی کہ اپنی خوش گلو آواز میں اسے سنائے۔ ایک بار اس نے اس کا ارادہ کیا لیکن عفاف نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"کیوں چلا رہی ہو.... میرے کان پھٹ رہے ہیں۔"

اس نے چلانا بند کر دیا.... منہ سی لیا.... اور پڑوس کی عورتوں کو وہ شاعری سنانے لگی۔

وہ سینے پرونے سے اپنا ہاتھ روک لیتیں۔ "خوش

گلو پرندوں نے تمہاری آواز میں قیام کیا ہے۔" کوئی ایک کہتی۔

"نیلے چشموں کے کنارے آباد بنجارنوں کا جھوٹا پانی تم نے ضرور نوش کیا ہے۔" دوسری کہتی۔

* * *

عفاف کو اپنے دوست عبدالخبیر کی شادی میں شرکت کرنی تھی۔ و اپنے بابا کے گھر آگئی۔ اور دن گننے لگی اور اتنے زیادہ دن گن لیے کہ ایک دن بابا نے پوچھا۔

"کتنے مہینے ہو گئے وشمہ..... عفاف کب آئے گا؟"

"مہینے؟ کیا اب اسے مہینے بھی گننے ہوں گے؟" وہ کائی زدہ نالے کی طرح بدبودار ہو گئی۔

بابا نے چند لوگوں کو عفاف کے دوست کے گاؤں میں معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ وہ شادی کے فوراً بعد ہی روانہ ہو گیا تھا۔ اب خبر نہیں کہ کہاں ہے۔

جب مہینے گنتے، سال گننے کی نوبت بھی آ گئی تو عفاف آ گیا۔ اور اسے ساتھ لے گیا۔ گھر کے برآمدے میں جس میں اس نے پھولوں کے کئی گملے رکھے تھے اور جو سوکھ چکے تھے۔ وہ اب پھر سے سرسبز ہو چکے تھے۔ وہاں پھولوں کے پاس ایک پھول کھڑا تھا۔

"خوش آمدید۔" پھول نے اپنی پیاری سریلی آواز میں بہ آواز بلند کہا۔ ترنگ سے کہا.....

عفاف مسکرا دیا۔ وشمہ برآمدے میں ہی کھڑی رہ گئی۔

وہ عفاف کی بیوی تھی۔ اور وہ اسے بہت جدوجہد کے بعد حاصل کر سکا تھا۔ سفر اس کے لیے باعث رحمت ثابت ہوا تھا۔ اسے خانہ بدوش لڑکی کی آواز نے جکڑ لیا تھا جو وہ اپنے خیمے کی آڑ میں بیٹھی گایا کرتی تھی۔ چراغ روشن کر کے۔ ریشمی رومالوں پر پھول کاڑھتے ہوئے۔

فروسیا کے زیورات پر دھاگے نہیں لپیٹے گئے تھے۔

اور اسے بولنے میں تامل نہیں ہوا کرتا تھا۔

وہ ایک سزا جو اس کی والدہ کے بدلے میں ایک دوسری عورت کو ملنی چاہیے تھی وہ وشمہ کو مل گئی۔

اب وہ جزا کی طرف آیا تھا۔ جزا فروسیا کے لیے۔

اسی وقت وشمہ کے گلے کے سارے سر مر گئے۔ یہ ایسا صدمہ تھا اور اس واقعے میں ایسی غیرت مندانہ للکار تھی کہ وہ خود سے یہ عہد کیے بنا رہ نہ سکی کہ وہ عفاف کو اپنی آواز سے اس وقت تک محروم رکھے گی جب تک وہ ملک الموت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ نہیں سن لے گی۔

صبح و شام فروسیا کے گیت ان کے چھوٹے سے گھر کے کونوں میں دلیری سے گونجتے..... اس کی آواز جانباز پرندے کے پروں کی طرح رواں تھی۔ وہ زمین کی سات تہوں میں بیٹھ کر بھی گنگناتی تو زمین کی سات تہوں کے اوپر زندگی کو روک دیتی۔ انسان کو زمین کھودنے کا پابند کر دیتی۔ وہ یہ حق رکھتی تھی کہ اس کی آواز کو سنا جائے۔ پھر اس آواز کو دائرہ نکاح میں لے آیا جائے۔

اپنے زیورات سے سارے دھاگے ادھیڑتی وشمہ اپنی انگلیوں کی حرکات کو بھی گونگا کیے اس کے گیتوں کو سنا کرتی۔ اسے یہ گمان ہوتا کہ ہر عورت ایسا گا سکتی ہے..... ہر عورت کے گلے میں یہ سر آباد ہیں..... ہر عورت ایک جانباز پرندہ ہے۔ جو اڑان بھر سکتا ہے.....

اس نے اپنے سارے زیورات فروسیا کو دے دیے۔ وہ اتنی خوش ہوئی کہ اس کے سر کے بالوں کو گوندھ دیا اور ان میں ایک پھول لگا دیا جو جلد ہی مرجھا گیا۔ وشمہ نے بابا کا وہ بستر سنبھال لیا جس پر وہ گھٹنوں میں سر دیے کر سو جایا کرتے تھے۔ اور اس کتاب کو جو وہ پڑھ پڑھ کر خود کو دنیا سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ اسے اس نے ایسے حفظ کر لیا کہ وہ اس جیسی کئی ہزار کتابیں لکھ سکتی تھی۔ وہ صبح اٹھ کر گھر صاف کرتی۔ پڑوس کی عورتوں کے ساتھ مل کر لکڑیاں اکٹھی کر لاتی۔ اس کے قدم زمین پر ایسے پڑنے لگے جیسے وہ ہوا میں تیر رہی

ہو۔

پڑوس کی عورتوں نے ہی سب سے پہلے اسے گونگا پایا۔ پھر فروسیا نے اور پھر پڑوس کے ہی باقی کے گھروں نے۔ عفاف تک بات پہنچی تو وہ ہنس سا دیا جیسے اسے بے آباد گاؤں کے کسی آدمی کا قصہ سنا دیا گیا ہو۔ اسے پروا نہیں ہوئی کہ اسے ایسے ہی منظور تھا سب۔

وقت گزرا، پڑوس کی عورتیں اس کی خاموشی کی عادی ہو گئیں۔ اتنی کہ وہ بولتی جاتیں اور کبھی اس کی طرف سے جواب کی توقع نہ کرتیں۔ فروسیا ایک خانہ بدوش جرأت مند عورت! اس نے ایک گیت اس کے لیے بنایا اور اسے پاس بٹھا کر گایا۔ عفاف نے سنا تو فروسیا کو کچھ ایسے دیکھا کہ فروسیا سکتے میں آگئی۔ پھر بھڑک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھاگ کر اپنے سامان میں سے کپڑے کا ایک پارچہ اٹھا لائی اور اسے عفاف کے سامنے پٹخا۔

"میرا کوئی حق غصب نہیں کیا جا سکتا۔ میرا گانا بھی نہیں۔ میں پابند نہیں ہوں۔" عفاف پر نظریں گاڑ کر وہ تنک کر بولی۔

وشمہ نے فروسیا کو دیکھا اور اس کے وجود میں جو تھوڑی، بہت گویائی بچی، تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اس بار اسے اپنی غیرت پر شرم آئی۔ یہی غیرت نوحہ کناں ہو گئی......

"میرا کوئی حق غصب نہیں کیا جا سکتا، میرا گانا بھی۔" وشمہ نے کتاب کو چھوڑ دیا اور وہ اس فقرے کے احساس کو آگ بنا کر سینکتی رہی۔ اسے خود پر اتنی شرم آئی کہ وہ بے آواز رونے لگی اور زمین پر گرتے اپنے آنسوؤں کو دیکھنے لگی۔ اسے بولنے کی جو قوت دی گئی تھی کہ اسے اس نے غلام کر دیا تھا۔ وہ اس کی آقا بننے کے لائق نہیں تھی۔ وہ پابند تھی 'پابند رہی......

اب وہ اتنی خاموش ہو گئی۔ اتنی کہ اس کی آنکھ کے اٹھنے اور جھکنے کی گویائی بھی جاتی رہی۔ اس کا پورا وجود حلف میں سمٹ آیا۔ عہد میں ڈھل گیا۔ عفاف اس کی طرف دیکھتا تو تمسخر سے ہونٹ کے کنارے کو دائیں رخ لے جاتا کہ۔

"اچھا! تو آخر کب تک؟"

✡ ✡ ✡

زندگی کے آسمان تلے وہ پوری زمین پر قبضہ کیے ہوئے تھا۔ اسے پروا نہیں تھی کہ اس کے نکاح میں آئی ایک عورت کیا حلف لے چکی ہے۔ وہ باغ کی رکھوالی کے لیے جاتا اور چرواہوں کے گانے سنتا ہوا واپس لوٹتا۔ رات قہوہ خانے میں قہوہ پینے چلا جاتا۔ یا فروسیا کا ہاتھ پکڑ کر چشموں کے پانی سے چھیڑ چھاڑ کرتا۔

ایک دن وہ قہوہ خانے میں گیا تو ایک گاہک اور کام والا لڑکا آپس میں الجھ رہے تھے۔ اور ان کی تکرار اتنی فصاحت لیے ہوئی تھی کہ سب انہیں ایسے سن رہے تھے جیسے وہ انجانی زمینوں کی قصہ گوئی میں مصروف ہوں۔

"یہ کھوٹا سکہ میرا نہیں ہے۔ تم میری ایک انگلی کاٹ سکتے ہو۔ میں اف نہیں کروں گا تم مجھے دغاباز نہیں کہہ سکتے۔"

"محترم! یہ سکہ آپ نے عنایت کیا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ نے غلطی سے عنایت کر دیا ہو۔"

"میں اپنی جیب میں موجود سب سکوں کو ایسے جانتا ہوں جیسے اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو۔"

"میں بھی سکوں کی پرکھ پر ایسے قادر ہوں جیسے باپ اپنے بچوں کی۔"

"میں اس خاتون کی خاموشی کے عہد کی پاس داری کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں جس کی پاس داری میں وہ ایک جنگ جو سے بڑھ کر ہے۔ یہ سکہ میرا نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری جیب میں پہلے سے موجود ہو۔"

لڑکے نے خاموشی سے اپنے مالک کی طرف دیکھا۔ قہوہ خانے میں سناٹا سا چھا گیا۔ اور پھر مالک نے سرہلایا کہ "جانے دو یہ سچا ہے۔"

عفاف نے ایک قہر بھری نظر اس بڈھے پر ڈالی اور قہوہ پیے بغیر ہی بھاگم بھاگ گھر آیا۔ وشمہ فروسیا کے کپڑوں پر پھول کاڑھ رہی تھی۔

"وشمہ! مجھے اپنے بابا کا نام بتاؤ۔" وہ تیز آواز میں چلایا۔ اور خوں خوار نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

وشمہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سے پھول کاڑھنے لگی۔

"وشمہ! مجھے اپنے شوہر کا نام بتاؤ..."

وشمہ نے پھولوں کی پنکھڑیوں کو ایک نیا رخ دیا، اس نے انہیں آسمان کی اور اٹھا دیا...

"وشمہ اگر تم میرے نکاح میں رہنا چاہتی ہو تو اپنے بابا کا نام بتاؤ..."

فروسیا سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وشمہ کو اس کا سرخ پارچہ یاد آیا اور پھر اپنا حلف... وہ اٹھی اور اس نے اپنے وہ چند زیورات بھی اتارنے شروع کر دیے جو صرف شادی شدہ ہونے کی علامت کے طور پر اسے پہنے رکھنے تھے... عفاف دنگ رہ گیا۔ جلد ہی اس نے دھاگہ لپیٹے سارے زیورات اتار دیے اور ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی کہ بابا کو پیغام بھجوا دیا جائے وہ اسے آکر لے جائیں۔

"فروسیا... تم اسے کہو یہ گیت گائے" عفاف نے فروسیا کی کلائی دبوچ لی۔

فروسیا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ "یہ گیت گاتی تو ہے۔"

"کب...؟"

"سنو، وہ تو ابھی بھی گا رہی ہے..."

عفاف نے غصیلی نظر سے فروسیا کو دیکھا... اوہ! یہ دراصل فروسیا ہی تھی جس کے گیتوں نے وشمہ کے گیتوں کو زبان زد عام کر دیا تھا... اوہ! یہ وہ پڑوس کی عورتیں بھی تھیں جنہوں نے چشموں کے سنگ یہ عہد عام کیا تھا۔ ندیوں، نالوں، موسموں اور قصوں میں یہ حلف حلول کیا تھا...

اس کے حلف پر حلف لیے جانے لگے۔ عورتیں اور مرد اس کا نام لے کر اس کی سچائی پر لفظ رکھتے۔ فروسیا نے دو اور نئے گیت گائے۔ یہ گیت بھی ہوا کے دوش پر پہاڑوں سے ٹکراتے، دریاؤں سے اٹکھیلیاں کرتے، زبان زد عام ہو گئے۔ شادی بیاہ کے گیتوں میں

ایک اور گیت کا اضافہ ہو گیا۔ دولہا دلہن کو لینے آتا تو اسے یہ گیت سنایا جاتا کہ تم اس دلہن سے وہ سلوک نہ کرنا کہ اسے پہاڑوں کی چوٹی پر رہتی وشمہ کا سا عہد لینا پڑے۔۔۔ جواب میں دولہا والے بھی گیت گاتے کہ وہ دلہن کو ایسے رکھیں گے کہ وہ بلبل کی طرح گاتی رہے گی اس کی گویائی کسی پر گراں نہیں گزرے گی۔

☼ ☼ ☼

عفاف نے ایسے ہی کسی گیت کو سنا اور وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس نے اسے اس کے باپ کے گھر چھوڑا اور فروسیا کو لے کر نئی زمینوں کی طرف سفر شروع کر دیا۔ وہ خانہ بدوش بن گیا۔

بازاروں میں کاریگروں نے اپنے فن میں "عہد سکوت" کو کندہ کرنا شروع کر دیا۔ صراحیوں پر اس کا حلف کندہ تھا۔ قالینوں اور پارچوں، دیواروں اور دہلیزوں پر اس کا نقش فریادی تھا۔ قصہ گوؤں میں یہ قصہ اپنی اپنی طرز پر مشہور تھا۔

کوئی کہتا "جب اس نے اپنے شوہر کو ہرن کی طرح قلانچیں بھرتے ہرنی کی طرف بھاگتے دیکھا تو وہ وہیں خاموش ہو گئی۔"

کوئی کہتا "وہ پاکیزہ اور پابند عورت ہے۔ وہ بحکم خدا خاموش ہوئی ہے۔"

کوئی کہتا "خاموشی کے حلف سے پہلے اس نے اعلانیہ سب بیان کیا تھا۔ پر افسوس اسے سننے والا کوئی انسان وہاں موجود نہیں تھا۔"

عفاف ہر اس جگہ سے بھاگ جاتا جہاں اسے وشمہ کسی بھی صورت میں مل جاتی۔ اس کا بس چلتا تو وہ سب کو جلا کر راکھ کر دیتا۔ اس کے خون میں غصہ اور نفرت ایسے حلول کرنے لگے تھے کہ فروسیا نے مزید اس کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا۔

"تم وہ نہیں رہے جو مجھے میرے خیمے کے باہر ملا تھا۔ تم ہر روز ایک نیا لبادہ اوڑھتے ہو۔۔۔ پرانا اتارتے ہو۔"

"تم میری بیوی ہو۔۔۔ نہ میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں نا تم مجھے۔۔۔"

"میں تمہاری بیوی ہوں غلام نہیں۔ تم میرے شوہر ہو، آقا نہیں۔۔۔ مجھ سے نکاح کے وقت تم نے میری نسل دیکھی تھی تو میں نے بھی تمہاری نسل پرکھی تھی۔ ہم خانہ بدوش ہیں۔ زمین کو اس سے بہت پہلے چھوڑ دیتے ہیں جب وہ دلدلی ہو جاتی ہے۔ دریاؤں کے رخ بدلنے کی اولین نشانی پر ہجرت کر جاتے ہیں۔ ہم تمہاری طرح ندی، نالوں کے خشک ہونے کا انتظار نہیں کرتے۔ تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے۔ خانہ بدوش اپنے فیصلوں میں کہیں زیادہ جرأت مند ہوتے ہیں۔ وہ زمین کی قدر کرتے ہیں اسی لیے اس پر دوسری بار بسیرا نہیں کرتے۔"

"تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔۔۔"

"تم ملکیت کے شوقین ہو۔ اسی لیے چاندی کی صراحی پر اپنا نام کندہ کروایا ہے۔ میرے بچے پر اپنا نام کندہ کروانے کے لیے تمہیں اس کے پیتل یا چاندی ہونے کا انتظار کرنا ہو گا۔"

فروسیا اپنے لوگوں میں لوٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

عفاف کی ذات میں جو تھوڑی بہت دراڑیں بچی تھیں ان میں بھی نفرت حلول کر گئی۔ اور وہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ کتنے ہی مہینے اس نے کچے پکے جانور کھائے، پہاڑوں میں رہا، خزاؤں میں پلا۔۔۔ بہاروں سے پرے رہا۔۔۔

اپنے گروہ کے ساتھ اس نے فروسیا کا قبیلہ بھی لوٹ لیا تھا۔ اس نے خانہ بدوشوں کے سارے خیمے جلا دیے تھے۔ اور انہیں دریا کی طغیانی میں کود جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ گروہ کے سردار کا دایاں بازو بن گیا۔ اس نے اپنے گروہ کو مالا مال کر دیا تھا۔ قافلے لوٹتے، اناج چراتے، قصبوں اور گاؤں میں تباہی لاتے وہ اپنے بابا محترم کا نام تک بھول گیا۔

ایک رات وہ ایک گاؤں لوٹنے گئے۔۔۔ ہاں! اسے اس گاؤں کا نام یاد تھا۔۔۔ صلیام کا۔۔۔

گاؤں کے سردار کے گھر پندرہ سالوں بعد بیٹا ہوا تھا۔ سارا گاؤں وہاں جشن کے لیے اکٹھا تھا۔ سردار پر تحائف کی برسات کردی گئی تھی۔ وہ ان تحائف کا بوجھ سردار پر سے کم کرنے چلے تھے۔ جب سارا گاؤں مل کر لڑکے کے جھولے کے پاس گھیراڈالے خوشی کے شادیانے بجا رہا تھا۔ اس وقت ڈاکوؤں کا سردار اپنی بندوق کی نال کو گاؤں کے سردار کی کنپٹی پر رکھنے ہی والا تھا۔

گولی ہوا میں فائر کی گئی۔ سارے گاؤں کو سانپ سونگھ گیا۔ بچے کے جھولے پر بندوق کی نال تنی تھی۔ سردار نے خاموشی سے سب لالا کر وہاں رکھنا شروع کر دیا۔ ڈاکوؤں کے سردار کے کان میں کسی نے کچھ کہا۔ سردار نے مجمع میں موجود وشمہ کی طرف دیکھا۔

"تو یہ ہے وہ عورت جس کے قصے ڈاکوؤں کی پناہ گاہوں کی دہلیز بھی پھلانگ چکے تھے۔" سردار نے سوچا۔ بہت پہلے اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر اسے یہ عورت مل گئی تو وہ اس کا عہد توڑ کر ہی رہے گا۔ وہ اس کے سلے لب کھول دے گا۔

"بول تیرے باپ کا کیا نام ہے؟" بندوق کی نال وشمہ کی طرف اٹھی۔

"یہ گونگی ہے۔" کسی نے کہا۔

سردار نے نال کا رخ جواب دینے والے کی طرف کیا اور اس کے پیروں میں فائر کیا۔

"اس کے علاوہ کوئی اور بولا تو تالو پر گولی مار دوں گا۔"

"تمہارا اس سے کیا لینا دینا....." گاؤں کے سردار نے جرأت سے کہا۔

"میں گھوڑے پر سوار ہوں..... ہتھیار میرا غلام ہے، یہاں کوئی ایسا نہیں جسے پاش پاش نہ کیا جا سکے۔ خاموش رہو ورنہ قبروں میں اتار دوں گا۔"

"تم ایک مرد ہو یہ ایک عورت..... تم اپنی بہادری اس پر مت آزماؤ....."

"میں ڈاکوؤں کا سردار ہوں اور یہ اپنے عہد کی سردار..... سردار اپنی سرداری قائم رکھنا چاہتا ہے..... ایک ہو کر..... اگر اس نے اپنے باپ کا نام نہ بتایا تو یہ اپنے باپ کا نام بتانے کے لائق نہیں رہے گا۔"

بندوق کا رخ بچے کے جھولے کی طرف مڑ گیا۔

سارا گاؤں وشمہ کو دیکھنے لگا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے سر کو اٹھائے رکھا لیکن بچے کی ماں لپک کر وشمہ کے قدموں میں گر گئی۔

"مرد اگر سردار بھی ہو تو اس کی غیرت کو ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے..... عورت اگر ماں ہو تو اس کی ممتا کو قرار دلانا پڑتا ہے..... پندرہ سال بعد خدا نے میری طرف رخ کیا ہے..... اگر یہ مجھ سے بچھڑ گیا تو خدا مجھ سے بچھڑ جائے گا....."

سارے گاؤں کو سانپ سونگھ گیا۔ عفاف سردار کے پیچھے والے گھوڑے پر بیٹھا وشمہ کو دیکھ رہا تھا..... ٹکٹکی باندھے..... غصے سے..... نفرت سے.....

وشمہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس کے ہونٹ کانپ اٹھے۔ وہ ایک عہد بھی پورا نہیں کر پائی تھی۔

بندوق کا فائر جھولے پر ہوا۔ بچہ ڈر کر رونے لگا.....

وشمہ نے اپنے باپ کا نام بتانے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ عفاف نے بندوق سیدھی کی اور فائر اس کی کنپٹی پر کیا۔ اس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی بیوی کسی اور کے کہنے پر اپنا حلف توڑے۔ اس کی نفرت انگیز شدت پسندی نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ ساری زندگی اس کی بیوی نے اس کا حکم نہ مانا..... اب وہ کیسے کسی اور کا حکم مان کر اس کا سر نیچا کر سکتی ہے..... کیسے..... ؟

جس وقت وشمہ زمین پر بے روح پڑی تھی، اس وقت عفاف اپنے گھوڑے کو لگام سے قابو کرتے چلا رہا تھا۔

"میں ہوں اس غیرت مند عورت کا شوہر جس نے ساری عمر اپنے عہد کی پاس داری کی۔"

وشمہ کے مردہ وجود پر..... عہد سکوت پر..... عفاف کی فتح کا پرچم زندہ و جاوید لہرا رہا تھا۔

ام اقصیٰ

نہ جانے زندگی اس قدر مشکل کیوں ہوتی ہے اور خاص طور سے شادی شدہ زندگی کہ سسرال میں زندگی گزارے نہ گزرے.... گھسیٹنے سے گھسے.... جب سے اس کے میاں کا فون آیا تھا کہ آج رافعہ آپا آرہی ہیں وہ یوں ہی بیٹھی جل کڑھ رہی تھی۔

نہ جانے اس رافعہ آپا کا اپنے گھر میں دل کیوں نہیں لگتا۔ شوہر کا اکلوتا بھائی ہونا بھی مصیبت ہی ہوتا ہے.... شوہر کے لیے نہیں بیوی کے لیے.... بہنوں کو بیاہنے' دینے دلانے' برتنے میں ہی سب پونجی خرچ ہو جاتی ہے۔ اور بھائی بھی ایسا جو بہنوں کا مان رکھنے والا ہو۔ ٹھیک ہے بہنوں کا حق ہوتا ہے بھائیوں پہ.... پر کچھ حق ان کا بھی تو ہوتا ہے ناں جو بھائیوں کے گھر میں بس رہی ہوتی ہیں۔ صد شکر کہ سعدیہ شادی کے بعد.... جدہ شفٹ ہو گئی ہے۔

ہاں البتہ اس کی شادی پہ آنے والا خرچ اور جیسے اس کے بھائی صاحب نے ارمان نکالے اور جتنے مہینے قرض اتارنے میں لگے' یہ الگ داستان ہے۔ میاں کا کیا ہے۔ آرام سے فون کھڑکا دیا۔

"آج شام رافعہ آپا آرہی ہیں' کھانا اچھا سا بنا لینا۔"

اور تو اور عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم بھی آج لنچ میں چکن منچورین بن کباب اور ٹرائفل کی فرمائش کر کے گئے تھے۔ کہا کچھ نہیں بس اتنا کہ مما آج دعوتی لنچ۔ اور اپنے لاڈلوں کی فرمائشیں بھلا کہاں ٹالی جاتی تھیں اس سے.... اور یہ رافعہ آپا ابھی اکیسواں دن تھا انہیں دو دن رہ کے گئے ہوئے ڈرامے' ڈھکوسلے اس قدر آتے ہیں کہ بھائی صاحب کے لیے کبھی ساگ پکا کر لے آتیں اور کبھی اپنے بچوں کے پرانے کپڑے عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم کے لیے اور میاں صاحب اسی پہ بچھ بچھ جاتے۔ ممنون ہوئے جاتے ایسے میں ماریہ کا دل جس درجہ کڑھتا' وہی جانتی تھی۔

وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھتی اٹھی کہ رات نیند بھی ٹھیک سے نہ آئی تھی سو ارادہ تو آج آرام کا تھا۔ کام والی نو بجے تک سب نپٹا جاتی' دو گھنٹے آرام کے بعد اس کا بچوں کے لیے لنچ بنانے کا ارادہ تھا' ایک بجے تک وہ آجاتے تھے۔ آج لنچ باکس بھی نہیں لے کر گئے تھے۔ اب ان کا لنچ بناتی یا رافعہ آپا اور ان کے بچوں کے لیے چونچلے کرتی.... اسے نئے سرے سے غصہ آنے لگا۔

دو ایک بار یہ بھی کر دیکھا کہ کھانا نہیں بنایا' زبان تھوڑی شیرے میں ڈبو کے رافعہ آپا کی آمد پہ کہتی۔

"رافعہ آپا آپ خود بنالیں جو دل چاہے۔ اپنے بچوں کی پسند کے مطابق۔" جواباً" رافعہ آپا کے لہجے میں اس سے ڈبل شیرینی ہوتی۔ "ارے نہیں ماریہ چندا! تم جو بھی بناؤ گی بچے شوق سے کھالیں گے۔ وہ تو دیوانے ہیں تمہارے ہاتھ کے کھانوں کے ذائقے کے۔"

اگر تو شیرہ لگا رہتا اور اصرار بھی جاری رہتا تو رافعہ آپا اتنا کچھ بناتیں' منگواتیں اور گند پھیلاتیں کہ الامان اور اوپر سے میاں صاحب کی تعریفیں کہ دیکھا! کتنا کچھ بنایا اور کتنا مزیدار بھی۔ اپنے خرچے پہ اتنا کچھ اور ایسا کچھ بناتیں تو بات بھی تھی "اوروں" کے پلے سے تو ماریہ بھی اس سے ڈبل کچھ بنالیتی۔

"اے کاش..." ماریہ دوبارہ صوفے پہ بیٹھی پاؤں اوپر کرکے قدرے نیم دراز سی ہوگئی "اے کاش رافعہ آپا نہ ہوتیں... اس کا میاں ایک ہی بھائی ہوتا یا رافعہ آپا بھی سعدیہ کی طرح کسی اور ملک شفٹ ہوجاتیں یا چلو اسی ملک میں کسی دور پار کے شہر میں ہوتیں... روز روز آیا نہ جاتا ان سے... تو زندگی کتنی حسین ہوتی۔"
وہ یونہی نیم دراز سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بظاہر تو وہ فارغ ہوچکی تھی۔ سب کام فی الحال نمٹ چکے تھے۔ لیکن ابھی تک اس نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ نڈھال اتنی کہ۔۔ اپنے لیے چائے تک نہ بنا پارہی تھی وہیں ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے اس نے ہاتھوں کو آپس میں الجھا کے اوپر سر ٹکالیا..
"بہو ذرا اک کپ چائے تو بنادو کڑک سی... اور پھر آ کے میرے سر میں تیل ڈال دو... اور ہاں اگر دوپہر کے کھانے کی تیاری کررہی ہو تو بریانی اور رشین سلاد بھی بنانا عفواد آرہا ہے آج۔" ساس کے احکامات پہ اس نے زور سے آنکھیں میچ کے کھولیں۔
"اف یہ زندگی بھی ناں... خاص طور سے سسرالی زندگی۔" صبح فجر سے ذرا پہلے ہی وہ اٹھی تھی۔ بچوں کے اسکول میں آج کلر ڈے اور ون ڈش تھی۔ یہ کہنے کو ہی ون ڈش تھی کیونکہ دونوں بچے ون ڈش کے نام پہ چار چار ڈشز بنوا کے لے گئے تھے ساس سسر کی بیڈ ٹی... ناشتہ اور پھر چائے شوہر کے جوتے موزے سے لے کر ہر کام ناشتے تک... نند ذرا لیٹ کالج جاتی تھی... سو چار مرتبہ تو ناشتہ ہی بنایا... اوپر سے کام والی بغیر بتائے دو دن سے چھٹی پہ تھی صفائی اور برتن خاص طور سے دھوتے اس کے ہاتھ شل ہوجاتے۔ ایسے میں اپنے ناشتے کا ہوش اسے کہاں رہتا تھا۔ نڈھال ہوجاتی تو یاد آتا کہ ابھی تک ناشتہ تو کیا ہی نہیں۔ ویک اینڈ تو اور بھی مصروف گزرتا تھا کیا ہی دو نندیں جیٹھ جٹھانی اور دو کنوارے دیوروں کی آمد پہ کھانا نہ صرف مقدار میں

زیادہ پکتا بلکہ تعداد میں بھی زیادہ ہوتا۔
ارباز اچھا تھا اس کے ساتھ.... ماں کی شکایتوں پہ اسے کچھ نہ کہتا تو اس کی جلی کٹی بھی سن لیتا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ ارباز کی وجہ سے ہی سب سن اور سہ لیتی عورتیں ایک شوہر کی خاطر ہی تو سب کی سن اور سہ لیتی ہیں۔
چائے کے لیے پانی رکھ کے وہ پھر سے کرسی پہ آ بیٹھی.... یونہی دل میں ایک خیال سا آیا۔ دبی راکھ میں چھپی چنگاری سی خواہش من آنگن میں سلگی.... اے کاش اس کا الگ گھر ہوتا.... جہاں وہ ارباز اور اس کے دونوں بیٹے رہتے۔ ارباز ایک ہی بھائی ہوتا یا چلو ایک اور ہوتا.... الگ اپنے گھر میں.... ایک بہن ہوتی یا چلو دو بھی ہوتیں لیکن بیاہی اور اپنے گھر میں خوش.... کبھی کبھار ملنے آتیں.... وہ ان کے لیے ڈھیروں کھانے بناتی' ایک فیملی مہمان کے لیے کھانا بنانا بھلا کون سا مشکل ہوتا ہے؟ اور ساس اور سسر.... کچھ پل کو خواہش کو خیال بنانے سے دبائے رکھا کہ اپنے ماں باپ کا خیال آگیا تھا اور پھر اپنے ہی خیال کو زور سے جھٹکا....
کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ ارباز سودا سلف اٹھائے اندر آرہا تھا.... وہ بے ساختہ کاؤچ سے اٹھ بیٹھی۔
"رافعہ آپا اگلے ہفتے.... شاید عمرے پہ جارہی ہیں سو میں نے سوچا تھوڑا اچھا سا ڈنر بنالیں۔ کچھ تو بنا بنایا لے آیا ہوں۔ آفٹر آل میری بیوی تھک جاتی اتنا کچھ بنا کے۔" وہ مقابل آکھڑا ہوا۔
"اٹس او کے میں بنالیتی۔" ماریہ فریش تھی۔
"شیور....!"
"بالکل۔" وہ مسکراتے ہوئے سودا سلف اٹھائے کچن میں لے آئی۔ سلیب پہ سامان رکھتے اس نے بے ساختہ سانس خارج کی۔
صد شکر وہ ایک خواب تھا۔ آشنائی کا.... آگاہی کا۔
آستینیں اوپر چڑھا کے گنگناتے ہوئے وہ رافعہ آپا کے لیے اچھا سا ڈنر بنانے کے لیے تیار تھی۔

عندلیب زہرا

زری خالہ ہمارے خاندان کی داستان کا ایک بند باب تھیں۔ سب افراد کی یادداشت کے طاق میں موجود ہونے کے باوجود ایسی گرد آلود اور بند کتاب، جسے کھولنا منع تھا۔ مگر جب بھی کوئی اڑتی خبر کانوں میں پڑتی یا غلطی سے کسی کی زبان پر ان کا نام آجاتا تھا تو مردوں کے نتھنے غصے سے پھڑکنے لگتے۔ زبان سے نفرت و غصے کا اظہار ہوتا۔ گھر کی عورتیں سہم جاتیں۔ نانا کے کندھے مزید جھک جاتے اور نانی امی کے چہرے پر

جھرّیوں کا مزید اضافہ ہو جاتا۔

دوسرا کردار پھوپی سکینہ تھیں۔ جن کی برسی پر ہر سال دادا اور چچا دیگیں پکواتے اور قرآن پاک کا ختم کرواتے۔ ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے جاتے۔ انہیں غیر برادری کے لڑکے سے محبت ہو گئی تھی۔ بارہا بھیجے گئے رشتے کو دادا نامنظور کرتے رہے۔ انہوں نے بھاگنے کا قصد کیا لیکن عین موقع پر مخبری ہو گئی۔ پھر ایک رات ایسا سوئیں کہ کبھی نہ اٹھ سکیں۔ کوئی کہتا کہ دماغ کی نس پھٹ گئی اور کوئی کہتا کہ چچا نے زہر دیا تھا۔ یہ سب افواہیں تھیں یا سچ پتا نہیں لیکن دادی نے دادا اور چچا سے پھر کبھی کلام نہ کیا اور آخر ایک دن اسی بھید بھری ناراضی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

بچپن میں تو نہیں لیکن لڑکپن میں آگاہی ہوئی کہ زری خالہ ہمارے خاندان کی سب سے خوب صورت اور قابل لڑکی تھیں۔ وہ پہلی لڑکی تھیں جو میٹرک کے بعد کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے چودہ جماعتیں پاس کیں اور سب سے پہلا کام اپنے منگیتر سے شادی کرنے سے انکار تھا۔

"میں حمید کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ ایک ان پڑھ شخص جو صرف کھیتی باڑی کر سکتا ہے یا کھیت میں کیڑے مار ادویات کا چھڑکاؤ....." زری نے نخوت سے کہا تھا۔

"کیا تعلیم دوسروں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے یا ان کو حقیر سمجھنا؟ وہ پڑھا لکھا نہیں ہے لیکن دیگر اوصاف سے مالا مال ہے۔"

عادت کے برخلاف نانا تحمل کا دامن تھام کر گفتگو کر رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ زری نے ان کی خواہش پر تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن کاش وہ ان کی عزت کی سربلندی کی خواہش کا بھی احترام کر سکتیں۔

"مجھے یہ حق مذہب نے بھی دیا ہے اور معاشرے نے بھی۔" زری نے اپنی خواہش کو مذہب کے نام پر پیش کیا۔

"مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال مت کرو۔ مذہب تو والدین کی فرماں برداری کا حکم بھی دیتا ہے، مجھے صرف یہ بتاؤ کہ وہ کون ہے۔ جس نے تمہیں اتنا منہ زور کر دیا ہے۔" نانا نے بیٹی کی آنکھوں میں جھانکا۔

زری خالہ نظریں چرا کر رہ گئیں۔

نانا کا شک بے جا نہیں تھا۔ وہ ان کا کوئی کلاس فیلو تھا۔ اس بحث، ضد، انا، نافرمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ زری خالہ نے کورٹ میرج کر لی۔

ہمارے خاندان کے مردوں کی اونچی پگڑیاں اور شملے نیچے ہو گئے تھے، معاشرہ کی نگاہوں میں اور لوگوں کی گفتگو میں، لڑکیوں پر مزید سختی ہوئی۔ تعلیم، اسکول، کتابیں شجر ممنوعہ بن گئیں۔ فصیلیں مزید اونچی اور تنگ ہو گئیں۔ گھر کی بھی اور دل و دماغ کی بھی۔

والدین کی دل آزاری کی سزا تھی یا اپنی کوتاہ بینی کی، جو دامن میں پچھتاوے لے کر واپس والدین کے پاس آئیں لیکن سب نے دھکے دے کر نکال دیا۔

مجھے نانا کا چہرہ یاد آتا ہے۔ جس پر دکھ اور صدمہ، پچھتاوا رقم تھا..... وہ خاموشی سے دیکھتے رہے اور جھکے کندھوں کے ساتھ اندر چلے گئے۔

پچھتاوا انہیں بیٹی کو اتنا پڑھانے پر تھا۔

دکھ اس کی نافرمانی پر تھا۔

جبکہ صدمہ زری خالہ کو برے حالوں میں دیکھ کر ہوا تھا۔

زری خالہ پھر کبھی واپس نہ آئیں۔ کوئی کہتا انہوں نے خودکشی کر لی ہے۔ کوئی کہتا کہ وہ فلمی دنیا میں چلی گئی ہیں اور کوئی کہتا کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی آلہ کار بن چکی ہیں۔ بہر کیف یہ لوگوں کی قیاس آرائیاں تھیں۔ حقیقت تو صرف اللہ کو معلوم تھی۔

میں بارہ، تیرہ برس کا تھا جب نانا کا انتقال ہوا۔ ایک دنیا جمع تھی۔ سب رو رہے تھے۔ جب ماموں، چچا اور ابا تیزی سے پچھلے دروازے کی طرف گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے گیا تو وہاں ایک سیاہ چادر میں لپٹی عورت رو رہی تھی۔

"ایک دفعہ' ایک دفعہ ابا کا چہرہ دیکھنے دو..... مجھے ان سے معافی مانگنی ہے۔"

"بے غیرت' دنیا کو بھولے قصے یاد کروانے آئی ہے۔" ماموں پھنکار رہے تھے۔

"میں دن رات اللہ سے معافی مانگتی تھی۔ میں ابا کو ہر ہفتے معافی کے خط لکھتی تھی۔" زری خالہ صفائیاں دیتی رہیں لیکن ماموں اور ابا نے دھکے مار کر انہیں حویلی سے نکال دیا۔

روتی بلکتی سیاہ چادر میں ملبوس' زری خالہ واپس چلی گئیں۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتیں لیکن اب سب کچھ پتھر کا ہو چکا تھا۔ میری یادداشت کے کسی گوشے میں ان کا آخری مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھنا' ان کی آخری نظر ہمیشہ محفوظ رہی۔

اس واقعے کے بعد میں نانی کا اہم رازدار اور غم خوار بن گیا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے دل میں چھپے غم' شکوے گلے' زری خالہ کی باتیں' یادیں سب بانٹا کرتیں۔ اس یقین پر کہ میں ان کا بھروسہ کبھی نہ توڑوں گا۔ اور میں نے بھی ان کا یقین کبھی غلط ثابت نہیں کیا۔ اور زری خالہ کو نجانے زمین نگل گئی تھی یا آسمان.....

☆ ☆ ☆

وقت گزرتا گیا۔ ہم لوگ بھی گاؤں سے شہر منتقل ہو گئے تھے۔ وقت بدلا۔ رجحانات' خیالات بدلے لیکن اندر سے ہم سب وہی تھے۔ روایات کے پابند' غیرت کے نام لیوا اور اونچے شملوں کی خاطر جان کی بازی لگانے والے' بہنوں اور بیٹیوں کو قربان کرنے والے۔

میری سوچ قدرے مثبت تھی۔ جو میں نے بیٹوں کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی مناہل کو بھی تعلیم کی روشنی سے منور کیا تھا۔ وہ اعلا تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میری ذہین' فرماں بردار اور قابل فخر بیٹی۔

اس کی تعلیم پورے خاندان کے لیے سوالیہ نشان تھی اور اس کے چچا اور دیگر رشتہ دار ناگواری کا اظہار کرتے۔ لیکن میں روشن خیال تھا۔ (کم از کم اپنی دانست میں)۔ مگر آج جو اس نے اعلان کیا تھا اس نے میری ذات کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اور اس نے اپنی رائے کا اظہار تب کیا جب اس کے تایا زاد کا رشتہ اس کے لیے آیا۔

"بابا! میں گاؤں کے ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ تعلیم' سوچ' ہر بات کا فرق ہے۔ آپ فراز سے ایک بار ضرور مل لیں..... ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

اس کی خود اعتمادی جس پر مجھے "فخر" ہوتا تھا۔ آج زہر لگ رہی تھی اور میرے اندر کا وہی روایتی باپ اور مرد جاگ اٹھا تھا جو بیٹیوں کو ہزار تعلیم دلائیں' ان کے لاڈ نخرے اٹھائیں لیکن شادی کے فیصلہ کا اختیار انہیں نہیں دے سکتے۔

"آپ ایک بار فراز سے مل تو لیں۔ اگر آپ کو پسند نہیں آیا تو میری زبان پر اس کا نام دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔ میں زری خالہ نہیں ہوں جو بھاگ گئی تھیں بابا! میں اس گھر میں رہ کر اپنا مقدمہ لڑوں گی اور میں ایسا کر سکتی ہوں۔"

میں نے تھپڑ مار کر اسے خاموش کروا لیا۔ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور اندر بھاگ گئی۔ میں غصے

میں چیخ رہا تھا۔ میرے بیٹے بھی طیش میں تھے۔ بیوی پریشانی سے ہاتھ مل رہی تھی۔
جب ملازمہ نے روتے ہوئے کہا۔ "مناہل بی بی مناہل بی بی نے... گولیاں کھالی ہیں صاحب جی۔"
سب بھاگتے دوڑتے اسے اسپتال لے کر گئے۔ وہ رات میں نے کانٹوں پر بسر کی تھی۔ میرے اندر کا غصیلا اور انا پرست مرد مر گیا تھا۔ اور صرف ایک باپ اور اس کی بیٹی سے محبت زندہ رہ گئی تھی۔

میں اس کی زندگی کی دعائیں مانگتا رہا۔ کبھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا کبھی سجدے میں گر جاتا۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان کے بعد ڈاکٹرز نے اس کی زندگی کی نوید سنائی تو مجھے لگا کہ جیسے میں زندہ ہو گیا ہوں۔ میں پہلی فرصت میں فراز سے ملا۔ مڈل کلاس کا مناسب صورت لڑکا جو تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔
پڑھا لکھا اور باادب۔ تعصب کی نظر سے نہ دیکھو تو اتنا برا نہ تھا۔ سماجی تفاوت کے باوجود وہ قابل قبول تھا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر مناہل کی خاطر اسے قبول کیا۔ بیٹے ابھی بھی مجھ سے خفا تھے۔ ساری برادری میرے اس قدم کے خلاف تھی۔ اور مناہل... شاید میری خاطر چپ ہو جاتی، صبر کی سل رکھ لیتی۔ لیکن میرے تھپڑ نے اس کے اندر بغاوت اور سرکشی پیدا کر دی تھی۔ میں اس آگ کو بجھانا چاہتا تھا۔ اور اس کی خودکشی نے میرے اندر صرف باپ کی محبت جگا دی تھی اور منفی جذبہ سرد کر دیا تھا۔
"بابا! مناہل کی اس حرکت نے ہمیں کتنا شرمندہ کر دیا ہے۔"
"ہم تو اسی لیے لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف ہیں۔"
"مناہل کی فراز سے شادی... ہم برادری سے کٹ جائیں گے۔"
یہ فقرے، دل جلانے والی باتیں میں مسلسل سن رہا تھا۔
میں لان میں تنہا بیٹھا تھا۔ مناہل کی رخصتی کے بعد سب مہمان بھی رخصت ہو گئے تھے۔ گھر میں خاموشی تھی اور اداسی بھی۔ وہی اداسی جو بیٹی کی گھر سے رخصتی کے بعد گھر کے بام و در سے لپٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ میں نے لان پر ایک نظر ڈالی۔ مناہل کے ہاتھوں سے لگائے ہوئے پھولوں کی پنیریاں، اس کا جھولا، سب اپنی سہیلی کی رخصتی پر اداس نظر آرہے تھے۔
ایک جنگ تھی، جو میں نے مناہل کی خاطر اپنے خاندان اور برادری سے لڑی تھی۔ اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔
میں نے سب کی ناراضی مول لی تھی۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بیٹی بغاوت یا نفس کی سرکشی کے ہاتھوں وہ غلط قدم اٹھاتی جو معاشرے میں اسے ہمیشہ کے لیے ناقابل قبول بنا دیتا۔ اور نہ ہی میرا دل یہ گوارہ کر سکتا تھا کہ وہ اتنا پڑھ لکھ کر گاؤں کے تنگ ذہن اور اجڈ مرد سے بیاہی جاتی۔ جہاں حویلی کی تنگ اور اونچی دیواریں اسے اندر سے مار دیتیں۔
شاید یہ ایک باپ کی محبت تھی جو جیت چکی تھی اور ایک مرد کی خاندانی روایات سے محبت دم توڑ چکی تھی۔
میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مرد وہ نہیں ہوتے جو اپنی عورتوں کو ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر معاف کرنے کی بجائے ظالم دنیا کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں یا نام نہاد غیرت پر انہیں قتل کر دیتے ہیں۔
مرد تو وہ ہوتے ہیں جو اپنے گھر کی عورتوں کی لغزشوں کو معاف کرنا جانتے ہیں۔ انہیں کندھوں سے پکڑ کر اپنے قدموں پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ وہ ان کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ اور ان کی عزت کروانے کے ہنر سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔
عورتوں کی حفاظت جبر و استبداد، اندھی روایات اور بے جا پابندیوں سے نہیں ہوتی بلکہ عزت و احترام سے ہوتی ہے کہ یہ نازک آبگینے ہوتی ہیں۔
دل بہت اداس تھا اور بوجھل بھی۔
یادوں کی منڈیر پر پھوپھی سکینہ کی قبر تھی اور روتی بلکتی سیاہ چادر میں زری خالہ... تو دوسری طرف میری برادری کے مردوں کی نام نہاد، سسکتی اور کراہتی غیرت...
لیکن یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں اپنے حصے کا دیا روشن کر چکا تھا۔ ☼

نایاب جیلانی

بیہ، عنایہ کے کمرے میں گئی تو اس نے دیکھا، عنایہ نزع کے عالم میں تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ اس نے بیہ سے کہا کہ تمہاری خاموش اور صبر جیت گیا اور میری فرماں برداری ناکام ہوئی۔ میرا دل اور ہاتھ دونوں خالی ہیں۔ مجھے اس سے محبت تھی۔ وہ میرے اندر بستا تھا۔ میں جان ہی نہ سکی۔ تم اسے بتا دینا کہ مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔ بیہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اسے "فاتح" سے عشق تھا، بیہ ساکت رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ دیا کو عنایہ کی موت کے بارے میں بتانے گئی۔

دیا کا کمرہ خاص تہ خانے میں تھا۔ جہاں وہ عبادت کرتی تھی۔ وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ بیہ پہلی بار وہاں گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ پتھر ہو گئی۔

دیا بھی مرنے کے قریب تھی۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ بیہ جو اس سے گزرے برسوں کا حساب لینے آئی تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔ دیا نے دم توڑ دیا تھا۔ وہاں کچھ تصویریں تھیں ایک ہی بندے کی تصویریں اور دیا کی ڈائریاں.... ان ڈائریوں کے ساتھ ایک رقعہ تھا جس پر لکھا تھا۔ "انہیں پڑھ لینا۔ تمہارا تجسس دور ہو جائے گا۔"

بیہ نے کچھ قریبی لوگوں کو ان دونوں اموات کی اطلاع دی تھی اور فاتح کو بھی فون کرکے عنایہ کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔ فاتح نے سرد لہجے میں کہا تھا کہ تم یہ اطلاع رافع کو دے دو۔ بیہ کے جتانے پر کہ رافع اس کا شوہر ہے اس نے سرد مہری سے کہا کہ وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے۔

بیہ نے رافع کو اطلاع نہیں دی تھی۔ افسون مشہدی ایک بزنس ٹائیکون کی اکلوتی بیٹی تھی رافع ابراہیم ایک مزدور تھا۔ افسون مشہدی نے اس کو دیکھا اور اس کی اسیر ہو گئی۔ لیکن رافع ابراہیم نے اس پر توجہ نہ دی۔ افسون نے اسے اپنے باپ

کی آئل کمپنی میں ملازمت دے دی۔ وہ اسے چھوڑ کر جارہا تھا۔ تب ہی ایئرپورٹ پر افسوں پہنچ گئی تھی اور اس نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب رافع افراہیم نہ مانا تو اس نے اسے روکنے کے لیے انتہائی قدم اٹھالیا تھا۔

مرید نے اپنے دوست حریر کو اپنی منگنی میں آنے کی دعوت دی تھی اور کہا اپنے ساتھ ایک اور "دوست" کو بھی لے آنا۔ حدید کا یہ دوست پائلٹ ہے۔ وہ انتہائی وجیہہ ہے لیکن ساتھ ساتھ بددماغ اور غصیل بھی ہے۔ اناویہ بہت حسین دل کش تھی۔ اس کی کلاس فیلو رویا اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لے آئی۔ اناویہ نے اس کو ناراضی سے منع کردیا اور کہا اس رشتہ سے انکار کی وجہ خود رویا ہے۔

رویا جب اناویہ کے گھر گئی تو اس نے انادیا کے تایا زاد افراہیم کو دیکھا۔ اس کی گہری محبت بھری نظریں رویا کو ڈسٹرب کر گئی تھیں۔

فوزان مشہدی کے آئل پلانٹ پر کام ہورہا تھا۔ فوزان مشہدی اپنے ایک ایک ورکر سے بخوبی واقف تھے۔ پچھلے چھ ماہ سے ان کے پلانٹ پر ایک ورکر کام کررہا تھا۔ اسے افسوں کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔ یہ ورکر بہت غیر ذمہ دار اور لاپروا تھا۔ یہ لڑکا رافع افراہیم تھا۔ فوزان مشہدی کو بتایا گیا کہ وہ معاہدہ توڑ کر ظہران سے فرار ہورہا ہے تو فوزان مشہدی کو غصہ آگیا اور اس نے خروج لگوا کر اسے جیل بھجوادیا۔

افسوں مشہدی کی اپنی سوتیلی ماں آبگینے سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اس کے سوتیلے بھائی حمیر اور عمیر بھی اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ افسوں کا اپنا سگا بھائی ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا۔

رافع افراہیم کے جیل جانے سے افسوں بہت پریشان تھی۔ وہ اسے باہر نکالنا چاہتی تھی۔ وہ اسے چھڑانے کے لیے جیل چلی گئی، جس کی وجہ سے اس کا باپ بہت پریشان ہو گیا۔

حریر اپنے پائلٹ دوست کے ساتھ ڈین ہیگ پہنچا تو مرید قاضی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ حریر نے اسے بتایا کہ مرید نے اپنی منگنی میں شرکت کے لیے بلایا ہے۔ یہ سن کر اس کا پائلٹ دوست سیخ پا ہو گیا تھا۔ وہ مرید کی منگنی میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا، لیکن مرید نے اسے زبردستی روک لیا۔

مرید نے زندگی میں بہت برے دن دیکھے تھے۔ امید اس کی خالہ زاد تھی جس سے اس کی منگنی ہونے والی تھی۔ اس کے خالو خوش حال تھے۔ رانیہ کی شکل میں مرید کی لاٹری نکلی تھی۔

افسوں نے پہلی بار جب رافع افراہیم کو دیکھا تھا تو وہ ایک معمولی مزدور تھا۔ اس کی تباہ حالی کے باوجود افسوں اسے دل دے بیٹھی، وہ اس کی منت سماجت کرکے اسے اپنی کمپنی میں لے آئی۔ رافع افراہیم ماضی کے کسی واقعہ کی وجہ سے شدید پشیمانی اور اذیت کا شکار تھا۔ اس نے افسوں کی محبت قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کی ہر ممکن مزاحمت اور انکار کے باوجود افسوں نے ہار نہیں مانی تھی اور بالآخر رافع نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اس کا کمزور دل یہ برداشت نہ کرسکا اور اس کی سانس بند ہونے لگی۔ افسوں یہ منظر نہیں دیکھ سکی اور خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی تھی، لیکن وہ بچ گیا تھا۔

فوزان، مشہدی کو پتا چلا کہ وہ جیل سے رافع کو نکال لائی ہے تو انہوں نے افسوں کو بتایا کہ وہ رافع کے متعلق ساری معلومات کراچکے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کا دھتکارا ہوا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کی بیوی پر بری نیت رکھنے کا گناہ کیا تھا۔

عنایہ اور دیا کی موت پر سب رشتے دار شکوک کا شکار ہورہے تھے۔ کچھ رشتہ داروں نے بیہ پر شک کیا کہ اس نے پیسے کی خاطر سوتیلی بہن اور بھانجی کو زہر دے دیا۔

دیا کا پورا نام اناویہ تھا۔ رویا جب اناویہ کے لیے رشتہ لے کر گئی تو وہاں اناویہ کے چچا کے بیٹے افراہیم نے اسے دیکھ کر پسند کیا اور رشتہ بھجوادیا۔ اناویہ کو شدید غصہ آیا۔ اور حسد محسوس ہوا کیوں کہ افراہیم نے اس کے لیے تو صاف انکار کردیا تھا۔ اناویہ کا رویہ سوتیلی ماں کے ساتھ دن بہ دن خراب ہوتا جارہا تھا۔ فرزانہ ماں بننے والی تھی۔ یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

اناویہ نے افراہیم کے گھر سے آئی، اس کی منگنی کی مٹھائی بھی چھت پر پھینک دی تھی۔ اس نے ناجو کے ذریعے اماں دیوانی سے جادو کرایا۔ کاشف اس پر بری طرح ریجھ گیا۔

انادیہ کا بھائی ناصر ایک لڑکی کو بھگا لایا۔ اس وجہ سے گھر پر پولیس آگئی اور ابا کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ابا اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکے اور دل کے دورے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

افراہیم کا نکاح ہونے لگا تو انادیہ نے اماں دیوانی سے اس نکاح کو رکوانے کے لیے تعویذ لیے۔ لیکن انادیہ کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ نکاح ہو گیا۔ چچی نے انادیہ کے بارے میں کہا کہ یہ جس کی زندگی میں جائے گی' اسے جہنم بنا دے گی۔ یہ سن کر انادیہ کے تن بدن آگ لگ گئی۔

افراہیم نے ناصر کو جیل سے چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اسے اس بات کا بھی غصہ تھا۔ انادیہ نے ایک بار پھر اماں دیوانی سے رجوع کیا۔

فرزانہ ایک بچی کو جنم دے کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔ روبا امید سے تھی۔ وہ سیڑھیوں سے پھسل گئی تو اسے انادیہ کی غلطی کہہ کر افراہیم نے انادیہ کو بہت مارا۔ اس تذلیل نے انادیہ کے دل میں شعلے بھر دیے۔ وہ اماں دیوانی کے پاس پہنچ گئی۔

روبا کی زندگی اچانک طوفانوں کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے گھر میں سائے نظر آتے۔ وہ خوف زدہ رہتی۔ اماں کی حالت بھی خراب رہنے لگی۔

روبا کی شادی کاشف سے ہو گئی تھی۔ انابیہ اس کی سوتیلی بہن اس کے مزاج کی سختی کا شکار تھی۔ افراہیم کی امی نے افراہیم کے بیٹے فاتح سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ انادیہ کو اس پر بھی شدید غصہ تھا۔ وہ دن بہ دن غلط عملیات میں ڈوبتی جارہی تھی۔

ایک دن ناجو اچانک دیا کے گھر آگئی۔ اس نے بتایا کہ عملیات کی وجہ سے وہ برباد ہو چکی ہے۔ اس نے اس کا ذمہ دار دیا کو ٹھہرایا۔ اس کی ساس نے یہ باتیں سن لیں۔ انہوں نے کاشف اور دیا کو گھر چھوڑنے کے لیے کہا۔

اماں کے دل میں روبا کے لیے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ روبا سے خوف زدہ تھیں۔ افراہیم نے بھی تنگ آکر ایک دن کہہ دیا کہ..... "تم اماں کے سامنے نہ آیا کرو۔"

چھٹی قسط

"فلائٹ لے کر آیا ہے' تھکا ہوا ہے' ہلکی حرارت بھی تھی۔ پھر شادی کے ہزار کام ہیں۔ رافع کا تو تمہیں پتا ہے۔ آج کل سب سے خفا' موڈ ہو تو کام کرے گا۔" وہ رافع کے نام پہ فوراً" ٹھٹک گئی تھی۔ فاتح کو حرارت تھی یا وہ آج تھکا ہوا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ اسے بس رافع کے بارے میں سننا تھا۔ رافع کہاں تھا؟ کدھر تھا؟ اتنے دن سے کہاں غائب تھا؟

وہ بے قرار سی ہو گئی تھی۔ بے تاب سی ہو گئی تھی۔

"دادی! رافع کہاں ہے؟" اس نے اپنی بے چینی چھپانے کی حتی المقدور کوشش کی تھی۔

"وہیں' اپنے ٹھکانے پہ۔" دادی نے ناگواری سے کہا۔ رافع کا ٹھکانا انہیں کچھ پسند نہیں تھا۔ عنایہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پچھلے صحن کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

دادی کا یہ گھر بڑا پیارا تھا۔ گرمیوں میں بہت ٹھنڈا۔ چاروں طرف جھکے برآمدے تھے۔ نیچی چھتوں والے۔ یہ گھر جھکے برآمدوں کی وجہ سے خاصی انفرادیت رکھتا تھا۔ عنایہ کو یہاں آنا ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی تو کبھی کبھار پاپا کے ساتھ یہاں آتی تھی اور اسے یاد پڑتا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتی واپسی پہ اس کی ماں کا سارا عتاب اس پہ گرا کرتا تھا۔ پاپا کے سامنے بس نہیں چلتا تھا مگر بعد میں وہ عنایہ کی درگت بنا دیتی تھی۔

وہ تیزی سے پچھلے صحن کی طرف جاتی کی یاد میں
آنسو بھی بہا رہی تھی۔ جانے کیسے ڈھیر سارے آنسو
اس کی آنکھوں میں بے ساختہ اتر آئے تھے۔ پھر جب
وہ سٹور نما رافع کے اس ٹھکانے پہ پہنچی تو اسے وہ
سامنے ہی وائلن کے ساتھ کھیلتا دکھائی دیا تھا۔

اس گھر میں یا اس کے اپنوں میں صرف دو لوگ اس
کی دھنوں اور آواز کے دیوانے تھے۔ ایک فاتح اور ایک
عنایہ۔ فاتح کو وہ خود اب کچھ سنانا پسند نہیں کرتا تھا اور
عنایہ سے وہ ناراض تھا۔ ملتا بھی نہیں تھا اور اس کے
گھر جاتا بھی نہیں تھا اور اس کے وہم و گمان میں نہیں
تھا کہ عنایہ اسے منانے آجائے گی۔ عنایہ اپنی ماں کی
پابندیاں توڑ کر اس سے ملنے آجائے گی۔

وہ ایک ہیجان آمیز کیفیت میں "ہاں' میں اکیلا
ہوں" گا رہا تھا۔ ایک جنونی سی کیفیت میں اور اس کی
آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے تھے اور آنکھوں کی
پتلیوں کے پیچھے عنایہ کسی سبک خرام ندی کی طرح
بہتی تھی۔ عنایہ اس کے اندر رہتی تھی۔
اور عنایہ اسے بہت یاد آتی تھی۔ اس کی یاد رافع کو
ایسے ہی رلا دیتی تھی اور کون جانے؟ رافع کے تنہائی
میں بہتے یہ آنسو بہت قیمتی تھے۔ بہت ان مول تھے اور
ہر روز بے مول ہو جاتے تھے، لیکن آج پھر سے انمول
ہو گئے تھے۔ عنایہ اس وقت دروازے کے چوکھٹے میں
چوکڑی جما کر بیٹھی تھی۔ گھٹنے پہ ٹھوڑی ٹکائے'
آنکھیں موندے۔ وہ بھی رافع کی آواز کے ساتھ سفر
میں تھی۔ تنہائی کے سفر میں اور اس کی آنکھوں سے
بھی آنسو بہتے تھے اور بے قیمت ہو جاتے تھے۔
معاً" دھن کا اختتام ہو گیا تھا۔ وائلن کے سر گہری
نیند تلے دبنے لگے اور نیم اندھیرے کمرے میں
خاموشی بہنے لگی۔
اچانک رافع کی نگاہ دروازے کے چوکھٹے میں جمی
اور ٹھہر گئی۔ اس کا دل اس شدت سے دھڑکنے لگا جیسے
سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آجائے گا۔ کیا وہ عنایہ تھی؟
ایک وہم؟ ایک خیال؟ ایک عکس؟ ایک خواب؟۔ وہ
آنکھیں ملتا اپنی جگہ سے اٹھا اور عنایہ کے قریب دو زانو
بیٹھ گیا۔ عنایہ بھی کسی طلسم کے اثر سے باہر نکلی۔
جیسے گہری نیند سے جاگی ہو۔
رافع اس کے بہت قریب تھا۔ وہ ہاتھ لگاتی اور اسے
چھو لیتی اور اس نے بے خیالی میں ایسا ہی کیا۔ کئی مرتبہ
رافع کا گھٹنا چھوا تھا۔ رافع اس ادا پہ نہال ہو گیا تھا۔
اس نے عنایہ کا مکھن سا ہاتھ پکڑ لیا۔
"مجھے یقین نہیں آتا۔ تم یہاں کیسے؟" رافع نے
کئی مرتبہ بے یقینی بھرے لہجے میں عنایہ سے کہا تھا۔
جواباً" وہ بھی اس طلسماتی فسوں سے نکل کر ناراضی
بھرے لہجے میں بولی تھی۔
"مجھے بھی یقین نہیں آتا۔ تم مجھ سے ناراض
ہو سکتے ہو اور میرے میسج کا رپلائی بھی نہیں
کر سکتے۔"
"میسج کا رپلائی کیوں کرتا؟ تم جانتی ہو نا میرے
مزاج کو۔ فاتح کی دی ہوئی چیز تمہارے پاس تھی۔
کیوں؟ اور اسی موبائل سے تم مجھے میسج کرتیں تو
میں کیوں رپلائی کرتا۔" رافع کے لہجے میں بلا کی
شدت پسندی تھی۔ عنایہ اسے بس دیکھتی رہ گئی۔
"تو پھر تم سے رابطہ کیسے کرتی؟ میرے پاس موبائل
نہیں تھا۔ نہ ماما لے کر دیتیں۔" عنایہ نے بے بسی
بھرے لہجے میں جتلایا تھا۔
"میں جاب ڈھونڈ رہا ہوں اور کوشش بھی بہت
کرتا ہوں، لیکن لگتا ہے پاکستان میں میرے لیے کام
ہی نہیں ہے۔" رافع پہ مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔
عنایہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ پھر گہرا سانس بھر کے
بولی۔
"تم پہلے اپنی تعلیم تو پوری کرلو۔"
"ڈگری لے بھی لی تو جاب کہاں سے ملے گی۔" وہ
شدید مایوس تھا۔
"تم نے بس یہی سوچ کر ترقی کے بارے میں سوچنا
چھوڑ دیا ہے۔" عنایہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔
"کچھ نہ کچھ تو کروں گا۔ تب ہی تو دیا ماہی تمہارا ہاتھ

میرے ہاتھ میں دیں گی۔" کچھ دیر بعد وہ اس کثیف فضا کو توڑتا گھرے لہجے میں بولا تو عنایہ کو ڈھیر ساری شرم آگئی تھی۔

"ماما کو متاثر کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرو۔ ورنہ منہ تکتے رہ جاؤ گے۔" عنایہ بھی ہنس پڑی تھی اور اسے شرارت بھرے لہجے میں چھیڑنے لگی۔

"اور میں کسی اور کی ڈولی میں بیٹھ جاؤں گی۔"

"واٹ؟" رافع ایسے بدکا تھا جیسے کرنٹ لگا ہو۔

"آگ نہیں لگادوں گا۔"

"کس کو؟" عنایہ کو بڑا مزہ آیا تھا۔ وہ اسے جلا کٹا دیکھ کر تنگ کر رہی تھی۔

"جس کی ڈولی میں بیٹھنے کی جرات کروگی۔" رافع کا انداز سخت تھا۔ بڑا ہی دوٹوک قسم کا۔ بلکہ عجیب جنونی سا۔ عنایہ کو تھوڑا سا خوف بھی آیا تھا۔

"اچھا' ڈراؤ تو نہیں۔" وہ سہم کر بولی تھی۔ رافع بھی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر عجیب سے انداز میں بولا۔

"تم ابھی چھوٹی ہو عنایہ! تمہیں میرے جذبوں کی سمجھ ہی نہیں ابھی۔ اس گہرائی میں اتروگی تو سمجھوگی۔ میں تمہارے سائے کے ساتھ کسی کا سایہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔" رافع جس انداز میں بولا تھا۔ وہ کوئی ایسا انداز نہیں تھا جسے عنایہ سمجھ ہی نہ سکتی۔ وہ اس کے لہجے میں اتری اس ہیجانی کیفیت کے اثر کو سمجھتے ہوئے تھرا گئی تھی۔ اس کا لہجہ اور لفظ ایسے نہیں تھے جنہیں نظر انداز کر دیا جاتا۔

عنایہ کے سارے لفظ رافع کی شدید محبت کے سامنے ہیچ ہوگئے۔ اس کی پلکیں جھک گئی تھیں اور وہ مزید کچھ بول بھی نہیں سکی تھی۔

پھر عزہ آگئی اور سارا فسوں ---- ٹوٹ گیا تھا۔

"بیہ کو بھی لے آتیں۔ اسے بھی کبھی خود کو ہوا لگالینی چاہیے۔ کہیں وہ اپنی متوقع سسرال میں آنے سے شرم تو نہیں محسوس کرتی؟"

"وہ ماما سے ڈرتی ہے۔" عنایہ نے اپنی سمجھ کے مطابق بتایا تھا۔ ظاہری بات تھی۔ دیا کو تو کبھی بھی بیہ کا یہاں آنا پسند نہ تھا۔ نہ اس نے کبھی بیہ کو دادی کے گھر آنے دیا تھا۔

"اور تم؟" عزہ نے فوراً بات پکڑی تھی۔ عنایہ نے دانتوں تلے زبان دبالی تھی۔

"میں بھی۔" اس نے سر جھکا کر اقرار کرلیا تھا۔

"اگر مامی کو پتا چل گیا تم یہاں آئی ہو تو پھر....؟" عزہ نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔ عنایہ کچھ دیر کے لیے گم صم ہوگئی تھی۔

"پھر مار پڑے گی۔" اس نے ایک کرب ناک دل میں اترتی لہر کو دباتے ہوئے اقرار کرلیا تھا۔

"کیا ابھی تک؟" عزہ چیخ پڑی۔ اسے تو گویا یقین نہیں آیا تھا۔ دیا مامی ---- اتنی بڑی بیٹی کو بھی مارتی تھیں؟

"ہاں۔" وہ درد کا ہر احساس دباتے ہوئے بے نیازی

سے بولی تھی۔ جیسے یہ سب اس کے لیے معمول کے مطابق ہو۔ جس میں کچھ نیا پن نہ ہو اور نہ اسے کوئی تکلیف یا اہانت محسوس ہوتی ہو۔ وہ ہر چیز کی عادی ہو چکی تھی یا اتنی بے حس کہ اسے ذرا سی تکلیف کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔

پھر اس دن عنایہ نے دادی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھایا تھا۔ دال' چاول اور املی پودینے کی چٹنی' میٹھے میں چاندی کے ورق سے سجی ٹھنڈی ٹھار کھیر۔

اس دن پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا تھا اس نے ایک گھر کے ماحول میں کھانا کھایا ہے۔ فاتح اور عزہ کی نوک جھونک کے درمیان۔ دادی' دادا کی محبت کے ساتھ۔ ہاں' رافع ناراض ہی رہا تھا۔ کم ہی بول رہا تھا اور فاتح سے تو خاص طور پر بے زار تھا۔

جب دادا نے فاتح سے کہا۔ "عنایہ کو گھر چھوڑ آؤ۔" تو فاتح نے بے ساختہ رافع کی طرف دیکھا تھا۔

شاید وہ کہنا چاہ رہا تھا۔ "رافع ڈراپ کر آتا ہے۔ وہ اس کی گاڑی لے جائے۔" لیکن رافع نے اس کا ارادہ بھانپ کر فورا" ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

"نہیں اس کی گاڑی استعمال کروں... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رافع کے چہرے پہ لکھا قطعا" "نولفٹ" کا بورڈ سب ہی کو دکھائی دے گیا تھا۔ تب ہی فاتح نے مزید کچھ نہیں کہا تھا اور فورا" گاڑی کی چابی لینے اندر چلا گیا۔

واپسی پر عنایہ بڑی کنفیوزڈ تھی اور بہت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ فاتح اس کی پریشانی بھانپ گیا تھا۔ تب ہی اس نے عنایہ کو تسلی دی تھی۔

"ڈونٹ وری عنایہ! تم مامی سے مت ڈرو۔ میں ساتھ ہوں نا۔" اس کا ڈھارس پہنچاتا لہجہ۔ وہ اس کی پریشانی کو چہرے سے کھوج چکا تھا۔ عنایہ حیران رہ گئی تھی۔ فاتح نے بن کہے اس کا ڈر اور سراسیمگی کو بھانپ لیا تھا۔ یہ کتنی حیران کن بات تھی۔ کوئی آپ کی اندرونی کیفیات کو سمجھ لے۔ آپ کی سوچ کو پڑھ لے اور آپ کے خوف کو شیئر کرے۔ آپ کی ڈھال بنے۔ عنایہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ اس کا گھر آگیا تھا۔

عنایہ سہمی سہمی سی گاڑی سے اتری۔ حالانکہ وہ فاتح پہ اپنا ڈر ظاہر کرنا نہیں چاہ رہی تھی' لیکن اسے اپنے یہ تاثرات چھپانے بھی نہیں آتے تھے۔

فاتح کی اسی وقت ضروری کال آگئی تھی۔ وہ سائیڈ پہ ہو کر فون سننے لگا تھا۔ عنایہ سر جھکا کر اندر چلی گئی۔ گیٹ سے آگے پتھریلی روش تھی۔ اس سے آگے لاؤنج کا دروازہ اور سامنے دیوان تھا جس پہ دیا فروکش تھی اور اس کی ایک نگاہ گھڑی پہ جاتی اور دوسری گیٹ کی طرف اٹھتی۔

جیسے ہی عنایہ نے لاؤنج کے اندر قدم رکھا۔ دیا کے جسم میں کرنٹ دوڑ پڑا۔ وہ کسی چیتے کی طرح غراتی ہوئی عنایہ کی طرف لپکی تھی اور پھر اس نے اپنی جوتی اتار لی۔ اس وقت وہ غصے اور اشتعال میں بالکل پاگل ہو رہی تھی۔

"بے حیا! اتنے گھنٹے سے ماں سولی پہ ٹنگی ہے اور تجھے اپنی آوارگیوں سے فرصت نہیں..." دیا نے جوتی اتار کر ابھی لہرائی ہی تھی اور قریب تھا کہ دیا کی چپل عنایہ کا سر گھما ڈالتی' اسی وقت فاتح نے لاؤنج کے اندر قدم رکھا تھا۔ دوسرے ہی پل صورت حال کو سمجھتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ دیا کی طرف بڑھا تھا اور پھر اس نے دیا کے ہاتھ سے جوتی پکڑ کر نیچے پھینکی۔

"سوری مامی!" اس نے فورا" ہی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کیا۔ "غلطی ہماری ہے۔ آپ کو اطلاع نہیں کر سکے۔ عنایہ کی وین خراب ہو گئی تھی۔ سوئے اتفاق میری نظر پڑ گئی اور میں نے دیکھ لیا۔ یوں عنایہ نے آج دوپہر اپنی دادی کے ساتھ گزاری ہے۔ آپ کوئی غلط خیال نہ کریں۔" فاتح کی وضاحت پہ دیا جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ بلکہ فاتح کو دیکھ کر ہی اس کا رویہ بدل گیا تھا۔ اس کا غصہ بیٹھ گیا اور برہم تاثرات فورا" نارمل ہوئے تھے اور دوسرے ہی لمحے اس کے منہ میں شیرینی گھل گئی تھی۔

"اچھا تو... عنایہ تمہارے ساتھ تھی۔ بتا دیتے نا۔ میں فکر تو نہ کرتی۔" دیا نے خوش اخلاقی کے سارے

ریکارڈ توڑتے ہوئے جواب دیا تھا۔ فاتح نے اپنی غلطی تسلیم کرلی اور دیا لمحوں میں ہشاش بشاش۔ فاتح کو زبردستی بٹھایا اور پھر اپنی خوش اخلاقی کے سارے جوہر آج ہی دکھاڈالے۔ عنایہ حیران تھی تو بیہ مہا حیران۔

دیا نے فاتح کے لیے پر تکلف چائے بنانے کا آرڈر دیا تھا۔ وہ کچن میں مصروف تھی اور عنایہ اپنے کمرے بند۔

جب بیہ چائے بنا کر ڈرائنگ روم میں لائی تو دیا کا واضح طور پر اسے دیکھ کر رنگ بدلا تھا۔ کیا ضرورت تھی اسے فاتح کے سامنے آنے کی؟

اور پھر فاتح کا چونک کر اپنی جگہ سے احتراماً" اٹھنا۔ اس کا مہذب انداز' باوقار اور نفیس سا نشست و برخاست کا اسٹائل۔ دیا تو اسے نظروں میں تول تول کر عنایہ کے لیے اوکے کر چکی تھی۔ اور رہی بیہ؟ تو اس کی خیر تھی۔ کہیں بھی شادی ہو جاتی اور پھر رافع بھی تھا۔ خوب صورت' شاندار' خاندانی۔ چلو' جاب بھی کہیں مل ہی جاتی۔ آگے بیہ کے نصیب ہوتے۔ دیا نے بالا ہی بالا سب کچھ طے کر لیا تھا۔ اب اسے اپنی پسند کے مطابق ماحول بنانا تھا۔ ایک بساط بچھائی تھی اور من پسند مہرے ترتیب دینے تھے۔ یہ کام مشکل ضرور تھا' مگر ناممکن ہرگز نہیں تھا۔

لیکن ایک چیز غلط ہو چکی تھی۔ بیہ کا فاتح سے ٹکراؤ اور فاتح کی آنکھوں میں بیہ کے لیے مخصوص نرمی' پسندیدگی اور چمک۔ جو ایک خاص رشتے کی بدولت نگاہوں کا رخ بدل دیتی ہے۔ دلوں میں نرمی بھرتی ہے اور انہیں ایک دوسرے کے قریب کرتی ہے۔

فاتح کا بیہ کو چائے پہ روک لینا اور ان کی عام سی گفتگو' جو دیا کو بہت خاص محسوس ہو رہی تھی اور اسے چبھ رہی تھی۔ پھر جاتے جاتے فاتح کا بصد اصرار دیا سے کہنا' بار بار کہنا۔

"عزہ کی شادی میں آپ بیہ کو بھی ساتھ لائیے گا ماں۔" وہ دیکھ بیہ کو رہا تھا اور مخاطب دیا سے تھا۔ بظاہر کچھ خاص نہیں تھا' مگر دیا کو بہت ہی خاص لگ رہا تھا۔ یوں جیسے یہ سرسری اور اتفاقیہ ملاقات کسی نئے جذبے کی شروعات میں ایک پل کا کام کرے گی۔ دیا کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔

"تو پھر آپ بیہ کو لائیں گی نا ماں!" اس نے ایک مرتبہ پھر دیا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا جو سوچوں کے بھنور میں الجھ رہی تھی۔ ایک دم چونک گئی۔

"آں۔ ہاں' کوشش کروں گی۔" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"کوشش نہیں کرنی۔ لے کر آنا ہے۔" فاتح نے اپنی ایک ایک بات پہ زور دیا تھا۔ دیا کو سرہلانا ہی پڑا۔ وہ فاتح کو خفا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اور پھر فاتح بیہ کو خاص طور پر آنے کی تاکید کر کے چلا گیا تھا۔ بیہ کو ایک خوش گوار سا احساس دے کر۔

ایک امید کا دیا تھما کر۔ وہ اس دیے میں روزانہ اپنی یک طرفہ محبت کا تیل ڈالتی تھی اور اس دیے کو اپنے خوابوں کی تیلی سے روشن کرتی تھی۔

یہ ایک بے نام سی آس تھی جو اگر ہاتھ میں تھی تو آگے کا سفر ایسا مشکل نہیں تھا۔ راہوں میں کٹھنائیاں تو تھیں اور انتظار کی اذیت کا احساس بھی ساتھ ساتھ تھا' لیکن امیدیں کب تھکاتی ہیں۔ امیدیں تو طاقت ہوتی ہیں۔ روشنی ہوتی ہیں جو تاریکی میں اجالا کرتی ہیں۔

اور امیدیں مسافر بھی ہوتی ہیں۔ تمام عمر سفر میں رہتی ہیں اور سانسوں کے تسلسل کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور سانسوں کا تسلسل تو صرف موت توڑ سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

جھکے بر آمدوں والا دادا کا منفرد سا گھر بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ قمقموں کے بڑے بڑے ہار مکان کے ماتھے' پشت اور دیواروں پہ جلوہ گر تھے۔

دادا کے گھر میں شادی کی رونق تھی۔ دور دراز سے مہمان شادی میں شرکت کرنے آچکے تھے۔ دادا نے عزہ کی شادی میں سارے ہی دور نزدیک کے رشتے داروں کو بلایا تھا اور ریاں تک کسی کو خبر ہی نہیں تھی کہ

دادا' عزہ کی شادی کے ساتھ ساتھ کسی اور کی شادی کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔

اور سب سے حیران کن واقعہ یہ تھا۔ دادا کی اکلوتی بہو بے شمار سالوں کے بعد ساری خود ساختہ ناراضیاں بھلا کر اپنی بیٹی اور بہن کے ساتھ شادی میں شرکت کرنے پہنچ چکی تھی اور آج کے دن دادی نے بھی گزشتہ ساری کدورتیں بھلا کر بہو کو گلے سے لگایا اور پیار بھی کیا اور یہ سب کرنا کوئی آسان نہیں تھا۔ بڑے ظرف اور بڑے دل کی بات تھی۔ حالانکہ دیا نے جو کچھ ان کی اکلوتی بیٹی کے ساتھ کیا تھا۔ وہ مر کر بھی اسے منہ نہ لگاتیں' لیکن بعض فیصلے وقت اور حالات کرواتے ہیں۔ سو ان کے تابع ہونا پڑتا ہے۔

دیا نے بڑے سالوں بعد سسرال میں قدم رکھا تھا اور اس گھر میں ہونے والی تبدیلیوں نے اسے چونکا دیا تھا۔ سب سے اہم چیز جو اس گھر میں موجود تھی' وہ اس کی ساس کا لاڈلا نواسا تھا' فاتح افراہیم' دیا کو آج پتا چلا تھا۔ فاتح اپنے پورے خاندان میں کس قدر مشہور و مقبول تھا۔ لڑکیوں کی مائیں پکڑ پکڑ اس کا تعارف اپنی بیٹیوں سے کرواتی تھیں۔ اس کی گلیمر سے بھری زندگی' شان دار مستقبل اور بہترین نوکری۔ اس کی شخصیت میں چار چار چاند لگے ہوئے تھے۔

اور پہلی مرتبہ دیا کو اپنی عام سی سوتیلی بہن پہ رشک آیا تھا۔ اگر فاتح اس کے نصیب میں تھا تو یہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی تھی' لیکن ضروری تو نہیں تھا۔ فاتح بیہ کا ہی مقدر بنتا۔ تقدیر بدل بھی سکتی تھی۔

اور ادھر عزہ کی شادی میں خوشی سے اڑتی پھرتی عنایہ اور بیہ کو دیا کے اندر چھڑنے والی جنگ کی خبر ہی نہیں تھی۔

وہ دونوں اپنی اپنی جگہ بہت خوش تھیں۔ وہ اپنی زندگی کا پہلا فنکشن اٹینڈ کر رہی تھیں اور ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

دادی نے بیہ کو ابٹن گھولنے کے لیے کہا تو وہ دوسری منزل کے برآمدے میں بیٹھ کر بڑے سے کٹورے میں ابٹن گھولنے لگی۔ اس نے سبز انگرکھا پہنا ہوا تھا اور بالوں کی فرنچ ناٹ کر رکھی تھی جو بار بار کندھے پہ جھولتی اور سامنے آگرتی۔ دونوں ہاتھ اس کے ابٹن گھولنے میں مصروف تھے۔ اب وہ بال پیچھے کیسے ہٹاتی؟ ہاتھ تو گندے تھے۔ ابٹن میں لتھڑے ہوئے۔

معا" تیسری منزل سے فاتح اپنی جھونک میں اترتا دکھائی دیا تھا۔ وہ شاید لائٹنگ والوں کا کام ختم کروا رہا تھا۔ باقی لوگوں کو نیچے بھیج کر وہ ستون کے پیچھے' فرش پر بیٹھی جھنجلائی سی بیہ کے قریب آگیا۔ پھر اس نے گلا کھنکھار کر بیہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ بیہ کی نگاہیں اس کی سیاہ چپل سے ہوتی ہوئی اوپر کو اٹھیں اور ٹھٹک گئیں۔

فاتح اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ بیہ کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑک اٹھا۔ اس کے چہرے پہ ہلکا سا گلال پھیلا تھا اور اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ اس کے قریب دو زانو بیٹھنے والا فاتح ابھی کیا کرنے والا ہے۔ وہ اپنے دھیان میں مگن ابٹن گھولتی' بار بار کندھے سے آگے جھولتی چٹیا پہ جھنجلا رہی تھی۔ فاتح نے اس کی جھنجلاہٹ کو بغور نوٹ کیا اور اس کے کندھے سے جھولتی بل کھاتی چٹیا کو پیچھے لگے کیچر میں اٹکا دیا۔ یہ سب بہت اچانک ہوا تھا۔ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔

"اب بتاؤ کیسا؟" وہ مسکراتے ہوئے بہت نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ حیران بیٹھی بیہ کا منہ حیرت سے کھلا اور پھر بند ہوا۔ وہ اتنی حیران تھی کہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

"اچھا۔" اس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا اور دل اس شدت سے دھڑکا جیسے سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔

"کیا اچھا...؟" فاتح نے اسے چھیڑا۔ "کیا میں اچھا؟" وہ بہت دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔ بیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جی ہاں۔" وہ مسکراہٹ چھپا کر سر جھکا گئی تھی۔

"میں اس تعریف کو کیا سمجھوں؟" بڑی معصومیت سے پوچھا جا رہا تھا۔ بیہ کو بڑی شرم سی آئی۔ وہ فاتح کی قربت سے گھبرا رہی تھی۔ اوپر سے اس کی گہری نگاہیں

اور بھرپور توجہ۔ وہ بیہ کو بڑی اپنائیت سے دیکھ رہا تھا۔
"پتا نہیں۔" بیہ گھبرائی۔ ایسی شوخ نگاہیں' ایسی توجہ کے انداز' ایسی قربت... اس کا دل بڑا ہی بے قابو ہو رہا تھا۔
"سنو بیہ!" فاتح نے کٹورے میں لگے ابٹن کو اپنی ایک انگلی سے مس کیا تھا۔ بیہ اس طرز تخاطب پہ چونک گئی تھی۔ اس کے چہرے پہ گھبراہٹ بکھر گئی تھی اور دل سرپٹ بھاگ رہا تھا۔
"یہاں آنے کا شکریہ۔" وہ انگلی پہ لگے ابٹن کو دیکھتا دھیمی آواز میں بولا تھا۔ پھر اس نے ابٹن لگی انگلی سے بیہ کا ماتھا چھوا... اب وہ اس کے ماتھے پہ کچھ لکھ رہا تھا... کیا؟ بیہ چونک اٹھی۔ گھبرانے لگی۔ وہ ذرا سا جھک کر اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پھر اس کی سہمی سہمی ہرنی جیسی آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔
"میں نے یہاں کیا لکھا؟" وہ اس کی پیشانی کی طرف اشارہ کرکے پوچھ رہا تھا۔ بیہ نے نفی میں دھیمے سے سر ہلایا۔
"پتا نہیں۔"
"کیا جاننا چاہو گی؟" فاتح نے ملائمت سے کہا۔ بیہ نے ہاں کی صورت میں ایک مرتبہ پھر سر ہلایا تھا۔ فاتح اس ادا پہ مسکرا دیا۔
"تم زبان کو بالکل تکلیف نہیں دیتیں۔ سر بے چارے کی ایکسر سائز کرواتی ہو۔ اینی وے۔ تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دیوار سے لگے ایک شیشے کو اتار کر بیہ کے سامنے لے آیا۔
"دیکھو یہاں۔" وہ اس رخ پہ بیٹھا تھا کہ بیہ اور اس کا چہرہ ایک شیشے میں واضح طور پہ نظر آ رہا تھا۔ بیہ نے اپنی پلکوں کی چلمن کو اٹھایا اور شیشے میں نظر آتے اپنے اور فاتح کے عکس کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔
اس نے بے ساختہ ابٹن سے لتھڑی انگلیوں سے اپنے ماتھے کو چھوا اور اس کی آنکھوں میں حیرت گھلتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی پیشانی کو دیکھتی اور چھوتی تھی... اس کی صبیح پیشانی پہ بہت واضح لفظوں میں "فاتح" لکھا تھا۔ ایسا خوب صورت "اظہار" جس نے بیہ کو اگلے کئی گھنٹوں تک ابٹن کی نہ ختم ہونے والی مہک سے گوندھے رکھا تھا۔ یہاں تک کہ پھر وہ سب ہو گیا... جو کسی کے گمان میں ہی نہیں تھا۔ جو کسی کے خواب و خیال میں ہی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

آخر عزہ کی شادی میں ہوا کیا تھا؟
اس دن بڑا سہانا موسم تھا اور شام بھی بڑی دلفریب تھی۔
اس شام عزہ اور ڈاکٹر ارمیز کا نکاح تھا۔
گھر میں نکاح سے پہلے والی ہلچل تھی اور سب مصروف تھے۔ فاتح اور رافع شامیانوں کا انتظام چیک کر رہے تھے۔
لڑکیاں بالیاں اپنی تیاریوں میں لگی تھیں۔ اور خواتین اپنی پسندیدہ چغلیوں میں مصروف تھیں۔
دادی نے عنایہ سے کہا۔ اوپر سے پھولوں والے تھال اٹھا لائے۔ وہ جیسے ہی گلابوں کے تھال اٹھاتی نیچے آئی۔ سامنے سے آتے فاتح سے ٹکرا گئی تھی۔ نتیجتاً" سارے پھول کچھ فاتح کے اوپر اور کچھ سیڑھیوں پہ بکھر گئے تھے۔
"الٰہی خیر' میرے سہرے کے سارے پھول تنکا تنکا بکھر گئے۔" وہ انتہائی شوخی سے کہتا خفا خفا عنایہ کی ساری خفگی کو بھول کر سیڑھیوں سے تیزی سے پھول سمیٹتا بول رہا تھا۔ اور عنایہ آنکھوں میں خفگی سموئے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ سارا قصور فاتح کا معلوم ہوتا تھا۔ جو اندھا دھند سیڑھیوں پر بھاگ رہا تھا۔
"تو آپ بے نتھے بیل کی طرح جھومتے نہ اوپر آتے۔ میرے سارے پھول آپ نے گرا دیے۔" وہ منہ پھلا کر واضح طور پر خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔
"لیکن یہ پھول تو میرے تھے۔" فاتح نے جان بوجھ کر اسے چڑایا۔
"آپ کے کہاں سے آئے۔ جائیے اپنا راستہ ناپیے۔" وہ خفگی سے منہ موڑ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

گلابی گوٹا لگے لہنگے میں ملبوس ماتھے پر بندیا سجائے، کھلے بالوں کے ساتھ وہ عزہ سے زیادہ دلہن لگ رہی تھی۔ فاتح کی رگ شرارت پھڑک اٹھی تھی۔

"ویسے عنایہ! آج تمہاری مایوں تو نہیں؟" کہیں عزہ کی جگہ تمہیں رخصت کرنے کا ارادہ تو نہیں بن گیا؟"

"جی نہیں..... ہمیں ابھی شادی نہیں کرانی۔" عنایہ نے ناک چڑھائی۔ فاتح کو اس کی یہ سادی سی ادا بہت اچھی لگی تھی۔

"یہ نہ ہو۔ نانا نواسی کے ساتھ پوتی سے بھی جان چھڑا لیں۔" وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔

"کیا ہے فاتح بھائی۔ ہمیں تنگ نہ کریں۔" عنایہ نے خفگی سے کہا تھا۔ فاتح اس کے دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

"آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے کیا؟" فاتح نے نہایت حیرت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور آنکھیں خوب پھیلا رکھی تھیں۔

عنایہ جھنجلا گئی۔ وہ جلدی سے نیچے جانا چاہتی تھی۔ مبادا وہ "جن" دوبارہ اسے یہاں دیکھ لیتا۔

"جی نہیں..... ہم اکیلے ہیں۔" اس نے ایک ادا سے کہا اور تھال اٹھا کر جانے لگی۔

"تو پھر آج آپ خود کا اتنا ادب و احترام کسی خوشی میں کر رہی ہیں؟" وہ سیڑھیوں کی ریلنگ تھامے اسے پیچھے سے آواز دیتا چھیڑ رہا تھا۔ عنایہ خفگی سے کندھا مارتی آگے بڑھ گئی تھی۔ دراصل وہ کچھ پریشان دکھائی دیتی تھی۔ اور اس کی پریشانی کا دائرہ۔ بس رافع تک محدود تھا۔ جو رات سے اکھڑا اکھڑا دکھائی دیتا تھا۔ آج صبح بھی وہ اپنے کپڑے استری کرتے ہوئے پاس سے گزرتی عنایہ کو روک کر الجھ پڑا۔

"یہ فاتح تم سے کس خوشی میں بے تکلف ہوتا ہے؟ اسے کہو، خود کو بیہ تک محدود رکھے۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" رافع کی شہد بھری آنکھوں میں اتنا غصہ اور نفرت تھی، جس نے عنایہ کو ٹھٹکا دیا تھا۔

"تو کیا ہوا رافع! فاتح بھائی بہت اچھے ہیں۔ میرا اتنا خیال کرتے ہیں۔ اگر میں ان سے بات کر لیتی ہوں۔ تو کیا گناہ ہے اس میں۔" عنایہ نے اپنی معصومیت میں رافع کے غصے کو اور ہوا دے ڈالی تھی۔ وہ کونچی کو ہاتھ پر پھیرتی پریشان دکھائی دی۔ دادی نے اسے کہا تھا سونے، چاندی کے زیور صاف کرنے والی کونچی اوپر سے لادے۔ وہ کونچی لے کر نیچے جا رہی تھی جب رافع نے اسے روک لیا تھا۔

"وہ اپنے خیال کا دائرہ بیہ تک رکھے۔ تمہارا احساس کرنے کے لیے میں موجود ہوں۔ خبردار، جو وہ تمہارے آس پاس بھی دکھائی دیا۔ جان نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا اس کی۔" رافع کے دھیمے لہجے میں ایسی پھنکار تھی جس نے عنایہ کو دہلا دیا تھا۔ اور وہ ایسی ڈری سہمی کہ جہاں بھی فاتح کو دیکھتی آگے پیچھے ہو جاتی تھی۔ اب جو یہ اتفاقیہ مڈھ بھیڑ ہوئی تھی اس کی رپورٹ نجانے کیسے رافع کو مل گئی۔ جوابا" وہ شامیانے کی نگرانی چھوڑ تا کچھ دیر کے لیے عنایہ کو اور بدحواس کرنے پہنچ گیا تھا۔

"فاتح جو ڈرامے کر رہا ہے۔ میں صاف سمجھ رہا ہوں۔ اور دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں؟" ابھی مجھے نانا ایک ضروری کام کے لیے بھیج رہے ہیں۔ عزہ کا جہیز شوروم سے اٹھوا کر اس کی سسرال پہنچانا اور سیٹ کروانا ہے۔ کچھ دیر میں وہ لوگ نکاح کرنے بھی پہنچ رہے ہیں۔ سامان آج ہی سیٹ کروانا ہے۔ ورنہ میں اسے مزہ چکھا دیتا۔"

وہ آگ بگولہ سا عنایہ کے حواسوں کو اڑاتا پیروں کی دھمک چھوڑتا چلا گیا تھا۔

اور اس کے پیچھے وہ کچھ ہو گیا تھا جس کا تصور عنایہ اور رافع دونوں نے نہیں کیا تھا اور نہ ہی فاتح اور بیہ کے گمان میں تھا۔ یوں لگا، بس لمحوں کے کھیل میں زندگی کے عنوان بدل گئے تھے۔ منزلوں کے نشان بدل گئے تھے۔

یہ ایسی بدنصیبی اور سیاہ بختی تھی جو عنایہ اور بیہ دونوں کے نصیبوں میں اچانک ——— بھری اور پھیل گئی تھی۔ بدقسمتی اور نحوست کا یہ حلقہ ان دونوں کو ہی نہیں فاتح اور رافع کو بھی ان دیکھے عذابوں میں

مبتلا کر گیا تھا۔

ان کی قسمت کا گردوں اچانک سیاہ پڑ گیا تھا اور بدنصیبی اس سے بارش کے قطروں کی طرح ٹپکتی تھی۔

اس شام عزہ کے سسرالیوں کی آمد سے پہلے دادا اپنی لاٹھی ٹیکتے مکان کے اس حصے میں پہنچے تھے۔ جہاں پہ دیا براجمان تھی اور کسی ملکہ کی طرح گردن تان کر بیٹھی تھی۔ دیا سسر کو دیکھ کر چونک گئی اور پھر دادا بہو کے قریب بیٹھ گئے اور انہوں نے بڑے سبھاؤ کے ساتھ اپنی اور اپنی بیوی کی مشترکہ صلاح اور خواہش کو دیا کے سامنے رکھا تھا۔

"میں اور تمہاری ساس چاہتے ہیں کہ آج عزہ کے نکاح کی تقریب میں فاتح اور انابیہ کا بھی نکاح کر دیا جائے۔ ماشاء اللہ فاتح اب شادی کی عمر میں ہے اور یہ بھی پڑھ چکی۔ بچپن کے اس طے شدہ رشتے کو اب باقاعدہ ایک شرعی بندھن میں تبدیل کرنا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں آج نکاح ہو جائے اور عزہ کے ساتھ ہی رخصتی بھی کروالیں۔"

دادا نے بڑے قرینے سے اپنی خواہش بہو تک پہنچادی تھی۔ وہ تو کب سے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ اگر ابا خود نہ بات کرتے تو وہ از خود اپنی تمنا کا اظہار کر دیتی۔

اس نے تحمل کے ساتھ ابا کی پوری بات سنی پھر وہ اٹھی اور ابا کے قریب فرش پہ دوزانو بیٹھ گئی۔ اس نے ابا کے پیروں پر اپنے ہاتھ رکھ لیے۔

"ابا! ساری عمر میں نے اپنی مرضی کی۔ اپنی تمناؤں کے سامنے سر جھکایا۔ اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگی۔ جانے کس کس کا دل دکھایا۔ ابا مجھے آپ کو ایک بات بتانی تھی۔ آپ کے بیٹے کی آخری خواہش۔ جو میں اپنی خودی اور روبا سے جیلسی کے اثر میں آکر نہ بتاتی اور شاید اپنی اکڑ میں کاشف کی اس آخری خواہش کو اندر ہی اندر دبا دیتی لیکن ابا! میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔ مجھے کچوکے لگاتا ہے۔"

وہ رونے لگی تھی۔ آنسو لگاتار اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے اور ابا ہکا بکا رہ گئے۔ وہ کاشف کے نام پر تڑپ اٹھے تھے اور تڑپ تو اس کی ساس بھی اٹھی تھیں جب اندر آتے ہوئے انہوں نے دیا کے منہ سے کاشف کی آخری خواہش سنی تھی۔

ان کے لاڈلے بیٹے کی آخری تمنا؟ آخری التجا؟ ماں کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ ان کے اندر بے قراری بڑھنے لگی۔

"کاشف نے مرنے سے پہلے مجھے کہا۔ "اللہ مجھے ایک موقع دے تو میں اپنے ماں باپ کے قدموں میں سر رکھ کر صرف اتنی سی التجا کروں کہ میری عنایہ کو در در بھٹکنے سے بچالیں۔ اسے اپنی بیٹی بنالیں۔ کاشف کو مجھ پہ بھروسا نہیں تھا۔ اگر وقت انہیں مہلت دیتا تو وہ آپ کے قدموں پہ سر رکھ کر بھی اپنی بات منوالیتے۔"

دیا ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی تھی اور اس کے ساتھ اماں بھی رونے لگیں اور پھر ابا بھی۔ وہ تینوں بے آواز رو رہے تھے۔ اماں کے سینے کے اندر اپنے جوان بیٹے کی جدائی نے ایک مرتبہ پھر آگ بھر دی تھی۔ اماں کے اندر آگ لگ گئی تھی۔ انہوں نے بے ساختہ ——— روتے ہوئے بہو سے کہا۔

"میرے کاشف نے کیا کہا تھا؟ مجھے بتا؟ میں اپنے بچے کی آخری خواہش پوری کروں گی۔ چاہے میری جان چلی جائے۔ ماں کاشف کی خواہش پہ واری جائے۔" وہ جذباتی طور پر ٹوٹ چکی تھیں۔ دراصل دیا کا وار ہی ایسا تھا۔ وہ شکستہ سے بوڑھے والدین اپنے اکلوتے بیٹے کے غم میں ٹوٹنے لگے۔

"وہ اپنی تمنا دل میں لے کر کیوں چلا گیا؟ اس نے اپنے ماں باپ کو کیوں نہ بتایا؟ ہائے' میرا بچہ...... میری جان...." اماں کی آہیں دل چیر دینے والی تھیں۔ ابا کا سر جھکا تھا اور مونڈھے ڈھلک گئے تھے۔ ان کی سفید داڑھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔

"کاشف کو وہم تھا۔ میں ان کی بیٹی کے لیے کوئی اچھا فیصلہ نہ کرسکوں گی اور ان کی خواہش تھی..... عنایہ اپنی دادی کے زیر سایہ رہے۔ عنایہ فاتح کی دلہن بنے۔" دیا نے دل کڑا کرکے روتے ہوئے بالآخر کہہ دیا تھا اور ابا کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اسی طرح اماں بھی فق رنگت کے ساتھ دیا کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں جانتی ہوں۔ یہ آپ کے لیے مشکل ہوگا۔ اسی لیے کہہ نہ سکی' مگر میرے دل پہ بڑا بوجھ تھا۔" دیا سسکنے لگی اور اماں' ابا وحشت بھری نگاہوں سے دیا کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

"اور بیہ.....؟" بہت دیر بعد اماں نے لب کشائی کی تھی۔ ان کے ماتھے پہ بار بار پسینہ آرہا تھا۔ وہ گھبرائی گھبرائی سی کبھی شوہر کو دیکھتی تھیں اور کبھی بہو کو۔

دیا نے گہرا طویل سانس اندر کو کھینچا اور اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔ وہ اب مطمئن تھی کیونکہ ساس اور سسر کے حواس اڑانے کے بعد اسے پورا اطمینان تھا کہ وہ کاشف کی آخری خواہش کو رد نہیں کریں گے۔

"اسی لیے میں نے پہلے بیہ سے بات کی اور یقین مانیں' بیہ نے میرا مان رکھ لیا۔ دراصل کاشف کی خواہش کا اسے بھی بہت احترام ہے۔ آخر عمر بھر کاشف کی بنائی چھت تلے رہی اور ان ہی کا دیا آج تک کھایا۔" اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی اور ان دونوں کے چہروں کو دیکھنے لگی۔ ان کے چہروں پہ واضح طور پہ تبدیلی آئی تھی۔ دیا نے خود کو شاباشی دی۔

"بس مجھے فاتح کی طرف سے پریشانی ہے' لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ وہ آپ کی بات نہیں ٹالے گا۔" اس نے آخری پتا بھی آزمایا اور اپنے اندر گہرا سکون اترتا محسوس کیا تھا۔

"اور اگر فاتح مان جائے تو میں ابھی نکاح کے ساتھ رخصتی کے لیے بھی تیار ہوں۔" وہ گیند ان کے کورٹ میں ڈال کر اب چین کی بانسری بجا رہی تھی۔ اماں اور ابا سوچوں میں گم تھے۔ ان کے چہروں پہ پریشانی کی ریت اڑ رہی تھی۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ ہوگیا تھا جو دیا نے چاہا تھا اور جس کی اس نے خواہش کی تھی اور جو دیا چاہتی تھی ایسا نہ ہو۔ یہ کہاں لکھا تھا۔ کس کتاب میں لکھا تھا؟

☆ ☆ ☆

زندگی میں کبھی کبھار انسان دوراہے پہ آکھڑا ہوتا ہے جہاں سے نہ آگے بڑھا جاسکتا ہے اور نہ پیچھے ہٹا جاسکتا ہے اور فاتح اسی مقام پہ کھڑا تھا۔ متذبذب' پریشان اور دو راہوں کا مسافر۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ نانا کی فرمائش اور نانی کے آنسوؤں نے فاتح جیسے نرم خو رقیق القلب انسان کو بے بس کردیا تھا۔ ان کی خواہش ایسی نہیں تھی جس پہ فورا" سر جھکا کر وہ فرماں برداری کا ثبوت پیش کردیتا۔ وہ بھی اس صورت میں جب وہ ایک معصوم لڑکی کی آنکھوں میں اپنی پسند کی شمع روشن کر آیا تھا۔ اسے ڈھکے چھپے اظہار کی ڈور تھما آیا تھا۔

"اگر ماموں کی ایسی کوئی خواہش تھی تو یہ بھی میرے بابا اور دادی کا طے کیا رشتہ ہے۔ ان کی روح کو تکلیف ہوگی۔" مگر نانا کے پاس دلائل بہت تھے اور نانی کے پاس آنسوؤں کا ہتھیار تھا۔

"مجھے بس اتنی سمجھ بوجھ ہے کہ اگر تم نے عنایہ کے لیے انکار کردیا تو وہ بڑی ضدی عورت ہے۔ ہماری عنایہ کو انتقاما" کسی کنویں میں دھکیل دے گی۔ وہ عنایہ کے لیے کبھی بھی اچھا فیصلہ نہیں کرے گی۔ وہ میرے بیٹے کی واحد نشانی ہے فاتح! مجھے اس عورت سے آج بھی اتنا ہی خوف آتا ہے' جتنا پہلے دن آیا تھا۔"

نانی کی منتیں' ان کی بے بسی اور التجائیں۔ فاتح ہارنے لگا تھا۔ گو کہ اسے بیہ سے دھواں دھار محبت نہیں تھی' لیکن ایک انسیت ضرور تھی۔ اس وقت

سے جب عزہ نے بابا کی جیپ میں سفر کے دوران اس کے کانوں میں گھس کر اسے بیہ کے ساتھ جڑے رشتے کے متعلق بتایا تھا۔ تب وہ حیران ہوا تھا اور یہ حیرانی پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گئی تھی۔ اس نے بڑوں کے طے کیے اس رشتے کو دل سے قبول کر لیا تھا۔ وہ اپنے رویے، مزاج اور جذبوں میں اعتدال پسند تھا۔ جو ہے جس طرح ہے۔ اسے قابل قبول ہوتا۔

جیسے اس وقت وہ نانا اور نانی کے مجبور کرنے پہ بے بس ہو گیا تھا اور اسی شام عزہ کے ساتھ ہی عنایہ اور فاتح کا نکاح ہو گیا تھا۔

اور فاتح کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ دیا کو بیک وقت کتنے محاذوں پہ لڑنا پڑا تھا۔

یہ نکاح اتنی آسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہوا تھا۔ پہلے تو دیا نے اپنی بہن کے حواسوں پہ بم پھوڑا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے ویسا ہی بیہ کے سامنے ڈراما کیا تھا جیسا ڈراما اپنی ساس اور سسر کے سامنے کیا۔

"بیہ! تمہارے لیے تو روشن راہیں ہیں۔ پوری زندگی پڑی ہے مگر میری عنایہ مر جائے گی۔ وہ فاتح کو چاہتی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کی چیٹ پڑھی۔ فاتح بھی یقینی طور پر اس سے محبت کرتا ہے تب ہی تو عنایہ اس مقام تک آ پہنچی ہے۔ پھر کاشف کی بھی یہی خواہش تھی۔" دیا نے روتے ہوئے بیہ کے سر پہ دھماکا کیا تھا اور بیہ کے وجود سے روح تک کو کھینچ لیا تھا۔

"دیا! خدا کا واسطہ۔۔۔ ایسے مت کرو۔ اس طرح ظلم مت ڈھاؤ۔ عنایہ کب فاتح سے؟ وہ تو رافع کو چاہتی ہے۔" بیہ کی پھٹی پھٹی آواز اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

"عنایہ کسے چاہتی ہے؟ یہ میرا درد سر ہے۔ بس تم فاتح سے دست بردار ہو جاؤ۔" وہ آن کی آن میں فولاد بن گئی تھی۔ بیہ نے وحشت بھری نگاہوں سے اپنی بہن کو دیکھا۔ جو اس وقت کوئی بلا لگ رہی تھی۔

وہ دیا کے قدموں میں گر گئی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ دیا کے سامنے جوڑ دیے تھے۔

"دیا! یوں مت کرو۔ میرا دل یوں برباد نہ کرو دیا فاتح کو مجھ سے مت چھینو۔" اس نے دیا کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا تھا۔ اس نے مانگا بھی تو کس سے؟ وہ عورت جس کا اپنا کشکول عمر بھر خالی رہا۔ وہ کسی اور کو کیا دیتی؟

"فاتح کو بھول جاؤ بیہ! بچپن کا یہ نام نہاد تعلق ختم ہی سمجھو اور صرف اتنا یاد رکھو کہ یہ خواہش میری نہیں۔ کاشف کی ہے اور کاشف وہ انسان ہے۔ جس کے ٹکڑوں پہ عمر بھر تم پلیں۔ اسی نے تمہیں چھت دی، تعلیم دی، عزت اور پیار دیا۔ اب تمہارا یہ فرض بنتا ہے کہ کاشف کے احسانات کے بدلے میں اپنا حق چھوڑ دو اور عنایہ کے دادا سے از خود کہو۔" اس نے نہایت نخوت اور تکبر سے کہا تھا۔ بیہ نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ پھر اس نے اپنے اندر سے اٹھتے جوار بھاٹے کو روکتے ہوئے کہا۔

"تم نے کاشف بھائی کے احسانات کی اتنی کم قیمت لگائی ہے دیا! اس شخص کے احسانات تو میں شاید اپنی جان دے کر بھی نہ اتار سکوں۔" کچھ دیر بعد وہ بڑے ضبط اور ۔۔۔ تحمل کے ساتھ خود کو تل تل جوڑتی دیا سے مخاطب تھی۔ "وہ اتنا پیارا انسان جو تم جیسی خود غرض عورت کے ساتھ نباہ کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اپنی زندگی بھی ہار گیا! اگر یہ کاشف بھائی کی خواہش ہے تو بیہ کی دس زندگیاں بھی ان کی خواہش پہ قربان۔۔۔ کہو، فاتح سے جا کر بات کروں یا اس کے نانا کے سامنے اپنا انکار پیش کروں؟"

وہ ایک ایک لفظ کا بھالا دیا کے اندر اتارتی ضبط سے کھڑی تھی۔

دیا اس کے صبر اور ضبط کے ساتھ اعتماد کی طاقت کو دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر کمزور پڑی تھی، لیکن اس نے اسے آرام سے عنایہ کے دادا کی عدالت میں پیش کر دیا۔

ابا نہیں چاہتے تھے کہ کاشف کی خواہش کو پورا کرنے کے چکر میں وہ فاتح کے ساتھ زیادتی کریں یا بیہ

کے خواب نوچ ڈالیں۔ انہوں نے دیا پہ پورا اعتبار نہیں کیا تھا انہوں نے بیہ کو بلا کر اس کی خواہش جانچی۔ بیہ نے نہایت آرام کے ساتھ دیا سے کی گئی باتیں دہرا دی تھیں۔ اس نے اقرار کیا۔ وہ فاتح کے لیے گہرے جذبات نہیں رکھتی اور یہ کہ وہ کاشف بھائی کی آخری خواہش کا احترام کریں۔ وہ اس بچی کی اعلا ظرفی کے سامنے جھک گئے تھے۔ وہ شرمندہ ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنا کانپتا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا تھا۔

جب فاتح مرد ہو کر پیچھے ہٹ گیا تھا تو وہ عورت ہو کر کیا کر سکتی تھی؟

اور جب دیا نے گلابی لہنگے میں ملبوس اپنے آپ میں گم عنایہ کا بازو دبوچ کر اسے ایک کونے والے کمرے میں دھکیل کر صرف اتنا کہا کہ۔

''آج' ابھی اور اسی وقت تمہارا نکاح ہے۔ اگر زبان ہلائی تو کاٹ کے کتوں کو ڈال دوں گی۔''

تب عنایہ کا گلابی رنگ سفید پڑ گیا تھا اور اس کا پورا وجود کانپنے لگا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹ نیل میں ڈھل گئے تھے اور اس نے صرف سوالیہ نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا تو دیا نے اس کا بازو دبوچ کر جھنجھوڑا اور اس کی ہنسلی کی ہڈی پہ اپنا پنجہ گاڑ دیا تھا۔

''ایک لفظ بھی نہیں۔ ورنہ بہت ماروں گی عنایہ! میں نے یہ سب کچھ اتنی آسانی سے نہیں کیا۔'' وہ زہر خند سی دھاڑی تھی۔

''ماما! پلیز' یہ مت... کریں۔'' عنایہ نے نظروں سے التجا کی تھی اور اس کے کندھے پر ایک گھونسا پڑا۔ حالانکہ اس نے زبان بھی نہیں ہلائی تھی۔ اس نے بس سر جھکا دیا تھا جانے ابھی اسے کتنا اور کہاں کہاں صبر کرنا تھا۔

بیہ نے دیکھا۔ ہاں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ عنایہ نکاح نامے پہ دستخط کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ اپنی موت کے پروانے پہ دستخط کر رہی تھی۔

عنایہ صابر تھی۔ بیہ کو یقین آ گیا تھا۔ اس نے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس نے خود کو قربان کر دیا تھا اور وہ ایسے مجسمے میں ڈھلی لگ رہی تھی جو سانس تو لیتا ہو' مگر اس کے اندر زندگی ختم ہو چکی ہو۔ اس کے سامنے بھی آگ تھی۔ پیچھے بھی آگ تھی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو سکی۔ عنایہ چاروں طرف سے آگ میں گھری ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

چالیں چلنے والے کو اپنی چالوں پہ کمال حاصل تھا۔ اس نے مہرے آگے پیچھے کیے اور بازی کو ہاتھ میں کر لیا۔

دیا نے بالکل ایسا ہی کیا تھا۔ عنایہ کا نکاح ہوتے ہی رخصتی بھی ساتھ کر دی۔ یوں عزہ سے پہلے عنایہ شادی شدہ ہو گئی تھی۔ اس سے اگلے دن عزہ کی رخصتی تھی اور پھر ولیمہ۔ عزہ کے ولیمہ کا فنکشن نمٹا کر ابا نے فاتح اور عنایہ کا ولیمہ بھی کر دیا تھا۔

دیا اپنی بیٹی کے ولیمہ پہ بے پناہ خوش تھی اور اس کی خوشی دیوانوں کو بھی دکھائی دیتی تھی۔ ابا اور اماں بھی خوش تھے۔ عزہ اپنی خوشیوں میں گم تھی اور بیہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فاتح بالکل نارمل تھا۔ وہ اپنے مزاج کے عین مطابق کسی بھی تبدیلی کو فوری طور پہ قبول کر لیتا تھا۔

اماں اور ابا اس لیے خوش تھے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی آخری خواہش کو پورا کر دیا تھا اور اس کی دنیا سے ناخوش گئی روح کو سکون پہنچا دیا تھا اور سب سے بڑی خوشی تو یہ تھی فاتح نے عنایہ کو قبول کر لیا تھا۔ پچھلے چار دنوں سے وہ اتنا ہی مطمئن اور خوش دکھائی دیتا تھا۔ نارمل انداز میں گفتگو کرتا اور روز مرہ کے معاملات کو نمٹاتا۔

اور اس پورے فنکشن میں ایک عنایہ تھی جو اپنے آپ میں نہیں تھی۔ گم صم حیران پریشان' اپنے دھیان میں اور ایک رافع تھا جو کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

رافع کہاں تھا؟ سب سے پہلے نانی کو خیال آیا اور پھر عزہ اور نانا کو جب کہ عنایہ تو پچھلے چار دن سے پریشان تھی۔

اور جب فاتح اس کے قریب آیا اور اسے بے چین دیکھ کر نرمی سے وجہ دریافت کی تو اس نے بڑی غائب دماغی سے پوچھا تھا۔

"رافع کہاں ہے؟"

اس کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ فاتح لمحہ بھر کے لیے حیران رہ گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے تاثرات پہ قابو پالیا۔

"اسے بخار ہے۔"

فاتح کے جواب نے عنایہ کے دل کو پنکھے لگا دیے تھے اور اس نے اپنے پاس سے اٹھتے فاتح کا بے ساختہ ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"وہ کہاں ہے؟" اس کے لہجے میں بے قراری پنہاں تھی۔ فاتح نے لمحہ بھر کے لیے خاموشی اختیار کی اور پھر آہستگی سے بولا۔

"اپنے اسٹوڈیو میں۔" فاتح یہ کہہ کر اسٹیج سے اتر گیا تھا اور اپنے دوستوں کی طرف چلا گیا۔ اور عنایہ پورے فنکشن کے دوران گم صم ہی رہی۔

دیا اسے ڈھیر سارا پیار کرکے بیہ کو ساتھ لے کر چلی گئی تھی اور جاتے سے بیہ نے عنایہ کا ملائم ہاتھ پکڑ کر صرف اتنا کہا۔

"عنایہ! اپنے حواسوں میں آجاؤ۔ خود کو سنبھالو۔ فاتح، رافع نہیں ہے، لیکن رافع سے بہت اچھا ہے۔ اپنی نئی زندگی کو قبول کرلو۔"

بیہ اسے بدحواسی کے ساتھ گم صم نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ عنایہ کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے خبر تھی کہ دیا نے صرف اس کے ساتھ ہی کھیل نہیں کھیلا تھا بلکہ عنایہ کے دل پہ بھی شب خون مارا تھا۔ اسے دلوں سے کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔

گھر آتے ہی اس نے دادی سے پوچھا۔

"دادی! رافع کو دیکھ آؤں؟" اس کے لہجے میں واضح بے قراری پنہاں تھی۔ دادی نے ایک نظر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں بیٹا۔" انہوں نے ملائمت سے منع کیا تھا۔

وہ حیران ہوئی۔ دادی نے کیوں منع کیا تھا؟

"کیوں دادی؟" اس کی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی جسے اس نے بڑے ضبط کے ساتھ اندر دھکیلا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ دوائی کھا کر سو رہا ہے۔" انہوں نے نرمی سے کہا اور نگاہ چرالی تھی۔ "تم اپنے کمرے میں چلو۔ فاتح ابھی آتا ہی ہوگا۔" انہوں نے اسے زبردستی اس کے کمرے میں بھجوا دیا تھا اور وہ کھوئی کھوئی سی اندر چلی آئی۔

یہ اس کا کمرہ تھا اور اسے اتنا ہی پرایا نظر آتا۔ یہاں پہ فاتح تھا۔ اس کی خوشبو تھی اور عنایہ کو فاتح کی خوشبو سے وحشت ہوتی تھی۔

وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی مسہری پہ ڈھے گئی۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ تنہائی تھی۔ ایک مہیب سناٹا تھا۔ جو اس کے اندر بھی ڈیرا جمائے بیٹھا تھا۔ اس مہیب خاموشی میں باہر سے دادی کی دبی دبی آواز آتی تھی۔

"دوائی نہیں کھاتا، بولتا بھی نہیں، کچھ کھاتا بھی نہیں، بات بھی نہیں کرتا۔ جانے اسے کیا ہوگیا ہے۔ کہتا ہے مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ کوئی میرے سامنے نہ آئے۔" دادی شاید دادا کو بتا رہی تھیں۔ پھر اسے فاتح کی آواز سنائی دی تھی۔ یعنی ان دونوں کے ساتھ فاتح بھی موجود تھا۔

"سمجھ میں نہیں آرہا۔ رافع ایسے کیوں کررہا ہے، اپنے ساتھ دشمنی؟ دوائی اٹھا کر پھینک دی ہے۔ مجھے دیکھ کر ایک ہنگامہ کھڑا کردیا تھا۔ نانی! آپ اسے سمجھائیں۔" وہ بھائی کے لیے فکر مند تھا اور اس کی پریشانی لہجے سے مترشح تھی۔

"میں دیکھتی ہوں۔ اب تم اندر جاؤ۔ عنایہ اکیلی ہوگی۔" دادی نے شاید فاتح سے کہا تھا۔ وہ سر ہلا کر کچھ سوچتا ہوا اندر آیا تو عنایہ مسہری پہ نیم غنودہ سی پڑی تھی۔ آڑی ترچھی، بے آرام سی۔

فاتح اسے ایک نظر دیکھ کر اپنے کپڑے نکال کر باہر نکل گیا تھا۔ پھر کافی دیر بعد لوٹا تو بے حد تر و تازہ تھا۔

عنایہ ابھی تک روایتی لباس میں تھی۔ سجی سنوری سی۔ فاتح گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتا مسہری پہ آگیا۔ پھر اس نے بکھری بکھری عنایہ پہ نگاہ ڈالی۔ اس کا فالسئی

رنگ کا شرارہ پوری مسہری پہ بکھرا تھا۔ فاتح نے اس کے شرارے اور دوپٹے کو سمیٹ کر اپنے لیے جگہ بنائی تھی پھر اس نے عنایہ کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ اسے عنایہ کی پیشانی بہت برفیلی محسوس ہوئی تھی۔ ایک دم ٹھنڈی۔

"عنایہ!" فاتح نے اسے نرمی سے پکارا تھا۔ عنایہ ایک دم ٹھٹک گئی اور پھر کرنٹ کھا کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔ تب ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کا دوپٹہ فاتح کے گھٹنے تلے دبا ہے۔ اس کی اٹھنے والی کوشش ناکام ہو گئی تھی۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے عنایہ!" فاتح نے ایک مرتبہ پھر پوچھا تو عنایہ نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا تھا۔

"نہیں۔"

"ہوں۔ بی پی لو لگ رہا ہے۔ رکو' میں چیک کرتا ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر دراز کھولی اور بی پی آپریٹس نکال کر اس کی کلائی میں لگایا تھا۔ عنایہ کوئی مزاحمت بھی نہیں کر سکی تھی۔ فاتح نے کچھ دیر بعد بی پی آپریٹس اتار کر عنایہ سے کہا۔

"بی پی تو نارمل ہے۔ عنایہ! لگتا ہے تم تھک گئی ہو۔ چائے پیو اور آرام کرو۔ میں چائے لے کر آتا ہوں' لیکن اس سے پہلے اپنا ڈریس چینج کرو۔" فاتح کچھ سوچتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ پھر جب واپس آیا تو عنایہ عام سے سوٹ میں مسہری پہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ وہ چائے کے ساتھ اسنیکس بھی لایا تھا۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا نا؟ اپنے ولیمہ کا۔ ایسا یادگار کھانا نہیں کھایا۔" وہ عام سے انداز میں چائے اسے تھماتا ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تھا۔ عنایہ اسے بس دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"مجھے بھوک نہیں تھی۔ میرا دل نہیں چاہا۔" اس نے سر جھکا کر وجہ بتائی۔

"دل کا بھوک سے کیا تعلق ہے؟" فاتح نے گفتگو آگے بڑھائی تھی۔ وہ جان بوجھ کر عنایہ کو بولنے پہ اکسا رہا تھا۔ پچھلے چار دن سے وہ ایسی ہی گم صم' حیران پریشان تھی۔ جیسے یہ سب کچھ غیر متوقع ہو اور غیر متوقع تو فاتح کے لیے بھی تھا' لیکن وہ مرد تھا۔ اس نے جلدی حالات کو قبول کر لیا تھا لیکن عنایہ کے لیے یقیناً" یہ سب بہت مشکل تھا اور ابھی فاتح اسے وقت دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کو دل و دماغ کی رضامندی کے ساتھ قبول کر لے۔

"بس ایسے ہی۔ ابھی موڈ نہیں ہو رہا تھا۔" عنایہ نے تھکن زدہ لہجے میں کہا تھا۔

"چلو' موڈ بنا لیتے ہیں۔ آؤ یہ اسنیکس کھاؤ۔" اس نے زبردستی عنایہ کو اسنیکس کھلائے تھے۔ پھر اس نے خود بخود چائے پی لی تھی اور تکیے پہ سر رکھ کے لیٹ گئی۔

"اب یقیناً" تم سونا چاہو گی؟" فاتح نے اس کے بکھرے بالوں پہ ہاتھ پھیر کر پوچھا تھا۔ عنایہ کا دل حلق میں آگیا۔ فاتح اس کے قریب تھا۔ بہت قریب.... اس کی سانسوں کی حدت عنایہ کو اپنی پیشانی پہ محسوس ہوتی تھی۔

"جی۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا تھا۔

"بچو جی! کر لو اپنی نیندیں پوری۔ پورا پورا حساب لوں گا۔" اس نے مسکرا کر عنایہ کی ناک دبائی تو اس کا دل بڑی شدت کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔

عنایہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ کیا اس نے عنایہ کے ساتھ شادی کو قبول کر لیا تھا؟ کیا یہ زبردستی نہیں تھی۔ دیا نے اسے بھی بلیک میل کیا تھا۔ دادا دادی کو بلیک میل کیا تھا تو کیا فاتح نے اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا تھا۔ قلبی' روحانی طور پر.....؟

عنایہ کا دل بند ہونے لگا تھا اور فاتح اس کے تاثرات کو دیکھ کر گہرا سانس بھر کے رہ گیا۔

"عنایہ! تم خود پہ بوجھ مت ڈالو۔ پریشان مت ہو۔ یہ شادی جتنی تمہارے لیے غیر متوقع ہے۔ اسی قدر میرے لیے بھی۔ جب تک تم ذہنی طور پر مان نہ لو۔ میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا۔ اب تم سو جاؤ سویٹ ہارٹ۔ اچھی سی نیند لو اور فریش ہو جاؤ۔ میں تمہیں پہلی سی عنایہ کے روپ میں دیکھنا چاہوں گا۔"

وہ اس کا گال نرمی سے سہلاتا اپنی جگہ سے اٹھا اور

باہر نکل گیا تھا اور عنایہ اس کے جاتے ہی تکیے میں منہ چھپا کر گھٹ گھٹ کے رونے لگی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اونچی آواز میں دھاڑیں مار مار کر روئے اور ہر طرف اپنے "لٹنے" کی منادی کرا دے۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی اتنی مشکل نہ ہوتی۔ اتنی بوجھ زدہ' تکلیف دہ نہ ہوتی۔

وہ فاتح کے قابل تھی کیا؟ وہ اتنے عالی شان بندے کے قابل تھی کیا؟

اسے اپنا آپ فاتح کی محبت' توجہ اور خیال کے سامنے بہت ہی ہیچ اور کم تر لگتا اور فاتح واقعی بہت اچھا تھا۔ اتنا اچھا' ہمدرد' خیال رکھنے اور چاہنے والا۔

وہ عنایہ سے پہلے بھی بہت پیار کرتا تھا اور جب سے وہ اس کی زندگی میں آئی تھی تب سے بہت زیادہ ہی توجہ دینے لگا تھا۔ وہ اکثر سوچتی تھی۔ فاتح نے بیہ کو بھلا دیا کیا؟ حالانکہ بیہ کے اندر تو فاتح اب بھی بستا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں اور زندگی میں بستا تھا جب کہ فاتح نے اسے ایسے بھلایا جیسے بیہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق کبھی نہیں تھا۔

وہ اپنی زندگی اور عنایہ میں گم ہو گیا تھا اور عنایہ اس کی بے پناہ توجہ' محبت اور چاہت کے سامنے کوئی مزاحمت نہیں کر سکی تھی۔ وہ فاتح کی محبت کے سامنے "سرنگوں" ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

وقت اچھا ہو یا برا گزر ہی جاتا ہے۔ یوں وقت بیہ کے اوپر سے گزرنے لگا تھا مگر رافع کے اندر جمنے لگا تھا۔ جم جم کر پگھلنے لگا تھا۔

وہ رافع افراہیم تھا۔ ایک ناکام انسان۔ زندگی نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔ وہ ہر میدان میں اپنے بھائی سے پیچھے رہ گیا تھا۔ تعلیم' کھیل' معاشی' سماجی حتیٰ کہ زندگی کی ہر چھوٹی بڑی خوشی میں اپنے بھائی سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ فاتح تھا' ہر میدان میں فتح یاب ہوتا رہا۔ وہ رافع تھا۔ ہر میدان میں ہارتا رہا۔ حتیٰ کہ اپنے دل کی بازی بھی ہار گیا۔ اپنی زندگی کی بازی بھی ہار گیا۔ جب محبت ہار دی تھی تو پیچھے کیا رہ جاتا تھا اور اسے ہرانے والے اس کے بہت اپنے تھے۔ ماں باپ سے بڑھ کر چاہنے والے نانا نانی۔ انہوں نے رافع کو ہرا دیا تھا۔

وہ ایک گھنٹے کے لیے منظر سے غائب ہوا اور انہوں نے اسے مرا ہوا تصور کر کے اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا۔ اس کی اتنی اہمیت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے بھائی کے نکاح میں شامل ہوتا' لیکن وہ اس کا بھائی کہاں تھا؟ وہ تو اس کا رقیب تھا۔ اس کا دشمن تھا۔ جس نے اس کی اولین چاہت پہ شب خون مارا تھا اور رافع افراہیم کو کسی ایسے موقع کی ہی تلاش تھی۔ جب وہ اپنے دشمن کو نیچا دکھاتا۔

اور ان ساری باتوں میں بس ایک چیز واضح تھی۔ عنایہ کی نیلی آنکھوں میں جمی ہوئی تنہائی اور محبت کو کھو دینے کا دکھ۔

وہ جب بھی گھر آتا یا کبھی عنایہ سے سامنا ہوتا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں اتری ویرانی اور آنسوؤں کا ضبط کی شدت سے ٹوٹ جانے والا بند رافع کے اندر قیامت کی ہلچل مچا دیتا تھا۔ اس کا جنونی سا جذباتی ذہن صرف ایک ہی بات کو سوچتا اور تڑپ تڑپ اٹھتا۔

"عنایہ فاتح کے ساتھ خوش نہیں ہے۔" اور یہ سوچ رافع کے اندر تہلکہ مچا دینے کے لیے کافی تھی۔ شہر درد کے کھنڈر اور لٹی ہوئی چاہتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔ ہمیشہ ایک سی لگتی ہیں۔ اس کے اندر ایسی آگ لگی تھی جو بجھتی نہیں تھی۔ کبھی عنایہ کی آنکھوں میں جمے ہوئے آنسو دکھائی دیتے تو اس آگ میں بھانبھڑ لگ جاتے۔ رافع افراہیم کے پاس اتنی سمجھ نہیں تھی۔ نہ اس کے پاس ایسی آنکھ تھی جو عنایہ کے اندر اتر کر جھانک لیتا۔ وہ روتی ضرور تھی' مگر اس کی جدائی میں نہیں۔ اس کی تنہائی پہ' اس کی دیوانگی پہ۔ اگر رافع افراہیم تب صرف اتنی سی بات جان جاتا تو یہ سب نہ ہوتا؟ وہ در در نہ بھٹکتا۔ وہ نگر نگر پیاسا نہ پھرتا۔ وہ پچھتاووں کی اس

آگ میں بھڑ بھڑ نہ جلتا۔

اگر رافع افراہیم تب جان جاتا کہ عنایہ کی آنکھ میں آنسو اس لیے نہیں آتے کہ وہ فاتح کے ساتھ خوش نہیں۔ یہ آنسو تو اظہار تشکر تھے۔ ایک اچھی چیز کے کھو جانے کے بعد اس سے زیادہ اچھی چیز کے ملنے کی خوشی میں۔

وہ ان آنسوؤں کی کہانی جان ہی نہ سکا۔ خود بھی لٹتا' خود بھی برباد ہوا اور اپنے ساتھ کتنے ہی لوگوں کو بھی برباد کر دیا۔ ہاں' تب وہ ایسا ہی جنونی تھا۔ ایسا ہی جذباتی تھا۔ اس نے وہ کام کیا تھا۔ جو رہتی دنیا تک یاد رہتا۔ اس نے ذلت اور رسوائیاں سمیٹی تھیں۔ اس نے کیا خریدا تھا؟ کیا کھویا تھا' کیا پایا تھا۔ جانے کس جہاں کا زہر خریدا تھا۔ جو امرت سمجھ کر پیا اور نیل نیل ہو گیا تھا۔

عنایہ خوش نہیں تھی۔ یہ اس کا وجدان کہتا تھا۔ عنایہ کی جھکی آنکھیں بھیگی رہتی تھیں اور رافع کو دیکھ کر وہ منظر سے ہٹ جاتی تھی۔

ایک گھر میں ہوتے ہوئے یہ کیسے ناممکن تھا کہ آمنا سامنا نہ ہو۔ حالانکہ رافع نے خود کو بے پناہ مصروف کر لیا تھا۔ یکے بعد دیگرے ملنے والی ناکامیوں کے بعد اچانک ہی اس کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا تھا۔ اس کو ٹی وی پہ گانے کا ایک موقع ملا تھا۔ جو اس کے لیے کامیابیوں کا سنگ میل ثابت ہوا تھا۔ اسے یکے بعد دیگرے دو تین کنسرٹ مل گئے تھے اور وہ موسیقی کی دنیا پہ راج کرنے لگا۔

اور رافع کو پکا یقین تھا۔ اس کی کامیابی پر نانا اور نانی خوش نہیں ہوں گے اور ایسا ہی تھا۔ نانی ٹی وی پہ اسے ناچتے اور جھومتے دیکھ کر اٹھ کر باہر نکل جاتی تھیں اور ان کی بڑبڑاہٹ۔ "تمہاری عاقبت خراب کرے گا۔"

عنایہ تاسف سے دادی کو دیکھتی اور زیرلب بڑبڑاتی۔

"اتنا اچھا تو گاتا ہے دادی!" وہ خوب دل لگا کر ٹی وی دیکھتی تھی۔

مشہور ہونے کے ساتھ ہی اس کے پاس وقت کم ہو گیا تھا۔ اب وہ ہفتوں گھر نہ آتا تھا۔ یہ اس کے لیے بہت بہتر تھا۔ اسے فاتح اور عنایہ کو دیکھنا نہ پڑتا اور عنایہ کی جھکی بھیگی آنکھیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

لیکن یادیں کہاں پیچھا چھوڑتی تھیں۔ وہ نئے بننے والے پرستاروں اور شہرت کے بیچ سفر کرتے ہوئے بھی ان یادوں سے پیچھا چھڑانے سے قاصر تھا۔ اسے عنایہ بہت یاد آتی تھی۔ وہ چینی کی گڑیا جو اس کی تھی اور جو اس سے چھن لی گئی تھی۔ اسے دیا پہ غصہ چڑھتا تھا جس نے عمر بھر اسے دھوکے میں رکھا اور ہمیشہ یہی باور کرایا کہ عنایہ اسی کی ہے۔

ہاں' جب فاتح کو کامیاب ہوتا دیکھ لیا تو اس نے اپنی نیت بدل لی تھی۔ اس نے عنایہ کے لیے خود غرضی کی حد تک اچھا سوچنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کے لیے بہتر سے بہترین کے سفر میں' بہت سارے دلوں کے ساتھ کھیلا تھا۔ پھر دیا کیسے سکون سے رہ سکتی تھی؟

اور ایک دن اسی طرح اپنے کامیاب کنسرٹ سے واپسی کے بعد اس کا ایسے میٹر گھوما کہ وہ اپنی نئی نکور چمکتی کار میں اپنے ماموں کے گھر سیدھا چلا گیا تھا۔

اس وقت دیا اکیلی تھی اور رافع کو دیا سے حساب لینے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے دیا کے ساتھ بہت لڑائی کی تھی۔ اب وہ پہلے سا رافع نہیں تھا۔ جو اس کی ساری کڑوی کسیلی سن کر آجاتا۔ اب وہ ایک مشہور ہستی تھا۔ لوگ اس سے ملنے کے لیے وقت لیتے تھے اور بات کرنے سے پہلے بہت دفعہ سوچتے تھے۔

جیسے اب دیا کو بھی سوچنے کا اور ناپ تول کر بات کرنے کا ارادہ کرنا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رافع کی بدلی ہوئی پرسنالٹی تھی اور اس کی چمکتی کار' برانڈڈ کپڑے' اعلا خوشبو' بہترین گھڑی اور اعلا گلاسز۔ وہ پہلے والے رافع سے بہت مختلف تھا اور دیا کو سوچ سمجھ کر اس سے بات کرنا تھی۔ اس کا شکوہ دیا کے اندر ترازو ہو گیا۔

"بس سمجھ لو' وہ تمہاری قسمت میں نہیں تھی۔" دیا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ابا فاتح کے لیے عنایہ کو

مانگ لیں گے۔ میرے تو ذہن میں تمہارا ہی خیال تھا۔" دیا نے کمال چالاکی سے معصوم بن کر ساری ہمدردی رافع کے ساتھ کرلی تھی۔ رافع کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی تھی۔

"تو یہ سب نانا کی چال تھی؟ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اپنی پوتی کے قابل مجھے نہیں سمجھا۔" وہ اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا تھا اور دیا کو مزید اچھا بننے کا موقع مل گیا۔

"انہوں نے تمہارا نام بھی نہیں لیا۔ ورنہ مجھے رافع اور فاتح میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میرے لیے تم دونوں برابر تھے۔ بلکہ فاتح سے زیادہ عزیز تھے۔ تمہیں یاد بھی ہوگا۔ میں تم سے ہمیشہ پیار کرتی تھی۔"

اس نے بازی پھر سے اپنے ہاتھ میں کرلی تھی اور اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اپنے بچاؤ کے لیے اس نے کتنے غلط بندے سے دل ادھیڑ دینے والی گفتگو کی تھی۔

جو بلا کا جذباتی تھا اور جلد بدگمان ہونے والا تھا اور وہ اپنے اندر اٹھتے جوار بھاٹے کو روک نہ پایا اور اپنے نانا نانی کے سر پہ پھٹ پڑا۔ اس کے الفاظ ایک تباہی تھے جو اٹھے تو ہر چیز کو تباہ کرتے چلے گئے تھے۔

"آپ نے ہمیشہ فاتح کو مجھ پہ فوقیت دی۔ اس میں ہیرے جڑے تھے نانا! یا وہ بہت پیارا تھا آپ کو۔" وہ رونے لگا تھا۔

انہیں اندازہ نہیں تھا۔ وہ اتنا بڑا ہو کر بھی رونے لگے گا۔ جیسے بچپن میں فاتح کے پاس اچھی چیز دیکھ کر مچل اٹھتا تھا۔ وہ اب بھی بچوں کی طرح رو رہا تھا اور اب بات چیز کی نہیں تھی۔ بات عنایہ کی تھی اور بات عنایہ کی بھی نہیں تھی۔ بات تو رافع پہ فاتح کو فوقیت دینے کی تھی۔ بات تو ساری ٹھکرائے جانے کی تھی اور ٹھکرائے جانے کی ذلت ہر ذلت پہ بہت بھاری ہوتی ہے۔

"عنایہ تو میری تھی۔ پھر آپ نے اسے فاتح کا نصیب کیسے بنادیا۔" وہ چیخنے لگا تھا۔ وہ اپنے آپے میں نہیں رہا تھا اور نانا نانی شدید پریشان تھے اور رافع کی باتوں پر ان کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

"کیسی بے شرمی کی بات کرتے ہو رافع! یہ بات تمہیں زیب نہیں دیتی۔ عنایہ اب تمہارے بھائی کی عزت ہے۔" نانی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنا سینہ پکڑ لیا تھا۔

"عزت داروں میں ایسی باتیں گناہ سمجھی جاتی ہیں۔"

"تو آپ مجھے عزت دار ہی نہ سمجھیں۔" وہ انتہائی بدتمیزی سے چیخا تھا اور باہر کھڑکی سے چپکی عنایہ کا دل لرز اٹھا۔ یہ رافع کو آج کیا ہوگیا تھا؟ وہ اس طرح کیوں کر رہا تھا؟ اب تو اسے عنایہ کو خوش دیکھ کر سنبھل جانا چاہیے تھا۔ پھر وہ اتنا شور کیوں کر رہا تھا؟ اگر اس کی بکواس فاتح سن لیتا تو کیا ہوتا؟

عنایہ کی جان نکلنے لگی تھی۔ بہرحال اسے رافع سے زیادہ اپنا گھر بچانے کی فکر تھی اور اسے اتنی سوجھ بوجھ تو تھی۔ بلا کا حلیم الطبع فاتح کم از کم ایسی بکواس سن کر اپنی ساری حلیمی کو بھول سکتا تھا۔ وہ غصے یا غیرت میں آکر کچھ بھی کر سکتا تھا۔

لیکن فاتح نے ایسا کچھ بھی نہ کیا۔ وہ گھر میں اٹھتی شورش کو دیکھ کر بھی خود کو اس سارے معاملے سے لاتعلق رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ رافع نے ابھی تک فاتح کی موجودگی میں اپنے سرکش ہوتے جذبات کو ظاہر ہونے نہیں دیا تھا۔

مگر اس دن وہ دونوں بھائی مدمقابل تھے۔ بہت دن بعد ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے تھے اور اس دن فاتح نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کے بھائی کی آنکھوں میں سرکشی کے رنگ نظر آتے تھے اور وہ اپنے لب و لہجے سے رشتوں کا باغی دکھائی دیتا تھا۔

ہاں اب وہ امیر ہوگیا تھا۔ اس کے ٹھاٹ باٹ سے نخوت ٹپکتی تھی اور وہ فاتح کو ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے اس نے کسی کی ناجائز زمین پر قبضہ کرلیا ہو۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے قیمتی رشتوں کو ایک ایک کر کے کھونے کے بعد اب اپنی حیا کو بھی کھوتا جا رہا تھا۔

نانا نانی اس سے دور ہو چکے تھے۔ بہن اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ فاتح کو وہ اب کھو رہا تھا جب کہ

عنایہ کو تو اس نے پہلے ہی کھو دیا تھا۔

رشتوں کے نام پر رافع کے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا تھا' لیکن اس نے اپنی دیا مامی سے ایک چیز ضرور سیکھی تھی۔ آخری پتے تک ہارنا نہیں۔ جیتنے کی لگن میں جنگ لڑتے رہنا ہے۔ پھر چاہے ہاتھ میں کچھ آتا یا نہ آتا۔

"کسی کے مفتوحہ علاقے پر اپنی فتح کا پرچم لہرانے سے کوئی عظیم "فاتح" نہیں بن جاتا۔" وہ اپنے پرانے وائلن کو جھاڑتا انتہائی معنی خیزی سے قریب بیٹھے فاتح کو دیکھ کر بولا تھا۔

فاتح جو چھٹی کے روز اخبار دیکھ رہا تھا۔ واضح طور پر اس کی بات سن کر چونکا تھا۔ رافع کی اس بات کے پیچھے کیا شیطانیت کار فرما تھی۔ وہ قطعی طور پر انجان نہیں رہ سکا۔

"ضروری نہیں کہ کسی کا وجود تسخیر کر لینے سے اس کا دل بھی اپنے اختیار میں کر لیا جائے۔ جذبے اور احساسات بھی۔" وہ وائلن پہ کوئی پرانی دھن بکھیرتا لمحہ بھر کے لیے فاتح کی طرف دیکھنے لگا۔ فاتح کے تاثرات اسے مزہ دے گئے تھے۔ وہ خواہ مخواہ اتنا عرصہ جلتا رہا۔ یوں جلا جلا کر لطف اٹھاتا تو مزہ آتا۔

عنایہ کچن میں تھی اور اس نے دادی سے بہت کوشش کے بعد فاتح کی پسندیدہ کافی بنانا سیکھی تھی اور اب کافی بناتے ہوئے اس کے ہاتھ بار بار لرز رہے تھے۔ اس کا دھیان بھٹک بھٹک کر رافع کی باتوں تک جاتا تو اس کا دل کانپنے لگتا تھا۔ رافع کی بکواس کے جواب میں فاتح خاموش تھا اور اس کی خاموشی عنایہ کو گھبراہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"کیا کوئی غیرت مند شخص اس احساس کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے کہ اس کی بیوی کسی اور کی محبوبہ بھی رہ چکی ہو؟"

اس نے نہایت معصوم بنتے ہوئے وائلن کے سارے نوٹ سروں کو ایک ہی ساتھ چھیڑا تو ایک معنی خیز سی طنزیہ دھن فضا میں بکھر گئی تھی۔

معاً" فاتح نے اخبار میز پہ پھینک دیا تھا اور بڑے ہی ضبط کے ساتھ رافع کا طنزیہ مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک وائلن کے بٹنوں کو پھونکیں مار رہا تھا۔

"پھر ایسے شخص کو "غیرت مند" نہیں کہنا چاہیے۔۔۔ ہے نا فاتح؟" رافع نے آخری پھونک سے وائلن پہ پھیلی نادیدہ دھول کو اڑایا اور جیسے فاتح کی ذات کے پرخچے بھی اڑا دیے۔ معاً" کچن میں موجود عنایہ کے ہاتھ سے کانچ کی پیالی گر کے ٹوٹ گئی تھی۔ ماحول پہ ایک ناگوار شور پھیلا تھا جسے ان دونوں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

"کبھی کبھی رشتے انسان کو بے غیرت بنا دیتے ہیں۔" فاتح ایک زہر خند نگاہ رافع کے بے حس ہوئے وجود پہ ڈالتا کرسی دھکیل کر اٹھا اور عنایہ کو آواز دیتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رافع نے ایک جھلسا دینے والی نگاہ عنایہ پہ ڈالی تھی جو حکم ملتے ہی کسی کنیز کی طرح بھاگتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں گم ہو گئی تھی۔ جب کہ رافع سے یہ منظر دیکھنا محال تھا۔

اس نے پیر کی ٹھوکر سے میز کو ہوا میں اچھالا اور وائلن سمیت اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اسٹوڈیو میں جانے کے بجائے وہ فاتح کے برابر والے اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا اور پھر رات سے دن' دن سے دوپہر' دوپہر سے اگلی شام اتر آئی تھی' مگر وہ کمرے سے باہر نہیں آیا تھا۔

مسلسل کئی گھنٹوں سے ایک ہیجانی کیفیت میں وائلن بجا بجا کر اس نے اپنی انگلیوں کو زخمی کر لیا تھا لیکن نہ اس کے ہاتھ تھک رہے تھے اور نہ ہی اس کا جنون کم ہو رہا تھا۔

فضا میں مختلف دھنوں کا ناپسندیدہ شور اعصاب پہ گراں گزر رہا تھا اور رافع کی آواز اس شور کو مسلسل سوگوار کرتی تھی۔

"گناہوں کے سفر میں' میں اکیلا ہوں۔" فضا میں اس کی آواز کا درد دلوں کو چیر دینے کی طاقت رکھتا تھا۔ نانی سے اس کا درد سہا نہیں جا رہا تھا۔ آخر انہوں نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ پھر ان کے بوڑھے ہاتھ

دروازہ بجا بجا کر تھک گئے تھے، لیکن رافع نے دروازہ کھولنا گوارا نہیں کیا تھا۔

وہ ابھی تک ایک عالم جنون میں وائلن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

"تمہیں جیتوں یا نہ جیتوں یہ بازی جیت ہی جاؤں گا۔" اس کی آواز عنایہ کے کمرے تک بھی آتی تھی اور اس کے دل تک بھی آتی تھی۔ وہ اس حال میں عنایہ کی وجہ سے پہنچا تھا۔ عنایہ کو لگا، رافع کو اس منزل تک لانے والی وہ خود ہے۔ اسے سارا قصور اپنا دکھائی دے رہا تھا۔ نہ اسے رافع سے الفت ہوتی نہ رافع کو اس سے محبت ہوتی۔ نہ رافع اس حال کو پہنچتا۔

عنایہ اپنے کمرے میں موجود اس کے جنون سے سہم رہی تھی۔ اس کے اوپر ایک دہشت سوار تھی۔ حالانکہ فاتح نے رافع کو حوالے سے اس سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ہلکی سی باز پرس بھی نہیں کی تھی۔ جانے وہ اس کے معاملے میں اتنا نرم دل کیوں واقع ہوا تھا یا پھر وہ بہت ہی اعلا ظرف تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ عنایہ بھی خاموش رہتی۔ اسے رافع کی سرکشی کو روکنا تھا۔ اس کے جنون کو لگام دینی تھی۔ اسے نرمی سے سمجھانا تھا۔ کیا پتا وہ اس کی بات کو سمجھ جاتا۔ مان جاتا۔ اور تقدیر کے سامنے سرنگوں ہو جاتا۔ لیکن ایسے محبتوں میں باغی لوگ، بنا ٹھوکر کھائے سمجھتے نہیں۔

اور اسے محبت کے اس باغی کو روکنے کے لیے بہت سی عقل اور فہم کی ضرورت تھی۔ جو اس کے پاس نہیں تھا۔ پھر اس نے رافع کو سمجھانے کا ایسا بار کیوں اٹھایا۔ جسے اٹھانے کی اس میں طاقت نہیں تھی۔ حالانکہ دادی نے عنایہ کو رافع کے کمرے کی طرف بڑھتا دیکھ کر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"اس کے حال پہ چھوڑ دو اسے۔ ہم نہیں سمجھا پائے تو وقت اسے سمجھا دے گا۔ اس راہ پر نہ چلو، جس پر ببول اگے ہیں۔" دادی کی تنبیہہ کو اس وقت کون سنتا؟ عنایہ پہ تو ایک دم غصہ سوار تھا۔ وہ رافع کا منہ توڑ دیتی۔ جو اسے فاتح کی نظروں میں بے مول کر رہا تھا۔ جو اس کا گھر خراب کر رہا تھا۔

اس نے دروازے پہ دستک دی تو وہ دستک کے انداز سے ہی سمجھ گیا تھا۔ آنے والا کون ہے؟ اور اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ عنایہ ایک بھپرے طوفان کی طرح اندر آئی تھی۔ لیکن رافع پہ نگاہ پڑی تو اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر عنایہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ آج جو کچھ رافع تھا۔ عنایہ کی وجہ سے تھا اس کے ٹھکرانے پر وہ ضد میں آ کر محنت کرتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔ اور اس کی بے وفائی نے رافع کو سودائی کر دیا تھا۔ یہ وہ رافع نہیں تھا۔ جسے عنایہ جانتی تھی۔ جو کبھی اس کا محبوب تھا۔ اور اسے انسانوں کے اس ہجوم میں سب سے پیارا لگتا تھا۔

یہ وہ رافع تھا۔ جو اتنے انسانوں کے ہجوم میں بالکل اکیلا تھا۔ فگار جذبوں اور فگار دل کے ساتھ۔

اس کا چہرہ سرخ اور پژمردہ تھا۔ اس کے بال الجھے تھے۔ یوں لگ رہا تھا۔ اس نے کئی گھنٹوں سے منہ بھی نہیں دھویا تھا۔

وہ عنایہ کو دیکھ کر چیخنے لگا تھا۔

"اے نرگس مخمور! آؤ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ آؤ اور میرے حال پر شادیانے بجاؤ۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر وائلن کے قریب لے آیا تھا۔ پھر اس نے دیکھتے ہی دیکھتے وائلن کو توڑ پھوڑ کر کسی قابل نہ چھوڑا تھا۔ یہ اس کا بڑا پیارا وائلن تھا۔ جو اوائل عمری میں پاکٹ منی جمع کر کے اس نے خریدا تھا۔ ایسا ہی ایک وائلن اس نے عنایہ کو بھی تحفے میں دیا تھا۔

"تمہاری نسبت سے ملی ہر چیز مجھ پر حرام ہے۔ ہر کامیابی، ہر شہرت۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ صرف تمہارے سوا۔ یہ سب میرے لیے بے کار ہے۔ لیل و نہار میں کچھ بھی نشاط افزا نہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ تاریکی ہے اور زندگی بہت بری ہے۔" وہ رونے لگا تھا۔ اتنا بڑا رافع رونے لگا تھا۔ یہ رونا عنایہ کے نہ ملنے پر تھا یا شکستگی کی ذلت اٹھانے پہ۔

"اسے تو عادت تھی مجھے پچھاڑنے کی۔ ہمیشہ کلاس میں اول اس لیے آتا تھا کہ ماما اور بابا سے تعریفیں بٹور سکے اور میری شامت بلوا سکے۔ اسے تم سے لگاؤ نہیں تھا۔ اسے ہمیشہ سے بیہ پسند تھی۔ اس نے تمہارے لیے ہامی اس لیے بھری تا کہ مجھے ہرا سکے اور نانا نانی کے سامنے خود کو عظیم ثابت کر سکے۔ وہ اپنی فرماں برداری کے جھنڈے گاڑنا چاہتا تھا۔ اس نے تو تب مجھے ہرایا۔ مجھے بس ایک جواب چاہیے عنایہ! تم نے اس طوق کو گلے میں کیوں ڈالا؟ تمہیں کس نے مجبور کیا؟" اس کی مدھ بھری آنکھوں کا رنگ بدلنے لگا عنایہ نے ایسی خونی آنکھیں کسی کی نہیں دیکھی تھیں۔ وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ اس سے جواب لینا چاہتا تھا۔

"بتاؤ' وہ مجھ سے محبت تھی یا ایک ڈرامہ تھا؟ وقتی لگاؤ' انسیت؟" وہ چیخ رہا تھا اور عنایہ خوف سے منجمد تھی۔

اسے دادی کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ اسے رافع کے سامنے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگر آ ہی گئی تو رافع کو "وضاحتیں" نہ دیتی۔ یہ وضاحتیں بے سود تھیں۔ جو صرف اتنا کام کر سکتی تھیں کہ اس کے شوہر کو بدگمانی کے کنویں میں دھکیل دیا۔ آخر وہ ایک انسان تھا کوئی پتھر تو نہیں تھا۔

"میری بات کا یقین کرو رافع! میں اپنی ماں کے سامنے سر اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتی۔ یہ میری بزدلی ہے یا کم ہمتی۔ یا فرماں برداری یا کچھ بھی سمجھ لو۔ میں دیا کے سامنے ایک لفظ نہیں بول سکتی۔ مجھے دیا نے مجبور کیا تھا اور میں نے تمہارے ساتھ کوئی ڈراما نہیں کھیلا۔ میں نے تو صرف تمہیں چاہا تھا۔"

رافع نے وہ سب سن لیا تھا جس کی اسے تمنا تھی۔ اور اسے بھی سنوا دیا جسے عنایہ کے منہ سے یہ سب اگلوا کر سنوانا چاہتا تھا۔ آخر اس کے ہاتھ میں چوسر کی ایک گوٹ تھی۔ شطرنج کا ایک مہرہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے وہ مہرہ بہ آسانی کھیل لیا۔ اس نے شطرنج کی پوری بازی اپنے ہاتھ میں کر لی تھی۔ اب اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ عنایہ ملتی یا نہ ملتی۔ عنایہ برباد ہوتی یا آباد ہوتی۔ عنایہ اس گھر میں رہتی یا نہ رہتی۔ عنایہ فاتح کے دل میں ٹھہرتی یا نہ ٹھہرتی۔ عنایہ فاتح کی زندگی سے نکلتی یا نہ نکلتی۔ اس نے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا تھا۔ اس نے فاتح پہ "جتا" دیا تھا کہ اس نے واقعی پہلے سے مفتوحہ علاقے پر اپنی فتح کا پرچم بلند کر رکھا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کو پچھاڑ دیا تھا۔ اس نے فاتح کو چوکھٹ پار کرتے اس حال میں دیکھا تھا کہ وہ قدم کہیں رکھتا تھا۔ اور پڑتا کہیں تھا۔

اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ فاتح اس شام چپ چاپ گھر سے نکل کر کس سمت جا رہا ہے۔ "کیا اس جگہ" جہاں سے واپسی کی کوئی راہ نہیں بچتی تھی۔

اور اے کاش کہ فاتح افراہیم اس شب اپنے دل کے اجڑنے اور بیہ کے جذبات کے ساتھ کھیلنے کا حساب لینے اپنے ماموں کے اس شیشے کے گھر کبھی نہ جاتا۔ جہاں پہ ایک سنہری بالوں والی جادوگرنی کا قیام تھا۔ اور جس کا جادو ابھی تک سر چڑھ کے بولتا تھا۔ وہ اپنی "ساحری" میں اب بھی ناممکن کو ممکن بنا دینے کا کمال رکھتی تھی۔

☆ ☆ ☆

اور اتنے مہینوں کے اعداد و شمار کے بعد اس پہ ایک حقیقت کا انکشاف بالآخر ہو ہی گیا تھا۔

"عنایہ خوش نہیں۔" اس انکشاف سے اس کے اندر کھلبلی سی مچ گئی تھی۔

آخر عنایہ خوش کیوں نہیں تھی؟ من کی مراد پا کر بھی عنایہ خوش نہیں تھی؟ اور اگر عنایہ اب بھی خوش نہیں تھی تو اس کی ریاضت تو سراسر بے کار تھی۔ دیا نے کاہے کو دوزخ خریدی۔ جہنم کے پاتال منتخب کیے؟ حالانکہ بیہ اسے بہت دفعہ تسلی دے چکی تھی کہ عنایہ بہت خوش ہے۔ بس انتقاماً "دیا کے سامنے اپنی خوشی کا اظہار نہیں کرتی۔

"انتقاماً" کیوں؟" دیا انتہائی بے وقوفوں کی طرح اپنی اس بہن سے ڈھارس لینے والے سوال پوچھتی تھی

جس کے اندر سے اس نے خوشی کا اکلوتا احساس تک اکھاڑ ڈالا تھا۔ اور اب اسے اپنی اس بہن سے تسلی چاہیے تھی۔ اور توجہ بھی اور وقت بھی۔ دیا کا ان دونوں اپنے "عبادت کدے" میں دل نہیں لگتا تھا۔ وہ سارا دن بولائی بولائی چکراتی پھرتی تھی۔ ایسی بے قراری دل سے بندھی تھی کہ چین کہیں پڑتا ہی نہیں تھا۔

"کیا تم نہیں جانتیں دیا!" اس نے استہزائیہ لہجے میں دیا کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "جب زبردستی کا رشتہ اس پر مسلط کرو گی تو کیا وہ تم سے انتقام نہیں لے گی؟ اور اس کا انتقام بھی اسی کی طرح معصومانہ ہے۔ وہ تم پہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ فاتح کے ساتھ خوش نہیں۔ حالانکہ وہ بہت خوش ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تم میں محسوس کرنے کی "حس" نہیں۔"

"یہ زبردستی کا رشتہ تھا کیا؟ تم گواہ نہیں فاتح اور عنایہ کے تعلق کی۔ فاتح کا عنایہ کے لیے لگاؤ' وہ تحائف کا لین دین۔ عنایہ کا اسے لمبے لمبے میسج کرنا۔ اور میں نے خود ان کی گفتگو میسجز کی صورت میں پڑھی تھی۔ تب مجھے لگا تھا۔ عنایہ رافع کو بھول کر فاتح میں دلچسپی لے رہی ہے۔ میں نے تو عنایہ کے لیے سب کچھ کیا۔ اس کی خوشی کے لیے؟ اور کاشف کی روح کو سکون دینے کے لیے کہ میں نے اس کی بیٹی سے انتقام لینا ترک کر دیا اور میں نے کاشف کی روح کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے فاتح کو عنایہ کے لیے چُنا۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ فاتح ہی وہ شخص ہے جسے کاشف اپنا داماد بنا کر خوشی محسوس کرتے۔ میں نے تو عنایہ کے لیے سب کچھ کیا۔ اور عنایہ مجھ سے ناخوش ہونے کا بہروپ بھر کے انتقام لے رہی ہے؟ اپنی ماں سے؟" دیا ہذیانی انداز میں چیخ پڑی تھی۔ بیہ اسے تاسف بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

"تم نے محسوس کیا۔ تم نے سوچا' تم نے چاہا۔ تم نے سمجھا۔ ہمیشہ خود کو اپنی ہی خواہشات کے تابع رکھا؟ کیا ہمیشہ جو تم چاہو گی وہی ہو گا؟ جیسا تم محسوس کرو گی ویسا ہی ہوا کرے گا؟ تم چاہو گی تو عنایہ رافع کی طرف متوجہ ہو گی۔ تم چاہو گی تو عنایہ کا دھیان رافع سے ہٹ جائے گا؟" بیہ اسے آپے سے باہر ہوتا دیکھ کر بڑے تحمل کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر بولی تھی۔

"ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ ساری عمر تم ہمیں سناتی رہی ہو۔ ہم پہ حکم چلاتی رہی ہو۔ ہماری زندگیوں کے ساتھ کھیلتی رہی ہو۔ تو آج مجھے کہہ لینے دو۔ تم ایک خود غرض عورت ہو۔ تم نے ہمیشہ اپنے لیے سوچا۔ ہمیشہ اپنا فائدہ دیکھا۔ اور ہمیشہ اپنے شوہر کے تعلق داروں سے نفرت کی۔ ہاں تم نے نفرت کی۔ کاشف بھائی کی ماں سے' ان کے باپ سے۔ ان کی اکلوتی بہن سے اور اس کے شوہر سے۔ تم نے ہمیشہ نفرت کی ان دونوں کے بچوں سے بھی۔ یہ نفرت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتی رہی۔ تمہیں ہمیشہ رافع اور فاتح سے نفرت رہی۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ وہ افراہیم بھائی کے بچے تھے۔ یا وہ رویا بھابھی کے بچے تھے۔ ان دونوں کے پاس اولاد نرینہ تھی اور تم اس نعمت سے محروم تھیں۔ تم نے رافع کو اس کے گھر والوں سے دور کرنا چاہا۔ اور اس کے لیے عنایہ ایک بہت اچھا ہتھیار تھی۔ تم نے رافع کو عنایہ سے اس حد تک اٹیچ کیا کہ وہ اس کے بغیر رہنے کا سوچنے سے بھی گیا۔

وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے اور تب تمہاری سوچوں کا بہاؤ ایک مرتبہ پھر بدل گیا تھا۔ کیونکہ وہ تمہارے تصوراتی خاکے پہ پورا اترنے سے قاصر تھا۔ فاتح ہر لحاظ سے اسٹرونگ تھا۔ اور اپنے حالات تو تمہارے سامنے ہی تھے۔ کاشف بھائی کے بعد ان کا بزنس تباہ ہو گیا تھا۔ سوائے اس گھر کے پراپرٹی کے نام پہ تمہارے پاس کچھ نہیں تھا۔ اور تم نے سوچا فاتح اپنا ہے۔ عنایہ کے ساتھ تمہیں بھی سپورٹ کرے گا۔ اور تم نے کامیابی تو پالی لیکن اپنا سکون ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ اس لیے کہ تم نے بہت سارے دلوں کو توڑا۔ تم نے ایک کامیاب کھیل کھیلا۔ لیکن یہ ہرگز بھی تصور نہ کرو کہ ہر کامیابی صرف تمہارے لیے ہے۔"

بیہ کے الفاظ نہیں تھے۔ کوڑے تھے۔ طمانچے تھے۔ جو دھڑا دھڑ دیا کے منہ پر پڑ رہے تھے اور وہ ایسی

ساکت کہ بیہ کے ہاتھ میں پکڑا آئینہ دیکھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ بیہ روتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

جبکہ دیا جو اس باختہ سی چکراتے سر کو تھام کر کراہنے لگی۔ ابھی تو ایک عدالت لگی تھی اسے خبر نہیں تھی کہ ابھی ایک اور عدالت لگنی تھی۔ اور ابھی کئی کٹہرے اس کے منتظر تھے۔ ابھی کئی عدالتیں باقی تھیں۔ اور ابھی کئی حساب اس کے سر کے اوپر قرض کی طرح لدے ہوئے تھے۔

اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا اور کوئی دبے قدموں اس کی راج دھانی میں داخل ہو گیا۔ اس حال میں کہ دیا چلا چلا کر خود سے مخاطب تھی۔

"یہ میں نے کیا کر دیا؟ عنایہ کی خوشی کو اس سے دور کر دیا۔ میں نے عنایہ کی محبت اس سے چھین لی۔ یہ مجھ سے کیسا گناہ ہو گیا۔ میں تو اسے زندگی میں پہلی مرتبہ خوشی دینا چاہتی تھی اور میں نے اس کو کس شان سے چوٹ پہنچائی۔ عنایہ کا دل خالی کر دیا۔ ہائے افسوس' یہ مجھ سے کیسا جرم ہوا؟ تھوڑا سا انتظار کر لیتی تو رافع بھی فاتح کے مقابل آجاتا۔ آہ! اب میں کیا کروں؟" وہ روتے روتے ایک دم ٹھٹک گئی تھی۔ پھر اس کے دماغ میں ازلی ہلچل نے اودھم مچا دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک منصوبہ اس کے ذہن میں بن گیا۔ جسے تکمیل تک پہنچانے میں چند لمحے بھی نہیں لگتے تھے۔

کیونکہ اس کا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے فاتح بہ نفس نفیس خود ہی آگیا تھا۔

اور دیا کے لیے ایک اور عدالت تیار ہو چکی تھی۔ آج اس کی جان شکنجے میں آن پھنسی تھی۔

"جو کچھ بیہ نے کہہ دیا اس سے آگے میرے کچھ بولنے کی تو ذرا بھی گنجائش نہیں بنتی۔ لیکن کیا کروں..... اس دل پہ ندامت اور ذلت کے بار لدے ہوئے ہیں۔ ندامت تمہاری بہن کا سچا اور پاک دل ٹھکرانے پر ہے۔ کہ مجھے میرے چاہنے والوں نے واسطے دے کر مجبور کر دیا تھا۔ جبکہ ذلت کا بوجھ ہر احساس پہ بھاری ہے۔ میں شرم سار ہوں اپنے بھائی کے سامنے' جس کی آنکھوں کے سامنے اپنی خوشیوں کا جشن مناتا رہا۔ میری عزت' وقار اور غیرت کی دھجیاں تمہاری بیٹی نے میرے سامنے "اقرار محبت" کے بعد اڑا کر رکھ دیں۔ میں اور کتنا بے غیرت بنوں؟ تمہارے غلط فیصلوں نے کتنے لوگوں کو جہنم کی دہکتی آگ میں جھونک دیا ہے۔ اے کاش' تمہاری آنکھوں پہ بندھی پٹی اب بھی کھل جائے۔ مجھے عمر بھر خود پہ ندامت رہے گی۔ میں ایک ناجائز فیصلے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب بتاؤ' میں کیا کروں؟ جو الاؤ تم نے ہمارے ارد گرد دہکا رکھے ہیں۔ انہیں کون بجھائے گا....."

وہ اتنی شدت سے دھاڑ رہا تھا کہ کمرے میں بند بیہ تک دہل کر باہر آگئی تھی۔ مگر وہ فاتح نہیں لگ رہا تھا۔ وہ دنیا کا سب سے حلیم انسان تھا اور اس وقت سب سے زیادہ وحشی لگ رہا تھا۔

جب دیا نے جان لیا کہ اس کی چال فاتح اور بیہ دونوں پہ کھل چکی ہے۔ اور اب ساری بساط الٹ چکی ہے۔ مہرے بکھر چکے ہیں۔ سو اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک اور انتہائی فیصلہ کر لیتی۔ اس نے لمحے بھر کے لیے سوچا اور فاتح کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"تم میری بیٹی کو طلاق دے دو۔ عنایہ تمہارے ساتھ خوش نہیں۔ وہ رافع سے محبت کرتی ہے..... یہ میرا غلط فیصلہ' غلط مشاہدہ تھا۔ جس کا نتیجہ میری بیٹی کو بھگتنا پڑا۔ تم عنایہ کے حال پہ رحم کرو۔ اور ایک آخری مہربانی کر دو۔"

جب دیا فاتح سے عنایہ کے لیے طلاق کا مطالبہ کر رہی تھی۔ تب پہلی مرتبہ بیہ کو احساس ہوا تھا کہ اس کی بہن کا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔ الٹی سیدھی چالوں نے اس کی ذہنی رو بہکا دی ہے اور اب وہ ایک مرتبہ پھر جذباتیت اور اپنے پاگل پن میں غلط فیصلہ کر رہی ہے۔

بیہ کا دل چاہا۔ وہ بھاگ کر فاتح کے قدموں سے لپٹ جائے۔ اور اس کے پیروں پہ اپنا سر رکھ کر عنایہ کے لیے رحم کی بھیک مانگے اور فاتح کو بتا دے۔ "عنایہ صرف تم سے محبت کرتی ہے۔ اپنے ماضی کو بھلا کر۔ تم

اس عورت کی باتوں میں نہ آؤ۔ تم عنایہ کو زندہ درگور نہ کرو۔"

لیکن بیبہ کا ایک قدم بھی نہ اٹھ سکا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگے لگے زمین پہ گرتی گئی اور بے ہوش ہوگئی۔ اور اس پہ طاری نیند کے دوران ہی بیبہ کی لاڈلی عنایہ اجڑ کر گھر آگئی تھی۔

عنایہ اور فاتح کے بیچ طلاق ہوگئی تھی۔

عنایہ برباد ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ دن نفرت کی حد تک تکلیف دہ اور بوجھ کی حد تک ناقابل برداشت تھے۔ وہ منحوس ترین دن تھے۔ جن کی یاد اب بھی بیبہ کو پہروں رُلاتی تھی۔ اور ان دنوں کی یاد اور بھی کچھ لوگوں کو بری طرح سے تڑپاتی تھی۔ جن میں ایک رافع بھی تھا۔ اور جن میں ایک فاتح بھی تھا۔ اور ان تین لوگوں کی تکون میں اب عنایہ کہیں نہیں تھی۔ وہ نہ کسی کو یاد کرتی تھی نہ کسی کے لیے روتی تھی۔ وہ قطعی طور پر بے حس ہو چکی تھی۔

لیکن بیبہ کے لیے بے "حس" ہونا ناممکن تھا۔ وہ ان دنوں کو یاد کرکے روتی بھی تھی تڑپتی بھی تھی۔ اور اکثر عنایہ کو بھی تڑپانے کے لیے کچھ یاد دلانے کی کوشش کرتی۔

اسے فاتح کی محبتیں یاد دلاتی تھی اور رافع کی بے رخی بھی۔ وہ چاہتی تھی۔ عنایہ کے اوپر چڑھا خول چیخ جائے اور عنایہ کسی بھی چیز کی پراہ نہ کرتے ہوئے اتنا روئے کہ اس کے اندر جمی ہوئی کائی صاف ہوجائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ عنایہ کو زندگی کی طرف لانا ممکن نہیں تھا۔

عنایہ کے گھاؤ بھرنے والے نہیں تھے۔ اس کا ایک ایک زخم کھلا ہوا تھا۔ ایک ایک زخم ادھڑا ہوا تھا۔ ان زخموں پہ کھرنڈ کیسے آسکتا تھا؟

پھر وقت آگے کو کھسکنے لگا۔ لیکن عنایہ کو اپنی جگہ پہ گاڑ گیا۔ نہ وہ آگے بڑھ سکی۔ نہ پیچھے ہٹ سکی۔ وہ اسی مقام پر پتھر کی مورت میں ڈھل گئی تھی۔

جس مقام پر اسے فاتح چھوڑ گیا تھا اور جس مقام پر اسے رافع چھوڑ گیا تھا۔

ہر مشکل انسان کی ہمت' جرات' طاقت اور ثابت قدمی کا امتحان لیتی ہے۔ لیکن عنایہ نے ثابت کردیا تھا۔ وہ ایک کم ہمت' بزدل لڑکی ہے۔ وہ ہر امتحان میں فیل تھی۔ محبت کے بھی اور زندگی کے بھی۔

بیبہ کی عنایہ کے لیے ہر کوشش بے کار تھی۔ وہ بیبہ کے ساتھ یادوں کے سیل رواں میں بہنے سے ہمیشہ کے لیے انکاری تھی۔ عنایہ نے اپنا دل' اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند کرلیے تھے۔

جبکہ بیبہ پیچھے رہ جانے والی یادوں میں ان لمحوں کو تلاشتی جس میں اس کے لیے لمحاتی خوشی کا کوئی جگنو بھی اڑا کرتا تھا۔ اسے فاتح بے طرح یاد آیا کرتا تھا۔

کتنا کٹھن تھا بھول جانا۔ کسی کا یادوں سے نکل جانا۔ اور یادیں حادثے کی طرح ہوتی ہیں۔ جاتے جاتے بھی اپنے پیچھے ان مٹ نشان چھوڑ جاتی ہیں۔ وقت نہیں ٹھہرتا لیکن یاد ٹھہر جاتی ہے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن اپنے پیچھے یادوں کی سوغات دے جاتے ہیں۔ برا ہی وہ بھرتھا کسی کو بڑی ہی شان و شوکت اور اہتمام کے ساتھ رات دن یاد کرنا اور بیبہ فرض نماز کی طرح یہ "فرض" بھی نباہتی جارہی تھی۔

حالانکہ یادوں میں سوائے زخموں کے اور کچھ نہیں تھا۔

اسے وہ دن یاد آتے تھے جب شیشے کے محل میں عنایہ کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔

جب فاتح نے دیا کے مجبور کرنے پہ عنایہ کو طلاق دے دی تھی اور پھر بغیر کسی سے حساب لیے چپ چاپ دنیا کی اس بھیڑ میں ہمیشہ کے لیے کھو گیا تھا۔ وہ قرینہ عشق کو بھول گیا۔ عنایہ سے دور ہوگیا اور عنایہ اس کے پیچھے دیوانی۔ تب عنایہ کو ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے۔ اور وہ پورے گھر میں پاگلوں کی طرح چلاتی پھرتی تھی۔ بیبہ' عنایہ کو سنبھال کر تھک جاتی۔ رونے لگتی۔ خود کو کوسنے لگتی۔

دیا بھی تو ایک ماں ہی۔ اور اب عنایہ کی حالت زار

پہ دھاڑیں مار مار کر روتی تھی۔
دنیا کے کسی حکیم، طبیب کے پاس عنایہ کا علاج نہ تھا۔ انہوں نے کئی ڈاکٹر بدل کر دیکھ لیے تھے۔ دیا نے اپنے مشہور زمانہ تعویذ دھاگے بھی آزما لیے۔ اماں دیوانی تو جہنم واصل ہو چکی تھی۔ دیا نے کسی اور عامل سے عنایہ کے لیے تعویذ لیے۔ جن کا الٹا اثر پڑا اور عنایہ کی حالت مزید بگڑ گئی تھی۔
پھر دیا دوبارہ اسے ڈاکٹرز کے ہاں چکر لگوانے لگی۔ ان ہی میں سے ایک ڈاکٹر نے عنایہ کی کہانی جانتے ہوئے اس کے لیے دوبارہ شادی کا مشورہ تجویز کیا تھا۔ جو دیا کو بہت پسند آیا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ عنایہ اب اس "سوگ" کا خاتمہ کر کے اپنی نئی زندگی کی شروعات کرے۔
اور اس کے لیے دیا نے رافع کی خدمات حاصل کی تھیں۔ رافع خود بھی عنایہ پہ فریفتہ تھا اور اس کی صحت یابی کے لیے بے قرار بھی۔
جیسے ہی دیا نے ڈاکٹر کی تجویز رافع کے سامنے رکھی اس نے فوراً "عنایہ سے نکاح کے لیے ہامی بھرلی تھی۔ وہ تو کب سے تیار تھا۔ بس عنایہ کی حالت کے پیش نظر خاموش تھا۔
"جب "شر" انسان کے اندر نمو پاتا ہے تو اسے تب سمجھ میں نہیں آتا۔ جب یہ تناور درخت بن جاتا ہے۔ تب اس کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور پھر وہ اس کی جڑوں کو کاٹنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔
یوں عنایہ کا عقد ثانی کسی ملکی اور قومی اہم ترین معاملے کی طرح "صیغہ راز" میں رکھا گیا تھا۔ حتیٰ کہ رافع نے اپنے نانا، نانی کو بھی ہوا تک لگنے نہیں دی تھی۔ ویسے بھی فاتح اور عنایہ کی طلاق کے بعد رافع نے گھر چھوڑ دیا تھا کیونکہ نانا اور نانی اس جیسے شخص کو اپنے گھر میں رکھنے سے معذور تھے۔ وہ اس کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ نانا نے اسے جوتے اور دھکے ٹھڈے مار کر گھر سے نکالا تھا۔ وہ اس بدکردار، ذلیل انسان سے نفرت کرتے تھے۔ رافع کو پھر جانا ہی پڑا۔ لیکن جب عزہ کو رافع کی نکاح والی کارروائی کا علم ہوا تو وہ کسی بپھرے طوفان کی طرح دیا کے سر پہ آکر پھٹ پڑی تھی۔ اس نے اتنا واویلا کیا، اتنا شور مچایا، اتنی آہ و بکا کی کہ جس کی حد نہیں۔
"میرے ایک بھائی کو برباد کر کے سکون نہیں ملا۔ جو دوسرے کو بھی برباد کرنے پہ تلی ہو۔ خدارا، ہمارے ناکردہ گناہوں کو معاف کردو۔ اور ہماری جان چھوڑ دو۔"
عزہ کا یہ واویلا اور رونا دھونا کسی کام نہیں آیا تھا۔ وہ روتی چلاتی واپس لوٹ گئی تھی۔ لیکن اپنے رونے کی نحوست یہیں چھوڑ گئی تھی۔ جس نے ایک مرتبہ پھر عنایہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
رافع، عنایہ کو پا کر شروع کے چند دن بہت خوش رہا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اپنی خوشیوں کو چھین کر حاصل کرنے میں کوئی برائی نہیں۔ اس نے چند دن عنایہ کے دوروں اور چیخوں کے ساتھ سمجھوتہ کیے رکھا اور خود کو مختلف بہلاوں سے بہلاتا رہا۔ اسے امید تھی کہ عنایہ جلد ہی اسے قبول کرلے گی لیکن اس کی یہ امید آہستہ آہستہ دم توڑتی رہی۔ عنایہ اول روز کی طرح ہی رافع کو دیکھ کر چیخنے چلانے لگتی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی۔ چیزوں کے پیچھے چھپنے لگتی۔ اور مدد کے لیے فاتح کو پکارتی تھی۔
رافع کو اندازہ نہیں تھا کہ جس فاتح کو وہ عنایہ کی زندگی سے نکال چکا تھا۔ وہ فاتح اب بھی عنایہ کے حواسوں پہ سوار تھا۔ فاتح خود چلا گیا تھا لیکن اپنی پرچھائیاں پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ یہ صورت حال رافع کو پریشان کرنے لگی۔ وہ الجھتا، غصہ کرتا اور دیا اسے عنایہ کے ٹھیک ہونے کی سو سو امیدیں دلا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔
پھر ایک دن دیا نے فاتح کی یادوں سے عنایہ کو نکالنے کے لیے رافع سے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہا۔
"تم عنایہ کو اپنے رشتے کا احساس دلاؤ۔ تم اس کے ساتھ زبردستی کرو۔ کیا خبر، بہتری کے کچھ آثار دکھائی دیں۔"
دیا کے مشوروں نے رافع کو امید کا آخری سرا تھما

دیا تھا۔ اس نے سوچا‘ وہ یہ آخری حربہ بھی آزمالیتا ہے۔

اس دن باہر بارش ایک تواتر سے برس رہی تھی۔ رات تک بھی یہی موسم رہا اور ادھر رافع بھیگے موسم میں عنایہ کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔ اسے یہ سب تو کرنا ہی تھا۔ کیا خبر‘ اسی بہانے عنایہ اسے قبول کرلیتی۔

وہ عنایہ کے روم میں آیا تو وہ مسہری پہ بیٹھی کسی سے باتیں کرتی دکھائی دی تھی۔ وہ خود میں اتنی مگن تھی کہ اسے رافع کے آنے کی خبر ہی نہ ہو سکی۔

رافع کو اندازہ نہیں ہوسکا کہ کیا باتیں کررہی ہے۔ اور کس سے مخاطب ہے۔ تاہم وہ دھیرے دھیرے چلتا عنایہ کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ عنایہ اپنے دھیان میں اس قدر گم تھی کہ چونکی بھی نہیں۔ وہ خود سے بول بول کر اور ہنس ہنس کر تھک گئی۔ اور وہیں اسے دواؤں کے زیر اثر نیند آگئی۔ وہ مسہری پہ لیٹی اور تھوڑی دیر میں غافل ہوگئی۔ رافع عجیب سے تاثرات کے ساتھ عنایہ کو دیکھنے لگا۔ وہ سوتے ہوئے بہت معصوم لگ رہی تھی۔ کسی کم سن سہمی بچی کی طرح۔

رافع کے دل میں عجیب سے جذبات مچلنے لگے۔ وہ عنایہ پہ تھوڑا سا جھکا۔ تو اس کا دلفریب چہرہ اس کے قریب آگیا۔ وہ اس کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ لمبی لمبی مڑی ہوئی پلکوں والی خوب صورت آنکھیں۔ جو کسی بند کلی کی طرح بند تھیں۔

اور اس کا شفاف چہرہ۔ کٹاؤ دار گلابی ہونٹ۔ رافع کا ہاتھ بڑھا اور عنایہ کے لبوں تک آتا رک گیا۔ اور پھر اس کے اوپر عجیب سے جھلسا دینے والے تاثرات اور کیفیات کا نزول ہونا شروع ہوگیا تھا۔

یہ عنایہ تھی۔ اس کے بھائی کی بیوی‘ اس کی زندگی کا ایک حصہ۔ اور اس کی قیمتی متاع۔ اور یہ چہرہ عنایہ کا چہرہ تھا۔ جسے نجانے کتنی مرتبہ فاتح نے چھوا ہوگا۔ ان آنکھوں کی تعریف کی ہوگی۔ اِن پلکوں کو چوما ہوگا۔

رافع کو لگا وہ مزید یہاں بیٹھا رہا تو جھلس جائے گا۔ جل جائے گا۔ تباہ ہوجائے گا۔

اس کے دل پہ آرے چلنے لگے تھے اور اندر کہیں کوئی دوزخ دہک گیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اٹھا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ وہ بغیر مڑے یا بغیر رکے بھاگ رہا تھا۔

بیہ نے اسے ایسی حالت میں اتنی شدید بارش اور طوفان میں باہر کی طرف بھاگتے دیکھا اور ٹھٹک گئی تھی۔ پھر وہ رافع کے پیچھے بھاگی تھی۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ ایک مرتبہ اسی حالت میں کاشف بھائی بھی گھر سے نکلے تھے۔ ان پر بھی اتنی ہی وحشت سوار تھی۔ مگر وہ پھر واپس نہیں لوٹ سکے تھے۔ بالکل ایسے ہی رافع اس گھر سے وحشت کے عالم میں نکل رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا۔ اپنی جان چھڑا رہا تھا۔ کوئی آسیب اس کی جان لینے پہ تلا ہوا تھا۔ اور اس آسیب نے پتھریلی روش پہ بھاگتے رافع کی پشت پہ پہلا چابک مارا تھا۔ رافع پانی پہ پھسلتا ہوا منہ کے بل گر پڑا۔

”کیا ملا تمہیں۔ اندھی خواہش کے پیچھے بھاگ کر۔ اپنے بھائی کو خوار کرکے۔ اتنے دلوں کو روگ لگا کر آخر تمہیں کیا ملا؟ اب مجھ سے کیوں بھاگ رہے ہو؟ آؤ‘ مجھے گلے لگاؤ۔ میں تمہاری اندھی خواہشوں کا آسیب ہوں۔ میں آج سے تمہارا ساتھی ہوں۔ تمہارا ہمراز ہوں۔“

اس کے پیچھے آتا آسیب اندھا دھند اس کی پشت پہ کوڑے برسا رہا تھا۔ اسے لہولہان کررہا تھا۔ رافع نے اٹھنے کی کوشش میں بڑے ہاتھ پیر مارے تھے لیکن اس سے اٹھا نہیں جارہا تھا۔ وہ اٹھتا گرتا۔ پھر اٹھتا پھر گر پڑتا۔ گر گر کے اٹھتا اور پھر پانی میں پھسل جاتا۔

”اور میں تمہارا ضمیر ہوں۔ مجھ سے بھاگ کر آخر کہاں جاؤ گے۔ میں تمہیں ہر روز کوڑے ماروں گا۔ اور تمہیں تمہارے گناہوں کی یاد دلاؤں گا۔ تب تمہیں اندازہ ہوگا۔ تم نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا کیا؟ اور اس کی بیوی کے ساتھ کیا کیا؟ اور تمہیں خبر ہوگی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جب نگر نگر کی خاک چھانو گے اور پھر بھی سکون نہ پاؤ گے۔

کوئی اس پر کوڑے برسا رہا تھا۔ اسے لہولہان کر دیا تھا۔ اسے طمانچے مار رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس حال میں اٹھا کہ رونے کی کوشش میں اس کے آنسو آنکھوں کی پتلیوں میں جم گئے تھے۔ پھر اس نے نانا کے گھر کی دہلیز پکڑلی۔ ہر طرح سے پیروں میں گر کر معافی مانگی مگر بے سود۔ وہ خالی ہاتھ جا رہا تھا۔ وہ خالی دل جا رہا تھا۔ وہ ایک ایسا مسافر تھا۔ جس کے پاس زادِ راہ کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ کسی لٹے پٹے ہارے ہوئے مسافر کی طرح اس اندھیری رات میں گھر سے نکلا اور ہمیشہ کے لیے "بے گھر" ہو گیا۔

اس روئے زمین پہ رافع افراہیم کے لیے ایک بھی شبستان نہیں تھا۔

یاد ایک گلاب کے پھول کی مانند ہوتی ہے۔ پھول کی پتی پتی بکھر بھی جائے تو خوشبو ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ یادوں کی خوشبو' تپتے نخلستان میں بھی اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے انسان بچھڑ جاتے ہیں۔ کھو جاتے ہیں مگر ان کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ کبھی نہ جانے کے لیے' کبھی نہ کھونے کے لیے۔

یادوں کا یہ سلسلہ رافع' فاتح اور انابیہ تک محدود تھا۔ یہ تین افراد ایسی ہی تکون کے تین حصے تھے۔ جن کا ایک سرا دوسرے کے ساتھ ایک یاد کی صورت میں بندھا ہوا تھا۔ یادوں نے انہیں آپس میں جوڑا ہوا تھا۔

یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔

باہر مصنوعی جھیل پہ رات اتری ہوئی تھی۔ رات جو ہزار بھید اپنے پیٹ میں چھپائے رکھتی ہے۔ رات جو گنہگاروں جیسی سیاہ ہوتی ہے۔ رات جو شر اور خیر کا سنگ میل ہے۔ جو چاہے تو شر کی طرف بھاگے اور جو چاہے خیر کی اوٹ میں پناہ لے۔

رات خیر کی تلاش میں جاگنے والوں کو "فلاح" دیتی تھی۔ فلاح بھی' بہشت بھی اور شر کے پیچھے لپکنے والوں کو تباہی اور نرگ یعنی آگ۔

وہ ایک مست ازل خواب کے پروں پہ سوار تھا۔ وہ خواب جو سرمدی تھا۔ جس کی نہ کوئی ابتدا تھی اور نہ کوئی انتہا۔ یہ خواب اسے تب ہی ستاتا تھا جب عشوے دکھاتی اچھی نیند اس کی پلکوں پہ کبھی کبھی مہمانی دکھاتی۔ وہ خواب کے سفر پہ تھا۔

جھکے بر آمدوں والا ایک گھر۔ جو اپنی شان و شوکت میں کمال نہ تھا۔ اس کے جھکے بر آمدوں اور کمروں میں ٹھنڈک بارہ مہینے قائم دائم رہتی تھی۔ وہ گھر جو اس کے خوابوں کا مسکن تھا۔ وہ گھر جو امن کا گہوارہ تھا۔ محبتوں کا گڑھ تھا۔ جہاں پہ ہنسی کی جھنکاریں اور قہقہے سنائی دیتے تھے۔

معاً" ایک تیز بگولا اٹھا تھا۔ پورب سے اٹھتی آندھی جیسا اور عجیب سا شور۔

وہ اس شور کی آواز سے گھبرا گیا تھا۔ یہ کیسا شور تھا؟ رونے کی آواز؟ اور نتھنوں سے ٹکراتی عجیب سی خوشبو۔ یہ کیسی خوشبو تھی؟ اسے خوشبو پہچاننے میں بڑی دیر لگی۔

یہ خوشبو کافور کی تھی اور کسی دور نگر سے آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے پڑھتا دماغ بند ہونے لگا تھا اور یہ کافور کی خوشبو اس کی حسِ شامہ کو نہایت اذیت دے رہی تھی۔

وہ جائے نماز پہ کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا۔ اسے پہلے کیا پڑھنا تھا؟ ثناء' تسمیہ' تعوذ؟

اس نے نیت باندھ لی اور قبلہ رخ کیے کھڑا ہو گیا۔

اتنے سالوں بعد نماز تہجد میں اس کی کوئی یکسوئی نہیں تھی۔ اس کے دھیان کا پنچھی بار بار اڑنے لگتا۔

اور اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے وہ جادوگرنی تن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ اس جادوگرنی کی پچھلی کہانی کسی دن وہ کھوج نکالے گا۔

لیکن عنایہ سے محبت؟ یہ وہ چیز تھی جو فاتح کے دائرہ

اختیار سے بہت باہر تھی۔ وہ اس کی بیوی ہوتی یا نہ ہوتی۔ وہ فاتح سے بے وفائی کا اقرار کرتی یا نہ کرتی۔ اسے عنایہ سے بے بہا محبت تھی۔

وہ چینی کی گڑیا جو اپنے ماں باپ کی عدم توجہی سے ایک سہمی ہوئی ہرنی میں بدل گئی تھی۔ وہ فاتح کے ساتھ تین مہینے نہیں۔ تین قرن گزار کے گئی تھی۔ وہ اس کے اندر بستی تھی۔ وہ چینی کی مورت تھی چاہے جانے کے لائق۔ خوف زدہ ڈری سہمی۔ ماں کی مار اور ستم کا شکار۔ وہ ان کی زندگیوں کا سب سے مظلوم کردار تھی۔ لیکن وہ "بے وفا" بھی تھی۔ اور بے وفاؤں کے لیے فاتح کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نفرت کا معمولی سا جذبہ بھی نہیں۔

وہ لایعنی سوچوں سے بچنے کے لیے اونچی آواز میں سجدے کی تسبیح پڑھنے لگا۔ پھر جلسہ اور بعد میں قیام کے دوران اس کی سوچوں کو پھر سے پنکھ لگ گئے تھے۔

اس نے دیا کے مجبور کرنے پر عنایہ کو طلاق دے دی تھی۔ اور خود وہ اس رات اپنا مختصر سامان باندھ کر گھر سے ہمیشہ کے لیے نکل آیا تھا۔ اسے یہ شہر چھوڑ کر نہیں یہ دیس ہی چھوڑ کر چلے جانا تھا۔

لیکن آج کی رات وہ کہاں گزارتا؟ پھر اسے اپنے مرحوم تایا ناصر کے اکلوتے بیٹے مدید کا خیال آیا۔ مدید جو اس کی جند جان تھا۔ اس کا گہرا اکلوتا اور بہت پیارا دوست۔

اور جب چار ویگنیں بدل کر مدید کے ننھیالی چوزوں کے ڈربا نما مکان میں تھکا ہارا بکھرا ٹوٹا پہنچا تو مدید اس کے دکھ درد اور تکلیف کو بانٹنے کے لیے پہلے سے ہی تیار تھا۔

وہ فاتح پہ ٹوٹ پڑنے والی مصیبت سے واقف تھا۔ بلکہ وہی کیا؟ اس کا پورا خاندان جانتا تھا۔ اور اسی لیے یہاں پہ ایک رات بھی ٹھہرنا محال ہو چکا تھا۔ اتنی عورتیں' ان کی چہ میگوئیاں' اشارے' طنز اور طعنے۔ سونے پہ سہاگہ اسی رات مدید کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اوپر سے اس کی ماں مدیحہ تائی کا واویلا۔

"یہ ساری فاتح کی نحوست ہے۔ جو ان کی سات پیڑھیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا سارا خاندان ہی منحوس ہے۔ اس کی ماں ایسی منحوس بلا تھی۔ اپنے شوہر سمیت اپنے اکلوتے بھائی کو بھی بھری جوانی میں نگل گئی تھی۔ اور فاتح کی ماں بھی بلا کی منحوس عورت تھی۔ ایسی سبز قدم جو افراہیم کا گھر بھی بد بختی کی لپیٹ میں آگیا۔"

تائی کی دہائیاں کو سنے اور آہوں سے بے نیاز فاتح نے مدید کو اپنے جسم کا خون دے کر اس کی زندگی کے گل ہوتے چراغ کو روشن کیا اور خود اجنبی فضاؤں کے حوالے اپنے آپ کو کر کے ہر رشتے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

لیکن یہ مدید تھا جو اس سے کبھی رابطہ نہ توڑ سکا اور مدید کی وجہ سے ہی حریر۔ دنیا کے دو بہترین دوست اور غم گسار۔ زخموں پہ مرہم لگا کر مسیحائی کرنے والے۔

اسے یاد آیا۔ وہ نماز کے لیے کھڑا ہے اور اسے قعدہ اور پھر تشہد کے بعد سلام پھیرنا ہے۔ لیکن وہ بار بار سجدے کی تسبیح پڑھ رہا تھا۔ "سبحان ربی الاعلیٰ" اس کا دل اللہ کی کبریائی کے خوف سے لرزنے لگا تھا۔ اور وہ نماز میں ہی بلند آواز میں رونے لگا۔ اور جانے وہ کتنی دیر سجدے میں پڑا رہتا۔ جب فون کی آواز نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ فون تک آیا۔ اس نے فون اٹھایا اور دوسری طرف سے آئی سانسوں کی آواز سن کر ہی تھرا اٹھا تھا۔

وہ اس کی سانسوں کے اتار چڑھاؤ سے ہی سمجھ گیا تھا کہ دوسری طرف کون ہے۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہلے اور ریسیور پہ اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔

"انابیہ!" اس کی بڑبڑاہٹ لبوں کے اندر ہی دم توڑ گئی۔ دوسری طرف بیہ اس کے سر پہ دھماکے کر رہی تھی۔

"فاتح! وہ مر گئی ہے، تمہاری عنایہ۔" بیہ کے دل پہ خنجر چل رہے تھے۔ اس نے آنکھیں موند کر وہ سب کچھ کہہ دیا۔ جسے کہنے میں اتنی دشواری کسی فون کال میں نہیں ہوئی تھی۔ اور اس وقت بیہ کا دل صدمے کی شدت سے بند ہو رہا تھا۔

"تم مجھے یہ اطلاع کیوں دے رہی ہو؟ تم نے غلط نمبر ڈائل کیا ہے۔ تمہیں یہ اطلاع رافع کو دینی چاہیے۔" وہ اسے بڑی رکھائی سے کہہ رہا تھا۔ بیہ کو بڑی زور کا دھچکا لگا۔

"کیا عنایہ کے ساتھ ایک ہی رشتہ تھا؟ وہ ایک رشتہ ٹوٹ گیا تو باقی سب رشتے بھی ٹوٹ گئے۔" یہ وقت ان سوالوں کا نہیں تھا۔ مگر وہ پھر بھی سوال کر رہی تھی۔ اور سوال میں جرح کر رہی تھی۔

"ہاں' سب رشتے ٹوٹ گئے۔" اس کا لہجہ بلا کا برفیلا تھا۔

"تم اس کے شوہر ہو فاتح؟" بیہ اسے کیا یاد کروانا چاہتی تھی؟ کیا وہ پاگل ہو چکی تھی یا اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ ہاں اس انا دیہ نامی عورت کے ساتھ رہتے ہوئے کس کا ذہنی توازن ٹھیک رہ سکتا ہے۔

"میں اس عہدے سے معزول ہو چکا ہوں۔" وہ زہریلے لہجے میں اسے جتائے بغیر نہ رہ سکا۔

"تمہاری بیوی مری ہے فاتح۔" یقیناً طور پر وہ اپنی یادداشت کھو چکی تھی۔

"وہ میرے لیے ایک سال چھ مہینے دو ہفتے پہلے ہی مر گئی تھی۔ جب میں پاکستان چھوڑ کر آیا تھا تو اسے وہاں دفن کر کے ہی آیا تھا۔" فاتح نے رکھائی سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اسے نماز جنازہ کی تفصیل بتا رہی تھی کہ اگر فاتح نے آنا ہو تو وہ لوگ تدفین میں تاخیر کر لیں گے۔

فاتح نے فون بند کر دیا تھا اور پھر خود پہ چڑھایا ضبط کا خول اپنے ہاتھوں سے تڑ تڑ توڑتا وہ بے آواز رونے لگا تھا۔ بے انتہا شدت کے ساتھ۔ پھر اس کی گھٹی گھٹی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ وہ ضبط کے سارے اختیار کھونے لگا تھا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگا تھا۔

وہ بھول گیا تھا کہ فلیٹ میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ کوئی اور یعنی حریر؟ اس کا دوست جو اپنے شہر ظہران سے لوٹ آیا تھا۔ اس کی اپنے گھر والوں سے صلح ہو چکی تھی۔ وہ فاتح کو اپنے گھر لے جانے کے لیے

آیا تھا۔

وہ چاہتا تھا۔ اسی ہفتے فاتح اس کے ساتھ ظہران چلے۔ ظہران میں فاتح کے لیے ایک "سرپرائز" تھا اور ابھی سونے سے پہلے ڈنر کے دوران فاتح نے حریر کے ساتھ ظہران جانے کی ہامی بھری تھی۔ کیونکہ حریر کے سرپرائز کو دیکھنے کی بے چینی اسے بھی لاحق ہو چکی تھی۔

اور اب اس کا پروگرام تبدیل شدہ تھا۔ اسے ظہران نہیں جانا تھا۔ روتے روتے اسے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی کمرے میں اس کے ساتھ موجود ہے اور پھر بن دیکھے وہ آنے والے کی خوشبو کو پہچان گیا تھا۔ وہ آنے والے اپنے دوست کو جان گیا تھا۔ وہ حریر تھا۔ جو جانے کب سے کمرے کی چوکھٹ میں کھڑا تھا۔ شاید اس نے فون کال بھی سن لی تھی۔ کیونکہ جب فاتح اس کے کندھے سے لگا روتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"حریر! عنایہ مرگئی ہے۔" تو حریر نے اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے صرف اتنا کہا۔

"میں نے پاکستان جانے کے لیے دو سیٹیں کنفرم کروالی ہیں۔ ہم عنایہ کے جنازے میں شرکت کرنے پاکستان جارہے ہیں فاتح۔"

اور فاتح حریر کے سامنے ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ اتنا سا انکار بھی نہ کرسکا۔ اسے جانا تھا۔ عنایہ کے جنازے کو کندھا دینے جانا تھا۔ عنایہ کو لحد میں اتارنے کے لیے جانا تھا۔ عنایہ کو "الوداع" کہنے کے لیے جانا تھا۔ یہ اس کا عنایہ سے بہت پرانا عہد تھا۔ اسے اپنا عنایہ سے کیا گیا عہد نبھانا تھا۔ اسے لوٹ کر اپنے آشیانے کی طرف جانا تھا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے تو صاف صاف قتل کی واردات لگتی ہے۔ نہ چور' نہ مور نہ کوئی ہور۔ ان ماں بیٹی کے بعد کون ہے جو اس وراثت کا حق دار ہے؟ روبا اور افراہیم کے بیٹے تو پردیس میں ہیں۔ عزہ اپنے گھر کی۔ نانا' نانی آج مرے کل دوسرا دن۔ تو بچی نا پھر؟ جو سالوں سے اسی گھر میں رہتی آرہی ہے۔ جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ لکھوالو مجھ سے۔ اسی نے کام تمام کیا۔"

ارسل کی دادی نے فرد جرم عائد کردی تھی۔ انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ بیہ اسی قابل تھی اور وہ واقعی اسی قابل تھی۔ ڈھیر ساری گلہریوں میں ایک اور گلہری کا اضافہ ہونے والا تھا اور اب کے بولنے والی عزہ تھی۔ فاتح اور رافع کی بہن۔ جو اپنے گرتے آنسو پونچھتی نانا کے کندھے سے لگی پوچھ رہی تھی۔

"کیا یہ سب بیہ نے کیا؟ مامی سے اپنا انتقام لینے کے لیے؟ بیہ نے اپنی ناکام حسرتوں کا قتل عام ہوتا دیکھ کر پہلے اتنا عرصہ صبر کیا تاکہ کسی کو شک نہ گزرے اور پھر موقع دیکھ کر کام کر دکھایا۔ بیہ نے دیبا مامی اور عنایہ کو قتل کردیا.....؟" اس کے سرسراتے لہجے میں نوکیلی ہوا سی کاٹ تھی۔ جواباً" عنایہ کے دادا اپنی آنسوؤں میں بھیگی آنکھوں کو پونچھتے نفی میں سر ہلانے لگے۔

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ازمیر دیکھ رہا ہے۔ وہ چیک اپ کرے گا۔ طبی معائنے کے بعد پوسٹ مارٹم کی حتمی رپورٹ ملے گی۔ تب ہی پتا چلے گا۔ یہ طبعی موت مری ہیں یا انہیں سازش کے تحت قتل کیا گیا ہے۔" ان کا گہرا لہجہ درد سے بھرا تھا۔ وہ ایک دم بہت ضعیف اور معمر لگنے لگے تھے۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔

کتنا مشکل تھا۔ اپنے جان عزیز کا سرمایہ اس کے پہلو میں دفن کرکے آنا۔ کتنا کٹھن تھا۔ کاشف کے اکلوتے اثاثے کو زمین کے اندر اتار آنا۔

ستون سے ٹیک لگائے لگائے ہی بیہ نے پورے گھر میں ایک نامعلوم سی ہلچل محسوس کی تھی۔ شاید ڈاکٹری رپورٹ آگئی تھی یا نہیں..... باہر تو کوئی اور آیا تھا۔ ایک تھکا ہارا مسافر..... اپنے آشیانے سے اڑان بھرنے والا پنچھی۔

بیہ نے اپنی کھلی سرد اور تھکی تھکی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ فاتح افراہیم لوٹ آیا تھا اور وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ۔ ان شاء اللہ)

قانتہ رابعہ

انہیں علم ہی نہ تھا کہ برسوں کی تمنا اچانک یوں پوری ہو جائے گی۔ تمنا تو محض ایک چھوٹا سا لفظ ہے اس کے لیے تو آرزو' خواہش' حسرت' دعا' مراد' چاہت' لگن' لغت کے سارے لفظ ناکافی ہیں۔ صفیہ سلطانہ کے روئیں روئیں میں یہ چاہت تھی... ناخنوں سے گوشت کا وہ تعلق نہ ہو گا جو اس خواہش کا ان کے وجود سے تھا... یقین کامل تھا کہ مراد پوری اسی وقت ہو گی جب کاتب تقدیر نے لکھا ہو گا!

اور کاتب تقدیر نے یہ کیسے لکھ دیا؟ عقل دنگ اور حیران تھی' جب حالات ہی نہ تھے' سوچا بھی نہ جا سکتا تھا۔ اچانک بالکل اچانک ان کی بڑی بھاوج کا فون آیا۔

"میں نے اور تمہارے بھائی جان نے اس سال حج کا پروگرام بنایا ہے' سرکاری طور پر تو درخواست دینے کے اہل نہ تھے پرائیویٹ طور پر جانے کا ارادہ ہے' اگر ممکن ہو تو تم بھی چلی چلو۔"

صفیہ کا دل چاہا ننھے بچوں کی طرح ایڑیوں کے بل گھومیں۔ جیسے بچپن میں گلیوں میں جھوما کرتی تھیں بھائی کا ہاتھ پکڑ کے اور لپکتی ہوئی گاتی تھیں۔

"کالے بادل آئیں گے۔
آکر مینہ برسائیں گے۔"

ہائے رحمت کے بادل آ گئے... بلاوا آ گیا... چھم چھم آنسو برسنے لگے۔

پہلے میاں سے بات کی' وہ چونکہ چودہ پندرہ سال قبل حج کر چکے تھے اور مالی طور پر زیادہ مستحکم نہ تھے... اس لیے جانا تو صفیہ کو ہی تھا مگر مسئلہ محرم اور ساس کا تھا۔ ساس مریضہ تھیں' بڑھاپے کا شکار' چلنے پھرنے سے معذور... ان کی ذمہ داری بخوشی نند نے لے لی۔ محرم کا مسئلہ اللہ نے حل کر دیا۔ پاسپورٹ بنا رکھا تھا۔ بھائی جان نے ایک دفعہ لاہور بلوایا' کچھ بیانات کچھ دستخط' کچھ انگوٹھے لگوائے' لیجیے جناب پورے ستائیس اٹھائیس دن کے بعد ٹکٹ ہاتھ میں تھا۔

ٹکٹ کو چوما' آنکھوں سے لگایا۔ دو چار لان کے سوٹ اور چند ضروری اشیاء... غیر ضروری سامان تو انہوں نے گھر میں بھی نہ جمع کیا تھا کجا مسافرت میں لیے پھرتیں... وہاں کا زاد راہ تو ایک ہی ہے تقویٰ۔ حج کی معلوماتی کتابیں' دعائیں سب ازبر تھیں۔ بس چھبیس اگست آئے اور انہیں فضاؤں میں لے جائے۔

بچپن کی سنی نعتیں' قوالیاں اب کانوں میں رس گھولتیں...

صبا مدینے اگر ہو جانا' نبی سے میرا سلام کہنا کبھی...

آئی نسیم کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کھنچنے لگا دل سوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

یوں ہی آنسو پونچھتے اشک بہاتے اگست کی چودہ آ پہنچی۔

"سنیے! مجھے کل چیچہ وطنی اور بہاولپور جانا ہے۔"

میاں چودہ اگست کی چھٹی کی وجہ سے آرام سے لیٹے ہوئے تھے' صفیہ سلطانہ نے انہیں مخاطب کیا۔

"کیوں؟ وہ کیوں؟" نادر صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

"حج سے پہلے سب سے مل ملا کر دل صاف کر کے جانا چاہیے نا۔" صفیہ سلطانہ نے کہا۔ ان دونوں

شہروں میں ان کے عزیز و اقارب رہتے تھے۔

"افوہ.... خود ہی آجائیں گی وہ تم اپنا اسٹیمنا جمع رکھو حج کے لیے۔"

"ارے واہ.... ایسے ہی۔" صفیہ سلطانہ نے چمک کر کہا "آپ کو نہیں پتا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ سے پہلے سب سے دعا کا کہنے گئے تھے اور جب عمرہ کر کے آئے تو لوگ ان سے ملنے آئے تھے۔"

دلیل وزنی تھی۔ نادر صاحب چپ ہو گئے۔ دو گھنٹوں کے بعد بیٹے کے ہمراہ صفیہ بیگم سفر پر روانہ ہو گئیں۔ قیام مختصر ہی تھا لیکن سب سے ملاقات ہو گئی.... واپسی پر انہوں نے خوشی سے بتایا۔

"بھابھی آمنہ، رضیہ آپا، شکور بھائی سب کے گھروں میں گئے۔" دور پار کے اور قریبی سب رشتہ داروں کے نام انہوں نے میاں کو گنوائے۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا ورنہ ہمیشہ وہی آتے تھے۔" میاں نے بھی اظہار مسرت کیا۔

"ہاں اب گاؤں والے ماموں سرفراز اور چاچا اشرف رہتے ہیں، کل پرسوں موٹر سائیکل پر ہی لے جائیں، کہیں ان بے چاروں سے ملنے سے رہ نہ جاؤں۔"

"ہاں بھئی ضرور.... غریب رشتہ داروں کا تو ویسے ہی پہلا حق بنتا ہے' کچھ دے دلا بھی آنا۔" نادر صاحب نے مشورہ دیا۔

پچیس اگست کی علی الصبح انہیں لاہور روانہ ہونا تھا۔ سب تیاریاں مکمل تھیں۔ سامان گاڑی میں رکھا جا رہا تھا۔ آس پاس کے محلے دار سب الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ سب کی نگاہیں ہی عقیدت سے بھری ہوئی تھیں.... سب کے دلوں میں اس گھر اور اس در کی چاہ تھی۔

بیٹا سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھ چکا تھا۔

سب سے مل ملا کر وہ فارغ ہوئیں۔

"چلیے امی جان!" بڑا بیٹا فرحان مؤدب ہو کر بولا۔

"ایک منٹ میں دو نفل تو پڑھ لوں' اللہ آسانیوں کا اور قبولیت کا سفر بنائے۔" انہوں نے لاؤنج میں ایک جانب بچھے جا نماز پر فوراً" ہی نفلوں کی نیت کی اور دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھائے۔

بیٹا پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جوں ہی انہوں نے سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے' بیٹا سرگوشی میں بولا۔

"امی جان! آپ حج پر جا رہی ہیں.... آپ کے حج کو قبول ہونے کے لیے کن کن لوازمات کی ضرورت ہے؟"

"کیا مطلب؟ سیدھی صاف بات کرو....." صفیہ بیگم کے کان کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ بڑا بیٹا بہت عقل مند' مدبر اور سودانشوروں کا ایک دانشور تھا۔ فضول بات کرتا تھا نہ سنتا پسند کرتا تھا۔

"مطلب یہ ہے کہ آپ سب رشتہ داروں سے ملنے' سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے گئیں۔ آپ نے ایک دفعہ بھی نہ سوچا کہ آپ کے دائیں ہاتھ کے پڑوس میں آپ کی سگی بہن رہتی ہیں۔ اس بات پہ کہ انہوں نے آپ کی بیٹی کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا

'آپ ان سے تین ساڑھے تین سال سے خفا ہیں۔ صلح کی تمام تر کوششیں ان کی جانب سے ہوئیں۔ آپ نے آخری فقرہ یہ کہا تھا آئندہ جو بھی عطیہ سے ملے گا یا اس سے تعلق رکھنے کی کوشش کرے گا آپ اس سے کٹ آف ہو جائیں گی۔ اس دھمکی سے ڈرتے ہوئے ہم لوگ بھی ان سے نہ جڑ سکے۔ اگر آپ ان سے ملے بغیر چلی گئیں تو کیا آپ کا حج ہو جائے گا؟" نرم لہجے میں اس نے ماں کو اس عیب کی جھلک دکھائی' جو دیکھنا گوارا ہی نہیں ناپسند بھی تھا۔

"لیکن زیادتی اس کی طرف سے ہوئی تھی' بچپن میں اس نے ہی کئی دفعہ اس رشتہ کو جوڑنے کی بات کی تھی۔" صفیہ نے تڑپ کر کہا۔

طنزیہ سی مسکراہٹ فرحان کے چہرے پہ لحظہ بھر کے لیے نمودار ہوئی۔

"امی جان! زیادتی کرنے والا ہمیشہ میرے ساتھ ایسے کیوں ہوا" کا رونا رہتا ہے۔ حج پر تو آپ جا رہی ہیں ناں' پہل آپ کو کرنی چاہیے۔ ویسے بھی اجر سارا اسی کے لیے ہے' جو پہل کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ رشتے ناتے بچپن یا جوانی میں نہیں اللہ کے حکم سے طے ہوتے ہیں' اللہ نے یہ رشتہ نہیں لکھا تھا تو خالہ کیسے مان جاتیں..... امی جان۔"

فرحان کی آواز میں لرزش آئی۔

"سوچ لیجئے حج کرنا ہے' حج مقبول یا..... ایسے ہی پلٹ آنا۔"

"نہیں۔" تڑپ کر صفیہ سلطانہ نے کہا۔

جھجکتے جھجکتے۔ ہی سہی بہن کے گھر پر تین سال کے بعد دستک دے کر انہوں نے حج مقبول کا دروازہ بھی کھول دیا تھا' حالانکہ شیطان مردود کی اسکیم میں یہ بات شامل تھی کہ حج' کو حج مغرور ہی بنا دیا جائے ایک روٹھی بہن سے نہ بھی مل کر جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے!

خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے' دونوں بہنیں آپس میں گلے مل کر اشک بہا رہی تھیں۔ اب دونوں بہنیں پاک دل و پاکباز تھیں۔ فرشتے فتح کا نشان بنا رہے ہوں گے۔ ایک ہستی جلنے سڑنے والی بھی ہو گی' جس کے قلع قمع کے لیے تو حج کا ارادہ کیا تھا۔

نورِ دیانور

میں حیران تھی۔ اگر میری نظریں مجھے دھوکا نہیں دے رہی تھیں، تو میں دھوکا کیوں کھا رہی تھی اور اگر میں دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ تو کیا وہ حقیقت تھی یا بھیانک جھوٹ جو مجھے دکھایا جا رہا ہے۔ مگر وہ جھوٹ ہے۔ تو یہ سچ کیسے بن گیا اور اگر فریب ہے تو حقیقت کیسے بنا۔ گمان ہے تو یقیں کیونکر ہوا... اور... یقین ہی ہے... تو اتنی بے یقین کیوں ہوں میں۔

اور پھر اس اسٹیج پر کھڑی لڑکی، بلکہ خاتون کہنا چاہیے۔ ہاں تو اس خاتون کو شاید میری نظر کا ارتکاز محسوس ہوا۔ مگر اس وقت جب وہ مسکرا کر شیلڈ لے رہی تھی۔ تب اس کی نظر مجھ سے ٹکرائی... اس کی آنکھوں میں شناسائی کے رنگ ابھرے لحظہ بھر کو۔ بس... نظر ٹکرائی اور اس نے ہٹالی۔ وہ مریم احمد ہی تھی اور کہیں سے بھی وہ مریم احمد نہیں لگ رہی تھی۔

ہاں یہی اسکول ہی تو تھا... یہیں سے میں نے میٹرک کیا تھا۔

کئی سال پہلے... مجھے ایسا لگا جیسے وقت کا پہیہ پیچھے کی طرف گھوم رہا ہے۔ سن 2016ء کی دھوپ معدوم ہوتی گئی۔ لوگ معدوم ہوتے گئے دو ہزار تیرہ... دو ہزار بارہ... وقت، گھڑیاں الٹی گھومنے لگیں... اور ہوتے ہوتے اسی جگہ پر اسی اسٹیج پر... مارچ 1988ء کی سنہری دھوپ اتر آئی۔

ہر طرف شناسا سا چہرے ابھرنے لگے۔ اپنے گزر چکے غول کے پنچھی نظر آنے لگے۔ کم عمر، بے فکر، بے خبر، رنگ برنگ سوٹ پہنے، مسکراتی لڑکیوں سے گراؤنڈ بھر گیا۔

امنگ، ولولہ... جذبہ لیے... خوش، ہنستے معصوم چہرے... ہاتھ پہ ہاتھ مارتے... باتیں کرتے... کتنے پرجوش دکھائی دے رہے تھے۔

ہاں یہ ہی گراؤنڈ تھا... جو آج مزید کشادہ کر لیا گیا ہے... اور وہ دور پیچھے... جہاں ایک خوب صورت ہال ہے۔ تب ایک لان ہوتا تھا۔ خوب صورت سا... اور اسی لان میں تو بیٹھی تھیں۔ ہم تین، چار لڑکیاں...

ہمارے گروپ میں وہ آج بھی سب سے خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ اتنی مہنگی میکسی نہ بھی پہنتی... جو اس کے پاپا نے سعودی عرب سے بھجوائی تھی اس کے لیے، وہ تب بھی نمایاں ہی رہتی۔

اونچا قد خوب صورت نین نقش اور ذہانت چھلکاتی آنکھوں سے دیکھتی... وہ مقابل کو مسحور کر دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی اور ہم سب مرعوب ہو کے اس کی باتیں سنے جاتے۔ اس نے میک اپ نہیں کیا تھا پھر بھی وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ ہم تینوں بشریٰ کے میک اپ پر ہنس رہے تھے۔ سرخی ہونٹ کے گرد پھیلی تھی۔ کالے کالے گال بھی سرخ لپ اسٹک سے بھرے تھے۔ اس پر آنکھوں پر سرخ چشمہ لگا لیے۔ وہ بے چاری مضحکہ خیز سے بڑھ کر کچھ لگ رہی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے۔ آنکھ پر بھی اس کی اماں نے سرخی لیپ دی ہے۔ ہی ہی ہی..."

"آٹے کی بوری میں ایک بار سر ڈبو دیتی... کھی کھی کھی..."

"ارے نہیں... چونا کروالیتی، فنکشن سے ایک دن پہلے... ہاہاہا..."

"اسے دیکھو... بختاور بی بی کو..." بختاور بی بی کو...

ہم تینوں نے دیکھا۔۔۔ سرخ سفید فراک۔۔۔ فل میک اپ تھوپ کر وہ بھی کچھ دیکھنے کے قابل لگ رہی تھی۔۔۔ اگر وہ چٹیا نہ بناتی اپنی۔۔۔

"اتنی بھی بری نہیں لگ رہی' سوائے اس گردن پر لٹکتی چھپکلی کے۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔"

اس کے تھوڑے سے بالوں کی زبردستی لاغر سی چٹیا بنی تھی۔ وہ اسے بار بار پکڑ کر آگے کرتی اور ذرا سا سر ہلانے پر پیچھے ہو جاتی دوبارہ۔۔۔

ہمیں ہنسی آئی اس پر بھی۔۔۔ وہاں بیٹھ کر ہم ہنس ہی تو رہے تھے۔ بلاوجہ ذرا ذرا سی باتوں پر ہنسنا اور کام کیا تھا ہمارا۔ اور پھر چند لمحے سرکے۔۔۔ ساری لڑکیوں کو گراؤنڈ میں بٹھایا گیا۔ ٹیچرز کے لیے کرسیاں رکھی گئیں۔۔۔ میڈم تشریف لے آئیں۔ رزلٹ شروع ہوا۔

اور حسب توقع بیک وقت تین بھاری ٹرافیاں لیے۔۔۔ اعتماد سے مسکراتی۔۔۔ مریم احمد کا دلکش چہرہ سب کی نظروں کا مرکز بن گیا۔

بیسٹ اسٹوڈنٹ کا۔۔۔ پوزیشن لینے کا۔۔۔ اور اسپورٹس کی مایہ ناز کھلاڑی ہونے کا۔۔۔ وہ مسکرا رہی تھی اور ٹیچرز سے ہاتھ ملا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے پھوٹتی خوشی اور آنکھوں سے چھلکتی ذہانت' بے حد حسین لگ رہی تھی۔۔۔ اور لگنی بھی چاہیے تھی۔

اور وہ اسی اعتماد سے ہم دوستوں میں آکر بیٹھ گئی۔

ہماری نظروں میں اس کے لیے رشک تھا۔ ہم نے اسے مبارک باد دی' میں نے سیکنڈ پوزیشن لی تھی۔۔۔ سو۔۔۔ میں نے بھی اپنا انعام جاکر وصول کیا مجھے پتا تھا میری سیکنڈ ہی ہو گی' مریم احمد کے ہوتے ہوئے کسی بھی لڑکی کو سیکنڈ ہی ہونا تھا۔ اس پر فرسٹ کا ٹھپہ تھا جیسے پیدائش سے ہی وہ اول تھی۔۔۔ اس کے لیے اول ہی لکھا گیا تھا۔

اور اس وقت کتنا مذاق بنا۔۔۔ جب فیل ہو جانے والی لڑکیوں کے نام لیے گئے اور سب سے پہلے بختاور بی بی کا نام تھا۔ دوسری بار بے چاری فیل ہو رہی تھی اور جانے پچھلی رو سے کس لڑکی نے بے دھیانی میں تالی بجائی۔۔۔

اور دیکھا دیکھی تالیاں شروع ہو گئیں۔ بے چاری بختاور کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔

"یہ تالی بجانے کی بات ہے؟" عمر رسیدہ میڈم نے عینک کے اوپر سے گھورا۔۔۔ تب تک لڑکیوں کی تالیاں بھی ماند پڑ چکی تھیں۔ ہوش آگیا۔۔۔ کہ اوہو۔۔۔ تالیاں کیوں بجا رہے ہیں ہم۔۔۔

رزلٹ جاری تھا۔۔۔ اور اب نیکسٹ کلاس کا رزلٹ اناؤنس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور آج وہی اسکول تھا۔۔۔ وہی گراؤنڈ۔۔۔ مگر نقشہ بہت تبدیل ہو چکا تھا۔ سب چہرے اجنبی تھے۔ اسکول کی عمارت جدید ہو چکی تھی۔ دراصل حکومت کی طرف سے۔۔۔ اچھی کارکردگی دکھانے والے ٹیچرز کے لیے تقریب منعقد کی گئی تھی چھوٹی سی۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میرا مریم احمد سے سامنا ہو گا اور یوں ہو گا۔

شہر کے تمام اساتذہ مدعو تھے اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے شامیانے لگائے گئے تھے۔ کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر پیڈسٹل فین رکھے ہوئے تھے۔

آج تو یوں بھی دھوپ معدوم تھی۔ اتنی گرمی نہیں تھی' جتنی زیادہ لوگوں کی وجہ سے اور کچھ تھک جانے کی وجہ سے محسوس ہو رہی تھی۔ حبس سا ہو رہا تھا۔۔۔ اور شامیانہ ہلکی پھلکی نرم گرم ہوا کی بدولت کبھی بلند ہو جاتا اور پھر جھک جاتا۔

میری توجہ میسج ٹون نے کھینچ لی۔۔۔ انفہ کا میسج تھا۔

"ممی۔۔۔ آج شاید مجھے دیر ہو جائے۔ میرا پریکٹیکل ہے۔"

"اوکے بیٹا! جب فارغ ہو جاؤ تو میسج کر دینا۔ ڈرائیور کو بھیج دوں گی میں۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

مریم احمد اب دوبارہ دائیں طرف رکھی کرسیوں پر آکے بیٹھ چکی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں ایک بار پھر ٹکرائی تھیں۔ میری سمجھ میں آگیا۔ وہ یہ تو پہچان گئی

تھی کہ یہ شکل دیکھی بھالی ہے۔ مگر وہ شاید یاد نہ کرپائی۔۔۔ مجھے بھول جانا کون سی بڑی بات تھی۔ ہاں جہاں تک مریم احمد کی بات تھی۔ وہ جتنی بھی بدل جائے۔ وہ مریم احمد تھی۔ وہ بھولنے کی چیز تھی ہی نہیں۔

☆ ☆ ☆

"مریم احمد۔۔۔" میں نے پھر تصدیق چاہی۔

"حنا فاروق۔۔۔" اس نے مسکرا کر دہرایا۔۔۔ اور ہم ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

"کیسی ہو حنا؟ کیا کر رہی ہو آج کل۔۔۔" ہم دونوں ہی عجیب سی کیفیت کا شکار تھے۔ خوشی بھی۔۔۔ دکھ بھی۔۔۔ اپنے ایک حسین وقت کو پیچھے چھوڑ دینے کا احساس۔۔۔ بہت آگے بڑھ جانے کی بھی مسرت۔۔۔

جب بہت سال بعد آپ کو اپنے بچپن کا کوئی ساتھی ملے۔۔۔ تو بہت سی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ ہم کتنا آگے آ جاتے ہیں اور کتنی چیزیں پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔۔۔ کوئی بہت سال آگے جا کر ہی جان سکتا ہے۔

"تم۔۔۔ تم آج کل کیا کر رہی ہو مریم؟ بہت بدل گئی ہو۔" میں نے اسے دیکھا۔ مجھے لگا اس کی مسکراتی آنکھوں میں اداسی کے سائے لہرائے ہوں۔

"ہاں۔۔۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔۔۔ "بدل گئی ہوں شاید۔۔۔ تم سناؤ، کیسی جا رہی ہے لائف۔۔۔ ہزبینڈ کیا کرتے ہیں تمہارے۔۔۔؟"

"آفس جاب کرتے ہیں۔"

"اور بچے؟"

"ماشاء اللہ۔۔۔ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں، انفہ اب ایم ایس سی کر رہی ہے۔۔۔ بختاور کی بھانجی بنی ہوں نا میں۔۔۔ یاد ہے بختاور۔۔۔"

"بختاور۔۔۔" اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"بختاور بی بی۔۔۔ کی بھانجی بنی ہو۔" وہ حیران تھی۔

"ہاں۔۔۔" میں مسکرائی۔

"اچھا۔۔۔ گڈ۔۔۔" نالائق تھی۔۔۔ مگر اچھی لڑکی تھی اور وہ کیا کر رہی ہے آج کل۔۔۔"

"دبئی میں ہوتی ہے۔"

"خود تو ایک کلاس میں دو سال لگاتی تھی۔ مگر جس سے شادی ہوئی ہے وہ ٹاپر ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے مزید اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اچھا۔" وہ ہنس دی۔

"تم سناؤ، کتنے بچے ہیں، کیا کرتے ہیں تمہارے ہزبینڈ۔۔۔؟" ہماری گفتگو جاری تھی، برسوں بعد ملے تھے۔ بتانے کو بہت کچھ تھا۔ نہ بتانے کو بھی بہت کچھ تھا۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ کبھی کبھار ہمارے پرانے دوست ہمارے لیے ڈھارس بن جاتے ہیں۔ سہارے جیسے۔ وہ ہمیں کچھ نہیں دیتے۔۔۔ پھر بھی دل کو سکون ملتا ہے۔ ان سے باتیں کر کے۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ ہمارے خوش گوار وقت کے ساتھی ہوتے ہیں۔۔۔ مجھے خوشی ہوئی مریم سے مل کر اور مریم کو مجھ سے مل کر۔۔۔

"ہاں۔۔۔" وہ چپ ہو گئی۔ "ایک بیٹی ہے۔ بس۔۔۔" میرے موبائل پہ کال آنے لگی تھی۔ اسفند تھے۔۔۔

"تمہیں دیر تو نہیں ہو رہی؟" اسے جیسے خیال آیا۔

"مجھے تو نہیں مگر یہ اسفند۔۔۔ بیٹی بھی، پھر ان ہی کی طرح ضدی ہے۔ اچھا تم سیل نمبر دے دو اپنا، میں جلد رابطہ کروں گی تم سے۔"

"ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔" وہ پرس کھول کے موبائل نکالنے لگی۔

موبائل نمبر کے تبادلے ہوئے۔

"اور تمہارے ہزبینڈ؟" مجھے دوبارہ اپنا سوال یاد آیا۔

"بتاؤں گی حنا، آرام سے۔۔۔" اس نے مسکرا کر بات ٹالی۔

"اچھا۔۔۔" کچھ کچھ میری سمجھ میں آ بھی رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کبھی کبھی، بیک وقت سمجھ میں آنا۔۔۔ اور نہ آنا۔۔۔

⁂ ⁂ ⁂

وہ آج پھر میرے سامنے تھی۔۔۔ میرے گھر کے لان میں۔ ہلکی ہلکی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔۔۔ اور وہ چائے کے گھونٹ بھرتی ہوئی آہستہ سے بول رہی تھی۔

"بعض اوقات ہم اتنے برے نہیں ہوتے۔۔۔ جتنا برا ہم سے ہو جاتا ہے۔" اس کی آواز دھیمی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں تلے حلقے کتنے گہرے تھے۔

میں نے دیکھا' وہ شان دار اور عالی شان ڈریسنگ کرنے والی لڑکی۔ کتنے عام سے سوٹ میں تھی۔۔۔ مجھے یاد ہے' وہ اونچی پونی ہلاتے ہوئے کہا کرتی تھی۔

"فیشن وہ نہیں جو چلتا ہے مارکیٹ میں۔۔۔ مریم احمد کا فیشن وہ ہے جو اس کا دل پسند کرتا ہے۔۔۔ وہ جو میں چاہوں اپنے لیے' وہ نہیں جو لوگ پسند کریں۔"

اور ہم مرعوب ہوئے اسکی باتیں سنے جاتیں۔

ٹھیک ہی تو کہتی تھی' لڑکیاں اسے فالو کرتی تھیں۔ وہ جو بھی اسٹائل بناتی۔۔۔ ہوتے ہوتے وہی سب لڑکیوں میں ان ہو جاتا۔ اس کے کپڑے نت نئے ڈیزائن کے ہوتے تھے' منفرد۔۔۔ خوب صورت۔ اس کی پسند اعلا تھی۔ ڈریسنگ بھی۔۔۔ اس کے کپڑے فیشن تک محدود نہ تھے۔ جس ڈیزائن کا سوٹ چاہا۔۔۔ جیسا چاہا بنوا لیا۔

ایک بار میں اس کے ساتھ۔۔۔ اس کے گھر پر منعقد سالگرہ کی دعوت پر گئی تھی۔ تب اس کی ایک خالہ کہہ رہی تھیں۔

"ہاں! بہت ضد کر کے بنوایا ہے اس نے تو۔۔۔ کہاں۔۔۔ بس جو بھا جائے اس کے دل کو۔۔۔ جیسا سوچ لے۔۔۔ ویسا بنوانا ہوتا ہے۔۔۔ وہی پہننا ہوتا ہے۔ اتنے تو نخرے ہیں اس کے۔" اکلوتی خالہ تھیں اور اکلوتی ہی بھانجی تھی۔

ان کے لہجے میں بھانجی کے لیے شفقت تھی۔ وہ اس کی ماں جیسی ہی تھیں۔ کیونکہ پانچ بیٹے تھے اور ایک بھی بیٹی نہیں تھی۔

"ارے۔۔۔ تو پھر ہوتے بھی سب سے مختلف ہیں میری بیٹی کے۔۔۔" اس کی ماں کے لہجے میں محبت اور مان تھا۔

مجھے یہ بات اس لیے یاد تھی کہ پھر گھر آ کر کتنی ہی دیر میں نے اپنا اور اس کا موازنہ کیا تھا۔ میری ہاؤس وائف ماں۔۔۔ ایک ہی درزن سے کپڑے سلواتی تھی اور میں نے کبھی فیشن کے مطابق کپڑے بنوانے کی ضد نہیں کی تھی۔

مریم احمد ہم دوستوں میں بھی تو ملکہ جیسی ہی تھی۔۔۔ وہ مغرور نہیں تھی۔ خوش اخلاق تھی۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ اسے اپنی قابلیت کا اندازہ تھا۔ سو اس لیے گردن اٹھا کے چلتی۔۔۔ چلنا بنتا تھا۔ وہ جانتی تھی۔۔۔ وہ کون ہے۔۔۔ اور کتنی اہمیت رکھتی ہے۔

مجھے پرانی مریم یاد آئی۔۔۔ اور میں نے نئی مریم کو دیکھا۔۔۔ افسردگی کا گہرا احساس میرے اندر تک اتر گیا۔

"تم نے پھر بھی مجھے پہچان تو لیا۔۔۔ میرا خیال تھا شاید تم نہ پہچان سکو۔ مجھے ایک بار اریبہ ملی تھی۔ اپنی بیٹی کے لیے میرے پاس آئی تھی۔ مس۔ مس کہہ کے بات کرتی رہی۔ وہ انتہائی جلدی میں تھی۔ مگر پھر بھی۔۔۔ مجھے بہرحال پہچان نہیں سکی وہ۔۔۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پھر بھی میں نے اسے تسلی دی۔ "تم بھول گئیں۔۔۔ اریبہ کتنی بھلکڑ ہوتی تھی۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ مس نے اسے رجسٹر دے کر کیا بات کہی ہے۔ دوبارہ جانا پڑتا تھا۔"

وہ ہنس دی۔ "ہاں شاید۔۔۔"

"مجھے اندازہ نہیں تھا۔ جہاں زیب ایسے نکلیں گے۔ تم تو بہت خوش تھیں مریم' مجھے یاد ہے' جب آخری بار ہم ملے تھے۔ شاید کسی تقریب میں میٹرک کے ایک دو سال بعد۔ تم نے مجھے بتایا تھا ان کے بارے میں۔ تب تمہاری شروع شروع کی جان پہچان تھی ان سے۔"

"ہاں۔۔۔!" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔۔۔ "ان دنوں تو ہواؤں میں اڑا کرتی تھی میں۔۔۔ کم عمری تھی۔۔۔ یک

طرفہ پسندیدگی تھی۔ پتا نہیں۔۔۔ شاید کوئی وقت ہی ایسا ہوتا ہے جب ہم اتنے بے وقوف ہوجاتے ہیں کہ خود کو عقل کل سمجھنے لگتے ہیں۔

اور رفتہ رفتہ بات بڑھی' ہماری دوستی بھی ڈیڈ نہیں مانتے تھے۔ جہاں زیب کا فیملی بیک گراؤنڈ اتنا اچھا نہیں تھا۔ مگر وہ ایک اعلا پوسٹ پر تھے۔ اچھا کماتے تھے اور میرے لیے اتنا کافی تھا کہ میں ان میں انٹرسٹڈ تھی۔ میں نے بہت ضد کی۔ مما کے آگے بھی ڈیڈ کے سامنے بھی۔ حتیٰ کہ میں نے ان کے طے کیے گئے رشتے کو خود فون کرکے انکار کردیا تھا۔ تو پھر مجھے سزا تو ملنی تھی۔ حالانکہ آنی کی شدید خواہش تھی مجھے بہو بنانے کی۔ علی سے میری منگنی بھی کروادی بابا نے۔۔۔ ابھی تک جہاں زیب نے مجھے پرپوز نہیں کیا تھا اور جب کیا تو میں نے بخوشی ساری فیملی کی مخالفت مول لے لی۔ میں نے علی کو فون کرکے خود انکار کردیا۔ اور دیکھو آج تک بھگت رہی ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"بس جو ہوچکا ہے مریم۔۔۔ اسے بھول جاؤ۔"

"بھول ہی تو جانا چاہتی ہوں۔ بھول چکی ہوں بہت کچھ۔۔۔ کتنی ہی بار جہاں زیب نے شراب میں دھت ہوکر مجھے تشدد کا نشانہ بنایا۔ بعد میں پیر پکڑنے تک آجاتے تھے۔ میں محبت میں معاف کرتی رہی۔ وہ جانتا تھا۔ میں کشتیاں جلا کر آئی ہوں۔ سو۔۔۔ اس بات کا فائدہ اٹھاتا تھا وہ میں نے پرائی عورتوں کو بھی برداشت کیا ہے اپنے گھر میں۔۔۔ اور وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ جب اپنی گیارہ سالہ بیٹی کے ساتھ اس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔

میں بابا کے گھر بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں نے بابا کو کبھی بتایا ہی نہیں۔ کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ میں سمجھتی تھی میرے بابا ناواقف ہیں اور مجھے خوش و خرم سمجھ رہے ہیں۔ مگر میری غلط فہمی تھی۔ میرے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا' میں کتنی خوش ہوں' حالانکہ میں بہت کم گئی تھی شادی کے بعد میکے۔ جہاں زیب کو پسند نہیں تھا اور میں بابا اور سب کے سامنے بہانے گھڑ لیتی۔ اس رات مجھ میں ہمت نہ ہوسکی کہ بابا کے گھر جاؤں۔

میں تین دن اپنی آنی کے گھر رہی' پھر گھر والوں کو کچھ گڑبڑ کا پتا چلا۔۔۔ میں نے آنی کے ذریعے کرائے کے گھر کا بندوبست کیا تھا۔ بابا آئے تھے مگر میں اب کس منہ سے اس گھر جاتی۔ اور شکر ہے کہ میری شرمندگی اور ندامت دیکھ کر انہوں نے مجبور نہیں کیا۔

میں نے پوری کوشش کی تھی حنا۔۔۔ جہاں زیب کے ساتھ نبھانے کی' تم تو جانتی ہو۔۔۔ شکست میرے لیے کتنی تکلیف دہ ہوتی تھی۔ اور میں نے زندگی کے سب سے بڑے امتحان میں کیسی کیسی کوششیں نہیں کیں۔ کامیاب ہونے کی۔ مگر۔۔۔ بدخصلت لوگ کبھی نہیں بدلتے۔ اگر کوئی فتنہ برپا کرنا چاہے' تو اس کے لیے وہ کسی وجہ کا محتاج نہیں ہوتا۔ کوئی وجہ نہ بھی ملے تو بھی سے فساد برپا کرنے والے کو فرق نہیں پڑتا۔ جہاں زیب بھی۔۔۔ کم از کم کسی وجہ کا محتاج نہیں تھا۔ میں نے پوری کوشش کی حنا' نبھا کرنے کی مگر۔۔۔" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"پھر بھی۔۔۔ میرے ہاتھوں میں طلاق کے کاغذ آگئے۔ اس نے ایک اور شادی رچالی۔۔۔ اور میں۔۔۔ اب کئی سالوں سے۔۔۔ اکیلی رہ رہی ہوں۔"

مجھے تنہائی کے ان سالوں نے اتنا نہیں بدلا حنا! بدل تو میں تب گئی تھی۔ وہ بھیانک وقت جو میں نے جہاں زیب کے ساتھ گزارا تھا اور اس وقت کے گزر جانے کے بعد۔۔۔ بہت بعد مجھے پتا چلا میں خود کو کھو چکی ہوں۔ میں وہ مریم احمد نہیں رہی جو میں تھی۔ میں خود سے بچھڑ کر۔۔۔ بہت دور جاچکی ہوں اور اس دن کتنے ہی سائے میرے اندر اتر گئے۔ جب ہابیہ بولی۔

"مما! میرا فیشن وہ ہے' جو مجھے اچھا لگے۔ جو ہابیہ کا دل پسند کرے۔۔۔ ہابیہ کے لیے۔۔۔" اور میری آنکھوں میں مسکراہٹ اور نمی بیک وقت آگئی تھی۔

تب مجھے کوئی اور یاد آیا حنا... تم نہیں جان سکتیں۔
اس دن میں کتنی تکلیف میں تھی۔ میں کتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ کتنے عرصے بعد کتنے منظر میری نگاہوں میں گھومتے رہے تھے۔ وہ ہنستی ہوئی مریم' وہ قہقہے لگاتی' دوستوں کے جھمگٹے میں نمایاں رہنے والی مریم... وہ محفلوں میں چھا جانے والی مریم... اعتماد سے مسکراتی' ٹرافیاں اپنے حق کی طرح وصول کرتی مریم... نہ جانے کب سے وہ تھوڑی تھوڑی کر کے بچھڑتی رہی مجھ سے...

میں اس رات بہت روئی تھی حنا... بہت روئی تھی... تم نہیں جان سکتیں میری تکلیف... میں کتنا دور جا چکی تھی زندگی سے' تمہیں اندازہ نہیں حنا... وہ مریم احمد... زندگی تو اس کے اندر جیا کرتی تھی۔ میں نے روتے ہوئے طے کیا تھا کہ نہیں' مریم احمد کو یوں شکستہ اور ہارا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ میں جانتی ہوں۔"
اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
"وہ مریم احمد مجھے کبھی نہیں مل سکتی۔ لیکن میں اسے اب تلاش کرتی ہوں..." وہ رکی۔

میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ہمت' حوصلہ' وہ ابھی بھی... آج بھی مضبوط لڑکی تھی۔
"میں اسے جتنا تلاش کر سکتی ہوں حنا... وہ تم نے کل دیکھا تھا۔ کل مجھے ملا تھا۔ آئیڈیل ٹیچر ایوارڈ... ایک چھوٹا سا' بہت عام سا ایوارڈ مگر وہ میرے لیے خاص تھا۔ کیونکہ وہ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ نہیں تھا۔ میرے لیے وہ میری تلاش کے ناکام نہ ہونے کا عندیہ تھا۔ وہ حوصلہ تھا کہ مجھے مریم احمد کے حصے مل رہے ہیں۔ میں نے مریم احمد کا کچھ حصہ تلاش کر لیا ہے جس میں عزم' کوشش اور حوصلہ شامل تھا۔
اور ہابیہ... میری بیٹی... وہ مجھے زندگی کی طرف لائی ہے۔ میں اب جینے لگی ہوں اپنی بیٹی کے لیے۔ زندگی میں بے شک وہ رنگ وہ رعنائیاں نہیں رہیں' لیکن میں اب خوش رہتی ہوں۔ بہت آگے آ چکی ہوں اس کرائسس سے..."

وہ مسکرا دی اور میری آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔
"مجھے خوشی ہوئی مریم... تم اپنی زندگی میں لوٹ آئیں۔"
وہ مسکرا دی۔
"ہاں... میں نے ایک بھیانک سبق سیکھا' ورنہ وہ وقت جو تکلیف وہ تھا۔ میرے پیچھے پڑا رہتا۔ اگر میں بھاگ کر... کوشش کر کے خود کو آگے نہ لے آتی... اگر ہابیہ میری بیٹی نہ ہوتی۔" وہ خاموش ہو گئی۔ ہوا اب بھی خوش گوار تھی۔
"تم یہ کیک لو نا گھر پہ بنایا ہے میں نے..."
وہ ہنس دی۔ "ہاں کیوں نہیں۔"
مجھے اسفند بتا رہے تھے کہ تمہاری کوکنگ بری نہیں' انتہائی بری ہے۔
میں بھی ہنس دی۔ میں عادی تھی اسفند کے اپنے بارے میں ایسے ریمارکس سننے کی...
خاموشی ایک بار پھر... ہمارے درمیان چھا چکی تھی اور مریم لان میں بکھرے پتوں پہ نظر جمائے کہیں کھوئی ہوئی تھی' میں بھی خاموشی سے پلیٹ میں کانٹا چلانے لگی۔
اور وقت کے ہاتھوں مریم احمد کو سکھایا گیا سبق تحریر ہونے لگا۔
"وہ پتے... جو قدر نہ کریں۔ شجر سے اپنے مضبوط تعلق کی' جو وقتی ہوا کے سرور میں' درخت سے اپنا سالوں کا تعلق بھلا بیٹھیں۔ ان کی منزل بے سمت ہوتی ہے اور تقدیر قابل رحم..."
برگ... جو بے رحمی سے پرانے ناطے توڑ لیں... نگر نگر گھومنے والی ہوا کے بہکاوے میں آ کر... وہ بے مول ہو جاتے ہیں اور یہ نقصان کبھی نہیں بھرا جا سکتا۔

فرزانہ کھرل

اس وادی میں قدم رکھنے تک وہ حیرت کے تمام جہانوں میں سفر کرچکی تھی۔ اس برف پوش سفید پناہ گاہ کے سامنے ٹھہر کر، اسے دیکھ کر اس کا نڈھال جسم ٹھنڈ سے کپکپا اٹھا... وہ سفید قیام گاہ اس کے اندر کیوں دھڑکنے لگی تھی۔

اس کی سوچ تک کسی اور کی رسائی کیسے ممکن تھی۔ وہ صرف اس کا خواب تھا پھر کسی اور کی آنکھوں میں کیونکر اتر پایا... اگر یہ عمارت اسی خواب کی تعبیر تھی تو اتنی کامل تعبیر کس کے شدت عشق نے مجسم حقیقت میں ڈھالی تھی۔

"کیا تمہیں وہ اولین گیت یاد ہیں؟" کاٹ دار ہوائیں سماعتوں میں چنگھاڑیں۔

اس نے ایک جھرجھری لی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ دور نہیں۔

"یہیں کھڑی رہو گی تو تمہاری قلفی جم جائے گی۔ اندر آجاؤ مینو!"

اس کے قریب سے گزرتی کاشیہ نے کپکپاتی آواز میں کہا تو اس کے منجمد وجود نے حرکت کی۔ اینکسی کے اندر آتے ہی ان سب کی پہلی ترجیح آتش دان میں جلتی سرخ نارنجی "آگ" تھی۔

مکمل ناول

"اف کیا کڑا کے کی سردی ہے۔" کاشیہ نے دستانے اتار کر ہاتھ آپس میں مسلے اس کا شوہر کھل کر مسکرایا۔

"میں نے اچھا کیا ناں..... شذرہ کو اس کی دادی کے پاس چھوڑ آئی۔"

"آپ برا کب کرتی ہیں۔" کرنل مبین مسکرائے۔ "آپ کی طوفان نما بیٹی میری بوڑھی ماں کا تو حشر کر دے گی۔"

"تو جی..... بچی کو نہ بھیجوں تو دادی ناراض..... بھیج دوں تو بیٹے کو بہو ظالم لگنے لگتی ہے۔" وہ پیچھے کھسک کر منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ وہ ان دونوں میاں بیوی کی نوک جھونک سے محظوظ ہوتی ان کے پاس چلی آئی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی زندگی پہ پڑے کئی گرد آلود پردے اس وادی کی ہوا اکھاڑ پھینکے گی۔

☼ ☼ ☼

وہ تینوں اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ دوسرے دن کہیں دوپہر کو بیدار ہوئے۔ وہ باہر آئی تو دونوں میاں بیوی کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"تمہارا ناشتہ ٹیبل پہ موجود ہے۔ ہم نے تمہارا انتظار کیے بغیر کر لیا۔ سوری۔"

کاشیہ کی سوری پہ اس نے آنکھیں دکھائیں تو وہ ہنس دی۔

"ناشتہ آپ نے بنایا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کرنل صاحب کے دوست نے بھجوایا ہے۔"

"ہنہ گڈ.....!" مگر ٹیبل پہ دھرا ناشتہ دیکھ کر اسے حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ ناشتے کے تمام لوازمات اس کے پسندیدہ تھے۔ میدے کا پراٹھا، ہری مرچوں سے بھرا آملیٹ اور سفید جہازی مگ میں ڈارک براؤن چائے اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی۔

"اوون میں چائے گرم کر لینا۔" کاشیہ کی ہدایت اس نے غائب دماغی سے سنی..... اس کی بھوک نے چمک کھو دی تھی اس نے چائے گرم کی اور سٹنگ روم میں ان دونوں کے پاس آ گئی۔

"اب دونوں خواتین کا کیا پروگرام ہے؟" کرنل مبین کی آواز میں بشاشت نمایاں تھی۔

"مبین بھائی یہ رہائش گاہ کس کی ہے؟" جواب کے بجائے اس نے الٹا سوال داغ کر انہیں بری طرح چونکایا۔ دونوں میاں بیوی نے غائب دماغی سے پہلے اسے پھر ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھا۔

"دوست کی ہو یا دشمن کی ہمیں تو یہاں قیام کرنے سے غرض ہے۔" وہ خود کو سنبھال کر بولے۔

"اوہ! دو بج گئے' یہاں تو دوپہر کو ہی شام کا گماں ہوتا ہے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پھر باہر چلتے ہیں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ اس ذرا سی لڑکی کے اندازے اور انداز انہیں سٹپٹا گئے تھے سو انہوں نے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے وہاں سے کھسکنے میں عافیت جانی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" کاشیہ ہلکا سا مسکرا کے شوہر کے پیچھے لپکی۔

کچھ تھا۔ کچھ تھا کہ وہ اپنے احساسات کے بدلتے رنگ' ڈھنگ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ ان کے پیچھے ہی اٹھی..... تیار بھی ہوئی مگر کہیں بھی ان کے ساتھ جانے میں اس کی دلچسپی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

دوپہر نے شام کی طرف سرکنا شروع کیا۔ وہ ذرا ہی دور آئی تھی کہ ایک خوشبو نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

وہ وہم نہیں تھا اس کے پاؤں کے نیچے برف دبنے کی کرنچ مدھم ہوئی پھر معدوم ہوئی۔ وہ ساکت تھی بھاری قدم اس کے قریب رکے تھے۔ کبھی اس خوشبو کی تلاش نے بڑے سے بڑے شاپنگ مالز کی بڑی بڑی برانڈڈ دکانوں پہ اسے بھٹکایا تھا' کتنے ہی مہنگے ترین پرفیومز اس نے خریدے' کچھ پھینک دیے' کچھ کسی کو دے دیے مگر وہ کبھی اس خوشبو کا پتا نہ پا سکی' یہاں اتنی دور اس برفیلی وادی میں یخ بستہ ہواؤں میں وہی خوشبو اس کے اردگرد تھی۔ اس کے قریب تھی۔ یہ الوژن نہیں تھا۔ خواب بھی نہیں تھا۔ دل۔۔۔ دھڑکا۔

تم کہو' تمہیں یہ حادثہ کیسا لگا
ہمیں تو بسنے سے اجڑنا اچھا لگا

اس کے کان کے قریب آواز ابھری تھی دھیمی سی' جلتی بجھتی سی آنچ دیتی ہوا کو آگ لگاتی۔ یہ آواز بلاشبہ وہی تھی۔ وہ کسی خودرو پودے کی طرح اچانک اس کے سامنے اگا تھا پھر اس کے مقابل یوں جم کر کھڑا ہوا کہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھاتی تو اس چٹان جیسے شخص سے ٹکرا کے رہ جاتی۔ پورے بارہ سال اس نے رب عظیم سے گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں کہ قبروں سے دوبارہ اٹھائے جانے کے دن بھی ہم دونوں کا سامنا نہ کرانا۔ دعائیں رائیگاں گئیں۔۔۔ تب ہی تو۔۔۔ وہ لمحہ موجود میں تھا۔ اس کے ہونٹوں سمیت ہر شے نے سفید رنگت اوڑھ لی تھی۔ وہ اس کی پوری کھلی متوحش آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"یا خدا۔۔۔ یا خدا۔۔۔" نمکین پانی اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگا۔ سامنے کھڑے شخص کی نگاہوں کا ارتکاز نہیں ٹوٹا تھا۔ منجمد پلکیں ذرا سا اٹھیں اور خود پر گڑی نگاہوں میں الجھ کر رہ گئیں نظروں کے تصادم نے اسے ہپناٹائز کر دیا۔

"اب نظروں جھکا کر دیکھو جھکا سکتی ہو۔۔۔ جھکا پاؤ گی۔" ایک' دو کتنے ہی لمحے سرکنے لگے۔۔۔ گھرر' گھرر کی آواز سماعتوں سے دور ہوئی۔

"بارہ سال اپنے رب کریم سے ایک ہی دعا مانگتا رہا ہوں کہ زندگی میں بس ایک بار ہی اسے میرے مقابل لے آنا۔ میرے روبرو کرنا۔" یخ ہواؤں سے بے نیاز پُر حرارت نگاہوں سے اسے تکتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔

"میں پگھل جاؤں گی' پانی بن کر کسی پوشیدہ رستے کو جاتی ندی کا حصہ بن جاؤں گی۔ مجھ پر سے اپنی حرارت آمیز نگاہیں ہٹا لو۔ پلیز۔" اس نے اپنی آنکھیں زور سے میچیں۔ دو آنسو رخساروں پہ آ کے جم گئے۔

"میری وحشتوں کا مداوا۔۔۔ بس یہ دو آنسو۔" وہ عجیب سے ضدی لہجے میں بولا۔

وہ گھر سے اتنا دور نہیں تھی مگر وہ اپنے قدم پیچھے کیسے ہٹائے۔ کیا وہ الٹے قدموں بھاگنا شروع کر دے۔ اس نے کوشش کی۔ مگر ایک انچ پیچھے نہیں ہٹ سکی۔ شام کے دھندلکوں میں اس کی یخ بستہ سماعتوں میں ایک سرگوشی ٹوٹے ستارے کی طرح چمکی۔

"میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟"

چہار سو گھپ اندھیرا تھا۔۔۔ اس کا دل یک بارگی اتھاہ گہرائیوں میں اترا۔

وہ برفانی نیند میں اترنے لگی اس نے لب کھولنے چاہے۔

تیرا پیار کہرے کی بوند تھا۔۔۔ دل مضطرب پہ جو جم گئی
تیری یاد جاڑے کی شام تھی سو ٹھہر گئی اور ڈھل گئی

یہ آخری الفاظ تھے جو اس کے سُن ہوتے ذہن میں لہرائے تھے ابھرے تھے' اس کے ہاتھوں نے ایک واٹر پروف جیکٹ کو پکڑنے کی کوشش کی اس کے بعد اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

اسے وہ آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔ کوئی بے قراری سے اسے پکار رہا تھا۔۔۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اس کا رخسار ایک بھاری ہاتھ نے تھپتھپایا۔

"آنکھیں کھولو پلیز۔" اس کی سوئی حسیں بیدار ہونے لگیں۔ اسے یاد آنے لگا۔ وہ اپنے حواس کن حالات میں اور کیونکر کھو بیٹھی تھی۔۔۔ اسے اور بھی بہت کچھ یاد آنے لگا۔

"مینو! آنکھیں کھول دو پلیز۔" غصہ۔۔۔ تفکر۔۔۔ نرمی۔۔۔ یا محبت۔ اس کی آواز ان احساسات سے عاری تھی یا نہیں۔ مگر وہ آواز جان لینے اور جان نثار کرنے جیسی تھی' حیرت انگیز طور پر دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ اسے ہوش میں۔۔۔ آتا دیکھ کر وہ ایک دم سیدھا ہو کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے

یہ اس قدر سناٹا اور خاموشی تھی کہ وہ قیامت تک اب کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

پھر وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔۔ کمرے سے جاتے ہوئے دروازہ دھڑام سے بند ہوا تھا۔ کمرے میں نظر دوڑائی تو وہ انیکسی کا ہی بیڈ روم تھا۔

وہ تو بے سمت اور ہجرت زدہ پرندوں تک کو دیکھنا چھوڑ چکی تھی کہ کیا خبر کوئی اس دشمن جاں کا پیغامبر نہ ہو۔ پھر وہ خود کیسے؟ اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ وہ عالم بے ہوشی میں یہاں تک کیسے پہنچی۔۔۔ تو کیا وہ اسے اٹھا کر۔ اس کا پورا وجود کانپا۔۔۔ اس کی گردن سے لپٹی شال سے وہی خوشبو پھوٹی۔۔ حشر برپا ہوا۔۔۔

تیری آس ایسا جہان تھی۔

کبھی چل پڑی کبھی تھم گئی۔

کیوں' کیوں؟ اب کیوں؟ اس کے اپنے ہی سوال اس میں ہی ابھرتے اور مٹتے رہے۔

بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ گرم پانی کا فلاسک بھی موجود تھا

اس نے بیگ سے نیند کی گولیاں نکالیں جنہیں وہ ہمیشہ اپنے بیگ میں رکھتی تھی۔ دو گولیاں ہتھیلی پہ رکھیں پھر گلاس میں پانی انڈیلا اور اپنے ماؤف ہوتے حواس کے ساتھ دونوں نگل لیں۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا پڑا۔ وہ محبت نہیں بس چاہت تھی۔ وہ چاہت بھی نہیں بس خواہش تھی۔ ایک جذبہ تھا یا پھر خواب۔ ان ہی الفاظ کو دہراتے' دہراتے اس پہ غنودگی غالب آنے لگی۔

☆ ☆ ☆

وادی نلتر پر اترنے والی آج کی رات اس کی گزشتہ بارہ سالہ زندگی کی تمام بوجھل بھاری اور طویل راتوں سے ہٹ کر تھی۔ اس نے سرخ جلتی بکھرتی سلگتی راکھ کو ایش ٹرے میں جھٹکا۔ موسم کی شدت سے بے نیاز پچھلے کئی گھنٹوں سے راکنگ چیئر سنبھالے وہ بے تحاشا سگریٹ پھونک چکا تھا۔ کمرے میں ملگجی روشنی اس کی اس بے قراری اور اضطراری کیفیتوں سے واقف تھی

مگر آج کچھ حد سے سوا تھا۔

صرف ایک بار میرا سامنا ہونے پر تمہاری مضبوطی کی اوقات مجھ پہ کھل گئی۔ اس نے بے چین سا سانس بھر کے پورا سگریٹ مسل دیا۔

"کیا اللہ صرف تمہارا تھا؟" ایک تلخ سی بے رنگ سی مسکراہٹ نے اس کے بے رنگ ہونٹوں کو چھوا

" اللہ صرف تمہارا نہیں تھا مینو۔!" اس نے دائیں بائیں سر جھٹکا' پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر خود کلامی کی۔

"اگر ہر بار سامنا ہونے پر ہوش و حواس کھو دوگی تو میری اجاڑ زندگی کا حساب کیسے دے سکو گی۔ میری زندگی سے نکل جانا تمہارے لیے کس قدر آسان تھا۔"

اس کی دھڑکنوں تک میں کانٹے چبھے۔ آج محبت نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر اسے تسلی دینا چاہی تھی' آج محبت کا رنگ بدلا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

تمام رات وہ سوتی جاگتی رہی اسے محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہجوم اس کے کمرے میں آ۔۔۔ جا۔۔۔ رہا تھا۔۔۔ خواب میں اس نے اپنا بچپن بھی دیکھا۔ نازنین نے اس سے گڑیا چھینی تھی اور تیسری منزل سے نیچے پھینک دی۔ وہ روتی رہی۔ چلاتی رہی' نہ کسی نے اسے چپ کروایا نہ کوئی اس کی ٹوٹی پھوٹی گڑیا واپس لے آیا۔ وقت گزر گیا۔ گڑیا کی چوٹیں اب ٹھیک نہیں ہو سکتی تھیں۔

اس نے ایک اور خواب دیکھا' کاشیہ کے گھر میں بیل پہ صرف سفید پھول آتے تھے' اس بیل پہ ایک سرخ گلاب بھی کھلا ہوا تھا پھر اس کی پتیاں مرجھانے لگیں۔۔۔ وہ بکھر گیا' زمین پہ گری خشک پتیاں' لوا نے سمیٹ کر انہیں کئی محرابوں پہ لپیٹ دیا ان پتیوں سے لوبان کی خوشبو آنے لگی۔۔۔ گلاب لوبان کی خوشبو دینے لگا ایسی خوشبو بھی آنے لگی جو درگاہوں پہ دیے کی جلتی لو سے آتی ہے۔

اس نے وہ دن بھی دیکھا جب نازنین نے اسے آسمان سے نیچے پٹخا تھا۔ وہ روئی کیوں نہیں تھی؟ کیا اسے تکلیف ہوئی تھی؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ہتھیلیوں پہ لوبان کی اور جلے ہوئے تیل کی خوشبو پھوٹی پھر کسی لباس سے اٹھنے والی خوشبو اس کے رخساروں پہ رینگی۔۔۔ پندرہ' اکیس' پینتیس۔۔۔ پچپن۔۔۔ ہاں اس نے اتنے ہی پرفیوم توڑے ہوں گے۔۔۔ پھر یہ خوشبو۔۔۔ ایک ہجوم پھر سے اس کے کمرے میں آنے جانے لگا۔

اگلے دن وہ بیدار ہوئی تو نہ صرف اس کا سر بھاری تھا بلکہ پورے وجود پہ ایک نامعلوم سی تھکن غالب تھی۔ اس نے غٹاغٹ پانی کا گلاس حلق میں انڈیلا پھر بھی اسے خشک ہی محسوس ہوا۔ کیا یہ دونوں میاں بیوی باخبر ہیں کہ وہ اسی وادی میں موجود ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میرے ساتھ اس سے بدتر وہ اور کیا ظلم کر سکتے ہیں۔ اس کا ذہن تیزی سے سوال و جواب کے تانے بانے بننے لگا۔ وہ بستر چھوڑ کر اضطراری کیفیت میں کمرے کے چکر کاٹنے لگی۔

"اوہ تم جاگ گئیں۔" اس نے مڑ کر آواز کی سمت دیکھا' ادھ کھلے دروازے سے کاشیہ کا صرف چہرہ نظر آرہا تھا۔ اس نے شکوہ آمیز غصیلی نگاہوں سے اسے گھورا۔

"باہر آجاؤ' میں نے ناشتا پلس دوپہر کا کھانا لگادیا ہے۔" وہ گردن سمیت غائب ہوئی۔ اس نے گہری طویل سانس بھری۔

"مجھے جلد از جلد یہاں سے جانا ہوگا۔" اس کا فیصلہ سن کر دل سکڑ کر۔۔۔ رک کر دوبارہ دھڑکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آج کیا پروگرام ہے؟" مبین نے حلیم کا ڈونگا اپنی طرف کھسکایا۔

"رامین مجھے زندہ چھوڑے گی تو ہی پروگرام سیٹ کروں گی۔" اس نے کہہ کر محتاط نظروں سے بیڈ روم ایریا کی طرف دیکھا۔ جہاں اب دروازہ کھلنے کی آواز واضح تھی' وہ دونوں اس کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کر چکے تھے۔

"ہاں بھئی' کیا حال ہیں گڑیا؟" کرنل مبین کے کھنکتے لہجے سے شہد ٹپکا۔ ساتھ ہی غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا' جس پہ طمانیت کے رنگ مفقود تھے "ہم واپس آئے تو آپ وادی نلتو کے تمام جانور بیچ کے سو رہی تھیں۔"

جبکہ کاشیہ نے پوری توجہ ناشتے پر مبذول کر رکھی تھی۔ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"مینو! ناشتا کرو۔" اسے ہاتھ پہ ہاتھ دھرا دیکھ کر کاشیہ کو بولنا پڑا۔

"نہیں بس چائے لوں گی۔" وہ کسل مندی سے بولی۔

"کیوں۔۔۔؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ فکر مند سی ہوئی۔

کپ میں چائے ڈالتی رامین نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ شکوے' صدمے اور شدید اذیت کے معنی کاشیہ کی حیران آنکھوں کے آگے ناچنے لگے' وہ

مروتا" بھی مسکرا نہ سکی، رونے یا جاگنے کی وجہ سے رامین کی آنکھیں بے تحاشا سوجی ہوئی تھیں، ان تینوں کے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ آیا۔

"بھائی! آپ میری واپسی کا بندوبست کر سکتے ہیں؟" لمحاتی سکوت نے انہیں اپنی جگہ سن سا کر دیا.... کاشیہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر شوہر کا اشارہ پا کر خاموش رہی۔

"میں کوشش کروں گا.... مگر.... ایک دم اس فیصلے کی وجہ جان سکتا ہوں۔ آپ تو یہ برفیلی وادی دیکھنے کے لیے کب سے اصرار کر رہی تھیں، اب ایسا کیا ہو گیا۔" ان کی سوالیہ نگاہوں کو رامین نے کرنٹ کھا کر دیکھا، پھر اس نے اسی کیفیت میں گردن موڑ کر کاشیہ کا سپاٹ چہرہ دیکھا۔

"اب یہ ہو گیا ہے مبین بھائی کہ آپ اپنی بیوی سے اچھی خاصی ایکٹنگ سیکھ گئے ہیں۔" پانی پیتے ہوئے انہیں اچھو لگا۔ کاشیہ نے ٹھوڑی سینے تک لے جا کر مسکراہٹ ضبط کی۔

"میرے جانے کی وجہ آپ دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ مگر آپ دونوں کے یہاں آنے کی وجہ میں نہ صرف جان چکی ہوں۔" وہ رکی پھر بولی۔ بلکہ دیکھ بھی چکی ہوں۔" ان دونوں کے تنے ہوئے نقوش کچھ ڈھیلے ہوئے.... وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر کرسی پیچھے دھکیل کر کھڑی ہوئی۔

"سوری۔ آج آپ دونوں کو پھر میرے بغیر گھومنا پڑے گا۔" اب اس کا رخ اپنے چند روزہ بیڈ روم کی طرف تھا۔

پتا نہیں وہ کتنی دیر تک منہ سر لپیٹ کر پڑی رہی۔ گزرا ہوا وقت، پرانی یادیں اس پرانے سامان کی مانند کیوں نہیں ہوتیں جو کسی بھی غریب کو دان کر دیں یا کسی ردی خریدنے والے کو اونے پونے بیچ دیں، اس نے بے چین ہو کر کروٹ بدلی۔

"تو کیا وہ یادیں اب کاٹھ کباڑ میں پڑا سامان، ٹھہریں؟" دل نے بے یقین سرگوشی کی۔

اس کی بھوک کل شام سے اڑ چکی تھی صرف بھوک ہی کیا اس کا صبر و تحمل، اپنا خود پہ اعتبار، سب رخصت ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے لیے چائے کا جہازی سائز مگ بنایا اور سیدھا سٹنگ روم میں آئی.... آتش دان کے سامنے بڑی نازک سی کرسٹل کی تپائی پہ مگ رکھا، پھر دبے پاؤں کھڑکی تک آئی.... ذرا سا پردہ سرکا کر باہر جھانکا.... برف باری کے مزاج میں تیزی نہیں تھی، سبک روی سے ہوتی برف باری دیکھنا کبھی اس کی اولین خواہشوں میں تھا۔

"کبھی اسے دیکھنا بھی تمہاری اولین خواہشوں میں تھا جس کی وجہ سے آج تم یہاں سے بھاگنا چاہتی ہو۔" دل نے دہائی دی تو بے اختیار آہ نکلی۔

وہ شخص عجیب تھا جس سے وہ کبھی کھل کر نہ محبت کر سکی نہ ہی نفرت۔ وہ پردہ برابر کرتی آتش دان کے قریب فلور کشن پہ بیٹھی چائے گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ شال کندھوں کے گرد لپیٹی، گیلے ریشمی بالوں کی کچھ لمبی لٹیں بل کھا کے آگے آئیں۔ دفعتاً" عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کلون کی بے قرار خوشبو رگ جاں میں اترنے لگی۔

"مسنور رامین!" وہ آتش دان کے سامنے بڑی واحد کرسی پہ بیٹھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا مگ کانپا۔ آنے والے نے ان دونوں کے درمیان حائل ننھی سی تپائی کو اپنے مضبوط ہاتھ سے اٹھا کر سائیڈ پہ رکھا، پھر اس کے ہاتھ میں لرزتا مگ پکڑ کر اس تپائی پر رکھا۔ وہ شاکڈ رہ گئی۔ اس کے ننگے پاؤں مردانہ جوتوں سے مس ہوئے۔ اس کی گیلی لانبی لٹوں نے ان جوتوں کو چھوا، وہ ساکت پلکوں کے ساتھ اسے دیکھے گئی۔ اس شخص نے حالت رشک میں زمین کو چھوتی بالوں کی نم نوکیں دیکھیں، پھر اس کی گہری.... سرخ.... بوجھل.... چین قرار لوٹتی.... حواس چھینتی آنکھیں اس کے دھڑکتے وجود پہ ٹکیں۔ اسے سانس لینا یاد نہیں رہا، کسیری

رنگ اوڑھے جوگیوں کے ہاتھوں میں زمانہ قدیم کے ساز تھے' وہ پتا نہیں کس زبان میں گیت گا رہے تھے کہ ہر بول کے ساتھ دیوار کا قد اونچا ہو جاتا..... نہیں' وہ نوحے پڑھ رہے تھے۔

"ارے کوئی حیلہ وسیلہ نکالو... دلہن کیا سوچ گی اس پہ کیا بیتے گی۔" عورتیں کرلائیں۔ اب سمجھ میں آنے لگا کہ وہ جوگی گیتوں کو نوحوں کے ساتھ ملا کر گا رہے تھے۔

آنے والا بے نور ہی لوٹ گیا۔ دیواروں کا غرور بڑھتے قد کے ساتھ تناور ہوا' گیتوں کے بول نوحے کھا گئے۔ برباد حال شہر جوگیوں کی اس ادا پہ غصے سے پاگل ہوا۔ وہ چھری لے کر ماضی کے حصار سے نکلی' وقت رواں کے ہاتھ بھی کھردرے اور بدرنگ تھے سو اس نے پوری قوت سے جھٹکے اور کسی خوش رنگ وقت کا سنہرا دریچہ وا کیا۔

سنا تھا کہ وہ آئیں گے انجمن میں۔

سنا تھا کہ ان سے ملاقات ہو گی۔

حال کے لمبے ہاتھوں نے وہ دریچہ کھٹاک سے بند کیا' انجمن میں جلتی شمعوں کو جنگلی ہوا نے چھو لیا تھا۔ سو وہ آداب ملاقات بھلا بیٹھیں۔ ماضی پہ پڑے زرد پردوں کو گلاب اور صندل گھلی ہوا نے اٹھا دیا' ہوا کے ہاتھوں پہ لکھے وہ حروف شہر محبوب کے راستوں پہ کیسے نثار ہوتے تھے' ہوا کی ہتھیلیوں پہ لفظ محبت لکھ کر' انہیں مٹھیاں بند رکھنے کی تاکیدیں کرنا' در محبوب پہ اس لفظ کو کندہ کرنے کی تاکیدیں کرنا' تو پھر کیا ہوا تھا' ہوا کی مٹھیاں راستوں میں ہی کھل گئیں' سب خواہشیں ہوا برد ہو گئیں کیا۔

کوئی بات کرنی ہے چاند سے کسی شاخسار کی اوٹ میں

انہیں راستوں میں یہیں کہیں کسی کنج گل میں اتار دو

ایبٹ آباد کی سڑکوں پہ محو سفر ہونے کے باوجود..... وہیں کہیں قیام کی طلب' چاند سے روبرو ہونے کی آرزو۔ تو کیا کوئی دشمن ہوا کا راز دار تھا..... محبت کو پناہ دینے سے اس کا وجود کیوں انکاری ہوا۔

شہر مخالف کی تند ہوائیں وہ نام اڑا لے گئیں' کنج گل برباد ہو گئے وہ چاند کچھ یوں مقابل تھا کہ سانسیں رک بھی جا سکتی تھیں۔ شاخسار کی اوٹ بھی نہیں تھی مگر آج بھی رامین کے پاس اس شخص سے بات کرنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ الفاظ گم ہو چکے تھے۔ کوئی ایک جملہ بھی کیونکر بن پاتا۔ ماضی کے پاؤں میں چھنکتی سنہری پائلیں یک لخت ساکن ہوئیں۔ مقابل کی آنکھوں نے ایک نادیدہ اور بوسیدہ ڈائری اس کے سامنے پھینکی... ان ہی آنکھوں نے اوراق کھولے۔

"اسے پڑھو رامین!" اصرار کرتی آواز نے صفحات بدلے۔ فلاں دن' فلاں دن' پھر وہ سنہرا' قرمزی' اودا' اور آخر کار سیاہ پڑتا وہ دن نکالو۔ اور اس گرہن زدہ دن سے ایک دن' دو دن' آٹھ..... بیس دن تم کہاں تھیں؟ اگر جاگ رہی تھیں تو ہوش و حواس کیوں سلا دیے۔ اگر سو گئی تھیں' تو پھر قیامت سے پہلے تمہیں اٹھنے کا کوئی حق نہیں تھا..... تمہیں میرے لیے اپنی بینائی اور سماعت کو واپس بلانا تھا..... اپنے ہی گھر میں تم کیسے گم ہو سکتی تھیں۔ ان بیس دنوں میں وہاں جو کچھ بھی ہوا' مجھے وہ سب کچھ تم نے کیوں نہیں بتایا..... کیوں؟"

اس کی پست آواز زیر سوال کپکپائی۔

"عورت کسی بھی محبت سے پہلے اپنے آنگن کی دیواروں سے محبت کرتی ہے' وہ پُرغرور محبت ہوتی ہے ان دیواروں میں صرف اینٹ اور سیمنٹ بجری نہیں ہوتی۔ پرت در پرت تمام رشتے انہیں اونچائی تک لے جاتے ہیں۔ کوئی ایک رشتہ بھی اپنی جگہ چھوڑ دے تو محبت پُرغرور نہیں رہتی۔ اونچائی کا غرور ٹوٹ جاتا ہے۔"

"پھر بھی بیس دنوں میں ایک ہی بار مجھ سے رابطہ کیا ہوتا..... تو میں نہ آسمانوں سے گرتا نہ زمینوں کی پاتال میں اترتا۔"

"کچھ کہو رامین..... کچھ تو کہو۔" اس نے جھٹکے سے ہاتھ مار کر چائے کا کپ زمین بوس کیا۔ رامین کا سفید پڑتا چہرہ اس کی اشتعال انگیز حرکت پر زرد ہوا..... ضبط کے باوجود آنسو رخساروں تک ڈھلک آئے۔

"میری بربادی میں سوائے تمہارے پورا عالم

ہوتا۔ تو مجھے بھی چار آنسو بہا کر صبر آجاتا۔ مگر تمہاری بے وفائی نے مجھے کبھی شاد رہنے دیا نہ آباد۔" لہجہ زخم خوردہ تھا۔

"بے وفائی لازم تھی شہرام! کسی نہ کسی سے تو منہ موڑنا تھا وہ بھی عمر بھر کے لیے۔۔۔ سو میں نے تمہارا انتخاب کیا۔ رشتوں اور محبت میں ٹھن جائے۔ وہ بالمقابل ہوں تو ایک بیٹی کو رشتوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ کرنا چاہیے۔"

وہ اس خاموش بت کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا جو یوں بے حس و حرکت بیٹھی تھی کہ جیسے نبض برائے نام رہ گئی ہو۔۔۔ روز حشر لگ گیا تھا' حساب کتاب کا مرحلہ سر پہ آن پہنچا اب قوت گویائی کو پکارنا لازم تھا۔ وہ بھی گہری گہری سانسیں لے کر بکھری توانائی سمیٹنے لگی۔

"میں نے سنا تھا کہ وہ فیصلہ آپ کی مرضی سے کیا گیا تھا۔ وہ اٹکتے ہوئے نم آلود سی ہو کر بولی۔

"وہاٹ؟" وہ پھٹی۔۔۔ پھٹی بے یقین نگاہوں سے اسے تکتا رہ گیا۔ بارہ سال بعد اس بے مہر کے لبوں سے ادا ہونے والا وہ فقرہ زہر کا پیالہ تھا شہرام کے لیے۔

"بس۔ تم مجھے اتنا ہی جانتی تھیں کہ کسی نے کہا اور تم نے یقین کرلیا۔" اس کے متحیر لہجے میں بے یقینی تھی۔

"مجھ پہ اتنا ہی اعتبار تھا مینو۔!" اس نے کرسٹل کی تپائی پہ زوردار ہاتھ مارا۔ وہ پوری جان سے کانپی۔

رامین نے کئی گنا زیادہ چھناکا اس کی آواز میں سنا نہ کبھی وہ یوں روبرو بیٹھے نہ کبھی ایک آدھ جملے سے بڑھ کر گفتگو کی۔ اور آج وقت نے انہیں مقابل کیا بھی تو کس قدر بدصورت حالات میں' وہ واقف تھی کہ وہ اس دل میں دھڑکنوں کی صورت ہے۔ وہ دلکش آنکھیں اسے دل کی کہانیاں زیر زبر پیش کے ساتھ سناتی تھیں۔۔۔ مگر وہ خود کو ان رشتوں سے کیسے جدا کرتی جن کے وجود میں' جن کے خون سے اس نے نمو پائی تھی' زندگی پائی تھی۔ وہ موت تک ان کی جھکی ہوئی گردنوں کی وجہ خود نہیں ہو سکتی تھی۔

"وہ ایک سازش تھی۔ وہ فیصلہ نہیں تھا۔ اس لیے تو دو خاندان ذلت و رسوائی کے گڑھے میں اوندھے منہ گرے' آپ کو اس دن اپنے بابا کا حکم مان لینا چاہیے تھا۔"

شہرام کی رنگت متغیر ہوئی' ہتھیلی میں چبھنے والے کانچ کی نوک دل کے اس حصے میں چبھی جہاں محبت تھی۔۔۔ مان۔۔۔ تھا۔

"میرے نام کا تماشا دو خاندانوں کے سامنے لگا کر بھی آپ کے حصے میں کامیابی نہیں آئی تھی۔" بولنے والی کی آواز دکھ سے' اور سننے والے کا دل ان الفاظ سے ادھڑتا چلا گیا۔

"محبت خاندانوں کی عزت سے بالاتر نہیں ہوتی۔"

"خاندان۔۔۔ عزت۔۔۔ سازش۔۔۔ سب چھوڑو۔۔۔ تم صرف اپنی بات کرو۔" وہ مشتعل ہوا۔ وہ فق چہرے کے ساتھ کچھ دیر کے لیے ہل بھی نہیں سکی۔ "میں وہاں صرف تمہیں اپنانے گیا تھا۔ میں تمہیں چاہتا تھا۔ تم سے محبت کرتا تھا۔ تمہیں ہی دیکھ کر جینا چاہتا تھا۔ پھر کیسے کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کرلیتا میں کیسے تمہارا نام نہ لیتا' اور کیوں نہ لیتا۔"

وہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے اسے ٹکٹکی باندھ کے دیکھتی رہی۔

"جب تم نے میرا نام لیا' تب میں دنیا کے آخری کنارے پر کھڑی تھی' اس سے آگے کچھ بھی نہیں تھا نہ زندگی' نہ میں نہ تم۔ میرے لیے پیچھے ہٹنا بہتر تھا۔"

اس کی آواز میں کانچ سا ٹوٹا تھا۔ شور سا برپا ہوا۔ یہ پہلی بات تھی جو رامین نے پہلی بار اس سے اپنی ذات سے متعلق کی تھی۔

"جو تمہارے لیے آخری کنارا تھا' وہاں سے میری دنیا شروع ہو رہی تھی جس میں' میں بھی تھا' میری محبت بھی تھی۔ مجھ پہ بھروسا تو کرتیں۔ کچھ دیر ٹھہرتیں' کچھ دیر سوچتیں' تم اس قدر دیوانہ وار کیوں بھاگی تھیں کہ خود کو دنیا کے آخری سرے پر کھڑا کرلیا۔"

وہی ضدی لہجہ۔ وہ بے بسی کی کون سی انتہا تھی جو

اس چہرے پہ رقم تھی۔ یہ محبت کی کیسی داستان تھی جو آخری صفحے کے بعد پھر سے شروع ہونے لگی تھی۔

اب اس شخص کے لہجے کی شائستگی قصہ پارینہ ہو چکی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ کبھی یہ آنکھیں بولتی تھیں ہنستی تھیں جواب کثرت سگریٹ نوشی سے "مضمحل" بھاری اور بوجھل تھیں۔ سامنے بیٹھا یہ پُروقار سا بندہ کبھی اس کا تھا' کبھی اس کا ہوتے ہوتے اب کسی کا بھی نہیں تھا۔

آتش دان میں لکڑی زور سے چٹخنے سے وہ اپنے احساس سے چونکی۔ اس کی خون آلود مٹھی سے قطرے ٹپک کر اس کی اپنی چادر میں جذب ہونے لگے۔

"کک... کانچ ہتھیلی میں اتر گیا ہے۔" وہ ہکلائی اور ہچکچا کے اسے دیکھا۔

"میرے اندر سے وہ سفاک دن نکالو' وہ تکلیف وہ بارہ سال نکالو مینو۔ جو کئی برسوں سے چبھ رہے ہیں۔" اس کی شکوہ بھری آواز دل بند کرنے لگی۔ وہ بھیگی آنکھوں اور سرخ ناک کے ساتھ اس کا پتھریلا چہرہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ قطرے جذب کرتی چادر جیسے رامین کا دل بن چکی تھی۔

ان خفا آنکھوں کی سرخی دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگی شاید وہ اس کے جتنا بے رحم نہیں تھا۔

"یہ لمحے میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں' مگر یہ وقت میری زندگی کے بے حد پریشان کن احساسات سے دوچار ہے۔ میرے لیے یہ آنسو تمہاری بے وفائی اور جدائی سے بھی زیادہ اذیت کا باعث ہیں۔"

وہ اس کے سامنے سے باوقار انداز میں اٹھا۔ کانچ پہ چلتا اسے روندتا اگلے چند لمحوں میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہوا۔ ایک جانب آتش دان دہک رہا تھا۔ دوسری طرف کرچیاں تھیں۔ اس کے آنسو اور برف باری سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہونے لگا۔

☆ ☆ ☆

دروازہ کھلنے کی آواز پہ اس نے کمبل سر تک کھینچ لیا۔ وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی سو اس نے خود کو سوتا ظاہر کیا۔

"میں جانتی ہوں۔ تم جاگ رہی ہو۔" کاشیہ نے بیڈ سائیڈ پہ بیٹھتے ہوئے خشک آواز میں کہا۔ یہ جملہ سن کر بھی کمبل کے اندر ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔

"ٹیلیوی۔ رامین! کہ اس دن کے بعد کبھی ہم دونوں میاں بیوی نے شہرام سے رابطے کی کوشش تک نہیں کی۔" کچھ دیر کے وقفے پر اس کی سپاٹ آواز کمرے میں گونجی۔

"اس دن کسی نے بھی کسی کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔" رامین نے کروٹ لینے کی بے چین خواہش کو شدت سے روکیا" چھ ماہ پہلے اسلام آباد ایک ڈنر پہ ہماری ملاقات ہوئی۔ اس کی مجرم میں بھی تھی' مگر وہ مجھے دیکھ کر بے قراری سے میری طرف بڑھا تو شرم سے میرا گڑ جانے کو جی چاہا تھا۔ جب اس نے ملتے ہی تمہارے بارے میں پوچھا۔ میں ساکت رہ گئی۔ وہ مجھے اپ سیٹ' الجھا ہوا' بھٹکا ہوا کسی ویرانے کی مانند دکھا تھا۔"

چت لیٹی رامین کا سانس کسی نوک دار شاخ سے الجھا۔

"جتنا میں اسے جانتی تھی وہ عام لوگوں کی طرح نہیں تھا۔ ایک عمر میں سب کو محبت ہو جاتی ہے۔ جسے ناکامی یا کامیابی دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے' مگر جس طرح چھوٹتے ہی اس نے تمہارا احوال پوچھا میں شاکڈ رہ گئی۔ اس نے عام لوگوں کی طرح تمہیں نہیں چاہا تھا۔"

"کاش وہ عام مردوں کی طرح ہی مجھے چاہتا۔"

"وہ شاید کبھی تمہیں بھلا ہی نہیں سکا تھا۔"

"کاش وہ مجھے بھول جاتا۔ محبت ایک بہنے والا سیال کیوں نہیں" کان کی لوئیں' نمکین پانی سے بھیگیں۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ ابھی تک ان میرڈ ہوگا۔" کاشیہ کی اس سرگوشی نے اس کے کانوں کے پردوں میں چھید کیا۔

"تو تمہیں واقعی بسنے سے اجڑنا اچھا لگا شہرام! محبت کو پتھر کی بھاری سل نہیں ہونا چاہیے۔ پچھلے چھ

مہینوں میں اس نے کروڑوں بار تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی کہ ہم دونوں بے بس ہو کر رہ گئے۔ محبت روح میں پنجے گاڑنے والی بلا ہے۔"

آنکھوں سے بہنے والا پانی بے آواز تھا۔ گونگا تھا ورنہ کاشیہ سے پوچھتا کہ تم نے اپنی معافی تلافی کے لیے مجھے اس کی عدالت میں پیش کر دیا۔ اور خود تو وعدہ معاف گواہ ٹھہریں۔

"اور میں... ہم نے کئی جگہوں کے پروگرام بنائے' مگر وہ تم سے اس وادی میں ملنا چاہتا تھا۔"

"مجھے پھر سے برباد ہونے کے لیے اسی جگہ آنا تھا۔"

"اتفاقاً" ہی تم نے برف باری دیکھنے کی خواہش ظاہر کی... تو یہ سب ممکن سا ہو گیا۔"

"یہاں برف باری کب ہو رہی ہے' یہاں تو سنگ باری ہو رہی ہے۔ وہ جملے... وہ نگاہیں... وہ پورے کا پورا سنگ مرمر میں ڈھل چکا ہے۔ تم کہہ دیتیں' وہ مر گئی ہے... کہہ دیتیں' وہ گم ہو گئی ہے۔ تو مجھے اس کے سامنے ذلیل نہ ہونا پڑتا۔" اس نے ایک جھٹکے سے کمبل اتار پھینکا۔

"میں اس دفعہ اس کی آس نہیں توڑ سکی مینو!" کاشیہ نے نگاہیں چرا کر کہا۔

"چلو' تم تو اس کی نظروں میں سرخرو ہوئیں۔" وہ ہنسی۔ اس کے کھلے طنز پہ کاشیہ کے پیٹ میں گرہیں پڑیں۔

"تم کوئی ملا ضعیف نہیں ہو جسے میں نے امریکا کے سفاک ہاتھوں کے سپرد کر دیا ہے۔" اس نے اس کے بستر سے اٹھنے میں ایک سیکنڈ لگایا۔

"اس سے اچھا تھا تم مجھے امریکا کے سپرد ہی کر دیتیں۔" وہ دانت کچکچا کر بولی۔

☼ ☼ ☼
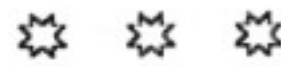
رات کے اس پہر اسے منزل عشق کے ہر گام پہ رونا آ رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا وہ کافی دور آ گئی ہے۔ ٹھہر کر اس نے چہار سو نظر دوڑائی سامنے دریا تھا جس کی دوسری جانب یقیناً "ایئر فورس میس تھا۔ وہ چلتے چلتے پل کے وسط تک آئی۔ دو لڑکیاں آپس میں گپ شپ کرتی دوسری طرف سے آ رہی تھیں۔

"ایکسکیوز می... وادی میں واپس جانے کا یہی ایک راستہ ہے؟" اس کا خیال تھا کہ وہ اب کسی دوسرے راستے سے واپس جائے تاکہ اسے یہاں کے راستوں سے مکمل واقفیت ہو۔

"واپسی کے ہزار راستے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔" اس نے اچانک سامنے آ کر اور ایک ذو معنی بات کہہ کر اسے خاموش سا کر دیا۔

"آپ کیسے ہیں؟" ان دونوں میں سے ایک لڑکی شہرام کی طرف گھومی۔

"فائن!" جواب نہایت مختصر آیا۔ وہ پھر رامین کی طرف متوجہ ہوا۔ تو وہ ان دونوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ اچھالتی اس کے پیچھے ہو لی۔ وہ دو دن بعد نظر آیا تھا۔ رامین نے اس کے بجائے نگاہ اٹھا کر دور پہاڑوں کو دیکھا۔ اس کا حال پوچھنے والی لڑکی پیچھے مڑ مڑ کے دیکھ رہی تھی جب کہ دوسری اسے اس حرکت سے روک رہی تھی۔

"یہ راستہ واپسی کا تو نہیں۔" اس نے لڑکیوں سے نظر ہٹا کر سامنے دیکھا۔

"جانتا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ واپسی کا سفر طے کر سکو گی۔" نہ چاہنے کے باوجود بھی اس نے اسے دیکھا۔ وہ چہرہ ایک ذو معنی مسکراہٹ کی زد میں تھا۔

"آئندہ یوں اکیلے مت نکلنا۔ راستہ بھٹک گئیں تو یہاں کے جانور مجھ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔" وہ اس وقت کلسنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے اس کے شانہ بشانہ چل رہا تھا۔

"اور بے فکر رہو میں تمہیں برف میں دفن نہیں کروں گا جیسے تم نے مجھے زندہ دفنایا تھا۔" اس کے چہرے پہ سلگانے والی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے حواس باختہ سا ہو کر اسے دیکھا۔ وہ کسی اور طرف متوجہ تھا۔ اسے اچانک دھیان آیا تو بے ساختہ پوچھا۔

"آپ کا زخم کیسا ہے؟"

"کون ساز خم؟" وہ استہزائیہ ہنسا۔ وہ ہر دوسرے پل اسے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا۔ اس نے تیکھی نظر اس پہ ڈالی۔

آج شہرام کے مزاج میں اشتعال مفقود تھا بلکہ ایک سرد مہری سی نمایاں تھی۔ وہ اس کی شکوہ کناں نگاہیں خود پہ اٹھتی محسوس کر چکا تھا۔ سرسری سا اسے دیکھا۔

وہ میس کے قریب پہنچ کر ٹھٹکی۔ وہ ایک کارنر کیبن کی جانب بڑھا۔

"یہاں کافی بے حد مزیدار ہوتی ہے۔" اس نے مڑ کر اس سے یوں کہا جیسے وہ دونوں تمام دن بد مزہ کافی پینے کے بعد اب اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچے ہوں۔

استقبالیہ پہ موجود لڑکے کے سلام کا جواب شہرام نے ہلکی مسکراہٹ سے دیا۔ وہ کیبن اندر سے خاصا کشادہ تھا۔ گپیں لگاتے فوجی جوان اپنے آفیسر کو دیکھ کر کھڑے ہوئے اور خفیف سے سیلوٹ کے بعد دروازے کی طرف بڑھے۔ ان میں سے کئی ایک نے مڑ کر بھی انہیں دیکھا۔ رامین نے ان کی آنکھوں میں ایک محظوظ سی مسکراہٹ اترتی دیکھی۔ وہ نو عمری میں اگر یہاں آتی تو پاگلوں کی طرح پورا میس گھوم چکی ہوتی۔ وہ بے تابی' وہ جوش گئے زمانوں کا حصہ بن چکے تھے۔ اندر گرمائش تھی۔ اس نے دریا کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ کی کرسی سنبھالی۔ وہ اس کے سامنے ہی بیٹھا۔

وادی نلتر پہ اترنے والی نیلگوں شام نے اس اجنبی مہمان کا چہرہ کھڑکی سے دیکھنے کی کوشش کی' مگر اس کے چہرے پہ ٹکی اس آفیسر کی پر شوق نگاہی نے اس کا ارادہ ناکام بنایا۔ کئی سال گزرنے کے بعد بھی وہ سادہ و شفاف چہرہ ویسا ہی کچھ چھپاتا کچھ جتاتا ہوا تھا۔ اب آنکھوں کے نیچے شفافیت کی جگہ حلقوں نے گھیر رکھی تھی۔ ان آنکھوں میں آج بھی گلابیاں گھلی ہوئی تھیں جن میں شہرام کی طرف دیکھتے ہمیشہ ایک جھجک اور حیا مانع رہی تھی۔

"کیا دریافت کر رہے ہو؟" وہ نظروں کے اتنے جامد ارتکاز پہ بے چین سی ہوئی۔

"تمہیں۔" وہ اک ذرا توقف سے لب کشا ہوا۔

"پھر؟" آنکھوں میں تیرتی نمی برف ہوئی۔

"پھر۔" شہرام نے دانستہ دہرایا۔ "پھر یہ کہ تم تو کہیں ہو ہی نہیں۔" وہ ٹیبل پہ دونوں کہنیاں ٹکا کر آگے کو جھک کر سرگوشی نما بولا۔ "تمہاری ذات میں ہر جگہ میں ہوں۔ تم جتنا مرضی خود کو چھپالو۔" لہجہ پُریقین تھا۔ وہ اس کی پُرتپش آنکھوں میں لحہ بھر ہی دیکھ پائی۔

"اب کچھ مت دریافت کرو۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ہلکی سی دستک دے کر ایک گیارہ بارہ سالہ لڑکا کافی لیے اندر آیا۔ شہرام کا اشارہ پا کر اس نے ٹرے میز پہ رکھی۔ کافی کی اشتہا انگیز خوشبو... حواسوں کو چھوتی محبت کی خوشبو۔ برف باری کی انوکھی خوشبو سامنے بیٹھے شخص کی موجودگی ہر شے پہ غالب تھی۔

وہ بدل گئی تھی۔ اس کی شخصیت میں اب جامد سناٹے تھے۔ ان چنچل آنکھوں سے خوابوں کے ڈھیر جہاں گم ہوئے' وہ جانتا تھا' مگر وہ ان خوابوں کو ڈھونڈ کر ان آنکھوں میں دوبارہ بسانے کا حق کھو چکا تھا۔

"سنبل! یہ کیا پاگل پن ہے۔" ورد اسے گھنٹہ بھر سے ٹیرس پہ جما دیکھ کر جھنجلائی۔ "ٹھنڈ سے مر جاؤ گی۔" اس نے اسے گھسیٹا۔

"تم دیکھنا' وہ واپسی پہ اس کے ساتھ ہو گا۔" وہ اس کے ساتھ گھسٹتی دانت پیس کر بولی۔

"تو ہوتا رہے' ہمیں کیا۔" ورد نے ٹیرس کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کیا۔

"تمہیں کچھ نہیں' مگر مجھے ہے۔" وہ لفظ چبا کر بولی۔

"تم نے دیکھا' کیسے اسے پہلو سے لگائے میس کی طرف جا رہا تھا اور مجھے برج پہ بھی کھڑا نہیں ہونے دیتا کہ اس کی شہرت' نیلی پیلی اور کالی ہوتی ہے۔ کسی کو اپنی طرف دیکھنے کی بھی اجازت نہ دینے والے کے ساتھ آج کوئی لڑکی ہے تو کیوں ہے۔ کیوں... ہے؟" اس نے مٹھیاں غصے سے کھولیں اور بند کیں۔

"تم اس کی ہمسائی ہو۔ وہ نہیں چاہتا کہ تمہاری ریپوٹیشن خراب ہو۔" وردہ نے آرام سے بات مکمل کی اور اپنے سامنے اخبار پھیلایا۔ "ویسے بھی وہ تم سے کافی بڑا ہے اور یہاں کون سا فوجیوں کی کمی ہے۔ تم تو اتنی خوب صورت ہو' کوئی بھی دل ہار سکتا ہے۔" وردہ کی بات اور مسکراہٹ نے اسے جلا کر خاک کیا۔

"خاک خوب صورت ہوں۔ اگر ہوتی تو کبھی تو وہ مجھے ایک نظر دیکھتا۔" وہ سچ مچ روہانسی ہوئی۔

"کم آن..... سنبل۔ وہ ایک میچور' بارعب اور ذمہ دار کمانڈر ہے۔ بیس اکیس سالہ لڑکا نہیں کہ ادھر اُدھر افیئر چلاتا پھرے..... وہ بھی تمہاری ایج کی لڑکیوں کے ساتھ۔"

"جو لڑکی اس کے ساتھ تھی' وہ بھی ساٹھ سال کی نہیں تھی۔" وہ بل کھا کر بولی۔

"وہ اب اس عمر میں محبت کے لیے لڑکیاں ڈھونڈنے سے رہا۔ جس لڑکی کو وہ یوں دیدہ دلیری سے ساتھ لیے گھوم رہا ہے۔ وہ اس کی زندگی میں بہت پہلے سے ہوگی۔" وردہ ایک دم سنجیدہ ہوئی۔

"جو بہت پہلے اس کی محبت تھی اس لڑکی نے اسے چھوڑ دیا تھا۔" سنبل کی آواز دھیمی ہوئی۔

"اومائی گاڈ!" وردہ جیسے کرنٹ کھا کے اچھلی۔

"یعنی تم جانتی ہو۔ پھر بھی....." اس کی آنکھیں باہر ابلنے کو ہوئیں۔

"ہاں پھر بھی..... وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"تو اپنے جذبات بس پسندیدگی تک محدود رکھو۔ اس کے پاس اب کسی سے بھی کرنے کے لیے محبت نہیں ہوگی۔" وردہ کے دھیان میں اس کا چہرہ ابھرا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اب تک شادی نہ کرنے کی وجہ جان سکتا ہوں؟" کچھ زیادہ ہی پھیلنے والی خاموشی کو اس کے سرد و سپاٹ انداز میں پوچھے گئے سوال نے سمیٹا۔ اس نے مشکل بات اس قدر آسانی سے کی۔ جیسے آج یہ رنگ کیوں پہنایا پھر تمہارا اپریل نیک سوٹ بلیک ہونا چاہیے تھا۔

رامین کا جسم کپکپایا۔ جواب دینا آسان نہیں تھا' مگر وہ اس کا جواب سننے کے لیے سانس روک کے بیٹھا تھا۔

"وہاں موجود میرے تمام خاندان نے بہ ہوش و حواس تمہیں میرا نام لیتے سنا تھا۔" سچ بولنے کا تہیہ کر کے وہ باہر جھانکتے ہوئے بولی۔

"میرے کردار کی وقعت تمہارے لبوں سے ادا ہوتے میرے نام نے اسی پل ختم کر دی تھی۔" آخری جملہ اس نے اس کے چہرے پہ نظر ٹکا کے کہا تھا۔ اس کا لہجہ دکھ' صدمے یا شکوے کسی بھی جذبے سے عاری تھا۔

اس گرم ماحول میں ایک ٹھنڈا سکوت طاری ہوا۔

"میری آنکھیں تو محبت کے زم زم سے دھل کر یہ چہرہ چھوتی تھیں پھر میری بے بس سی پکار پہ یہ بے وقعت کیونکر ٹھہرائی گئیں جسے میں نے ہمیشہ بے وفا جانا۔ اس کی زندگی کے بھی قیمتی حصے سے موسم گل بے ثمر گزر گیا۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا' مگر وہ پہل کر گئی۔

"اس وقت اپنی فیملی کی حالت دیکھ کر مجھے آپ پہ غصہ آتا تھا' وقت گزرنے کے ساتھ میں تمہاری مشکور ہوتی گئی کہ اس دن تمہاری جرات نے میرے نام کو کسی بھی دوسرے نام کے بوجھ سے ہمیشہ آزاد رکھا۔" مسکراہٹ اس کے لبوں پہ اک پل ٹھہر کر معدوم ہوئی۔ دھوپ میں آئینہ چمکا تھا۔ وہ مبہوت ہو کر دیکھتا رہ گیا۔

"سب ختم ہو گیا۔" رامین کی آواز دھیمی ہوئی۔

"سوائے تمہارے۔" آواز اب بھرائی' پلکوں پہ اٹکے آنسو دفعتاً" پھسل پڑے۔ ایک سفاک درد نے اس شخص کے وجود کو تلووں تک کاٹا۔ آنسو بہاتی اس لڑکی نے برفیلے صحرا میں اڑتی لوبان اور صندل کی خوشبو کے ساتھ اڑان بھری تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ آئینے کے سامنے سے ہٹی اور کاشیہ کے پہلو میں

جا بیٹھی۔

"آپ دونوں کو بھی میرے ساتھ چلنا چاہیے۔"

اس نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھا۔

"لو جی! یہ اچھی فرمائش ہے۔ جب ہم انوائٹ ہی نہیں تو بن بلائے کیوں جائیں۔" اس نے صوفے پہ آلتی پالتی مارتے ہوئے کہا۔ "اور تم کیا کسی فٹ پاتھ کے جمعہ بازار سے کتابیں خریدنے جا رہی ہو۔" وہ از سر نو اس کا جائزہ لے کر بولی۔ "کوئی تمہارا یہ حلیہ دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا کہ کمانڈر صاحب کی اکلوتی مہمان ایک کینڈل ڈنر کے لیے تیار ہوئی ہے۔"

کاشیہ اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکی تھی۔ ایک تو وہ پہلے ہی نروس تھی اوپر سے اس کے ارشادات سن کر وہ اچھی خاصی کوفت میں مبتلا ہوئی۔

"اچھا بابا۔ اب موڈ مت خراب کرو۔" پھر اس کے شانوں سے براؤن شال کھینچی۔ "کم از کم شال تو خوش رنگ اوڑھو۔" اس نے اس کے آف وائٹ اور ٹی پنک امبرائیڈڈ سوٹ پہ اچٹتی سی نظر ڈالی۔

"جب تماشہ لگا ہی دیا ہے تو لطف اندوز ہونا تمہارا حق بنتا ہے۔" وہ اس کا شرارتی چہرہ دیکھ کر کھولنے لگی تھی۔ اس کے لیے یہ رویہ غیر متوقع نہیں تھا سو اس نے ڈونٹ وری جیسے اسٹائل میں کندھے اچکائے۔

"خدا بہتر جانتا ہے کہ تم غلط سوچ رہی ہو۔" صرف اتنا کہا۔ پھر اس کی الماری سے نفیس سی کالی شال نکال کر اس کے شانوں پہ پھیلائی۔ "ویسے آپس کی بات ہے اس مدھم سے کاجل نے بھی تمہاری آنکھوں کو چار چاند لگا دیے ہیں۔" اس کی چھیڑتی نگاہوں سے وہ لمحہ بھر کو سرخ ہوئی۔

"اچھا اب مجھے نہیں سننا۔ چلو اٹھو۔۔۔ ہاں البتہ وہاں تم پہ جو بھی بیتے گی واپسی پہ ضرور سنوں گی۔" یوں سنجیدگی سے کہا کہ اس کا پورا منہ کھلا۔

"کیا بکواس ہے؟" وہ خجل سی ہوئی۔

"اُو۔۔۔ ہو۔۔۔ جاؤ بھی۔ ایک شاندار سابندہ شاندار ڈنر پہ تمہارا منتظر ہے۔" وہ اسے کھینچ کے باہر لائی اور لاؤنج سے بھی باہر دھکیل کر دروازہ فوراً" بند کیا۔

☆ ☆ ☆

اس نے بھاری دروازے پہ ہلکی سی دستک دی اور دروازے کی خوب صورتی کو سراہا۔ ذرا سا وقفہ دے کر دوبارہ دستک دی۔ پھر وہ توقف سے دستک دینے لگی۔ اس گھر کا واحد مکین جیسے سو چکا تھا۔ تو کیا وہ لوٹ جائے؟ اس نے آخری دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ قدموں کی قریب ہوتی آواز پہ اس کا ہاتھ رکا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ان دستکوں کو سنتے رات تمام ہو جائے جانے کیوں، مگر اس کی نگاہ جھکی۔

"اس گھر کا دروازہ کسی خوش بخت وقت میں کھولوں تو باہر تمہیں پاؤں' یہ میری خواہش نہیں تھی' یہ میری دعا تھی۔ دعا جو یقین ہے۔ اس لیے تو آج تم میرے سامنے ہو۔ یقین بن کر اس دروازے پر ہو۔"

وہ نرم آواز اس قدر دھیمی تھی کہ اس نے سماعت پہ زور دے کے سنا۔ اس نے اپنے سر اور جسم کو سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہلکا سا خم دے کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ اس نے محتاط سا ہو کر دروازہ عبور کیا۔ پھر اس کا دل زور سے دھڑکا۔

ایک خواہش۔۔۔ دوسرا عشق۔۔۔ ایک خواب۔۔۔ دوسرا تعبیر۔۔۔ ایک یوٹوپیا۔۔۔ دوسرا حقیقت۔۔۔ دماغ میں دور کہیں گزرے وقت کا الارم بجنے لگا۔

دیوار گیر کھڑکیوں پہ گرے گہرے سرمئی پردے۔ ہلکے زرد پینٹ سے سجی دیواروں پر آویزاں ہر پینٹنگ میں ساحل سمندر نمایاں تھا۔ آبشاریں' جھیلیں اس کی جلتی سانسوں میں کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر جمنے لگا۔

ڈیکوریشن پیسز سے لے کر کارنر پلانٹس تک۔۔۔ دیواروں پہ سجی آرائشی اشیا' فرنیچر کے تمام آئٹمز۔۔۔ کیا وہ عالم نیند میں ہے۔ اس کے ذہن میں بجنے والے الارم میں ماضی کی ٹیون گونجی۔ ایسی وادی 'ایسا گھر' ایک جانب جھیل کا ساحل ہو' دوسری طرف گرتی ہوئی آبشار کی گنگناہٹ مجھے صبح بخیر کہا کرے۔۔۔ ایک بار پھر اس کا اپنا ہی قہقہہ یاد میں ابھرا۔

وہ اس ٹرانس کی کیفیت سے نکلی تو اس کی غیر

موجودگی کو محسوس کیا۔ وہ خاموش تماشائی پتا نہیں کب
اس کے عقب سے فرار ہوا تھا۔ اس نے ہتھیلی سے
اپنی آنکھیں رگڑ کر اس طرف دیکھا جہاں کھٹ' پٹ
ہو رہی تھی۔ پھر وہ کچن ایریا کی طرف بڑھی۔ وہ کسی ماہر
کک کی طرح کھانا ڈش میں نکال رہا تھا۔ اس کی
موجودگی محسوس کرتے ہی وہ عقب میں جھانک کے
مسکرایا۔

"میں زیادہ اہتمام نہیں کرسکا۔ بس اتنا ہی کیا جتنا تم
میرے لیے کرتی تھیں۔" وہ بنا مڑے بولا۔ اس کی
سانسیں تھمنے لگیں۔

"تم مجھے زبردستی کھلاتی تھیں۔"

"میں نے کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔" جانے
کیوں وہ روانی سے بولی۔ وہ سُرعت سے اس کی طرف
مڑا۔

"میں تمہاری آنکھوں کا کہا تب بھی جان لیتا تھا۔ وہ
سب میں اب شوق سے کھاتا ہوں۔" وہ اس کے
قریب سے گزرتے ہوئے مسکراتی آنکھوں سے بولا۔

ایک خاموشی نے رامین کو حصار میں لے رکھا تھا۔
وہ نم آنکھوں کے ساتھ اسے ٹیبل سیٹ کرتے دیکھتی
رہی۔ ایک آدھ منٹ بعد دونوں آمنے سامنے کھانے
کی ٹیبل پہ موجود تھے۔ کبھی اس شخص کو ہری مرچوں
اور لیمن کی قاشوں سے جھانکتی میکرونی سے چڑ تھی۔
آج وہی سجاوٹ اس نے خود کی تھی۔ اس کے حلق
میں کچھ اٹکنے لگا۔ چائنیز رائس کا حشر بگاڑتے ان ابلے
سفید چاولوں کو دیکھ کر وہ فلک شگاف قہقہے لگاتا تھا۔
آج وہ ان پر ابلے انڈوں کو سجاتے ہوئے پُرجوش سا
تھا۔ دکھ کو راستہ چاہیے تھا ورنہ دم گھٹ جاتا۔
کیچپ لگی فرائیڈ فش۔

"بھابھی! ذرا چیک کریں۔ میرے سامنے کہیں
خودکش فش تو نہیں۔" اس کا شرارتی بشاش سا لہجہ
کان کے پاس چہکا۔ رامین نے نظر اٹھا کر ان آنکھوں
میں دیکھا۔ وہ پلک جھپکائے بنا اسے تکتی رہی۔ شہرام
نے خود پہ جمی اداس آنکھوں کی سرخی کو اب سیٹ سا
ہو کر دیکھا پھر خاموشی سے چاولوں کی ڈش اس کی طرف
بڑھائی۔ آنسو دکھ کو راستہ دکھانے لگے۔ وہی ذائقہ
منہ میں ڈالتے ہی حیرت دوچند ہوئی۔

"یہ ذائقہ میں نے ہمیشہ یاد رکھا۔" وہ زیرلب
مسکرایا اور پانی کا گلاس خالی کرتے ہوئے ٹیبل پہ رکھا۔
آنسو بہے اور انہوں نے اس کے لرزتے ہونٹوں پہ
نمکین ذائقہ دھرا۔ "میں نے رشتوں کے اعتماد و
اعتبار کے تمام ذائقے آج تک اپنے حلق سے اتارے
ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے کچھ بھی یاد نہیں رکھا۔
ایک چیز جو میں نے مس کردی وہ اب تم بتاؤ گی۔" مدھم
سی آواز ابھری۔ رامین کا دل اس خواہش پہ اس لہجے پہ
دھڑکا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا۔

"جو ہمیشہ تم کھانے کے بعد بطور سوئٹ ڈش پیش
کرتی تھیں۔" لہجہ خود بخود دھیما پڑا۔

"سب کچھ۔۔۔ اتنا کچھ کیونکر اور کیسے یاد رکھا؟" ان
جلتی بجھتی آنکھوں سے بھیگی آنکھوں نے عجب انداز
میں شکوہ کیا۔ ہری مرچ نے دل تک جلا ڈالا تھا۔

"کمال ہے' یہ سب کھاتے ہوئے ان آنکھوں سے
پہلے پانی کب بہتا تھا۔" اس چہرے کی سرخی کو دلچسپی
سے دیکھتے ہوئے اس نے ٹشو باکس اس کی جانب
کھسکایا۔

"تب پانی بہتا تھا۔" وہ کہنا چاہتی تھی۔

"جو کچھ میں نے اس کے ساتھ کیا اس کے بعد
میری ہر خواہش' میری ہر پسند اپنی زندگی میں شامل
کرکے یہ چاہتا ہے کہ میں آنے والی زندگی پچھتاووں
کے ساتھ گزاروں۔"

"میں اس ڈنر کو کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔" وہ سنجیدگی
سے اسے دیکھ کر بولا۔

رامین نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا پلیٹ میں واپس رکھا۔
اور جھٹکے سے اپنی جگہ چھوڑتی سٹنگ روم میں آگئی۔
وہ اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ اسے تھوڑی دیر لگی'
مگر بمشکل ہی سہی اس نے آنسوؤں کے سلسلے کو
روک لیا۔

"اب اس عمر میں مجھے شوگر جیسا مرض لاحق
ہو سکتا ہے اسی خدشے کے تحت تم سوئٹ ڈش بنانے

کی بجائے بھاگ آئی ہو۔" کچھ دیر بعد وہ وہاں آیا تو اس کے مسکراتے لبوں پہ یہ جملہ اور ہاتھوں میں کافی کے مگ تھے۔ وہ اس کے برابر صوفے پہ ایک مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے بیٹھا۔

رامین نے سوجی ہوئی، سرخ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا۔ "میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ وہ سب باتیں مجھے مت یاد دلاؤ۔ قافلہ گزر چکا۔ اب بلندیوں کی انتہا پہ کھڑے ہو کر بھی پکارتے رہو تب بھی قافلہ واپسی کی راہ پکڑے گا نہ وقت پلٹ کر دیکھے گا۔"

وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا ان آنکھوں میں رقم تنبیہہ پڑھ کے وہ افسردگی سے مسکرایا۔

"کافی اچھی بناتے ہو۔" وہ پیتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔

"شکریہ۔"

"گھر بنا لیا تھا تو اسے آباد بھی کر لیتے۔" بات کرتے ہوئے سرسری سا اسے دیکھا۔

"میں اس گھر میں رہتا ہی نہیں۔" اس نے بنا ہاتھ اٹھائے رامین کے منہ پر کھینچ کر تھپڑ مارا تھا۔۔۔ کہ میرے اس قیام گاہ کا مقصد پہلے نہیں سمجھیں تو اب جان جاؤ۔۔۔ کہ یہ ایک خواہش کی تکمیل ہے۔

"ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں کرتے شہرام! زندگی کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اس کی خوب صورتیوں کو اس کے تقاضوں کو محبت کے بوجھ تلے نہیں دفناتے۔" وہ منت سے گویا ہوئی۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ میں سوچتی تھی کہ آپ بھی ایک نارمل خوشیوں سے بھرپور نہ سہی۔ فطرت سے قریب زندگی گزار رہے ہوں گے۔ زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ جیسے زندگی ایک سیدھی ڈگر پہ چلنے لگی تھی مگر وقت نے ایک بار پھر ہمیں سامنے لا کر ہمارے ساتھ پھر اچھا نہیں کیا۔ میں اگلی زندگی اس گلٹ کے ساتھ ذرا سے سکون کے ساتھ بھی نہیں گزار پاؤں گی کہ تم میری وجہ سے تنہا ہو چکے ہو۔ مانا کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا۔"

"میں نے بھی تمہارے ساتھ برا کیا۔" وہ جو اسے توجہ سے سن رہا تھا۔ ایک دم بولا۔

"مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کیا۔" ڈوبتا ہوا لہجہ کچھ اور دھیما ہوا۔

"مگر مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس کی طرح اس کے الفاظ و آواز بھی سر اٹھا کر ادا ہوئے۔

"اگر میں تمہارا نام نہ لیتا' فقط خاموشی سے اٹھ آتا تب بھی مجھے کوئی پکارتا نہ روکتا' مگر میرا بے صبرا پن اور بدحواسیاں تمہیں بھی لے ڈوبیں۔"

"میں اکیلی نہیں ہوں۔ میری امی' میری باقی فیملی میرے ساتھ ہوتی ہے۔ میری ماں پانچ سال سے فالج کی مریضہ ہیں۔ میں اللہ کی مصلحت پہ مطمئن ہوں۔ میں تو عورت ہوں شہرام۔ میری تربیت میں صبر ہے۔ میں ایسی دسیوں زندگیاں گزار سکتی ہوں مگر آپ کو اب تک اکیلے زندگی نہیں گزارنا چاہیے تھی۔" یہ بات کہنا مشکل مرحلہ تھا تو ان شکوہ کناں آنکھوں کا سامنا کرنا مشکل ترین تھا۔ سو نظر موڑنی پڑی۔

"جو تم کہنا چاہتی ہو۔" "میں سمجھ رہا ہوں۔" وہ تحمل سے گویا ہوا۔ "اور بہت تھیں جنہوں نے میری جانب محبت کے ہاتھ بڑھائے۔ میری زندگی میں آنا چاہا' ان میں سے چند ایسی بھی تھیں جو بہت آگے تک بھی آئیں۔"

دل اس بات پہ عجیب طرح دھڑکا' بھٹکا۔ "مگر سچ کہوں مینو! میں ان کا ہاتھ بھی نہیں چھو سکا۔"

دل ٹھہرا اور پُرغرور ہوا۔۔۔ "میرے وجود یا میرے دل نے عورت کی طلب یا قربت پہ کبھی آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔"

وہ اس پر سے نظر ہٹا کر اس کافی کو دیکھنے لگا جو اب ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

ان کے درمیان سکوت بیکراں ٹھہر گیا۔ اس کی نگاہیں بدستور اس خوش اطوار اور باکردار شخص کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"مجھ میں تو ایسا کچھ نہیں شہرام! کہ کوئی میرے راستوں پر بھٹک کر ہمیشہ کے لیے راستہ بھول جائے۔" اس کی آواز ہچکچائی۔ اس کے احساسات میں

ایک انہوں نے انگڑائی لی۔
"مینو! تمہاری محبت ہمیشہ مجھ پہ کسی آسمانی آبشار میں ڈھل کر برسی، متواتر، مسلسل۔ کب تمہاری محبت کا سکہ میری مٹھیوں میں جل کر کندن ہوا۔ تمہیں چھونے کی خواہش کب میرے وجود میں مٹی ہوئی۔ میں نہیں جانتا۔"
اس نے ماتھے پہ اترا پسینہ ہاتھ کی پشت سے خشک کیا۔ وہ دوبارہ سگریٹ سلگانے لگا۔
"اس طرز زندگی سے تمہارے بابا، یا تمہاری باقی فیملی کبھی مطمئن نہیں رہ سکتے شہرام۔" بات کرتے ہوئے اس کی سانسیں ناہموار تھیں۔ اس نے ہولے سے دائیں۔۔۔ بائیں یوں سرہلایا جیسے زمانے بھر کی نفی کر رہا ہو۔
"تمہارے بعد دنیا ہی ذرا سی رہ گئی تھی۔ زمین و آسمان، سمندر، دریا، سب سمٹ کر نقطہ ہو گئے۔" وہ یہ سب کہہ نہ سکی۔" اب یہ آنکھیں اس اٹھارہ انیس سالہ لڑکی کی نہیں۔" وہ کچھ اداس ہوئی۔
"اب یہ آنکھیں خالدہ حیات کی بیٹی کی ہیں جو اب بنت حیات کے نام سے ہی دفنائی جائے گی۔" وہ اسے سیدھے سادے انداز میں زندگی کے نئے سبق پڑھا رہی تھی۔
"میں نے کچھ پوچھا ہے" اس کی بات یکسر نظرانداز کر کے، چھیڑتے ہوئے سے بھاری لہجے میں بولا۔
"جو تبدیلی میرے لیے ضروری ہے وہ تمہارے لیے کیوں نہیں؟"
"میں اب بس اتنا ہی کاجل لگاتی ہوں۔" اس نے بھی اس کی دوسری بات ہوا میں اڑا کر پہلے سوال کا جواب دیا۔۔۔ تو وہ بس آنکھوں سے مسکرایا۔
"ان آنکھوں کا اس قدر ہی اہتمام ہم دل گزیدوں پہ بھاری ہے۔" اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ گہری ہوئی، لہجہ اس سے بھی گہرا ہوا۔۔۔ وہ نظریں چرا کر کھڑی ہوئی۔
"باہر چلیں۔" دو لفظ بول کر قدم بیرونی طرف بڑھائے۔ یہ اجازت نہیں تھی، حکم تھا۔
"کاش حکم دینے کا اور پھر منوانے کا ہنر کوئی ہمیں بھی سکھادے۔" نہ ٹھہرنے کی التجا کی۔۔۔ نہ رکنے کی استدعا کی۔۔۔ بس اک حسرت زدہ آہ بھر کے ایسا ہی جملہ اس کی جانب اچھالا مگر رات کے اس پہر بھی اس کے ہم قدم ہونے کی خواہش پہ دل کو روک نہیں سکا۔
کچھ دیر بعد وہ دونوں باہر سرد ماحول میں تھے وہ خاموشی سے جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے اس کے ہمراہ چلتا ٹیکسی تک آیا۔
"یہ ڈنر میں بھی ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" زیرِ شال وہ دونوں بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے بولی۔ وہ اس کے مقابل ٹھہر گیا۔
"اپنے ہی گھر میں شب کے کسی حصے کی مہمان داری ہمیشہ یاد رکھنے والی چیز ہے؟"
سردی کا احساس بھک سے اڑا۔۔۔ وہ ٹھہرا نہیں تھا۔۔۔ وہ اس کی پشت کو دیکھتی ہی رہ گئی۔
"یہ کھلی آنکھوں کا خواب تھا جو اس شب ہم نے دیکھا۔"
دروازہ کھولنے سے قبل اس نے مڑ کر ٹیکسی کی جانب نگاہ کی، اور بت بنی اس لڑکی کو دیکھ کر اپنے ہونٹوں پہ رینگنے والی مسکراہٹ اسے اچھی لگی۔
"تو کیا کتاب عشق سے لفظ "ختم شد" فنا کا ذائقہ چکھنے لگا تھا۔" وادی نیلتو میں اس لمحہ موجود میں محبت 'شب وسط میں راگ پہاڑی گا رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ دھیمی چال چلتی گھر سے کافی آگے نکل آئی۔
"ہیلو، ہیلو!" اس نے پکار پہ عقب میں جھانکا۔ ایک نوجوان لڑکی اب اس کے برابر کھڑی ہانپ رہی تھی۔ رامین مسکرائی۔
"ہم شہرام صاحب کے ہمسائے ہوتے ہیں بلکہ ہمیں ان کی ہمسائیگی کا اعزاز حاصل ہے۔" لڑکی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ رامین نے اسے سراہتی نگاہوں سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ انتہائی خوب صورت تھی۔
"آپ ان کی رشتے دار ہیں؟" اس نے جانے کیوں

بغور رامین کو دیکھا۔
"آپ کو کیا لگتا ہے؟" اس نے گول مول جواب دیا۔
"میں نے دو روز قبل آپ کو شہرام کے ساتھ میس کی طرف جاتے دیکھا تھا' ان کے گیسٹ روم میں لوگ آتے رہتے ہیں۔ میں نے آج تک کسی مہمان لڑکی کو یوں ان کے شانہ بشانہ نہیں دیکھا۔ تو پھر آپ رشتے دار ہوں گی۔ یقیناً" رامین نے دل ہی دل میں اس کی ذہانت کا اعتراف کیا۔
"ان کے بھائی اور بھابی سے اکثر ملاقات رہتی ہے۔" اسے ٹھٹکنا پڑا۔ یہ لڑکی کس حد تک جانتی ہوگی۔
"آپ مقامی ہیں؟" اس نے بات بدلی۔
"میرے بابا کا شمار یہاں کے سیاحوں میں ہوتا ہے یہ وادی انہیں اس قدر بھائی کہ اب وہ مقامی ہیں اور میں سیاح۔" لڑکی نے اپنی بات پہ خود ہی فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ وہ خاصی باتونی تھی رامین کو اچھی لگی۔
تب ہی ان کے قریب بھاری ٹائر چرچراتے ہوئے ایک جیپ رکی ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھلا اور وہ نکلا۔
"سنا ہے آج کل آپ لیو پہ ہیں؟" لڑکی اسے دیکھتے ہی بشاشت سے مسکرائی۔ وہ ہلکا سا مسکرا کر رامین کی طرف متوجہ ہوا۔
"چلیں۔" یوں جیسے وہ گھر سے پروگرام طے کرکے نکلے تھے' بے ساختہ اس نے لڑکی طرف دیکھا۔ لڑکی کے چہرے پہ مسکراہٹ کی جگہ اب حیرانی ابھری۔ اس کے گھوم کے آنے تک وہ جیپ کا پسنجر ڈور کھول چکا تھا۔
شہرام نے ہاتھ ہلا کر وہاں موجود لڑکی کو گڈ بائے کہا۔ جنگل کے بیچ کچی سڑک پہ جیپ رواں دواں تھی۔ اسے درختوں کے بیچوں بیچ لاتعداد آبشاریں نظر آئیں راستوں کی خوب صورتی نے اسے ہپناٹائز کر رکھا تھا.... رامین کا لباس برفانی موسم کا سامنا کرنے کے لیے انتہائی موزوں تھا۔
شہرام نے اسے نظر بھر دیکھنے کے بعد نگاہیں ٹیڑھے میڑھے راستوں پر مرکوز کیں۔ آج وہ ایک معتبر سی خاموشی کے حصار میں تھا۔
"اتنے خاموش کیوں ہیں؟" آدھا راستہ طے ہو چکا تو وہ پوچھ بیٹھی۔ وہ اس کے استفسار پہ باوقار انداز میں مسکرایا۔
"اگر یہی سوال میں تمہیں لوٹاؤں تو۔" زیر لب دبی دبی سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کی سنجیدگی کو دل نواز سا کیا.... آج اس نے نگاہ بھی بااختیار رکھی ہوئی تھی۔
"اس وادی میں اور اتنا دور رہنے کا کیوں سوچا؟" وہ اس قدر انجان لہجے پر بریک لگاتے' لگاتے رکا.... رامین کی نگاہیں تاحد نگاہ پھیلی برفانی سفیدی پہ تھیں.... جیپ کے لڑکھڑانے پہ اس نے اس کو اک نظر دیکھا۔
"صحیح کہہ رہی ہو.... اس سے بھی دور رہنا چاہیے تھا' جتنا تم چاہتی تھیں۔" اس نے سہل انداز میں کہہ کر اسے یاد دلایا۔
"وہ ڈراموں کے ڈائیلاگز' فلمی باتیں' اور گیتوں کے بول تھے۔ میری خواہشیں کب تھیں؟" کتنی ہی دیر کی خاموشی کے بعد وہ شکایتی انداز میں بولی۔
"جو بھی تھا.... مگر میں جانے انجانے میں سنے گئے تمہارے جملوں کو کبھی بھول نہیں سکا.... تمہاری خواہشوں کے چمکتے موتی میں نے گن گن کر رکھے۔"
وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ وہ چہرہ دیکھنا یاد رہا.... جو اس لمحے اس کی موجودگی سے آباد تھا.... جیپ ایک ہلکے جھٹکے سے رکی۔ دونوں دروازے ایک ساتھ کھلے۔
جہاں وہ اسے لے کر آیا تھا وہ ایک جھیل تھی' وہ خواب تھا یا پھر وہ بھٹک کر جنت میں آگئی تھی۔ اگر کوئی زمینی جنت تھی۔ وہ یہیں تھی وہ اس سے دو قدم آگے تھا۔ اسے اپنے ساتھ نہ پا کر قدم واپس موڑے۔
"یہ جگہ جتنی خوب صورت آج ہے' پہلے نہیں تھی" ساتھ چلتے ہوئے اس نے مدھم سی سرگوشی کی۔

"یہاں برف باری سے قبل پرندے ہجرت کر جاتے ہیں' جنگلی درختوں کی شاخیں تازہ برف سے ڈھکی رہتی ہیں..... گھونسلے خالی ہو جاتے ہیں..... مگر اس جنوری' یہ گھونسلے خالی نہیں ہیں۔" اس نے چوٹیوں کو عالم جذب میں پُر یقین ہو کر دیکھا۔
"اس جنوری میرے دل کی طرح کچھ بھی بے آباد نہیں۔" وہ اک سرخوشی سے بولا..... رامین کی آنکھوں میں نمی اتری' وہاں جابجا ٹیلے نما جھاڑیاں تھیں.....وہ کچھ پل کو قریبی ٹیلے پر رکی..... آج وہاں اکا دکا لوگ بھی تھے ان کے ہاتھوں میں چائے یا کافی کے تھرماس تھے' جھیل کے اطراف تین چار ڈھابے نما کیبن تھے' اور سیاحوں کی کیمپنگ جنگل میں منگل کا نظارہ پیش کر رہی تھی.....
دو تین افراد نے کمانڈر کو دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلایا وہ مقامی لوگ تھے آرمی کے ہوتے تو سیلوٹ کرتے۔ جھیل کنارے کرسیوں کی صورت ان کی نشست کا اہتمام کیا گیا۔
"جاب کیوں کرتی ہو۔" اس کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا۔
"خود کو مصروف رکھنے کے لیے بھی..... اور' میں اپنا اور امی کا بوجھ کسی پہ نہیں ڈالنا چاہتی۔" نگاہیں چرا کر جواب دیا۔
"جبران کا کینیڈا میں اپنا بزنس ہے۔وہ تمہیں اور تمہاری امی کو احسن طریقے سے سپورٹ کر سکتا ہے۔" اس کے انداز میں جرح سی در آئی..... رامین نے اس کی تنی' تنی سی پیشانی پہ تحیر بھری نظر ڈالی۔
"اس کے بچے اب جوان ہو رہے ہیں۔ ان کی اپنی ضرورتیں بے حساب ہوں گی پھر وہ اکثر رقم بھیج دیتا ہے۔" وہ سہولت سے بولی۔ پتا نہیں وہ بھائی کا دفاع کر رہی تھی یا خود کو مطمئن' وہ سمجھ نہیں پایا۔
ایک لڑکا انہیں کافی سرو کرنے لگا' دونوں ہی وقتی طور پر خاموش ہوئے۔
"جو کبھی پنڈی کا چکر لگا تو تمہارے آفس آؤں گا۔" اس کی بھاری آواز نے خاموشی توڑی۔

"نہیں پلیز' وہاں میرے کزن بھی ہوتے ہیں۔" وہ سرعت سے بولی۔
"تم اب بھی لوگوں سے ڈرتی ہو..... ابھی تک۔" اس کی درشت آواز پست ہوئی۔
"شاید۔" وہ گہرا سانس لے کر بولی' اور شہرام کی خواہش کے ہزاروں ٹکڑے کیے۔ کافی کے مگ دونوں نے یک بارگی اٹھائے۔ شہرام کا موڈ خراب تھا۔ اسی پل ایک لڑکی ان کے قریب سے گزری۔
"او..... خدا..... یہ لڑکی کس قدر خوب صورت ہے۔" وہ بے ساختہ کہہ گئی.....وہ پر تکلف انداز میں کافی پہ نظریں جمائے رہا۔
"جیسے ایک جیتی جاگتی باربی ڈول ہو۔" وہ سابقہ انداز میں خوش ہوئی۔
وہ گردن جھکائے کافی میں جیسے الجبرے کا سوال حل کر رہا تھا۔
"اس کے بال تو دیکھو۔ جیسے ریشم واطلس سے بنے ہوں۔"
اس نے لڑکی سے نظریں ہٹا کر سامنے موجود پتھر نما شخص کو گھورا۔
"اس کے ہاتھ تو دیکھو' سچ مچ کے سفید گلاب۔" پتھر کی آنکھوں نے جنبش کی اور کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔ "کس قدر مشکل اور مستقل مزاج ہو۔" لڑکی ایک کیمپ کے اندر چلی گئی' تو وہ مایوس سی ہو کر بولی۔ بے اختیار ہی اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا' کتنے ہی عرصے بعد رامین نے اسے اس طرح ہنستے دیکھا تھا' سو دیکھتی ہی گئی' وہ ان نگاہوں میں جھلکتی دلچسپی بھانپ چکا تھا' اس نے فوراً' نظروں کا زاویہ بدلا۔
"تم اب بھی ویسی ہو۔" وہ لب کچل کر پھر سے ہنسا۔
"کیسی؟" وہ پُرتجسس سی ہوئی۔
"اب بھی مجھے چھپ' چھپ کر دیکھتی ہو۔" وہ آنکھوں سمیت مسکرایا۔ سحر طرازی سے مسکراتا وہ ساحر لگ رہا تھا۔
"یہ جھیل بہت خوب صورت ہے۔" وہ اس

ساد ہوؤں جیسی نظر اور نظر میں جلتے چراغوں کا فسوں توڑتی چہار سو دیکھ کر بولی۔

"جب سورج افقی لکیر کے پیچھے چھپ رہا ہوتا ہے تو اس کی آخری کرنیں جھیل کو چھو کر قوس قزح کے تمام رنگ دان کرتی ہیں۔ وہ رنگ دیکھنے سیاح دور دراز سے آتے ہیں۔" اس کے لہجے میں آس ' امید ' اور خواہش لپٹی تھی ' دل کے خالی کونوں میں توجہ کے سنہرے پنچھی ' موسم وصال کے گیت سناتے پھیریاں لگانے لگے۔

"مجھے تو آج اور ابھی بھی سورج کی غیر موجودگی میں یہ جھیل قوس قزح کے رنگوں سے آباد دکھ رہی ہے کیونکہ آج یہاں تم ہو۔"

محبت کی خالی ہتھیلی کو اس گلزار لہجے نے رنگوں سے بھرا۔ محبت نے نادر انہیں دیکھا ' پھر ہتھیلی سے تمام رنگ جھٹک دیے۔ پھیریاں لگاتے پنچھیوں کی یادداشت سے موسم وصال کے گیت ختم ہوئے۔

"مجھے میری نظروں میں اور کتنا گراؤ گے۔" وہ حد ضبط پہ کھڑی ہوئی۔

"خود پہ نثار ہونے والوں کی اس قدر توہین نہیں کرتے مینو۔"

"مجھے کیوں لگتا ہے شہرام کہ تم میرے ضمیر کے آئینے قدم ' قدم پہ میرے سامنے رکھتے ہو۔" اس کی بھیگی نگاہوں نے گلہ کیا۔

"ایسا کچھ نہیں رامین!" وہ بے تاب سا ہوا۔

"ہزار ہا رخ بدل کے دیکھ چکی ہوں ' مگر بس آئینہ بھی وہ خوش آئند وقت نظر نہیں آتا جو میری پیشانی پہ تمہاری تقدیر رقم کر سکتا ہو ' میری ہتھیلیوں پہ تمہارے نام کی لکیروں کا اضافہ اب ممکن نہیں۔"

ان خیالات کا شور اس کے چہرے پہ بپا تھا ' جسے اس کی تیز سماعت سے سن لیا تھا۔

"مجھے تم سے اب ایسا کچھ بھی نہیں کہنا جو تمہیں دوراہے پہ کھڑا کر دے۔ جو تمہیں پھر سے توڑ دے۔ مجھے اب تمہیں گزرے وقت کا آئینہ بھی نہیں دکھانا۔۔۔ میں جان گیا ہوں کہ پہلی دفعہ آنکھ کھولنے کے بعد جس گھر کو ' جن چہروں کو تم نے دیکھا تھا آنکھیں بند کرنے سے پہلے آخری بار بھی تم اسی آنگن اور ان ہی چہروں کو دیکھنا چاہو گی۔"

ان جملوں کے ہجوم میں رامین نے خود کو تنہا اور بے بس پایا ' وہ اس کی بوجھل آنکھوں کے بوجھل تاثر تلے اس تتلی کی مانند اڑی۔۔۔ جسے شہر محبت میں اڑنے کے باوجود کتاب وقت کے کسی کی پھڑپھڑاتے صفحے تلے بند ہونے کا خوف ستاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

رامین سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ اجنبی لڑکی اس سے کچھ سننا چاہتی ہے یا اسے کچھ بتانا چاہتی ہے۔ وہ روزانہ کچھ وقت ان کی انیکسی میں گزارنے لگی۔

"آپ نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں۔" وہ کھلکھلاتے ہوئے بولی۔

"آپ نے بتایا ہی نہیں۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"سنبل!" نام پکارتے وقت اس کے خوب صورت ہونٹ گول ہوئے تو وہ اور پیاری لگی۔ "شہرام یہاں آتا ہو گا۔" اس کی آنکھیں چمکیں۔

اور وہ جو کہنے والی تھی کہ نام بہت پیارا ہے ' ان آنکھوں کی چمک نے اسے صدمے سے گنگ سا کر دیا۔

"ہاں!" وہ خشک لبوں پہ زبان پھیر کے بولی ' تب ہی کاشیہ اس کے لیے کافی لے کر آئی۔۔۔

"آپ پہلے بھی اسی طرح یہاں قیام پذیر مہمانوں سے ملنے آتی تھیں۔۔۔" کاشیہ منہ پھٹ تھی سو تین چار روز کے خدشات اس کے منہ پہ دے مارے۔

"یہاں اکثر جینٹس ہی قیام پذیر ہوتے ہیں۔" وہ کچھ برا مان گئی تھی۔ رامین نے کاشیہ کو گھورا۔

"مگر جب ' جب بھی شہرام کی بھابی آتی ہیں پھر ضرور آتی ہوں۔"

"چلو آؤ ' باہر چل کر کافی پیتے ہیں۔" وہ جانتی تھی کہ کاشیہ اب سوالات کا سلسلہ شروع کرنے والی ہے۔

"آپ میرڈ ہیں؟" وہ اچانک ہی بیرونی گیٹ سے

اندر آیا۔ رامین نے اسے ایک نظر دیکھا' وہ اس سے خفا تھا اور دو چار روز سے غائب تھا۔ وہ اسے جواب دینا بھول گئی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟" سنبل قریب سے گزرتے شہرام کی راہ میں آکر بولی۔

"خدا کا شکر ہے۔" وہ خفیف سا مسکرایا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ بے حد خاموش اور سنجیدہ تھا۔

"آپ نے کہا ہے تو ماننا پڑے گا ورنہ لگ نہیں رہا۔" اس نے جیسے راستہ روکا۔

"پلیز سنبل!" وہ اس کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے رامین کو یکسر نظرانداز کیا تھا۔

"یہ ایسے ہی ہیں۔" وہ مسکرائی اور نظروں سے اوجھل ہونے تک اسے دیکھا۔ رامین نے اس کے یوں' مڑمڑ کر دیکھنے کو بے چینی سے دیکھا۔

"پھر ملیں گے۔" وہ اسے ہاتھ ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔ ابھی وہ شش و پنج میں تھی کہ اس کے پیچھے اندر جائے یا یہیں کھڑی ہو کر انتظار کرے کہ وہ اسے باہر آتا دکھائی دیا۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر اس نے سرسری نگاہ اس پہ ڈالی' ان ساحر آنکھوں کے الاؤ میں جو شباب سا جلا تھا' اس میں اک خواب سا جلا تھا۔ وہ اس کے پاس سے گزر گیا..... اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑی۔ اب وہ جیپ کی طرف بڑھ رہا تھا' وہ اس سے دور ہونے لگا۔

"شہرام۔" وہ اپنے نام کی پکار پہ رکا' وہ آواز اسے وقت آخر بھی پکارتی تو وہ خدا سے ضرور مہلت مانگتا' وہ آگے بڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلتی اس تک پہنچی۔

"سوری!" اس نے تیزی سے کہا۔

"او کے۔" کہتا ہوا وہ جیپ میں بیٹھا..... قبل اس کے کہ وہ بھگائے جاتا' رامین نے شیشے پہ زوردار دستک دی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔

"سوری کہہ تو دیا ہے۔" اس کا لہجہ تاسف آمیز نہیں تھا' الٹا احسان جتانے والا تھا۔

"میں نے بھی کہا ہے کہ او کے۔" اس کا انداز بھی اکڑفوں اور بے لچک تھا۔

"تو پھر اب کہاں جا رہے ہیں؟" اس کا استحقاق بھرا انداز شہرام کو ہتھیار ڈالنے پہ مجبور کر گیا۔

"مینو تم؟" اس نے ٹھنڈی آہ بھر کے پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے۔

"آج آپ لنچ ہمارے ساتھ کریں۔" وہ گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھی اس یقین کے ساتھ کہ وہ پیچھے ہی آئے گا۔

"محبت بس جاں کا زیاں ہے۔" وہ منہ میں بڑبڑایا' اور اس کے پیچھے ہولیا۔ اپنے ٹیرس پہ کھڑی سنبل نے اس منظر کو بے یقینی سے دیکھا۔ اس کا پورا وجود مضطرب سا ہوا' محبت سیاہ راتوں میں جاگنے والا پرندہ ہے' جس کی قسمت میں بس صبح کی نیند لکھی جا چکی ہے۔

✡ ✡ ✡

"کیا تم پھر آؤ گی؟" اضطراب سوال' امید وصل کے گرد بھٹکا۔

"میں اس شہر روایات کی پروردہ ہوں جس کے قفل زدہ دروازوں پہ' تعینات پہرے داروں کی' نیند نہ بھی ٹوٹنے پائے' تو ہم مکین' کسی بھی خوشبو کو قفل کھولنے کی اجازت خود ہی نہیں دیتے۔"

وہ ایک دم کھڑا ہوا..... آج وہ نلتو جھیل سے آگے دس بارہ منٹ کی مسافت پہ نئی جھیلیں دکھانے لایا تھا' مگر اب اور آگے جانے کے بجائے وہ واپسی کا راستہ طے کر رہے تھے۔

"آپ تو کہہ رہے تھے آگے ایک کالی جھیل ہے وہاں چلیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ میرا عکس چھو کر سنہری ہو جائے۔" کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کی مسکراتی آواز نے خاموشی کو توڑا۔

"تم نے اپنی ذات سے تمام رنگ اڑا دیے ہیں۔ اب تمہارا عکس مجھ سمیت ہر چیز کو خس و خاشاک کر دیتا ہے۔" وہ اس قدر تلخ لہجے میں لب کشا ہوا..... کہ وہ اس چہرے کے تاثرات دیکھنے کی بھی جسارت

نہیں کر سکی۔

"ایک بات کہوں شہرام!" وہ آہستہ سے بولی "تم نے سچ کہا کہ رنگ میری ذات سے اڑ چکے ہیں' مگر مجھ میں اب بھی ایک رنگ ہے۔۔۔ جب موسم بدل جائے گا' ان جھیلوں کا پانی رواں ہوگا۔۔۔ تو اسے چھو کے دیکھنا۔"

شہرام کی پیشانی پہ چند شکنیں نمودار ہوئیں۔

"تمہارا لمس جو رنگ بھی جھیلوں کو عطا کرے گا۔ وہ میرا ہوگا۔ مدھم' گہرا' کامل۔ ٹھنڈا' روشن۔" اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پہ کانپے' جیپ نے جھٹکا کھایا۔

اس لڑکی کی ہنسی میں دیوانگی کی خوشبو جنگل میں اترتی شام کے وجود سے لپٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج وہ سنبل کے گھر چائے پہ انوائٹ تھی۔۔۔ وہ بالکونی میں نشستیں جمائے برف باری کا نظارہ کر رہی تھی۔ سنبل کے دو بھائی کوئٹہ میں رہائش پذیر تھے۔ اس کی ایک بہن منگلا ڈیم کے پاس رہتی تھی۔

"تم یہاں اکیلی کیسے رہ لیتی ہو؟" رامین نے نرمی سے پوچھا۔

"یہاں میرا دل لگ گیا ہے۔" ذو معنی انداز سے بولی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس کے دل لگنے کی وجہ جانتی ہے' وہ کتنی دیر کچھ بول نہیں سکی۔ اسے اس گلابی سی لڑکی پہ ترس آیا۔

"آپ انہیں کب سے جانتی ہیں؟" اسے بغور دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

"مجھے اسے جاننے کا تردد کبھی کرنا ہی نہیں پڑا۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو مجھ پہ ہمیشہ عیاں کیا۔ اور آپ انہیں کیوں جاننا چاہتی ہیں؟" اس نے سنبل کی آنکھوں میں جھانکا تب ہی وردہ چائے لیے وہاں آئی۔۔۔

"تاکہ میں یہ جان سکوں کہ انہیں اب محبت کرنا کیوں نہیں آتا۔"

دھڑ' دھڑ' دھڑ۔ رامین کے اندر لفظ "اب" نے تمام دروازے کھولے۔۔۔ اسے محبت کرنا ہی تو آتا ہے۔" ان خوش امید آنکھوں کو اس کی اداس آنکھوں نے آپ بیتی سنائی۔

وردہ نے سنبل کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹوکا کہ یہ تذکرہ اب چھوڑ دو مگر وہ سنبل ہی کیا جو دل کی نہ سنے۔

"وہ اس کے لیے تمام محبتوں سے منہ موڑ چکا ہے۔ جس نے عین نکاح کے وقت شہرام کو ٹھکرا دیا۔" اس نے رامین پہ تیل چھڑکا۔۔۔ اور بنا پل کی مہلت دیے جلتی پہ تیلی پھینکی۔

"شہرام کی بھابی نے مجھے بتایا تھا بھلا آپ بتائیں کہ ان جیسے ڈیشنگ آدمی کے ساتھ کوئی لڑکی ایسا کیسے کر سکتی ہے۔" اس کے تحیر بھرے سوال پہ رامین نے بلاوجہ نگاہ نہیں جھکائی تھی' وجہ بنتی تھی۔

"ان کے لیے تو زمانے ٹھکرائے جا سکتے ہیں۔" اس کا لہجہ چہکا۔

"سنبل آپ پوری بات نہیں جانتیں۔ لہٰذا خود بھی چائے پئیں اور ان کو بھی پینے دیں۔" وردہ مروتاً مسکرائی۔

"آپ ابھی چھوٹی ہو۔ آپ لوگوں کی مجبوریاں ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔" اس نے نرمی سے کہہ کر اس کا رخسار چھوا۔

"مجھے شہزان کی بیوی نے بتایا تھا کہ وہ محبت اس لڑکی کا ڈراما تھی۔" اس کے لہجے میں تلخی گھلی۔ "ورنہ قسمت نے اس لڑکی کو ایک موقع دیا تھا اختیار دیا تھا۔"

رامین کا دل کہیں بہت نیچے پھسلا' اتنے سالوں بعد وہ لڑکی کسی منجھے ہوئے وکیل کی طرح اس کیس کی پرانی فائل کھولے اسے کٹہرے تک لے آئی تھی۔

وہ اختیار اسے اخلاقی اور معاشرتی اقدار سے گرانے والا اختیار تھا۔۔۔ وہ یہ سب سوچ سکتی تھی' اسے بتا سکتی تھی نہ اس لڑکی کی صفائی میں کچھ بول سکتی تھی۔

"محبت کے سفر میں راستوں کا انتخاب اس سمت کرنا چاہیے جہاں اس عظیم جذبے کی توقیر پہ کوئی حرف آئے نہ اسے سر جھکا کر جینا پڑے۔" اس نے

فقط اتنا کہا اور اجازت چاہی۔
"آپ ان سے اتنا تو کہہ سکتی ہیں کہ میں ان کے لیے کبھی میس چلی آؤں۔ بس وہ مجھے اتنی سی اجازت دے دیں۔" وردہ نے شرمندگی کے ہزار جھٹکے کھائے۔
"چلیں یہ نہ سہی، مجھے اپنے راستوں میں کھڑا ہونے کی ہی اجازت دے دیں۔" وردہ کا چہرہ فق ہوا۔
"اچھی لڑکیاں راستوں میں کھڑی نہیں ہوتیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔
"مجھے اچھی لڑکی نہیں بننا۔" وہ منہ بسور کر بولی۔
"بری لڑکیاں بھی محبت نہیں کر سکتیں۔ وہ صرف خواہش کو محبت کا نام دے سکتی ہیں۔"
سنبل کا چہرہ زرد ہوا۔ شاید رامین کے لہجے سے زرد رنگ بندھا تھا کرنوں کا رنگ جوگیوں کا رنگ۔

✡ ✡ ✡
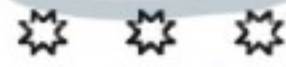
تھوڑی دیر بعد وہ ایئرفورس میس کی مغربی سمت چڑھائی کی طرف گامزن تھے۔ دونوں اطراف آبشاریں تھیں۔
"ایک بات پوچھوں؟" اس نے ایک ہاتھ کا دباؤ گھٹنے پہ ڈالا اور آگے بڑھی۔۔۔ شہرام نے چہرہ موڑا۔
"ایئرفورس والے تمہیں اتنی چھٹیاں کیسے دے دیتے ہیں؟" وہ پھولے پھولے سانس کے ساتھ بولی۔
وہ اس کی بات پہ کھل کر ہنسا، پھر ہنستا ہی چلا گیا۔
"میں نے کوئی جوک تو نہیں سنایا۔" وہ قدرے جھینپی۔
"دراصل میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ ایک حسین اتفاق سے کیپٹن صاحب تمہارے بہنوئی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جن سے تم نے باقاعدہ اجازت طلب کی تھی کہ میں ایک فوجی کو چھو کے دیکھ لوں۔"
مدتوں بعد وہ نظر شوخ ہوئی تھی، وہ بھی اک عرصے بعد وہ سرخ ہوئی۔
"لہٰذا تمہارے اتنے شدید مخلصانہ جذبات سے پاک فوج ابھی تک متاثر ہے۔ اس لیے جب بھی تم سے ملنا چاہوں، چھٹی مل جاتی ہے۔" وہ آنکھیں، وہ چہرہ، وہ لہجہ ایک شریر سی مسکراہٹ سے مزین تھا۔۔۔ اس کے سرخ چہرے پہ ایک مشتعل سی حیا نمایاں ہوئی۔
"یقین کرو مینو کہ جب بھی چھٹی لی تمہارے لیے ہی لی۔" وہ اب اک برفانی ڈھلان پہ پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ "یہ الگ بات ہے کہ اس فوجی کو کسی نے چھو کے کبھی خوش بخت نہ کیا۔" ایک ننھا سا الاؤ۔ اس لہجے میں بھڑکا۔ دل معمول سے ہٹ کر شوریدہ ہوا۔
سامنے ہی ایک چوڑے تنے کا درخت سجدہ نما جھکا ہوا تھا۔
اس گھنے درخت کی برفیلی شاخوں سے ڈھکا ایک ٹین کا کیبن تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسی سائز کے ایک تکونے کیبن کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں۔ وہ قریب پہنچے تو آہٹ پا کر تکونے کیبن سے ایک آدمی نمودار ہوا، اس نے لمبا گیروے رنگ کا چغہ پہنا ہوا تھا۔۔۔ اس نے شہرام سے مصافحہ کیا۔
"ہم کچھ وقت مرشد صاحب کے حجرے میں قیام کر سکتے ہیں۔" اس نے باادب ہو کر اجازت مانگی۔
اس چغہ پوش نے چوکور کیبن کا دروازہ کھولا، خفیف سی چرچراہٹ ہوئی۔ زمین پہ ایک بوسیدہ قالین تھا، وہ اس کے برابر ہی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔۔۔ یہاں اتنی ٹھنڈک نہیں تھی۔ دیوار میں بنی چھوٹی سی محراب میں چند موم بتیاں، ماچس اور اگربتیاں تھیں۔
تھوڑی دیر بعد وہی چغہ پوش آدمی چھال کی ٹرے میں چائے لے کر آیا، ساتھ خشک میوہ جات بھی تھے۔ شہرام نے چائے کے ایک کپ میں چاکلیٹ ملائی اور ٹرے سے اٹھا کر اسے پکڑایا۔
"اور آپ؟" وہ اسے دیکھنے لگی۔
"میٹھی چائے چھوڑے بارہ سال گزر گئے۔" وہ پروانہ وار مسکرایا۔۔۔ اور اپنا کپ اٹھا کر نشست گاہ سے کمر ٹکائی۔ رامین کی سانسیں تھمیں۔
"اتنے سال مجھ جیسی بے وفا لڑکی کو اس قدر کیوں یاد رکھا شہرام کہ زندگی کے اتنے قیمتی سال یوں ہی گزار

دیے۔۔۔ اس کی آواز غم سے بھیگی۔۔۔ دل میں گڑی پھانس نکالنے میں ایک لمحہ لگایا۔

"کوشش کی تھی، چاہا تھا کہ تمہیں بھلادوں مگر سارے جہاں کی خاک چھاننے کے بعد۔۔۔ وہ جیسی جیسا لمحہ میرے سامنے آکر ٹھہر جاتا جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو سوچو بعد کا تمام وقت۔۔۔ وہ سارے سال۔۔۔ وہ ایک عرصہ کیسے بھلاپاتا۔ اس دن مجھے لگا تھا کہ میں نے پہلی بار اوس کو دیکھا، میں نے پہلی بار بارش کی بوندوں کو پتوں پہ دیکھا، سچ کہوں تو اس کے بعد میری آنکھوں نے کچھ بھی خاص، کچھ بھی نیا نہیں دیکھا۔۔۔ میں خانہ بدوش ہوگیا تھا۔ کہیں دل ہی نہیں لگتا تھا۔" وہ ایک آزردہ سی ہنسی ہنسا۔

"ان چار پانچ سالوں میں بارہا، مبین کے گھر ایسے مواقع بھی آئے کہ دل چاہا کہہ دوں۔ میں تمہیں چاہتا ہوں مگر میری فیلنگز کا اظہار یہ الفاظ نہیں کرسکتے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ دنیا میں وہ الفاظ ہیں ہی نہیں جو میرے جذبات کی ترجمانی کرسکیں۔"

اس حجرے میں خاموشی اور خوشبو تک ساکت ہوئی۔ اس پل وہ بھی ایک خانہ بدوش ہوگئی تھی۔ وہ اس لہجے کے جادوئی، سحر انگیز جملوں میں ان لفظوں کے سنہری قمقمے روشن کرتی پھر رہی تھی۔

"اس دن میں تمہارے گھر سے سیدھا آرمی میس چلا گیا تھا اور اسی رات یہاں آنے والے ایک آفیسر کے ساتھ میں وادی میں آگیا۔ مجھے لگتا تھا میرے اندر ہر چیز ٹوٹ پھوٹ چکی ہے جسے جوڑنا اب ممکن نہیں۔ میں نے کئی ماہ اسی حالت میں گزار دیے۔

پھر ایک روز میرا دوست نبیل جو اب ونگ کمانڈر ہے، یہاں ایک اپنے مرشد کے پاس لے آیا جو یہاں تبلیغی دورے پہ آئے ہوئے تھے۔ ان ہی بزرگ کے کہنے پر وہ مجھے یہاں چھوڑ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے تھے، کہتے کچھ نہیں تھے۔ ان کے اس طرح دیکھنے سے میری بے قراری بڑھ جاتی۔ ایک رات میں نے تمہیں خواب میں دیکھا اور میں غنودگی میں تمہارا نام لے کر روتا رہا۔ دوسری شب انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور جو کہا وہ سن کر میرے اندر بھڑکتے دکھ پہ پانی پڑا تھا۔ انہوں جو کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ۔

"جو فقیر کردیتی ہے وہی محبت ہوتی ہے۔ مل جائے تو ٹھیک۔۔۔ نہ ملے تو بھی ٹھیک۔"

"اس کے بعد مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ محبت نے میری روح کی جانب کب سفر کیا، مجھے صبر سا آگیا۔"

آج رامین کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بولتا رہے گفتگو تمام نہ ہو۔ وہ اس کی خاموشی پہ بے قرار سی ہوئی۔ وہ عشق کے قرینے اسی شخص سے پیار کے اس دوسرے شہر میں سیکھ رہی تھی۔

"میں پہلے تمہیں چاہتی تھی، مگر مجھے تم سے عشق اب ہوا ہے۔" حجرے میں اگربتی کی مہک محبت کو کھینچ کر اپنی سانسوں سے لپیٹنے لگی۔

"محبوب سونے کا نہیں ہوتا، خدا نے تمام انسانوں کو مٹی سے بنایا ہے، مگر اس مٹی سے جتنی محبت ہم عشق گزیدہ کرتے ہیں کوئی کیا جانے۔" اس آزردہ ہنسی نے رامین کو ساکت کیا۔

"مٹی سے اتنی محبت نہیں کرتے شہرام! اسے مٹی نے ہی سمیٹ لینا ہے۔" اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی۔

"تو پھر وہ خود سے محبت کروائے، کسی ہمارے ہی جیسے انسان کے لیے ہمیں کیوں بھٹکاتا ہے کہ ہم دربدر ہوجاتے ہیں۔ وہ تو مختار کل ہے، پھر ہمیں اپنی ہی بنائی ہوئی مٹی کی مورتوں کے لیے بے اختیار کیوں کردیتا ہے۔ ہماری توجہ ہمارا عشق اپنے تک کیوں نہیں رکھتا۔"

محبت اس چھوٹی سی تکونی محراب میں جلتی موم بتی کی لو کے نیچے پناہ گزین ہوئی، مگر رامین کی سانسوں کو دل کش پل پناہ دینے سے انکاری ہوا۔

وہ اس کیبن نما حجرے سے باہر آئی۔

☼ ☼ ☼

"توبہ ہے اس لڑکی کو دیکھو، اس موسم میں بھی چین نہیں۔" سنبل کے جانے کے بعد کاشیہ نے اس کے

لتے لیے تھے۔

رامین جو ابھی تک سنبل کی بات میں الجھی تھی، کچھ پُرسوچ سی ہو کر بولی۔

"مجھے تو لگتا ہے یہ شہرام میں انوالو ہے۔" کاشیہ جملے کی پھانس اس کے حلق میں اٹکا کر کمرے سے چلی گئی۔

سنبل نے اسے میس کی طرف جاتے اور پھر واپسی پر شہرام کے ساتھ آتے بھی دیکھا تھا۔

"آپ نے میرا پیغام کمانڈر تک پہنچایا؟" کاشیہ کے ادھر ادھر ہوتے ہی وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔ رامین کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہوئی۔

"میں جانتی ہوں، آپ دونوں دن بھر ساتھ رہے ہیں۔"

وہ اسے کیا بتاتی کہ اس بندے کی گفتگو کس کے ذکر سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد کاشیہ بڑی سنجیدگی سے اس کے سامنے آکر بیٹھی تھی۔

"بہت سارا سوچنے کے بعد میں ایک نتیجے پہ پہنچی ہوں۔" اس نے سرخ پالش سے رنگے ناخنوں کو ریموور سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کہ آئندہ تمہاری چوائس سرخ کیوٹکس نہیں ہوگی۔" اس نے کشمش اور بادام ملا کر منہ میں ڈالا، ساتھ ہی سرکتی شال کندھوں پہ ٹکائی۔ کاشیہ نے ہاتھ روک کر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ اس کے خاندان کی بددعائیں تاعمر تمہارا پیچھا کریں۔ تم اسے کسی سے بھی شادی کے لیے رضامند کرو۔" اس نے انتہائی سکون سے کہہ کر اس کا سکون تہہ و بالا کیا۔ اس کے چہرے پر زردی چھائی تھی، موت کی سی زردی۔

☆ ☆ ☆

کاشیہ نے پھریری لی اور اس کے ہاتھوں کو یوں ڈر کے چھوا جیسے اس کے چھوتے ہی وہ غائب ہو جائے گی۔

"تم نے ہمیشہ میرے ساتھ برا کیا، ہر بار پتا نہیں تم اسے کہاں سے ڈھونڈ کر میرے مدمقابل لے آتی ہو۔" پہلے لہجہ بھیگا، پھر آنکھیں چھلکیں۔ اس نے تنی ہوئی گردن پہ بہتا گرم پانی ہتھیلیوں سے پوچھا۔ پتا نہیں وہ کون سا دن تھا جس دن محبت کاشیہ مبین کے گھر کی دیواروں کے ساتھ گھات لگائے بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

"سالی اور گھر والی ہمہ تن گوش ہوں کہ مہمان آچکے ہیں جب کہ کھانا ابھی تک آدھے ادھورے مراحل میں ہے۔ تم دونوں سست خواتین میں اول انعام یافتہ ہو۔" مبین نے کچھ چھیڑتے ہوئے کچھ مسکراتے ہوئے بیوی کو دیکھا۔

"جناب آپ کو اجازت ہے ہشیار قطار میں اول انعام یافتہ خاتون لے آئیں۔" کاشیہ نے مسکراتے شوہر کو گھورا اور کڑاہی سے بروسٹ پیس نکالا۔

رامین جو فریج سے مسالا لگی فش نکال چکی تھی۔ پیالہ کچن سلیب پہ تقریباً "پٹخا"۔

"ارے..... بریگیڈیئر چچا آگئے میں ذرا پاک فوج کو سیلوٹ مار کے ابھی آئی۔" وہ کچن سے ملحقہ لاؤنج کی جانب سرپٹ بھاگی، مگر نگاہ سامنے اٹھتے ہی قدم من من بھر کے ہوئے۔ سامنے یکسر اجنبی بندہ تروتازہ چہرے پہ خوشگوار مسکراہٹ سجائے جو کہ یقیناً "اس کی سیلوٹ والی بات سن چکا تھا" اب پُرشوق چمکتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہڑبڑا کے پلٹی۔

"یہ بے چارا ابھی پاک فوج کا حصہ ہے سیلوٹ بے شک مت کرو، سلام تو کرو۔" مبین نے اسے روکا تو مریل سی آواز میں سلام کیا جس کا جواب کچھ زیادہ ہی توانا مسکراہٹ سے دیا گیا۔

"اور آپ کے بریگیڈیئر چچا ابھی دیگر مہمانوں کا سرپیر کھا رہے ہیں۔" رامین کی گھوری کلٹ دار تھی۔

"میرا مطلب ہے ان کے ساتھ ہیں۔" فوراً "بیان بدلا۔ "ابھی آپ کو اتنی ہی پاک فوج پہ گزارا کرنا ہوگا۔" اشارہ پھر اجنبی کی طرف کیا۔

وہ کھسیانی سی ہوئی۔ "اس بار وہ دونوں ایک ساتھ ہنسے تھے اب وہ شرمائی اور کچن کی طرف دوڑ لگائی۔

"یہ بندہ صرف مبین کا دوست ہی نہیں دونوں کی برسوں ہمسائیگی رہی ہے۔ یہ تو مبین شادی کے بعد کینٹ شفٹ ہوئے ہیں۔ شہرام جب بھی گھر آئے تو ہماری طرف ضرور آتا ہے۔" کاشیہ نے اسے بتایا۔

"اب تم سب چھوڑو فٹافٹ ٹیبل سیٹ کرو اور محسنہ کو میرے پاس بھیجو۔ سارے جہاں کی نکمی لڑکی ہے۔" کاشیہ بڑبڑائی۔

"میں کھانا ڈش آؤٹ کرنے لگی ہوں۔" اس کی نگاہوں کی دلچسپی ذہن میں ابھری تو وہ رک سی گئی۔

"افوہ جاؤ بھی۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔" کاشیہ نے آنکھیں دکھائیں تو ناچار ڈائننگ روم تک جانا پڑا۔

"شکر ہے لاؤنج خالی ہے۔" گہرا سانس بھرا۔ بس وہاں اب مردانہ کلون کی مہک تھی۔

"شہرام تمہاری وجہ سے جھجک گیا ہے ورنہ ابھی کچن میں آکر تمام ڈشز چکھ چکا ہوتا۔" اب وہ دونوں کچن ٹیبل پہ ہی کھانا کھا رہی تھیں۔ کاشیہ کی شادی کو ایک سال ہو چکا تھا۔ میٹرک کے امتحانات کے بعد رامین پہلی مرتبہ وہاں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔

پھر وقت بے وقت رامین کو اس کی آمد کوفت زدہ سا کر دیتی۔ "ہم نے تو سن رکھا تھا کہ دادی کی وفات پہ بھی آرمی والوں کو بہ مشکل چھٹی ملتی ہے مگر مبین بھائی کے دوست کے لیے فوجیوں کے پاس کوئی کام کاج نہیں۔" وہ منہ کے زاویے بگاڑ کر بولی اور جب کاشیہ کی گہری ہوتی مسکراہٹ پر اس کے عقب میں جھانکا تو وہ پس پشت کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے رخ سیدھا کیا۔

"یہ بندہ پائلٹ کے عہدے پہ انڈین ایر فورس میں بھرتی نہیں ہوا۔ یہ بھی پاکستانی آرمی آفیسر ہے۔ لہٰذا پاک فوج سے محبت کا دم بھرنے والوں کو اس آفیسر سے بھی محبت کا مظاہرہ دکھانا چاہیے۔"

"اللہ..." اچانک چہرہ گلابی ہوا۔ سٹپٹا کے اسے دیکھا۔ وہ اس کی کیفیت سے محظوظ سا ہو کے ہنسا۔

مبین اپنی دھن میں ایک بات کہہ کے بیوی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

پھر مبین شہرام کو بتانے لگا کہ آرمی کی متوالی رامین کس طرح اس کے پروپوزل پہ لٹو ہوئی کہ رشتہ کروا کے ہی دم لیا۔ کچھ واقعات اسے کاشیہ نے سنائے کہ کس طرح مری میں پنڈی پوائنٹ پر فوجیوں کی رہائش گاہیں دیکھنے کی خاطر وہاں ڈیوٹی پہ موجود گارڈ کی یہ منتیں کرتی تھی اور وہ اندر کمرے میں کاشیہ کی گردن موڑنے کے پروگرام بناتی رہی۔

☆ ☆ ☆

اسے ہر وہ شہر اچھا لگتا جہاں ڈھیروں کی تعداد میں فوجی جوان مٹر گشت کر رہے ہوتے۔ فیملی ٹورز پہ جب بھی ان کا وادی جانا ہوتا تو وہ سب آتے اور جاتے ہوئے ابا میاں کے دیرینہ دوست بریگیڈیئر واثق عظیم کے گھر کینٹ ایریا میں ضرور ہی قیام کرتے تھے اور وہ بیرونی گیٹ پہ کھڑی آرمی آفیسرز کے بچوں کو بھی شوق و محبت سے دیکھتی رہتی۔ فوجیوں کی رہائش گاہیں اس کے لیے ہمیشہ ایک تصوراتی دنیا کی مانند رہیں اور ایک ایسا پزل باکس جیسے وہ ہمیشہ کھولنے کی کوشش میں ہلکان رہتی تھی۔ ابا کے ان ہی دوست کے توسط سے کیپٹن مبین سعود کا رشتہ آیا تو اس کے پاؤں خوشی اور غرور سے زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ انہیں "ہاں" کر کے واپس بھیجا جائے۔ جب اماں نے سوچنے کے لیے کچھ دنوں کی مہلت مانگی تو اس کی بلاوجہ کی بھوک ہڑتال پہ انہوں نے اس کی پشت پہ دو دھموکے جڑ کے کہا۔ "نادان! ایسے ہی منہ پھاڑ کے تھوڑی ہاں کہہ دیتے ہیں۔

رشتہ طے کرنے سے پہلے سو باتیں دیکھی جاتی ہیں۔" اماں نے کھانے کی ٹرے اس کے سامنے کھسکائی۔

"آپ بس یہ بات دیکھیں کہ لڑکا فوجی ہے۔ باقی ننانوے باتوں پہ لعنت بھیجیں۔" تو ساتھ ہی لیٹی کاشیہ کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

دو گھنٹوں سے جاری اس بحث و مباحثے سے بے نیاز نازنین نے ٹی وی بند کر کے رامین کی طرف رخ موڑا۔

"مینو! کیوں دونوں سے سب کا مغز کھا رہی ہو۔ اگر امی اس پروپوزل پہ راضی نہیں تو خالہ کلثوم کے آگے عرضی ڈالو۔ وہ بھی کاشیہ کی ماں ہوتی ہیں کیا پتا تمہارا کام بن جائے۔"

بات کے اختتام پہ اس کے ہونٹوں پہ مزا لینے جیسی مسکراہٹ ابھری۔ جہاں کاشیہ کا وجود ساکت ہوا' وہیں ماں نے بھی نازنین کو ملامتی نظر سے گھورا جب کہ رامین کو بنا سوچے سمجھے اس کی تجویز پسند آئی۔ ماں کے ارے... رے... رے کہنے تک وہ مرکزی دروازہ پار کر چکی تھی۔

شام کی چائے پہ نہ صرف خالہ بلکہ دونوں تایوں اور ایک چچی بمعہ اکلوتی پھوپھی۔ وہ سب کو ہال نما کمرے میں اکٹھا کر چکی تھی' تھوڑی دیر بعد گھر کے تمام مرد بھی وہیں جمع ہونے لگے۔ ماں نے رشتے کی بابت جب اس کی بھوک ہڑتال کا تذکرہ کیا تو وہاں ایک قہقہوں کا طوفان امڈ آیا تھا۔

"ارے بھئی میری بیٹی پکی پاکستانی ہے۔ خالدہ بیگم! وطن کی سرحدوں پہ تعینات فوجیوں کے لیے بھوک ہڑتال تو بنتی ہے نا۔"

ابا آنکھوں میں محبت کی چمک بھر کے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہاں موجود تمام افراد کی اتفاق رائے سے پروپوزل قبول کرتے ہوئے اسی وقت لڑکے والوں کو ٹیلی فون پہ جواب قبول ہے کی صورت سنا دیا گیا۔ رامین تو صحن میں جا کر باقاعدہ بھنگڑا ڈالنے لگی تھی۔

"خالہ جی... مانا کہ ایبٹ آباد یہاں سے دور ہے' مگر کینیڈا جتنا نہیں پھر آپ کا چہرہ کیوں بجھ سا گیا ہے۔" نازنین سلگتی ہوئی چنگاری کو پھونک مار کر وہاں سے اٹھ گئی تھی' مگر وہاں موجود تمام مجمعے کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

"کاشیہ! کیوں رو رہی ہو۔" رامین نے اس کی آنکھوں پہ دھرا بازو ہٹایا۔

"نہیں تو..." اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"کیا تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو؟" اس نے ملگجے اندھیرے میں اندازے کا تیر چلایا۔

"ارے نہیں بابا!" وہ کچھ جھنجلائی۔

"تو پھر یقیناً" نازنین آپی کی کسی بات پہ دکھ پہنچا ہو گا۔" اس بات پہ کاشیہ چپکی رہی۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ جبران ان کا بھائی تھا جسے پیدا ہوتے ہی خالہ کلثوم کو دے دیا گیا' مگر باقی کی کہانی سے سولہ سالہ رامین لاعلم تھی۔

"ماضی میں جو بھی ہوا' میری رضا سے تو نہیں ہوا تھا۔ اگر چچا مشتاق نے اس کے اچھے مستقبل کی وجہ سے کینیڈا بھیج دیا تھا تو اس فیصلے میں بھی میری مرضی نہیں تھی اور نہ ہی وہاں جبران نے میرے مشورے سے انڈین مسلم لڑکی سے شادی کی۔" آنسوؤں سے بھرا اس کا دردناک لہجہ رامین کے لیے تکلیف کا باعث تھا۔

"اچھا چھوڑو بھی۔ خوشی کے موقع پہ آنسو بہانا نیک شگون نہیں ہوتا۔" اس خاندانی قصے میں اس کو رتی برابر دلچسپی نہیں تھی۔ آج کل وہ بس اتنا چاہتی تھی کہ جلد از جلد اس کی شادی کیپٹن مبین سے ہو جائے تاکہ کاشیہ بھی کینٹ میں رہائش پذیر ہو۔ اس کی عمر کا تقاضا تھا یا پھر وہ اپنی پہلی خواہش کے پورا ہونے پہ خوش تھی' مگر اس کو پر لگ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

حیات' مشتاق' طارق اور فاضل چاروں بھائیوں کا کپڑے کا سانجھا کاروبار تھا۔ دو کنال کی کوٹھی میں وہ اوپر نیچے رہائش پذیر تھے' کچن چاروں کا الگ تھا۔ ان کی اکلوتی بہن ناظمہ بھی قریب ہی رہائش پذیر تھی۔

مشتاق بھائیوں میں ذرا رنگین مزاج قسم کا یار باش بندہ تھا۔ اس کے تعلقات ہر قماش کے لوگوں کے

ساتھ تھے۔ جلد ہی بھائیوں کو پتا چل گیا کہ وہ ایک گانے والی کے چکر میں پڑ چکا ہے۔ انہوں نے یہ خبر راز داری سے ماں کے کانوں میں ڈالی۔ ماں نے سوچ بچار کے بعد قریبی رشتہ داروں میں جھٹ منگنی پٹ بیاہ کرنے میں تاخیر نہیں کی۔

مشتاق کے دل میں عشق کا تازہ تازہ بھوت سمایا ہوا تھا۔ بھلا ان حالات میں بیوی کیسے دل پر چڑھتی۔ جدی پشتی خاندانی لوگ تھے۔ ریت رواجوں کو اپنے ساتھ قبر میں لے جانے والے۔ ان کے خاندان میں دوسری شادی کا رواج قطعاً" نہیں تھا۔ بے اولادی کی صورت میں بہن بھائیوں سے بچہ گود لے لیا جاتا۔ بصورت دیگر اگر کوئی اپنا بچہ دینے پہ رضامند نہ ہوتا تو برادری بہ امر مجبوری دوسری شادی کی اجازت دے دیتی۔

مشتاق جانتا تھا کہ بے اولادی ہی دوسری شادی کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔ کلثوم جانتی تھی کہ شوہر بے ایمانی میں کمال کے درجوں پہ جا پہنچا ہے بقول گائنا کولوجسٹ کہ تم میں کوئی نقص نہیں تمہارا شوہر تم سے اولاد نہیں چاہتا۔

اسی کھینچا تانی میں تین سال گزر گئے۔

ساس اس کی چھوٹی بہن خالدہ کو حیات کے لیے بیاہ لائی۔ بیٹی نے (ناظمہ) سو اعتراض کیے کہ ایک گھر میں دو بہنیں لکڑیوں کا گٹھ بن جاتی ہیں کوئی انہیں توڑ کر تو دکھائے۔ بیٹی کے ناک منہ چڑھانے پہ ماں بس مسکراتی رہی۔

"تو دس ماہ بعد خدا نے انہیں بیٹا دیا۔" دادی نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے پوتا اٹھا کے کلثوم کی جھولی میں ڈال دیا۔ تمام بھائی انگشت بدنداں رہ گئے۔ جانتے تھے کہ بھائی کون سے خواب دیکھ رہا ہے سو انہوں نے ماں کے اس فیصلے کو دل و جان سے قبول کیا۔ پورشن ایک ہی تھا بچہ اکثر خالدہ کی گود میں ہوتا۔

مشتاق تازہ تازہ زخمی تھا۔ سو زخم دینے کا خوب سوچا۔ ناظمہ شروع سے ہی بھائی سے اٹیچڈ تھی۔ بہن بھائی نے سر جوڑ کے صلاح کی۔ ناظمہ نے اپنا گھر بھائی کے حوالے کیا اور خود اس کے پورشن کی مکین بن گئی۔

کلثوم اور خالدہ صبر کے گھونٹ پینے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔ چند ماہ بچے سے لاپروائی برتنے کے بعد مشتاق کا دل جبران کی جانب مائل ہونے لگا۔ دوسری شادی کا جواز بھی جیسے دم توڑ چکا تھا۔ بھائی کے ہر اچھے برے راز کی واقف ناظمہ کو یہ تبدیلی کچھ خاص نہیں بھائی تھی تاہم اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

جبران چار سال کا تھا جب خالدہ حیات کے آنگن میں نازنین کی صورت رحمت نازل ہوئی۔ نازمین نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تو کلثوم کو خدا نے جڑواں بیٹیوں سے نوازا۔ جب خالدہ نے دیکھا کہ بہن سے جڑواں بچیوں کی دیکھ بھال صحیح طور نہیں ہو رہی تو کاشیہ کو کچھ عرصہ کے لیے اپنے گھر لے آئی مگر وہ بچی خالدہ سے کچھ یوں اٹیچ ہوئی کہ پھر کبھی واپس کلثوم کی گود میں نہ گئی۔ دونوں بچیاں آٹھ سال کی ہوئیں تو اللہ نے رامین کو ان کی زندگی میں بھیجا۔ خالدہ کے باقی دیور بھی شادی شدہ اور بال بچوں والے ہو چکے تھے اور ساس بھی اب حیات نہیں تھیں۔

جب رامین ہونے والی تھی تو ناظمہ پھوپھو دن رات نازنین سے بھائی کی آمد کی دعائیں کرواتی تھی۔ انہوں نے ہی نازنین کو بتایا کہ تمہاری ماں بہن کو پھول دے کر بدلے میں کاشیہ کی صورت ببول لے آئیں۔

ننھی نازنین کو ماں کا یہ سودا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

"تیرے حصے کی محبت کے ساتھ ساتھ کاشیہ نے ہمیشہ تیرے حصے کا کھایا پیا اور پہنا۔ کاشیہ کی جڑواں بہن آسیہ تیرے بھائی سے سارا دن ناز نخرے اٹھواتی ہے۔ میرا بھائی کہتے کہتے زبان نہیں تھکتی۔"

بڑھتی عمر کے ساتھ خالہ اور اس کی بیٹیوں سے اس کا عناد بڑھتا چلا گیا۔ خدا نے بھائی کی خواہش بھی پوری نہیں کی الٹا سوکھی سڑی رامین اس کا باقی ماندہ پیار بھی ماں سے وصول کرنے آ گئی۔ سو اس کے پیدا ہوتے ہی بہن سے اک بیر سا باندھ لیا۔ ایک نظر نہ آنے والا

ذہنی اور دلی فاصلہ ہمیشہ قائم رکھا۔ خاص کر بقول پھوپھی کے بھائی کے بدلے میں آنے والی کاشیہ کو ہمیشہ اس نے نیچا دکھانے کی کوشش کی۔

اس کے ذہن کے سفید کورے کپڑے پہ اکسانے والیوں نے کینہ اور نفرت کے جو رنگ پھینکے تھے' وہ اتنے پکے ثابت ہوئے کہ خالدہ کی تربیت و محبت کا پانی بھی انہیں اتارنے میں ہمیشہ ناکام رہا۔ جب اس کے باپ نے ان کے گھر آنے والا پہلا پرپوزل کاشیہ کے کھاتے میں ڈال دیا تو نازنین کی بدگمانی کو ایک نئی راہ مل گئی۔ ایسی راہ جس میں صرف خار اگتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

رامین گرمیوں کی چھٹیاں گزار کر واپس پنڈی آئی تو گھر میں ایک نیا قصہ زیر بحث تھا۔ ناظمہ کا ولی عہد خالہ کلثوم کی بیٹی آسیہ سے شادی کرنا چاہتا تھا' مگر بقول پھوپھو کے بہو کے روپ میں اس نے ہمیشہ نازنین کو ہی دیکھا تھا۔ فرسٹ ایر میں اس کا ایڈمیشن ہو چکا تھا۔ گھر کے حالات اس قدر متنازعہ تھے کہ اماں اور نازنین میں بات چیت تقریباً" بند تھی۔ وہ ایک بوجھل دن تھا۔

وہ کالج سے آئی تو بہن اور ماں کو بلند آواز میں باتیں کرتے سنا۔ جھگڑے کی وجہ آسیہ کی طرف بھیجے جانے والے جبران کے گفٹ تھے۔

"بھائی ہے وہ اس کا۔" امی کے لہجے میں دبی' دبی غراہٹ تھی۔

"ایسا کبھی نہ ہوتا' امی! آج وہ ابا کا سہارا ہوتا اور ہمارے لیے کمار ہا ہوتا۔" وہ ماں سے دوبدو ہو کر بولی۔

"جس کی قسمت میں جہاں کا دانہ پانی ہوتا ہے اس کا ٹھکانہ بھی وہیں ہوتا ہے۔" امی کا لہجہ دھیما ہوا۔

"خالہ تو ہمیشہ فائدے میں رہیں۔ آپ کا بیٹا ہتھیا کر کمائیاں کھا رہی ہیں اور بیٹی آپ کو سونپ کر جہیز کے خرچوں سے آزاد ہو گئیں۔" اب وہ خالہ اور ان کے بچوں کو باقاعدہ کوسنے دینے لگی۔

"آپی آپ ہر وقت امی کو ٹینشن میں کیوں مبتلا رکھتی ہیں۔" رامین سے رہا نہ گیا تو بھڑکے چھتے میں ہاتھ دے بیٹھی۔

"چپ کرو تم.... ابھی ہمارے معاملات میں تمہاری دخل اندازی کی عمر نہیں ہے۔" وہ غضب ناک ہو کر بولی۔ نازنین اسے ہمیشہ دبا کر رکھتی تھی۔ اسے بڑی بہنوں والا پیار سدا کاشیہ سے ملا اور وہ اسی کے ہی قریب رہی۔

"بری بات ہے بیٹا' چھوٹی بہنوں سے یوں مخاطب نہیں ہوتے۔" اندر آتے حیات نے بیٹی کی آخری بات سنی تھی جس کے چہرے پہ لمحہ بھر کو ہوائیاں سی اڑیں۔

"وہ ابا دراصل.... مم۔ میں" وہ بے ربطی سے بولتی ادھر ادھر ہو گئی۔

ابھی وہ کھانا کھا رہے تھے کہ ناظمہ اپنا دکھڑا لے کر آگئیں۔ نازنین کو پھوپھی زاد کزن سے کوئی دلی لگاؤ نہیں تھا' مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ خالہ کی بیٹی کو اس پہ ترجیح دی جائے۔ سو دروازے سے کان لگا کر اندر ہونے والی گفتگو سننے لگی۔

"ناظمہ! تم اچھی طرح جانتی ہو مشتاق کو شراب کی لت نے اندر سے ختم کر دیا ہے۔ میرے لیے آسیہ اور نازنین میں کوئی فرق نہیں۔ میرا بھائی جگر کا مریض ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کی بچی اس کی آنکھوں کے سامنے رخصت ہو اور پھر کیا بھول گئیں۔ مشتاق تمہارا بھائی کم دوست زیادہ تھا۔" ابا کی آنکھیں نم ہوئیں اور ناظمہ کا دل نم ہوا اور نرم بھی ہو گیا۔ نازنین پیر پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے ایک ماہ کے اندر آسیہ رخصت ہو کر ان کے پورشن میں آگئی تو رامین کو کاشیہ کی کمی پوری ہوتی محسوس ہوئی۔ نازنین نے یونیورسٹی میں اپنی دوستوں کا حلقہ وسیع کر لیا تھا۔ اب گھر میں ماں سے بھی اس کی تو تکرار کم ہو گئی تھی' مگر رامین سے وہ سارے ذاتی کام کسی نوکرانی کی طرح کرواتی تھی اور وہ بھی گھر کا ماحول پرسکون رکھنے کے لیے اس کی خدمت کو ہمہ وقت تیار رہتی۔

☆ ☆ ☆

حسب معمول وہ سردیوں اور گرمیوں کی چھٹیاں ایبٹ آباد کاشیہ کے گھر گزارتی تھی۔ ابا کے دوست بھی اکثر وہی آجاتے۔ فوجیوں کے قصے سن سن کے اس کا دل نہیں بھرتا تھا۔ اس کی ایبٹ آباد موجودگی پر شہرام کی چھٹیاں بھی آئے دن ہوتیں اور کیوں ہوتی تھیں۔ فوجیوں کی دلدادہ اٹھارہ سالہ خوب لڑکی سمجھ رہی تھی کہ وہ بھی ایک آرمی آفیسر کی نظر میں ہے۔

کاشیہ آج عصر کے بعد سے ہی رات کے کھانے کی تیاریوں میں مشغول تھی کہ اتفاقاً "مغرب کے بعد اس کے پاؤں میں موچ آگئی اور رامین جو ابھی صرف کچن خواتین کی مددگار بنی ہوئی تھی۔ اب ڈنر کا اہتمام اس اکیلی کو کرنا تھا وہ اس افتاد پہ بوکھلائی ضرور، مگر ہمت کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور ٹھیک نو بجے وہ ڈنر ٹیبل سیٹ کر چکی تھی اور اب ڈائننگ روم میں تین افراد اس کے خیال کے مطابق ڈنر پہ ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار تھے۔

صورت حال کی جانچ پڑتال کے لیے اس نے لاؤنج کا وہ حصہ منتخب کیا جہاں سے براہ راست کارروائی دیکھی جاسکتی تھی۔

"بھابھی! ذرا دیکھیں میرے سامنے خودکش فش تو نہیں۔" اس نے کیچپ میں لت پت ایک پیس اٹھا کر کہا۔ کاشیہ کی آنکھیں مارے تحیر کے پوری کھلیں۔

"مینو کی بچی! کیچپ فرائیڈ رائس میں ڈالنے کے لیے منگوائی تھی۔" وہ بے ساختہ بول پڑی۔

"مجھے لگتا ہے آپ کے کک نے میکرونی اور چائنیز رائس کا مسالہ بدل دیا ہے۔" شہرام کے قہقہے نے اس کا دل اندر تک جلایا۔ سفید ابلے چاول جن میں کالی مرچ اور ہری مرچ کی جھلک واضح تھی۔ وہ ہنس ہنس کے بے حال ہو رہا تھا اور اسے بے حال کر رہا تھا۔ وہ بھی شرمندگی اور غصے سے.... میکرونی کی ڈش پہ ہری مرچوں اور لیموؤں کا انبار تھا۔

"لو شٹ اپ آفیسر! یہ ہمارے کک کی اسپیشل ڈشز ہیں جو کسی بھی ایمرجنسی کے پیش نظر وہ مہارت سے تیار کرتا ہے۔"

مبین کو اس کی پریشان صورت دیکھ کر ترس آگیا۔ سو مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا اور رامین نے بھوک نہ ہونے کے باوجود اس کٹورے کے سامنے جس کی آنکھیں ابھی تک مسکرا رہی تھیں میکرونی پلس ہری مرچوں کی بھری پلیٹ یہ جتانے کے لیے کھائی کہ مسالہ نہیں بدلا تھا۔ وہ اسے کھاتا دیکھ کر حیران ہوتا رہا۔

"مینو! سوئیٹ ڈش میں کیا بنایا ہے؟" کاشیہ کے استفسار پر پندرہ منٹ بعد وہ انتہائی بیش قیمت نازک کپوں میں چائے لے آئی تھی۔ ان دونوں کو سرو کرنے کے بعد قدرے فاصلے پہ دھرا تیسرا کپ شہرام کو تھمایا۔

کپ تھامتے ہوئے اس نے تسلی سے اس کا چہرہ دیکھا اور پہلا گھونٹ بھرتے ہی اسے لگا تھا کہ وہ پورے کھلے منہ کے ساتھ چینی کی بوری میں گرا ہے۔

"ارے بھئی' وہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ سوئیٹ ڈش۔" کیپٹن صاحب کان کھجا کر بولے۔

"یہ ہے نا" اس نے چائے کی جانب اشارہ کیا اور دور ناک لگا کر بیٹھ گئی کہ مجھے تاکنے والا بنا پردہ اٹھائے راز پی جائے گا یا پھر اگل دے گا' مگر اس وقت اس کی حیرانی حدود سے باہر ہوئی جب نوخیز محبت کی پہلی سطریں سنانے والی ان آنکھوں میں وہ تمام مٹھاس سمٹ آئی کہ دور بیٹھی رامین کی نگاہیں جھکنے لگیں۔ تو کیا صفحات محبت کی پہلی سطریں اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں دل — بے طرح دھڑکا تو؟ اس نے وہاں سے کھسکنا مناسب سمجھا۔ ہواؤں کے سنگ اڑنے والے اجنبی نے راز پی لیا تھا مگر حال دل اگل دیا تھا۔

صبح رامین نے دیکھا کہ دیوار پہ چڑھی سفید چنبیلی کی بیل پہ ایک تروتازہ سرخ گلاب کھلا ہوا تھا..... جس کی خوشبو چنبیلی کی مہک سے لپٹ کر دریافت کی سماعتوں کو تیسرا' رازدار بنا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

نازنین اب اٹھائیسویں برس سے نکل رہی تھی۔ وہ ہر آنے والے رشتے میں کوئی نہ کوئی نقص نکال کر مسترد کر دیتی' وہ چاہتی تھی کہ اس کا چاند چہرہ صبح و شام

کوئی ایسا شخص دیکھے جو خود مانند آفتاب ہو۔ رامین بی اے کر چکی تھی اور مزید تعلیم کے لیے ابھی یونیورسٹی کے انتخاب پر سوچ بچار ہو رہا تھا۔

شادی کے چار سال بعد کاشیہ کو ماں بننے کی نوید ملی ابھی وہ اس خبر پر ٹھیک طرح سے خوش بھی نہیں ہوپائی تھی کہ وہ نوید اس سے چھن بھی گئی۔ خاندان کے تمام افراد یکے بعد دیگرے اس سے اظہار افسوس کی غرض سے آئے۔ وہ اس کی تکلیف کم نہیں کرسکتے تھے مگر اپنائیت و محبت کا بھرپور احساس دلا کر اس کا دکھ بانٹ سکتے تھے۔

نازنین نے اس کے گھر پہلی بار آکر نہ صرف اس کے ٹھاٹ باٹھ دیکھے بلکہ مبین جیسے خوبرو مرد کو کاشیہ کے آگے پیچھے پھرتا دیکھ کر اسے اپنے باپ کے اس فیصلے سے سخت رنج ہوا۔

دوسری جانب پوتے کی آمد کے ساتھ ہی پھوپھی ناظمہ نے بھی آسیہ سے دوستانہ تعلقات استوار کرلیے تھے۔ ان دونوں بہنوں کی سسرال میں عزت و توقیر نازنین کو اپنی کمتری اور بے عزتی محسوس ہونے لگی۔ کچھ دن ٹھہر کر باقی اہل خانہ واپس چلے گئے مگر رامین کو خالہ امی کی منت کرکے کاشیہ نے روک لیا۔ جب یہ یونی جانے لگے گی تو اس کے پاس یہاں رہنے کے لیے کہاں وقت ہوگا۔ اماں کا اعتراض اس مرتبہ اس کی طبیعت کے پیش نظر کچھ ڈھیلا سا تھا کہ مبین لاکھ اچھا سہی باپ کی جگہ سہی مگر ہے تو غیر ہی... وغیرہ وغیرہ۔

اسے آئے ایک ڈیڑھ ہفتہ ہوچکا تھا۔ جب کاشیہ کو اس نے شہرام سے بات کرتے سنا۔ قریب بیٹھی رامین کی ہتھیلیاں بھیگیں۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" بلاارادہ زبان پھسلی۔

"آج کل سب مجھ سے اظہار ہمدردی ہی کرتے ہیں۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"اسے دیکھے چار پانچ ماہ تو ہوگئے ہوں گے۔" اس نے دل ہی دل میں حساب کیا۔

"کہہ رہا تھا ایک دو ماہ بعد میری فیملی پاکستان آرہی ہے۔" رامین اس کی بات پہ اپنے دھیان سے چونکی۔

"ہوسکتا ہے اس کے والدین اس کی منگنی یا شادی وغیرہ کے سلسلے میں آرہے ہوں۔" اس کا دل یہ سن کے دھڑکا۔

کسی سوچ کے تحت اچانک کاشیہ کی آنکھیں چمکیں۔

"مینو! شہرام کے لیے نازنین کیسی رہے گی؟" کاشیہ نے اس کا دل بھاری چکی کے نیچے دھکیلا۔

"آں... ہاں... پتا نہیں..." وہ ذرا سے توقف سے بولی۔ "مطلب نازنین کے مزاج اور ہی طرح کے ہیں۔" کاشیہ کی گھوری پہ اس نے بوکھلا کر وضاحت پیش کی۔

"دونوں کی جوڑی خوب جچے گی۔" اس نے خیالوں میں رشتہ پکا کرتے ہوئے دونوں کو ایک ساتھ بٹھا کے دیکھا... وہ مطمئن سی ہو کر بولی، مگر اس کا چین و قرار لمحوں میں غارت کیا۔

"دراصل اس کی مما اس کی شادی اپنے میکے میں کرنا چاہتی ہیں۔"

لیجیے ایک اور دریا کا سامنا' کاشیہ کی ہلکی آواز پہ بھی دل بوجھ زدہ ہوا۔

"ان ماں بیٹے میں فاصلے محسوس نہیں ہوتے مگر وہ عورت اس کی خواہشوں کے عادتوں کے یوں متضاد چلتی ہے کہ وہ اگر مشرق کی طرف منہ کرکے چھینکے گا تو فوری اختلاف ہوگا کہ منہ مغرب کی طرف کیوں نہیں تھا۔" کاشیہ کے انداز میں شہرام کی ماں کے لیے ناپسندیدگی اسے بری کھلی۔

"ایسا تو سوتیلی مائیں کرتی ہیں۔" رائے سے بروقت نوازا۔

"اس لیے وہ بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ مگر انکل معید اس پہ جان چھڑکتے ہیں، شہرام کی ہر بات ان کے لیے حرف آخر ہے۔"

اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ بات اسی جگہ آئی گئی ہوگئی تھی مگر وہ جیسے ایک دم خود پہ منکشف ہوئی... ایبٹ آباد آنے کی کوئی ایک وجہ اس چہرے کی

طلب سے کب منسلک ہوئی بیتے سالوں میں وہ کبھی اندازہ نہیں کرسکی تھی۔ وہ محض ایک پائلٹ آفیسر کی اٹریکشن نہیں تھی' کاشیہ کی گفتگو سے پہلی مرتبہ اسے کھونے کی ایک کھردری سی بے چینی نے اس کے دل میں گھر کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ابتدائی ستمبر کی ایک ست زدہ دوپہر کو وہ کچھ یوں بے سدھ سوئی کہ عصر قضا ہونے پہ اٹھی' وہ سوتی جاگتی حالت میں باہر آئی تو وہ عین سامنے براجمان تھا اس نے آنے والی کو آنکھوں میں دل جان' روح اور محبت رکھ کے دیکھا' اور جیسے نگاہ موڑنے پہ اسے زمانے درکار تھے۔ سب کی موجودگی میں وہ اس کی اس قدر بے اختیاری پہ کٹ سی گئی۔ کچھ گلابی ہو کر جھینپ کر اس پہ سلامتی بھیجی' جسے نہایت انہماک سے محظوظ سا ہو کر وصول کیا گیا..... اپنے لیے چائے بنانے کی غرض سے کچن ایریا کی جانب بڑھتے ہوئے اسے اپنی پشت پہ بھی اس کی نگاہیں محسوس ہوئیں۔ وہ بھی رامین تھی اس کی بے اختیاریوں اور بے قراریوں کا غصہ رات کو یوں نکالا کہ دیگر ڈشز کے ساتھ اپنی سابقہ ڈشز بھی ان ہی لوازمات کے ساتھ اس کے لیے بنائیں۔ جن میں وہ دشمن دل و جان با آواز بلند تبصروں کے ساتھ کھاتا کم دیکھتا زیادہ رہا۔ وہ دور بیٹھی اندازے لگاتی رہی مگر ڈنر کے بعد وہ تینوں رات گئے تک بیڈ روم میں کونسی گتھیاں سلجھاتے رہے۔ رامین کو اس کا اندازہ تک نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

ناشتا کرتے ہوئے بھی اس نے محسوس کیا کہ کاشیہ گاہے بہ گاہے اسے مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگتی۔ ناشتے کے کچھ دیر بعد کاشیہ کو سیب کھلانا بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ وہ پاس آئی تب بھی کاشیہ کے چہرے پہ وہ ڈھیٹ مسکراہٹ چپکی رہی۔

"آپ کا مہمان چلا گیا؟" رامین نے سیب چھیلتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔

کاشیہ نے اخبار سے نظریں ہٹا کر جیسے اسے اندر تک دیکھا۔

"ہاں" کہہ کر وہ دوبارہ اخبار پڑھنے لگی اس کے انداز نظر سے رامین کا دل پسلیوں کی حدود و قیود بھی پھلانگ کر دھڑکا۔

"میں صبح سے سوچ رہی ہوں' یہ کمال کیسے ہوگیا۔" اس نے اخبار پہ نظریں جمائے ہی کہا۔ رامین نے سیب کاٹنے کا سلسلہ روکتے ہوئے تقریباً" ٹیڑھی ہو کر اخبار پہ نگاہ ڈالی۔

"یہ واقعی کمال نہیں بلکہ میکال ہے' خواہ مخواہ صبح سے دماغ گھس رہی ہو۔" وہ جیسے اسے بدھو سمجھ کر کھلکھلائی' اور سیب کاٹنے کا سلسلہ بحال کیا۔ کاشیہ نے آنکھوں میں زمانے بھر کی تیکھی مرچیں بھر کے اسے گھورا۔

"میں جانتی ہوں یہ کمال نہیں۔" وہ تنک کر بولی۔

"کمال یہ ہے کہ شہرام تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" اس نے اسے زور کا دھوکا جڑا' چھری سیب چھوڑ انگلی میں گھسی' کاشیہ کے بتائے گئے کمال نے دو ہزار والٹ کا کرنٹ اس کے جسم میں چھوڑا اف! وہ اچھلی۔

"اور مجھے دیکھو..... میں نازنین کے ساتھ اس کی جوڑی سیٹ کر رہی تھی۔" پھر کسی خیال کے تحت اس کی جانب گھومی۔

"اچھا سنو تو۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ نازنین کا رشتہ طے ہونے تک تمہارا پرپوزل نہیں جاسکتا۔" وہ دو گھڑی کے لیے رکی۔

"مگر اس نے میرا کہا ریجیکٹ کردیا' کہنے لگا مما' پاپا دوبارہ پتا نہیں کب چکر لگائیں۔" اس نے پلٹ کر کاشیہ کو دیکھا۔ "میں نے اسے یہ بھی کہا کہ ہمارے خاندان میں منگنی نہیں نکاح ہوتا ہے۔ کہنے لگا منظور ہے۔" وہ ہونق کھڑی رامین کو جیسے باخبر کررہی تھی۔

"میں نے اس سے کہا سوچ لو' ہماری کک روز مسالے بدلے گی' کہنے لگا' پھر بھی قبول ہے۔" کاشیہ کے ان الفاظ نے اس کا دل گدگدایا تو چہرہ سرخ ہوا۔

"دونوں ہی بڑے گھنے ہو' ہوا تک نہیں لگنے دی کہ

تم دونوں میں کچھ چل رہا ہے۔"

"ہوا کیسے لگتی۔" وہ اس کی بات کاٹ کر روانی سے بولی۔ "ہم نے تو روٹیوں والی ڈلیا کے اندر۔" کاشیہ نے اٹھ کر اسے پشت سے جالیا' دونوں کی کھلکھلاہٹیں عروج پر تھیں۔

"ہر عروج کو زوال کیوں ہے؟" چنبیلی کی ڈال نے اکلوتے گلاب سے پوچھا۔ مگر اس کے کان محبت برد آندھیوں کی آہٹ پر لگے تھے' جو قریب تر تھیں۔

☆ ☆ ☆

"خالہ امی! مبین کے دوست کی فیملی رامین کے لیے آپ کے یہاں آنا چاہتی ہے۔"

وہ شہرام کے والدین کی آمد سے چند روز قبل ہی پنڈی چلی آئی تھی' اب خالہ کو اکیلے پا کر اپنے آنے کی وجہ بیان کی' جنہوں نے اسے یوں بدک کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔

"رامین کے لیے ہی کیوں؟"

"معید انکل کو رامین بہت اچھی لگتی ہے۔" وہ ان کا مشکوک انداز دیکھ کر صفائی دینے لگی۔

"آواز نیچی رکھ کے بات کرو کاشیہ۔" انہوں نے درشتی سے کہتے ہوئے بند دروازے کی جانب دیکھا۔ "سنا نہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" لہجہ ہنوز برہم تھا۔

دیواروں کے کان تو محاورتاً ہوتے ہیں مگر دروازے سے چپکی نازنین کے کان سرگوشی بھی سن لیتے تھے۔

"لیکن خالہ امی میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے؟" وہ بدحواس سی ہوئی۔

"بڑی بہن منگنی شدہ بھی نہیں اور چھوٹی کا رشتہ آگیا بے وقوف! اس بات پہ گھر میں چہ مگوئیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔"

"رشتے تو بے حساب آئے' اب نازنین کو کوئی پسند نہ آئے تو اس میں رامین کا کیا قصور۔" کاشیہ کو ان کی اس ناانصافی پہ افسوس ہوا۔

"میں تو کہتی ہوں اب اگر اس کا رشتہ آئے تو بات ابا کے کان میں ڈال دیجیے گا' پھر وہ جانیں ان کا کام۔ آپ کی بے جا حمایت پا کر وہ سینکڑوں رشتے ٹھکرا چکی ہے۔"

اس کی باتوں سے نازنین کے اندر اشتعال انگیز لہر اٹھی۔

"تو پھر کیا کروں' بھرا پُرا خاندان ہے' ذرا سا اونچا بھی بولوں تو آواز چاروں گھروں میں سنائی دے گی۔" خالدہ اپنی اس بھانجی سے جسے انہوں نے بیٹی کی طرح پالا تھا سارے دکھ سکھ کہہ لیتی تھیں.... اب بھی اس کی بے بسی پہ وہ افسردہ ہوئیں۔

"تو پھر میں ان لوگوں کو فی الحال منع کر دوں۔" وہ دوستانہ انداز میں دھیرے سے بولی۔

"بالکل بھی نہیں۔" خالدہ سرعت سے بولیں۔ "انہیں ضرور آنے کا کہو۔ مگر یہاں کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دینا کہ وہ لوگ کس کے لیے آئے ہیں۔" خالدہ کی پیشانی پہ پُراسراری شکنیں ابھریں۔

"یا اللہ! انہیں میں کیسے سمجھاؤں کہ یہ رشتہ لڑکے کی ایما پہ آرہا ہے۔"

"اور اگر رحمہ آنٹی نے سب کے سامنے رشتہ مینو کے نام سے ڈال دیا تو؟" کاشیہ کو یہ خدشہ بچاؤ کا واحد راستہ نظر آیا تو فٹ سے زبان پر لے آئی۔

"وہ بعد کی بات ہے۔ میں دیکھ لوں گی سب۔" خالدہ اب طمانیت سے مسکرائیں۔

کاشیہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ نازنین کو ماں' زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی اپنی ماں محسوس ہوئی۔

"لڑکا کیا کرتا ہے؟" وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھیں۔

"وہ پائلٹ ہے۔ بہت اچھا خاندان ہے۔ ان کے چلغوزے اور انجیر کے باغات ہیں.... مگر اب انکل معید یو۔کے میں اپنا بزنس اسٹارٹ کر چکے ہیں اس لیے پاکستان کبھی' کبھار ہی آتے ہیں۔ اب بھی وہ ڈھائی ماہ ہی رکیں گے۔"

وہ ان کے مزید سوالوں سے بچنے کی وجہ سے اچانک کھڑی ہوئی۔

"مجھے لگتا ہے' کچن میں دودھ ابلتے ہوئے اچھل گیا

ہے۔" وہ باہر کو لپکی۔۔۔ شہرام کی خواہش سے متعلق کاشیہ کے ذہن و دل میں بھی ولے ہے اور پریشانیاں ابلتے ہوئے اچھلنے لگی تھیں مگر وہ جانتی نہیں تھی کہ یہ وہم بے جا نہیں ہیں۔

☼ ☼ ☼

"آپ خود سمجھ دار ہیں بسمہ! جب تک نازنین کا رشتہ طے نہیں ہوجاتا۔ ہم چھوٹی بیٹی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔" خالہ کے اس قدر صاف انکار پہ کاشیہ نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا' جسے بسمہ نے فوری نوٹ کیا۔ ساری کہانی کھل کر سامنے آگئی۔ بسمہ 'مونا لیزا' کے انداز میں مسکرائی۔ ان کے یہاں گھر کے اندرونی حصوں میں غیر مردوں کا داخلہ نہیں تھا۔ اس وقت ڈرائنگ روم میں ان تینوں خواتین کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ باقی خواتین کی آمد سے پہلے خالدہ اپنی خواہش کسی نہ کسی طور آنے والی معزز خاتون کو پیش کرنا چاہتی تھیں۔ بسمہ کے تصور میں شہرام کا چہرہ لہرایا۔ جب وہ انہیں رخصت کر رہا تھا تو باپ بیٹے کے چہرے پہ خوشی دیدنی تھی۔ "میرے بیٹے کو کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا لہٰذا سارے اندیشے دل سے جھٹک دو۔" معید کے قہقہے کی گونج سماعت میں ابھری۔

"جی میں سمجھ رہی ہوں۔" بسمہ نے پروقار طریقے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ چونکہ ہمارے داماد کے قریبی لوگوں میں سے ہیں۔ اور ہمیں اس پر پورا اعتماد ہے کہ وہ خاندانی لوگوں کو ہی ہمارے گھر کا راستہ بتا سکتا ہے۔" بسمہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔۔۔ مگر وہ ان کے منہ سے سننا چاہتی تھیں۔۔۔ جب تھوڑی دیر بعد ملازمہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی آئی تو ساتھ رامین اور آسیہ بھی تھیں۔

"رامین! ادھر بیٹھو۔" کاشیہ نے اسے بسمہ کے قریبی صوفے پر بٹھایا، جس پہ خالدہ کے انداز میں ایک واضح اکڑ ابھری۔۔۔ یہ صورت حال نہ صرف بسمہ کے لیے دلچسپ تھی بلکہ اس کے اپنے ارادوں کے مطابق جا رہی تھی۔

بسمہ نے رامین کا جائزہ لیا' وہ پرکشش تھی یا اسے جاذب نظر کہا جاسکتا تھا۔ شہرام کا پاگل پن اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ چار سال کا تھا جب بسمہ سے معید نے شادی کی اور آج تک اس نے کبھی وجہ یا بلاوجہ بسمہ سے الجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا اور زندگی کے ہر معاملے میں اپنی پسند اس کی اولین ترجیح تھی۔

ایک دفعہ گرمیوں میں وہ اپنی خالہ کے پاس امریکہ گیا ہوا تھا۔ گھر کی آرائش اور رنگ و روغن مکمل تبدیل کروا دیا گیا۔ معید اور بسمہ کی شادی شدہ زندگی کی وہ پہلی لڑائی تھی جو اس کی آمد کے بعد ہوئی تھی۔ جب تک اس کا بیڈ روم سابقہ حالت میں نہیں آیا تھا وہ ہفتہ اس نے ایک ہوٹل میں گزارا۔

بسمہ کے دل میں اس کے خلاف پڑنے والی وہ پہلی گرہ تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی شہزان پہ جان نچھاور کرتا تھا' کبھی دیکھنے والوں کو محسوس نہ ہوا کہ وہ اس کا سوتیلا بھائی ہے۔ شہزان کی اسکولنگ سے لے کر اس کے کالج کے مضامین تک کے تمام فیصلے بھی شہرام کی پسند کو مدنظر رکھ کر ہی معید نے کیے تھے۔ بسمہ کو اس کے اخلاق و کردار اور طرز زندگی میں۔۔۔ رتی برابر جھول نظر نہ آتا جس کی بنیاد پر معید کے دل میں اس کی محبت کم کی جاسکے۔ جب اپنے بیٹے شہزان کے معاملے میں انہوں نے بولنا چاہا تو معید نے یہ کہہ کر اسے جھڑک دیا تھا۔

"شہرام کی چوائس تم سے کہیں بہتر ہے۔ ابھی سے دونوں بھائی چھوٹے موٹے فیصلے مل کر کریں گے تو آگے چل کر ان کے لیے یہی جذبہ آسانیوں کا موجب بنے گا۔"

وہ چاہتی تھیں کہ شہرام کی شادی ان کی بھتیجی سے ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ بیچ میں شہزان کو لائی تھیں۔

"مگر میں اس کو کیوں فورس کروں کہ وہ رائمہ سے شادی کرے۔" ان کے اٹھارہ انیس سالہ بیٹے نے جس سرد انداز میں ماں کو ٹوکا تھا' وہ دنگ رہ گئیں۔۔۔

جیسے وہ شہزان نہیں' اس کے سامنے شہرام کا بڑا بھائی بیٹھا ہو۔ یہ شہرام کے خلاف ان کے دل میں دوسری گرہ تھی۔

اب اگر وہ رامین سے شادی کرنا چاہتا تھا تو وہ دنیا کی اول و آخر لڑکی تھی جسے شہرام کی دلہن بننا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر بغور اسے شہرام کی نظر سے دیکھا۔ اس کی پسند یہ ہی تھی ایک دم نظروں کو تروتازہ کرنے والی.... اس لڑکی میں چاندنی جیسی ٹھنڈک تھی مگر آنکھوں کو خیرہ کرنے والا حسن نازنین کو دیکھ کر بسمہ نے دیکھا۔

"آپ بھی سوچ لیجیے۔ ہمیں بھی گھر میں سب سے صلاح مشورے کا موقع ملنا چاہیے۔" خالدہ نے سلجھے ہوئے لہجے میں متانت سے ایک ذو معنی بات کی تھی۔ جسے بسمہ کے تیز ذہن نے فوراً" سمجھ لیا۔ کیونکہ خالدہ نے بسمہ کی آنکھوں میں نازنین کے لیے پسندیدگی کے رنگ بھانپ لیے تھے۔

"مجھے آپ کی بڑی بیٹی کی تصویر چاہیے۔" کاشیہ کسی کام سے باہر گئی تو بسمہ کو بات کرنے کا موقعہ مل گیا۔ خالدہ کی دل کی مراد بر آئی.... جب بسمہ وہ تصویر اپنے بیگ میں رکھ رہی تھیں تو کاشیہ اندر آئی.... وہ لفافے کی ساخت سے بھانپ گئی تھی کہ اس کے اندر کیا ہو سکتا ہے۔ وہ گنگ سی کسی پتھر کے بت میں ڈھلی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ خالہ کو کچھ بتا سکتی تھی نہ شہرام کی محبت کا راز افشا کر سکتی تھی کیونکہ رامین ہمیشہ ابا کی ایما اور اجازت سے ہی اس کے ہاں جاتی تھی۔ اماں کو ہمیشہ اس کے گھر کے ماحول سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔

"کچھ بھی ہو اس کا رشتہ نازنین سے طے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔" یہ سوچ کر ہی اس کے دل کو ایک گونہ سکون محسوس ہوا۔ وہ بے خبر تھی کہ پاس کھڑی تقدیر کیا کھیل کھیلنے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

انہیں واپسی کے راستے میں ہی شہرام کی کال موصول ہوئی۔

"انہوں نے سوچنے کی مہلت مانگی ہے۔" بسمہ نے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا۔ دو دن بعد ہی وہ ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ بسمہ نے سفید لفافے سے ایک تصویر نکال کر اسے تھمائی۔ انہیں پتا تھا ایسی ہزار تصویروں کے وہ ٹکڑے کر سکتا ہے۔ وہ اس کے رد عمل سے رامین کے لیے اس کی محبت کی حدود قیود بھانپنا چاہتی تھیں۔ تصویر دیکھتے ہی اس کی پیشانی ناگوار لکیروں سے بھر گئی۔ وہ پورے کا پورا حیرت آمیز سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔

"یہ اس سے بڑی.... نازنین ہے۔ تصویر میں تو کچھ بھی نہیں۔ حقیقت میں دیکھو گے تو میری طرح مبہوت رہ جاؤ گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ خوش گواریت سے مسکرائیں۔

"مجھے مبہوت نہیں ہونا۔" اس نے تصویر سامنے دھری ٹیبل پر اچھالی۔ اس کی اس حرکت پہ بسمہ کا رنگ اڑا۔

"رامین تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس کا تمہارے ساتھ کوئی جوڑ نہیں بنتا۔" انہوں نے فوراً" خود کو سنبھالا اور نرمی سے کہہ کر اس کا سکون تہہ و بالا کیا۔

"کون ابھی چھوٹی ہے؟" معید نے اندر آتے ہی شہرام کا سنجیدہ چہرہ دیکھا' پھر بیوی کی طرف دیکھا جو ان کی اچانک آمد سے گڑبڑا گئی تھیں۔ شوہر کو دیکھ کر مسکراہٹ کی صورت ہونٹ پھیلائے۔

معید نے بیٹھنے سے قبل وہ تصویر ٹیبل سے اٹھائی جسے وہ بیٹے کو بے دلی سے پھینکتا دیکھ چکے تھے۔

"انہوں نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ وہ بڑی بیٹی کی شادی سے قبل چھوٹی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔" معید کی نظر تصویر سے پھسل کر بیوی کی جانب اٹھی کہ یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔

"میں آپ دونوں کے ساتھ یہ بات کرنا چاہتی تھی۔" ان کی نظروں کا مفہوم جان کر وہ اب پہلو تہی سے کام نہیں لے سکی تھیں۔

"مما! بجائے اس کے کہ آپ انہیں کنوینس

کرتیں ان کی باتوں میں آکر آپ کسی بھی ایکس وائے کی تصویر اٹھالائیں..... "وہ برہم ہو کر بولا۔

"یہ ایکس وائے ان کی بڑی بیٹی ہے اور عجیب دقیانوسی لوگ ہیں۔ بجائے ہمارے پروپوزل پہ غور و فکر کرنے کے اُلٹا اپنا پروپوزل ہم پر ٹھونس دیا۔" بسمہ نے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پہ آیا غصہ کسی اور پہ جان بوجھ کے نکالا۔

"شہرام ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہیں تصویر نہیں لینی چاہیے تھی۔" وہ فکر مندی سے گویا ہوئے۔

"لوگ خاندانی اور وضع دار ہیں۔ اسی وجہ سے حیات صاحب کی بیگم نے تصویر گھر میں دکھانے کا کہا تو میں انکار نہیں کرسکی۔" انہوں نے بنا ہچکچاہٹ کے صفائی سے جھوٹ بولا۔

"آپ ان سے کہہ دیجیے گا کہ ہم انتظار کریں گے۔ مگر رامین کے علاوہ کوئی بھی نہیں۔" اس کے دو ٹوک اور قطعی لہجے پہ وہ دونوں ساکت رہ گئے۔ بات کرتے ہوئے اس کا لب و لہجہ مناسب تھا مگر اس کا جھٹکے سے وہاں سے اٹھنا بسمہ کو غیر مناسب لگا۔

"سچی بات ہے' ان کی بڑی بیٹی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ وضع قطع سے سلجھی ہوئی اور ہماری فیملی ماحول کے لیے سوٹ ایبل بھی ہے۔" اندرونی انتشار دباتے ہوئے انہوں نے آخری کوشش کی اور امید افزا نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

"شادی شہرام کو کرنی ہے اور اس کی مرضی سے ہوگی جسے اس نے پسند کیا ہے اب وہی لڑکی میری بہو ہوگی۔" معید کی سپاٹ آواز میں ایسا کچھ تھا کہ وہ کئی ثانیے پلک تک نہیں جھپک سکیں۔

"اور یہ بات مسز حیات کو بھی بتادیتا' اور اگر وہ اپنا سابقہ جواز پیش کریں تو انہیں انتظار کی بابت بھی بتادینا۔"

اب وہ بیٹے کے کمرے کی طرف جارہے تھے۔ انہوں نے متنفر نگاہوں سے شوہر کی پشت کو گھورا لفظ "میری بہو۔" نے ان کے اندر آگ سی بھردی تھی۔

"تمہیں ہماری بہو کہنا چاہیے تھا معید احمد۔ اور کیا خبر کبھی اس بیٹے کے حوالے سے لفظ بہو تمہارے اس خواب کو چھو ہی نہ پائے۔" ایک ظالمانہ فیصلہ انہوں نے کیا اور ایسی ہی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر چمکی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے سائیڈ ٹیبل پہ اوندھی پڑی تصویر سیدھی کی۔ اور تادیر دیکھتی رہی..... اس کے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔

"تو تمہارا پروپوزل رامین کے لیے آیا ہے' رامین میں ایسا کیا ہے پاٹملٹ صاحب۔" اس کی سوچ میں تلخی سی گھلی' وہ اس کے دلکش نقوش نگاہوں میں بھر کے ہنسی۔

"کیا خبر عمر بھر تمہیں میرا چہرہ دیکھنا پڑے۔" ماں اس کے لیے اگرچہ راہیں ہموار کررہی تھی مگر اسے کاشیہ کی طرف سے دھڑکا لگا تھا۔ اس نے تصویر دراز میں رکھ دی۔ اب وہی دھڑکا اسے ماں کے کمرے کی طرف لے جارہا تھا' اس کی آمد پہ خالدہ نے سرسری سا اسے دیکھا جیسے جانتی ہوں کہ وہ کیوں آئی ہے۔

"امی' آپ مجھ سے پہلے رامین کی بات کیسے طے کرسکتی ہیں؟" وہ بنا تمہید کے بولی تو ماں نے غصیلی نگاہ اٹھائی۔

"تمہاری چھپ کے باتیں سننے کی عادت اب خاصی پختہ ہوچکی ہے ماشاء اللہ" ماں کے کھلے طنز پہ وہ کچھ جزبز ہوئی۔ "لیکن تم بے فکر رہو میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔" وہ بستر کی چادر بدل رہی تھیں۔ بات ختم کرکے دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"اپنی لاڈلی کو بھی سمجھادیجیے گا' ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔" لاڈلی سے اس کا اشارہ کس کی طرف تھا' وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

"یاد رکھیں امی اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو میں خودکشی کرلوں گی۔"

"ہے' ہے خدانخواستہ۔" وہ دہل کر بولیں۔ اس کا

ٹھوس لہجہ خالدہ کی ریڑھ کی ہڈی میں چبھا۔۔۔ وہ ماں کے اعصاب ہلا کر وہاں ٹھہری نہیں تھی۔

"مجھے کاشیہ سے کہنا ہی نہیں چاہیے تھا نہ یہ سنتی نہ اس کا دماغ خراب ہوتا۔ ان کے اعصاب کچھ حواس میں آئے تو انہوں نے خود کو کوستے ہوئے سوچا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

سرما کی ہوائیں بدلتے موسم کے دعوت نامے بلا امتیاز' محلوں اور جھونپڑیوں تک دیتی پھر رہی تھیں۔ فوجیوں کے بعد وہ سردیوں کی دیوانی تھی۔

رات کو ناظمہ پھوپھی نے تسلہ بھر کے مہندی گھلوائی تھی کہ پھر وہ دو تین ماہ تک بالوں میں سردی کی وجہ سے مہندی نہیں لگواتی تھیں۔ ملازمہ مہارت سے بالوں میں مہندی لگانے لگی تو رامین بھی قریب ہی پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور سیدھے ہاتھ کی انگلیاں تسلے میں گھمانے لگی۔ قریبی چارپائی پہ کاشیہ کسلمندی سے لیٹی ہوئی تھی۔ چھوٹی چچی لحافوں کے غلاف دھلوا رہی تھیں جنہیں گاہے بگاہے کام والی کے ساتھ چھت پہ ڈلوانے آتیں' اس گھر کا سب سے چھوٹا بچہ بھی اب بارہ سال کا تھا۔۔۔۔ جو مونگ پھلی چھیلتا تو رامین کے اشارے پہ چند دانے اس کی دائیں ہتھیلی پہ دھرتا۔ آہستہ' آہستہ ناشتے سے فارغ ہو کر تمام خواتین ایک ہی جگہ اکٹھی ہو گئیں۔

"حامد میاں! اس سال تو ہم انجیر اور چلغوزے مفت میں خوب کھائیں گے۔" مہندی لگواتے ہوئے چھوٹی چچی نے چٹکلہ چھوڑا۔

"کاشیہ! لڑکے کی ماں کنجوس تو نہیں؟" منجھلی چچی نے رخ موڑ کر پائنتی سے لگی کاشیہ کو دیکھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" جواب بے دلی سے آیا۔ رامین ابھی انگلیاں دھو کے آئی تھی۔ سرخ پوریں دلچسپی سے دیکھیں۔۔۔ اجلے ہاتھ رچ گئے تھے۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی' نازنین صورت کی طرح قسمت کی بھی دھنی ہوگی۔"

دل کو بلا کا دھکا لگا' اس نے بدحواسی سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ شاید غلطی سے نازنین کہہ دیا ہو۔ کاشیہ نے اس کے دہلنے اور چونکنے کو محسوس کرتے ہی زور سے آنکھیں بند کیں۔

"تو کیا لڑکے والوں کی طرف سے کوئی پیغام آگیا ہے؟" ملازمہ نے خالدہ سے استفسار کیا۔

"ابھی بسمہ بیگم کا فون آیا تھا۔ پرسوں وہ لوگ نکاح کی تاریخ وغیرہ رکھنے آرہے ہیں۔"

خوشی خالدہ کے ہر انگ سے عیاں تھی کہ بسمہ نے رضامندی نازنین کے لیے دی تھی۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کاشیہ کی آنکھیں کھلیں۔

"ارے بھئی مبارک ہو خالدہ!" ملی جلی آوازیں بھنبھناہٹ میں بدلیں۔

"اے لو' خالی خولی خیر مبارک سے کام نہیں چلے گا شہزادوں جیسا داماد اور اعلا خاندان میں بیٹی بیاہ رہی ہو' مٹھائیوں کے ٹوکرے منگواؤ۔" کلثوم اور نازنین آگے پیچھے اوپر آئیں۔

"بی بنو! دھوپ میں مت بیٹھو' پندرہ بیس دن تو نکاح کے بیچ ہیں۔" ناظمہ پھوپھی نے ہنسی کے تیر پھینکے تھے جو سارے رامین کی سمت آئے۔

اس نے گھبرا کے سرخ پوروں کو دیکھا' وہ تمام رنگ کیسے اڑے' جہاں آنکھیں خوابوں سے خالی ہوئیں وہیں وہ تمام کی تمام بے رنگ ہوئی۔ ان کی محبت میں اظہار کی نوبت نہیں آئی تھی مگر وہ دونوں اندر تک جانتے تھے کہ محبت ہے پھر فیصلہ نازنین کے حق میں کیسے ہو گیا تو۔ کیا حسن جیت گیا' محبت ہار گئی۔

☆ ☆ ☆

بسمہ آنٹی سے ہونے والی گفتگو وہ خالہ امی سے دسیوں بار پوچھ چکی تھی۔

"خالہ امی! ہو سکتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو۔" وہ اندیشہ زبان تک لے آئی۔ "مجھے شہرام سے یا معید انکل سے بات کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بسمہ آنٹی نے یہ فیصلہ خود کیا ہو۔" کاشیہ کسی طور ماننے پر

تیار نہیں تھی کہ وہ نازنین کے لیے مان گیا ہوگا۔ خالدہ نے فق چہرے کے ساتھ اسے دیکھا۔

"مگر بسمہ اپنی طرف سے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتی ہیں' انہوں نے بیٹے کی رائے لی ہوگی تب ہی تو وہ لوگ آرہے ہیں۔" کاشیہ کا نفی میں ہلتا سر دیکھ کر خالدہ کی خوشی جھاگ کی طرح بیٹھی' اور اس نے کوئی فیصلہ کر کے اس کا ہاتھ اپنے سر پہ رکھا' کاشیہ نے کانپ کر انہیں دیکھا۔

"جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ کسی بھی حقیقت سے پردہ مت اٹھاؤ۔ میں نازنین کو زبان دے چکی ہوں' تمہیں میری قسم۔" وہ آبدیدہ ہو کر بولیں۔" اگر اس بار کچھ غلط ہو گیا تو وہ نفرت کی ہر حد پار کر جائے گی۔" ماں کے منت آمیز دکھی لہجے پہ وہ پتے کی طرح لرز کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

دوسری صبح گھر میں طلوع ہوتے سورج کی تیکھی کرنوں نے اس خود غرض لڑکی سے رحم کی اپیل کی تھی۔

"درد کی بارشوں میں تم بھی بھیگو گی۔" کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ سے اندر گھستی کرنوں نے قہر زدہ سا ہو کر اس کا چہرہ چھوا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ اختتام نومبر کی دھوپ اس قدر پُر تپش' باہر آئی تو ہو کا عالم تھا!!

"سب لوگ کہاں غائب ہیں؟" پھوپھو کے پورشن میں جھانک کر آسیہ سے پوچھا۔

"کاشیہ کا شاید بی پی لو ہو گیا تھا' چکرا کے گر گئی۔۔۔۔ خالہ اور رامین اس کے ساتھ اسپتال گئی ہیں۔"

"چلیں جی' اب پھر اماں سے ناز نخرے اٹھوانے اور خدمتیں کروانے کا موقع اچھا ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی واپس آئی۔ چائے بنائی پھر ٹی وی کے سامنے پھیل کے بیٹھی۔

کچھ دیر بعد اسپتال سے فون آگیا۔" کاشیہ کو ڈرپ لگی ہے' واپسی دو تین گھنٹوں بعد ہوگی۔ اماں کا لہجہ خوش باش تھا۔ مگر اس نے کچھ بھی مزید کہے سنے بنا فقط اچھا کہہ کر ریسور کریڈل پہ پٹخا۔

تب ہی دوبارہ بیل ہوئی۔ جبران کا فون تھا۔ وہ خوش ہوئی۔ بے زاری بھک سے اڑی۔ چھوٹتے ہی اس نے بیٹا ہونے کی خوش خبری سنائی۔ اس کے ہاں پہلے دو بیٹیاں تھیں۔ ڈھیروں خون بڑھا کہ بھائی نے یہ خبر پہلے اسے سنائی ہے۔

"ایک سیکنڈ' میں ذرا آسیہ کو بتادوں۔"

"نازنین۔۔۔ سنو۔۔۔ تو۔۔۔ میں اسے بتا چکا ہوں۔" وہ ہنسا تھا۔ اس کا ہواؤں میں اڑتا غرور دھڑام سے نیچے گرا۔ بے دلی سے خدا حافظ کہہ کر فون اس کی جگہ پہ پٹخا۔

"تو جبران! تمہاری کسی خوشی پہ بھی پہلا حق ہمارا نہیں۔" اس کا دل ساری دنیا سے اچاٹ ہوا۔ وہ ٹی وی آن کر رہی تھی کہ دوبارہ بیل ہوئی۔

"اب کون ہے۔" ریسیور اٹھا کر لٹھ مار انداز میں ہیلو کہا۔ دوسری جانب "کون بات کر رہی ہیں۔" فوراً پوچھا گیا۔

"جی میں نازنین!" اجنبی لہجہ محسوس کرتے ہی وہ شائستگی سے بولی۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ تم سے بات ہو گئی۔ میں نے فون اسی مقصد کے لیے کیا تھا۔" ان خاتون کے لہجے میں مراد بر آنے جیسی خوشی جھلکی۔ "میں شہرام کی والدہ بول رہی ہوں۔"

نازنین کا دل بلیوں اچھلا۔

"آپ کے انکل اور میں آپ کو ہی بہو بنانے کے خواہش مند ہیں اور شہرام کو بھی ہم نے تقریباً" راضی کر لیا ہے۔" وہ شیریں لہجے میں بولیں۔ "مگر جانے کیوں آپ کی بہن کاشیہ ایسا نہیں چاہتی۔"

نازنین کو کرنٹ سا لگا۔

"ایسا نہ ہو کہ وہ شہرام کو پھر سے اکسا کر اپنی خواہش پہ آمادہ کرے' بس آپ یہ کرنا کہ اس کی شہرام سے نکاح ہونے تک بات نہ ہو پائے۔"

بنا کسی ہچکچاہٹ کے انہوں نے نازنین سے یوں بات کی جیسے وہ دونوں رازدار سہیلیاں ہوں۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔ وہ نادانی میں

ایک ایسی آندھی کا رخ اس گھر کی طرف موڑ رہی تھی جو بپھری ہوئی تھی اور آندھی کب دیکھتی ہے کہ اس کی لپیٹ میں کون، کون آرہا ہے۔ اس کا بدن غصے سے کپکپایا۔ بسمہ نے اسے چند اور نصیحتیں کرنے کے بعد فون بند کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آج کا دن بہت ہی مبارک ثابت ہوا ہے۔ صبح ہی صبح خوش خبریاں سننے کو ملیں۔" چھوٹی چچی نے مٹھائی کھاتے ہوئے کاشیہ کو ڈھیروں نصیحتیں کیں جو دوبارہ ماں بننے کی خبر پہ بھی اندر سے خوش نہیں تھی۔

"خالہ! آپ مجھے ایک بار شہرام سے فون پہ بات کرنے کی ہی اجازت دے دیں۔ کیا خبر میرے دل میں ابھرنے والے وسوسے بے کار ہوں۔ یہ سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا ہو۔"

سب کے جانے کے بعد وہ دونوں اکیلی ہوئیں تو وہ منّت سے بولی۔

"تم سو دفعہ اس سے بات کرو، مگر اسے کریدنا مت۔ ایک طرف تو تم کہتی ہو اس کے والد کو رامین پسند آئی تھی، دوسری جانب لڑکا، لڑکا کر رہی ہو۔ مجھے صاف، صاف بتاؤ کہ کیا چکر ہے؟" خالدہ کی نگاہیں اس کے اندر تک اتریں۔

"چکر تو کوئی نہیں بس مجھے وہم سا ہو رہا تھا۔ اصل میں بسمہ آنٹی اس کی سوتیلی ماں ہیں۔"

خالدہ جیسے برف ہوئیں اور اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ "بی بی اب بھی نہ بتاتیں یہ کون سی اہم بات تھی۔"

"اچھا ہوا یہ بات کھل گئی۔ ایک دو روز تک میں اور تمہارے چچا ابا ایبٹ آباد جارہے تھے۔ تمہاری پھوپھی اور دونوں میں سے ایک چچی بھی جائیں گی۔ میرے علم میں اس بات کا ہونا ضروری تھا۔"

کاشیہ کے لیے یہ بات خوش آئند تھی۔ کیا پتا سب کے جانے سے یہ معمہ حل ہو سکے، مگر دو چار روز بعد بھی اس کی خوش امیدی مٹی میں ملی جب واپسی کے بعد مطمئن و مسرور خواتین نازنین کے سسرال کا راگ الاپتی رہیں۔ اس کا فون جانے کیسے خراب ہو چکا تھا اور پی ٹی سی ایل پہ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ بسمہ اور معید نکاح کی تاریخ بھی لے کر چلے گئے۔ بظاہر سب اچھا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بھی اس کا دل سب کچھ غلط محسوس کیوں کر رہا تھا۔ اسے جاگتا دیکھ کر رامین نے اس کی جانب کروٹ بدلی۔

"تم ٹینس مت ہو۔ یہ تمہارے لیے اچھا نہیں۔ مبین بھائی بتا رہے تھے کہ وہ خوش ہے۔ پھر ہم کیوں اداس ہوں۔"

"وہ ایسا نہیں ہے مینو! ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ تم نے محسوس کیا کہ میں مبین سے بھی بات کر رہی ہوں تو نازنین ارد گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ اگر ڈاکٹر نے مجھے سفر کرنے سے روکا نہ ہوتا تو میں ایبٹ آباد کا چکر ضرور لگاتی۔"

"سب لوگ وہاں سے ہو کر آئے ہیں۔ شہرام سے بھی مل کر آئے ہیں۔ بسمہ آنٹی سب کو تو چکما نہیں دے سکتیں۔ تم یوں ہی پریشان ہو رہی ہو۔"

وہ کاشیہ پہ اپنی حالت ظاہر کر کے اسے مزید ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی سو اپنا درد چھپائے اسے ڈھارس دینا زیادہ اہم تھا۔

یہ مقدر کی بات تھی۔ وہ زبردستی شہرام کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کیا کوئی بھی لاکھ تگ و دو کے بعد بھی کسی کو زبردستی اپنا مقدر نہیں بنا سکتا، مگر یہ بات نازنین نہیں جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆

زمین کی کشش آج حد سے سوا تھی کہ قدم جمنے لگتے۔ اس گھر کی چاروں خواتین کے لیے زمین آج مقناطیسی ہو رہی تھی۔ مختلف احساسات کے ساتھ وہ ایک ہی جیسی کیفیات کا شکار تھیں۔ رامین کے لیے آج کا دن انتہائی قلیل آکسیجن لے کر ابھرا تھا۔ کاش انسان اپنے اندر محبت کا وجود مٹا سکتا اس کی سانسیں

چھیننے کا اختیار رکھتا۔
"لڑکے والے آگئے۔" ایک بچے نے ہال کمرے میں آکر ہانک لگائی۔
کاشیہ کے سینے میں دل نے پلٹا کھایا۔ چار روز قبل شہرام نے لینڈ لائن پہ اس سے بات کی تھی۔ وہ خوش تھا اتنا کہ اسے لگا کہ اس کا دم ہی نکل جائے گا۔
"کیمرہ بھیجوں گا مبین کے ہاتھ ۔ واپس کر دیجیے گا' میں خود تصویریں نکلوالوں گا۔ مینو سے بات ہو سکتی ہے تو پلیز صرف دو منٹ۔"
اس کے گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ خالہ امی کی قسم وہ توڑ بھی دیتی اگر سب کچھ طے نہ ہو چکا ہوتا۔ بس ہوں ہاں۔ کرتے کرتے اس نے فون بند کر دیا تھا۔
"تو بسمہ آنٹی آپ نے اسے زندگی کے سب سے بڑے معرکے میں ہرا دیا۔ اس کے دل کی خوشی اس سے چھین لی۔ ہم سب نے اس کی آنکھوں میں حسب بساط دھول جھونکی۔"
"کاشیہ! تم ادھر کیوں منہ لٹکا کر بیٹھی ہو۔ عورتوں کے استقبال کے لیے ہال کمرے میں آؤ۔"
کلثوم اور خالدہ ایک ساتھ اندر آئیں۔ میں کیا منہ لے کر جاؤں گی۔ احساس شرمندگی و ندامت نے اسے لرزا دیا۔
"تم نکاح سے پہلے باہر نہیں جاؤ گی۔" نازنین کے ہاتھ کی زنجیر نے اسے بے حرکت کیا۔
"کون کہتا ہے کہ بلائیں نظر نہیں آتیں۔" وہ وہاں بیٹھے بیٹھے خوف سے 'دکھ سے مٹ گئی۔
"لڑکے والے تو جیسے پوری بارات لے کر آئے ہیں۔ دونوں طرف سے خاندان اکٹھے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں لگے ہاتھوں رخصتی بھی کر دو۔" کوئی بزرگ خاتون خالدہ کے ساتھ اندر آئیں۔
دروازہ کھلنے پہ مختلف خوشبوئیں کمرے میں گھسیں۔ قید کی ہوئی لڑکی پہ صدیاں گزر گئیں۔
انتظار ختم ہوا۔ گواہوں کے ساتھ نکاح خواں اندر آیا۔ شہرام ولد معید احمد کو کسی نے قبول کیا۔ وہ ایک دم خالی ہوئی۔
وہ آزاد ہوئی۔ زنجیریں توڑ کر دروازے کی جانب دیوانہ وار بھاگی۔ دل کو چلتے رہنے کے لیے ذرا سا قرار درکار تھا۔ میری دیوانگی کے جتنے بھی پاتال موسم ہیں سو اس اہل جنوں کو بس تیرا دیدار جھونکا ہے۔ یہ دل آویز سا چہرہ ہی بس تازہ ہوا سا ہے۔
سامنے سفید شلوار قمیص میں تنی گردن کے ساتھ وہ شہزادوں کی سی آن بان لیے بیٹھا تھا۔
"میرے ساتھ محبت کی رشتوں کی آنکھ مچولی کیوں کھیلی شہرام؟" ضبط کے کڑے پہرے توڑ کر آنسو آنکھوں کے در سے نکلے۔ وہ خوشی سے سنہرا ہو رہا تھا۔
"سکہ رائج الوقت بعوض پانچ لاکھ 'نازنین حیات آپ کو قبول ہے؟"
اس کے وجود سے سنہرا رنگ یکلخت اڑا۔ معید احمد کے وجود سے بھی جان ہوا ہوئی۔
"نام لینے میں آپ سے غلطی ہوئی ہے۔" وہ چند لمحوں بعد سنجیدگی سے بولا۔
نکاح خواں نے گردن موڑ کر قریب بیٹھے حیات ساجد سے کچھ کہا۔ "برخوردار آپ کا نکاح حیات صاحب کی بڑی صاحبزادی نازنین سے ہی ہو رہا ہے۔"
وہ تاریک ہوا۔ سیاہ ہوا۔ گھور اندھیرا۔ روشنی کہاں گم ہوئی۔
"کیا بات ہے نکاح کی رسم ادا کیوں نہیں ہو رہی؟" کسی بزرگ نے بارعب آواز میں پوچھا۔
"میں نازنین سے نکاح کیسے قبول کروں جب کہ میرا رشتہ رامین سے طے ہوا ہے۔"
بم پھٹا' بم بھی ایسا کہ لمحوں میں سب کے پرخچے اڑے۔ "مگر اندر بچی یہ نکاح قبول کر چکی ہے۔" اس انوکھی صورت حال پہ مولانا بوکھلا کر بولے۔
"یہ سب کیا ہو رہا ہے مبین؟" معید نے حمایتی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بھی برق رفتاری سے ان تک پہنچ چکا تھا۔
"شہرام تم ہوش میں تو ہو۔ ایسا کیوں کر رہے ہو؟" وہ جیسے دھاڑے۔
"کیوں جیسا سوال تو ہمیں کرنا چاہیے پاپا! آپ ان

سے پوچھیں کہ اندر نکاح خواں کس کا نکاح پڑھا کے آئے ہیں۔"

اس مرتبہ وہ اپنی آواز نیچی نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ دکھ سے نیم پاگل سا ہو رہا تھا۔ صورت حال بگڑتی دیکھ کر طارق اور فاضل نے گلی محلے کے افراد سے معذرت کرتے ہوئے وہاں سے جانے کی درخواست کی۔ اب اس وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں دونوں خاندانوں کے افراد رہ گئے تھے۔

"بابا! آپ مما کو بلوائیں۔" وہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

رامین مفلوج ذہن کے ساتھ یہ تمام کارروائی دیکھ رہی تھی۔ کچھ لمحوں بعد بسمہ اور خالدہ حواس باختہ اندر آئیں۔

"مما! کیا آپ نے میرا رشتہ یہاں رامین سے طے نہیں کیا تھا؟" اسے دیکھتے ہی وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا۔ لرزتی کانپتی رامین کے پاؤں کے نیچے قبر کی کھدائی شروع ہوئی۔

"یہ کون سی پوچھنے والی بات ہے" آف کورس ہم رامین کا ہی پیغام لے کر آئے تھے۔"

خالدہ کے پاؤں کے نیچے آگ دہکی۔

"تو پھر ان سے پوچھیں کہ نکاح رامین کی بڑی بہن سے کیوں کر رہے ہیں؟" صدمے سے اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

رامین کے پاؤں قبر نما گڑھے میں دھنسنا شروع ہوئے۔

حیات نے زندہ گاڑنے والی نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

"بسمہ بیگم نے مجھ سے خود نازنین کی بات کی اور اسی کے لیے رضامندی بھی دی تھی۔" وہ بدحواسی سے بولیں۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔" وہ تحمل سے اور اعتماد سے گویا ہوئی۔

سارا پنڈی آبادی سمیت الٹ پلٹ ہوا۔ پھر حیات فیملی کیونکر سالم رہتی۔

"آپ... کک... کلثوم اور نن... ناظمہ کو بلائیں حیات صاحب! جب ہم سب ایبٹ آباد گئی تھیں تو ان کی زبان پہ نازنین کے سوا کوئی نام نہیں تھا۔" قدموں کے ساتھ ان کی آواز بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"استغفراللہ... دراصل یہ اپنی بڑی بیٹی کی شادی پہلے کرنا چاہتی تھیں جس کے لیے انہوں نے باقاعدہ پلان کے ساتھ ہمیں بے وقوف بنایا ہے بلکہ دھوکا دیا ہے۔" وہ سابقہ انداز میں ان کے تمام جواز تمام صفائیاں رد کرتی گئیں۔ ڈرائنگ روم میں اب دیگر خواتین نے بھی جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ وہاں موجود تمام مرد حواس باختہ ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ مما کے اس دھوکے میں کاشیہ تو شریک نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کے تحت اس کے نیم جاں وجود میں جیسے جان سی پڑی۔

"نہیں! آپ بھابھی کو بلائیں۔" ڈوبتے نے تنکے کا سہارا لینا چاہا۔

"یہ سچ ہے کہ انہوں نے رشتہ رامین کے لیے دیا تھا مگر بعد میں خود ہی بسمہ بیگم نے ہماری بڑی بیٹی کے لیے رضامندی کا اظہار کیا۔ ہم زبردستی کیسے رشتہ طے کر سکتے تھے۔" حیات اور معید کی نظروں میں دونوں عورتوں کو اپنے لیے پھندے نظر آ رہے تھے۔

کاشیہ اندر تو آگئی تھی مگر شہرام کا سامنا اس کا لہو خشک کر رہا تھا۔

"بھابھی جب میری بات آپ سے ہوئی تھی تو آپ نے مجھے سچ کیوں نہیں بتایا؟" اس بے بس لہجے کی بے اعتبار نگاہوں کی تیز دھار چھریوں نے اسے ہر رخ سے کاٹا۔ اس کی گھائل آنکھیں خالدہ پہ ٹکیں۔ ان آنکھوں میں مرنے والوں جیسی التجا تھی۔ پردہ پڑا رہنے کا پیغام تھا۔ کاشیہ کو اس گود کی نرمی اور محبت کا اس گھر کے بھرم کا پاس شہرام کی خواہش سے زیادہ عزیز تھا۔

"جو بھی ہوا کسی بہت بڑی غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔ چونکہ معاملہ اب دو خاندانوں کی عزت کا ہے تو ہمارے لیے اس وقت یہ بات زیادہ اہم ہے۔" معید انتہائی وقار سے بولے۔

"جو بچی نکاح قبول کر چکی ہے اب ایجاب و قبول کی رسم اسی سے ہوگی۔ مولانا صاحب. بسم اللہ کیجئے۔"
انہوں نے جیسے فیصلہ کر کے حکم صادر کیا۔ اس سے آگے کا منظر بسمہ جانتی تھیں۔ ان کی مسکراتی نگاہیں بیٹے کی طرف اٹھیں۔ وہاں موجود ہجوم کی بھنبھناہٹ اچانک تھمی۔

"میں رامین کے علاوہ کسی سے نکاح نہیں کر سکتا۔"

اس آواز نے رامین کے جسم کی کھال ناخنوں تک کھینچی۔ اس کے پنجر کو کسی نے قبر کے اندر کھینچا۔

"شہرام! میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

وہ دھیمی آواز سے گرجے۔ اب اعتماد چور ہوگا' بھرم ٹوٹے گا' حکم عدولی ہوگی اور شہرام معید کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گر جائے گا۔ ان کی خواہش پوری ہوئی۔ آج انہوں نے اپنی ذہانت کے بل پہ میدان مار لیا تھا۔

شہزان نے بھائی کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو جو تمہارا دل چاہے وہ فیصلہ کرنا۔

"آپ میرا نکاح رامین سے پڑھائیں۔ عزت اس طرح بھی بچائی جا سکتی ہے۔" محبت ڈٹ گئی۔ وہ قطعیت سے بولا۔ اس سے پہلے کہ معید صاحب مزید کچھ کہتے۔ حیات صاحب کی آواز نے سب کو اپنی اپنی جگہ ساکت کیا۔

"ناظمہ! رامین کو لے کر آؤ۔"

شہرام کی سانسوں میں تازہ ہوا چلی۔ پنک سوٹ میں وہ مرجھایا ہوا سوکھا ہوا گلاب لگ رہی تھی جس کے جسم میں خون کی ایک بوند تک نہ ہو۔

"مولوی صاحب! نکاح شروع کیجئے۔" اس نے سرعت سے باپ کی طرف دیکھا۔ وہاں جو تاثرات رقم تھے۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ آج کے بعد یہ چہرہ خواب ہو جائے گا۔ ہماری مینو۔ اس کی سماعتیں اس آواز کو ترسیں گی۔ میری چڑیا۔ آواز پھر ابھری۔ گر آج یہ چڑیا اڑے گی تو اس شہر کی گلیاں دوبارہ اسے دیکھ نہیں پائیں گی۔ وقت بہرہ اور اندھا ہوا۔ خاموشی دیدہ بینا تھی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

"ایسا مت کرنا رامین! میں اپنی تربیت کے طعنے سنتے سنتے قبر میں جاؤں گی۔ جس کی ایک بیٹی دلہن بن کر بیٹھی ہو اور دوسری اسی شخص کی دلہن بن کر رخصت ہو جائے۔ وہ ماں کیسے جی پائے گی۔ لوگوں سے تا عمر نگاہ ملانے کے قابل رہے گی؟"

وہ شہرام کے خاندان کو نہیں جانتی تھی' مگر اپنے خاندان کو جانتی تھی۔ وہ ان کے لیے زندہ ہی مر جائے گی۔ وہ اس گھر میں رحمت بن کر آئی تھی۔ وہ کسی بھی بیٹی کو رحمت کے عہدے سے برخاست نہیں کرے گی۔ وہ حیات ساجد کو اسی عزت اور شان کے ساتھ ان گلیوں میں سر اٹھا کر چلتا دیکھنا چاہتی تھی۔

"مولانا صاحب! نکاح شروع کیجئے۔" ان ہی الفاظ کے ساتھ آواز دوبارہ گونجی۔ اس نے خشک بے جان ہونٹوں پہ زبان پھیر کر سب کو دیکھا۔ کاشیہ' مبین' آسیہ سب کی آنکھوں میں الفاظ گڈمڈ تھے۔ کوئی اشارہ' کوئی جملہ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔

"مینو! میری طرف بھی دیکھو۔" ان آنکھوں کی بے آواز سرگوشی اس تک پہنچی تھی۔

وہ انہیں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ان آنکھوں میں کچھ بھی گڈمڈ نہیں تھا۔ اردو' عربی' فارسی ہر زبان میں محبت فلیشر کی طرح روشن تھی۔

"بابا! مجھے ان سے شادی نہیں کرنی۔" فلیشر چکنا چور ہوا۔ وہ اک پل میں بھڑک کر راکھ ہوا۔ "میں یہ نکاح قبول نہیں کروں گی۔"

دوسرے پل وہ راکھ اڑ کر فنا ہوئی۔ جس کی سانس جہاں تھی' وہی جم گئی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوئی۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔

"مولانا صاحب! یہاں جو بھی ہوا... میں معافی چاہتا ہوں۔" پھر وہ باپ کی طرف مڑا۔

"آپ مجھے ابھی اسی وقت گولی مار سکتے ہیں۔ یہاں موجود جس جس کا بھی دل چاہے جس قدر تکلیف دہ موت دینا چاہے۔ مجھے دے سکتا ہے۔ سوری بابا

جان!" اس نے وہاں موجود دو افراد کو آنکھوں کی گیلی قبر میں دفنایا۔

کاشیہ اور مبین کی نگاہیں جھکیں۔ اس نے ایک پتھر میں ڈھلے تیسرے فرد کو کمرے کے کسی کونے سے کھینچ کر اپنے دل کی تازہ قبر میں دفنایا۔ اب اسے وہاں ٹھہرنا نہیں تھا۔ وہ انہیں چار سال کی عمر سے مما کہہ رہا تھا۔ وہ عزت کے ساتھ ان سے محبت بھی کرتا تھا۔ وہ اس کے باپ کی بیوی اور ازحد عزیز بھائی کی ماں تھی۔ وہ جان چکا تھا کہ اس کی محبت اور اس کے ادب کا قتل کس نے کیا ہے۔ اسے تہی داماں اور نافرمان کس نے کیا ہے۔

شہرام کی نظروں سے بسمہ کا جسم سن ہوا۔

اسے جانا تھا وہ چلا گیا۔ پھر وہ کہاں گیا۔ ایک لمبے عرصے تک معید اور شہزان بھی نہیں جان پائے تھے۔ کاشیہ اور مبین نے بھی کبھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ مبین نے اپنا ٹرانسفر کسی اور شہر کروالیا۔ وہ کاشیہ سے کافی عرصے تک خفا رہے پھر بیٹی کی پیدائش پر ہی اس کو واپس گھر لے گئے تھے۔

اس واقعہ کے ایک ہفتے بعد برسوں سے جگر کی بیماری میں مبتلا مشتاق ساجد نے یہ دنیا چپکے سے چھوڑ دی۔ اس قصے سے متعلق بے خبر لوگوں کو بھی وہاں باخبر کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ کوئی اجنبی یوں دیدہ دلیری سے کسی کا نام نہیں لیتا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ وہ سنتی تھی، مگر بہروں کی طرح تاثر دیتی کہ کچھ سنا ہی نہیں۔ قبرستانوں کی خاموشی اس کی آنکھوں اور لبوں کا ٹھکانہ بن چکی تھی۔

حیات ساجد جب تک زندہ رہے، کبھی بیوی سے ہمکلام نہ ہوئے، مگر بیٹی کے سر پہ ہمیشہ عزت اور مان بھرا ہاتھ رکھا۔ اسے اپنے باپ سے یہ ہی دونوں چیزیں چاہیے تھیں۔

نازنین کے لیے وہ ایک اجنبی کی مانند تھی۔ بسمہ نے جس طرح اسے اپنے ڈرامے کا کردار دیا تھا' وہ مہینوں گم صم رہی۔ حیات صاحب نے جس سے اس کی شادی طے کی۔ وہ واجبی سی شکل و صورت کا بندہ اس کے دل کے قریب بھی کبھی پھٹک نہ پایا۔ شہرام کی رامین سے محبت نے اس کے حسن کا غرور توڑ دیا تھا مگر وہ آج بھی کاشیہ اور اپنی بہن سے نفرت کرتی تھی۔ وہ اپنے خوابوں میں کئی بار بسمہ کا قتل کر چکی تھی۔ وہ بسمہ جنہیں شوہر اور سگے بیٹے کی نفرت نے زندہ درگور کر رکھا تھا۔ ان کی خوشیوں کو سولی پہ چڑھا کر بھی وہ خوش کیوں نہیں تھیں۔ شیطان کے ساتھ مل کر انہوں نے جو چال چلی تھی وہی چال ان کی زندگی کا سکون و آرام برباد کر گئی۔ شاید انہیں اندازہ نہیں تھا کہ شہرام معید اس لڑکی کے لیے یوں ڈٹ جائے گا۔ یہ اندازہ تو نازنین کو بھی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

میں سرمئی پرندوں کے پروں پہ لکھ بھیجوں گا۔
او پچھلی رت کے ساتھی۔
اب کے برس میں تنہا ہوں۔
تو پیار کے اس دوسرے شہر میں تمہیں آنا ہوگا۔
ان آنکھوں میں اول و آخر یہی التجا تھی۔ یہی گزارش تھی۔

"یہ آنکھیں تو حکم صادر کرنے والی ہیں۔ ان کے حکم پہ اہل دل نئی ریاستیں تعمیر کرنے کو تیار ہیں۔ تم کسی کو اشارہ تو کرو۔" وہ بلاوجہ ہی مسکرائی۔

آج وہ وادی میں آوارہ گردی کر رہے تھے۔ پرسوں ان کی واپسی تھی۔

"تمہیں شاخسار کی اوٹ سے دیکھنے والے بہت ہیں۔ کسی کا ہاتھ تھام لو۔ زندگی نئے سرے سے شروع کرو۔" وہ پھر مسکرائی۔ "میں نہیں چاہتی کہ میرا انتظار پھر سے تمہارا وقت روک دے۔ میں تمہارے پیغام نہیں پڑھوں گی۔ تمہیں اگلے برس تک تنہا نہیں رہنا ہوگا۔ تم سنبل سے شادی کرلو۔" اس نے باہمت ہو کر ایک دم ہی کہہ دیا۔

وہ یوں رکا جیسے اچانک راہ میں چلتا پہاڑ اس کے عین سامنے رکا ہو۔

"میں جس دن تم سے رشتہ جوڑنے آرہا تھا اس
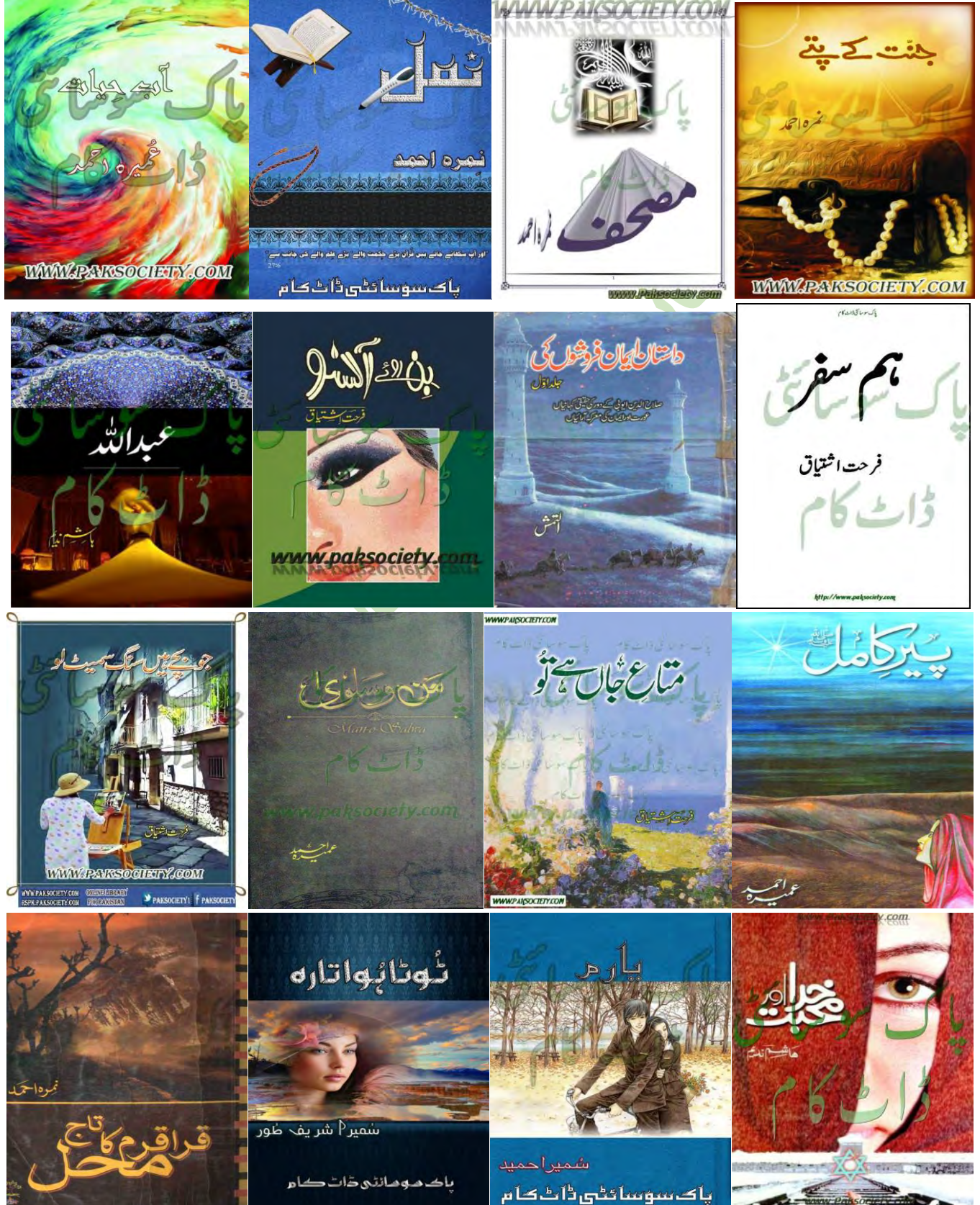
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

طویل سفر میں خوشی میرے ہمراہ تھی۔ تمہارے گھر کی دہلیز پار کر کے میں نے خوشی کے تمام ذائقے چکھ لیے تھے۔ خوشیوں کے دلفریب نقوش میری نگاہوں نے ازبر کیے تھے۔ وہ احساس اب میں دوبارہ کبھی محسوس نہیں کر سکتا۔ پھر میں کسی کو کیوں دھوکا دوں۔"

کچھ دیر کو وہ سناٹے میں آ گئی۔

"تم اسے دل کی نظر سے دیکھو تو سہی۔ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ اس کے خدوخال دیکھتے' دیکھتے میرا چہرہ تمہیں یاد نہیں رہے گا۔ اسے قریب سے دیکھو گے تو وہ دل کے قریب آ ہی جائے گی۔ یہ تنہا رہنے کی ضد چھوڑ دو۔"

اسے سناٹا توڑنا تھا۔ آج اسے بولنا تھا سو اس نے جرات کی تھی۔

وہ اس کی جرات پہ حیران ہوا تھا کہ ان جملوں نے اسے بے حرکت کیا تھا۔ اس نے اسے دیکھا۔ بہت فرصت سے دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔

"محبت خدوخال سے نہیں ہوتی۔ کسی حسین وجود کا قرب پا کر بھی نہیں ہوتی۔ کوئی دیکھتے دیکھتے دل کے قریب نہیں آتا۔ اگر محبت خدوخال سے ہوتی تو اس وادی کے تمام مرد تمہارے عشق میں مبتلا ہو چکے ہوتے۔"

وہ اس ہونق بنے وجود کو نرمی سے اپنے راستے سے ہٹاتا سامنے بڑھا۔ وہ اس کے بھاری بوٹوں کی آواز سنتی رہی۔ وہ اب میس ایئر فورس کے پل پہ آ گئے تھے۔ یہ قیمتی لمحے تھے' بچھڑ گئے تو سمجھو مر گئے۔

"تم مجھے سزا دے رہے ہو شہرام!" ضبط کی ڈور آج اس قدر ریشمی تھی کہ اس کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی گئی۔

"میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔" وہ اپ سیٹ ہوا۔ آج اس کی فرسٹریشن وہ سمجھ سکتا تھا۔

"تم مجھے احساس دلاتے ہو کہ راہ میں چھوڑ کے چلے جانا دوسرے کو کس قدر تکلیف میں مبتلا کرتا ہے۔"

"اف.... اتنے آنسو۔" ٹھوس دریا ایک دم ان آنکھوں میں جا کے بہنے لگا تھا۔ وہ کہہ ہی نہیں سکا کہ اس سے زیادہ آنسو میری بھی آنکھوں کی تہوں میں چھپے ہوں گے۔ وہ کہہ نہیں پایا کہ میں تو محبت یافتہ تھا۔ تمہاری خواہش کر کے سزا یافتہ ٹھہرایا گیا۔

اس کی آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ اردگرد اکا دکا سیاحوں نے انہیں ٹھٹک کر دیکھا۔ ونگ کمانڈر نبیل نے انہیں نم آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔ کتاب محبت کے صفحات ختم ہو رہے تھے۔ کہانی نے اب بھی نیا موڑ نہیں لیا تھا۔ وہ پہلے بھی جدا ہو گئے تھے۔ اب بھی بچھڑ رہے تھے۔ اگر کچھ نیا تھا تو وہ اظہار محبت جو اس نیلے موسم میں اذیت سے نیلی پڑتی اس لڑکی نے کیا تھا۔ کچھ نیا تھا تو وہ دکھ جس کا اظہار اس نے بہ آواز بلند کیا تھا۔

بارہ سال پہلے وہ دکھ سالم نگل گئی تھی۔ تب ایک آنسو بھی رسوائی تھا۔ تشہیر محبت تھا' حرف عزت تھا۔ اس جدائی پہ وہ آنسو بہا رہی تھی۔ آج وہ اپنی اور اس کی محبت کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ جدائی کا سوگ منانے کا اہتمام ابھی سے شروع کر رہی تھی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اس نے اپنے اور اس شخص کے لیے اب دنیا کو چوکور کرنا تھا۔ تکونیات میں ڈھالنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"رامین ایک بات کہوں؟"

وہ کتنی ہی دیر سے گومگو کی کیفیت میں تھی۔ اپنے شولڈر بیگ میں تیزی سے کچھ چیزیں بھرتی ہوئی رامین نے سوالیہ نگاہیں اٹھائیں۔

"تم شہرام سے شادی کر لو۔"

اس ایک جملے نے اس کے کئی ٹکڑے کیے۔ اس کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ وہ الفاظ نہیں تھے۔ کاشیہ نے دنیا جہان کا بارود اس کے قدموں تلے ڈھیر کر کے آگ لگائی تھی اس کے وجود کی دھجیاں اڑیں۔

"ہم واپس جا کر کہہ دیں گے' وہ ڈوب گئی تھی۔ لاش تک نہیں ملی۔" کاشیہ کے دوسرے جملے نے اسے خلا سے دھکا دیا۔ وہ کرہ ارض پر اوندھے منہ

گری۔

"تم میرے بارے میں ایسی گھٹیا بات سوچ بھی کیسے سکتی ہو۔" دکھ سے اس کی آواز پھٹنے لگی۔ کاشیہ کے سر پہ چھت گری۔

"کیا... کہا؟" اس نے تاسف زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ "شادی کرنا گھٹیا عمل کب سے ہو گیا؟"

رامین کا اس طرح مشتعل ہونا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"چھپ کے شادی کرنا انتہائی گھٹیا عمل ہے۔" وہ دبے لفظوں میں چیخی۔

"میں اور مبین تمہارے ولی بنیں گے۔ وادی کے تمام بارسوخ لوگ اور یہاں کی تمام ایئر فورس شادی میں شامل ہو گی۔" وہ انتہائی نارمل ہو کر بولی۔

"تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ کیا تم مجھے جانتی نہیں ہو۔" غم و غصے سے وہ بے ربطی سے بولی۔

"ہاں میں تمہیں نہیں جانتی۔ میں صرف شہرام معید کو جانتی ہوں جو کلثوم کی بیٹیوں کی وجہ سے تمہاری بہن کی نفرت کی بھینٹ چڑھا تھا۔ اس کی سوتیلی ماں کے ساتھ خالدہ کی لے پالک بیٹی بھی اس کی مجرم ہے۔"

وہ اس سے زیادہ بلند آواز میں چلائی۔ وہ دونوں ہی اب خاموش تھیں اور اپنا اپنا غصہ کنٹرول کر رہی تھیں۔

"مینو! اس وقت تم چھوٹی تھیں۔ نازنین کے خوف سے یا زمانے کے ڈر سے تم سے فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔" وہ تحمل سے اور ٹھنڈے لب و لہجے میں اسے سمجھانے لگی۔

"مگر اب تم میچور ہو' سمجھ دار ہو' فیصلہ کر سکتی ہو۔" کاشیہ کی آواز نرمی کی انتہا کو چھونے لگی۔

"اگر ایسا ہے تو ہر بیٹی کو ہمیشہ خود کو چھوٹا ہی محسوس کرنا چاہیے تاکہ وہ بڑے بڑے فیصلے کر ہی نہ سکے۔ جو مذہبی اور معاشرتی لحاظ سے انہیں اور ان کے والدین کو پستیوں کی نذر کریں۔ میں نے نازنین یا زمانے کے ڈر سے انکار نہیں کیا تھا۔ میں ابا کی پکار میں چھپا فیصلہ جان گئی تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی سے رخصت کرنے کا سوچ رہے تھے۔ انہیں شہرام کا بار بار میرا نام لینا خنجر کی طرح چبھا تھا۔ میرے ماں باپ میرے بعد ان سوالوں کے جواب کیسے دے پاتے جو آج تک مجھ سے کیے جاتے ہیں۔ اس ماں کا دل پھر کیسے دھڑکتا۔ وہ ایک کو رخصت کر کے دوسری کے گہنے کیسے اتارتی۔"

وہ چند ساعت کے لیے خاموش ہوئی۔ آنسوؤں نے اس کی آواز کا راستہ روک لیا تھا۔

"مینو! وہ تمہارے لیے ایک دنیا آباد کیے بیٹھا ہے۔"

"اگر وہ مجھے یہاں سے سیدھا جنت میں لے جانے کا بھی اختیار پا لے پھر بھی میں اس کے پاس لوٹ کر جاؤں گی' میری جنت جس کے قدموں میں ہے۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"میں جیتے جی... کیسے مر جاؤں... مجھے اپنے آبائی قبرستان میں صرف اپنے نام کا کتبہ اپنی قبر پہ نہیں چاہیے۔ میری خواہش ہے کہ اس قبر کے اندر رامین حیات کا وجود بھی ہو۔"

وہ ایک ایک لفظ پہ زور دے کر بولی۔

"میں اپنی ماں کا انتظار اس شخص کے لیے فنا کر دوں جسے میں سترہ سالوں سے جانتی ہوں۔ اگر اپنے والدین کے گھر بتیس سال گزارنے والی رامین ان کی عزت کا پاس نہیں رکھ سکتی' ان سے وفاداری نہیں کر سکتی تو کسی اور سے کیسے وفادار ہو سکتی ہے۔ کاشیہ! جو عورت خون کے رشتوں کی نہیں ہوتی وہ کسی کی بھی نہیں ہوتی۔ وہ بے شاخ کا پتا بن جاتی ہے۔" اس نے بیگ کی زپ جھٹکے سے بند کی۔

"جبران اور نازنین نے تمہارا حصہ بھی ہتھیا لیا۔ نوکری کرتی ہو' خوار ہوتی ہو۔ فضول کی باتیں سنتی ہو۔ تم یہ زندگی جینا چاہتی ہو۔ یہ سب تمہیں پسند ہے؟" وہ زہر خندی سے بولی۔

"ہاں' میں یہ زندگی جی لوں گی' مگر میری لاچار ماں سے کوئی یہ کہے رامین کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا یا پھر وہ اپنے پرانے چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی۔

حیات ساجد کی بیٹی کا نام و نشان مٹ گیا۔ دفع کرو۔ نام نہ لو اس کا' جہاں بھی منہ کالا کرتی پھرے۔ اس عمر میں میں اپنی ماں کے لیے اپنے باپ کے نام کے لیے ذلت کا باعث نہیں بن سکتی۔ میں اس محبت کا چہرہ سیاہ نہیں کر سکتی جو شہرام نے مجھ سے کی۔"

باہر دروازے سے لگی سنبل آنسوؤں میں نہا چکی تھی۔

"میں شام کو آؤں گی۔ میری پیکنگ بھی کر دینا۔" وہ نروٹھے انداز میں بولی اور کھڑی ہوئی سنبل کا رخ اب باہر کی طرف تھا۔ وہ آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

"آج کے دن کا تمہیں ضرور ثواب ملے گا۔" کاشیہ کی تلملاتی آواز اس نے سکون سے سنی۔

"میں مانتی ہوں کہ محبت ہوش کی دنیا کا پنچھی نہیں' مگر پنچھی ضرور ہے کھلی فضا میں آسمان تلے پرواز کرنے والا جسے پستیاں پسند نہیں۔"

وہ دروازے تک پہنچی تھی کہ عقب سے اس کی غصیلی آواز ابھری۔

"آج اس کمانڈر کو زندہ برف میں گاڑ کر اس پہ فاتحہ پڑھ کے آنا۔"

اس نے مسکرا کر دروازہ کھولا اور دھیمی چال چلتی اپنی راہ ہولی۔ کاشیہ کا غصہ سمجھ میں آنے والی چیز تھا۔

☼ ☼ ☼

برف باری آج اس وادی کے سب سے شاندار شخص کی طرح خاموش تھی۔ انہیں یوں ہی ساتھ چلتے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ اس کے کل کے رد عمل سے خوف زدہ ہو چکا تھا۔ وہ میس کے مشرقی حصے کی طرف دریا کے کنارے تک آئے۔ وہاں ونگ کمانڈر نبیل دو تین نوجوانوں کے ساتھ گپیں لگا رہا تھا جنہوں نے اسے سیلوٹ کیا اور وہ جگہ چھوڑ دی۔

نبیل نے شہرام کی بوجھل اور اداس آنکھیں دیکھیں۔

"ہم نے ابھی سپہ سالار کو کال کی ہے۔ وادی سے لے کر گلگت بلتستان تک آرمی ہائی الرٹ ہو۔ وادی نلتو میں گھسنے والا دشمن جان و دل' وادی سے نکلنے نہ پائے۔" ونگ کمانڈر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

رامین کے نقرئی قہقہے نے شہرام کی اداسی میں دراڑ ڈالی۔

"یہ دو گھنٹوں سے خاموش ہیں۔ ان سے کہیں مجھ سے بات کریں۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔

"میں لیو پہ ہوں۔ آرمی مجھے کسی بھی حکم کی سرتابی پر مجبور نہیں کر سکتی۔" اس کے لہجے میں شرارت چمکی وہی تاثر نبیل کی آنکھوں میں بھی ابھرا۔

"میں کافی بھجواتا ہوں۔" وہ مسکراتا ہوا وہاں سے غائب ہوا۔

اس کہانی میں یہ نیا پن آیا تھا کہ شہرام کے دل میں دبی محبت کی خوشبو وادی میں پھیل گئی تھی۔ اب اسے اداس دیکھ کر تسلیوں کے حروف اس کی ہتھیلیوں پہ لکھنے والے بہت سے لوگ تھے۔ وہ اس پہ عجیب سی نظر ڈالتا آگے بڑھا اور بادبانی تختے کے نوکدار کنارے پر رکا۔

وہ دنیا کا آخری کنارہ نہیں تھا مگر رامین کا دل ڈوب کے ابھرا۔ وہ اس کے عقب میں کھڑی دریا کا وہ حصہ نہیں دیکھ سکتی تھی' جسے وہ دیکھ رہا تھا۔ وہاں لاوا تھا' دلدل تھی یا عذاب کا موسم۔ وہ منظر وہ بھی دیکھنا چاہتی تھی جہاں اس کی نظر ٹھہری تھی۔

"بے شک ناراض رہیں مگر بات تو کریں۔"

وہ اس کی عجیب خواہش پہ پلٹ کر دیکھنے پہ مجبور ہوا۔ اس نے رامین کو دنیا کے آخری انسان کی طرح دیکھا جس کے بعد کرۂ ارض پر وہ تنہا رہ جاتا۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔" وہ اس کے پاس سے گزرتا تختے کی نوک سے قریبی ایک چرمی نشست گاہ پہ بیٹھ چکا تھا۔ وہ اس پل اس کے چہرے کے تاثرات سمجھنے سے قاصر تھی۔ چند لمحوں بعد وہ بھی اس کے برابر میں براجمان ہوئی۔ وہ اسے پاس دیکھ کے مسکرایا۔

"کوئی بات کرو' نہیں بلکہ ڈھیر ساری باتیں کرو' بے معنی باتیں اتنی کہ انہیں سوچتے' سوچتے' دہراتے'

دہراتے یا باقی عمر تمام ہو۔"
ان آنکھوں کی پتھریلی سطح آج مسلسل نم تھی۔ رامین سے ان آنکھوں کی نمی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔
"شاپنگ کہاں سے کرتے ہیں شہرام؟" اس نے ایک بے تکی بات کی۔ وہ مسکرانے پہ مجبور ہوا۔
"میں ہمیشہ اس وادی میں تو نہیں ہوتا۔" وہ سامنے کہیں بہت دور دیکھتے ہوئے بولا۔
"شہرام! آپ صرف اکیلے خرچ کرنے والے ہیں پھر اتنے پیسوں کا کیا کرتے ہیں؟" اب کے وہ ہنسا۔
"کوئی حساب رکھنے والا نہیں۔ کوئی مجھ سے مانگنے والا نہیں تو سارے خرچ ہو جاتے ہیں۔"
اسی اثنا میں ان کے لیے کافی آگئی۔
"تم سب آرمی آفیسرز ایک دن میں کتنی کافی پیتے ہو۔" وہ تلخ کڑوی کافی کا گھونٹ بھر کے بولی۔
"بہت' بہت زیادہ۔" آج اسے کافی سے اڑتی بھاپ اور خود میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔
"یہ کلر آپ کو سوٹ کرتا ہے۔"
وہ نچلا لب دبا کے مسکرایا۔
"جیکٹ کا کلر؟"
وہ کچھ گھبرائی۔
"سارے رنگ تم پہ سوٹ کرتے ہیں۔" خود ہی اپنی غلطی پکڑی۔ "شہرام مجھے تمہاری خوشبو چاہیے۔" پہلی غلطی چھپانے کو دوسرا جملہ پھر غلط بول گئی۔
کافی مگ سے چھلکی۔ وہ بے یقین ہوا۔ وہ مبہوت ہوا۔ اس کے چہرے کے استعجابی تاثر سے وہ نروس ہوئی پھر گڑبڑا کر وضاحت کی۔
"مطلب وہ کلون جو تم استعمال کرتے ہو۔" وہ اس کے یوں روانی سے وضاحت دینے پہ محظوظ سا ہو کے مسکرایا اور کتنی ہی دیر اس غلط جملے کی خوب صورتی کو محسوس کیا۔ اس تمام گفتگو میں اسے ان ہونٹوں کو بار بار چھوتا اپنا نام اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے نام لیوا ہزاروں ہوں گے مگر اپنا ہی نام سن کر دل جیسے اب دھڑکتا ہے
کیا آئندہ یوں دھڑک سکتا تھا۔
"مینو! کیا اب بھی تمہیں پاکستان آرمی سے اتنی ہی محبت ہے؟" اس نے اچانک عجیب انداز میں عجیب سوال پوچھا۔
"جب پاکستان سے محبت ہے تو فوج سے بھی لازماً ہوگی۔۔۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ کہاں ہیں۔" وہ محبت سے چور لہجے میں بولی۔
"یہاں سال میں ایک بار پریڈ ہوتی ہے۔ اگر وہ تم دیکھنے آؤ تمہاری محبت سچ ثابت ہوگی۔" وہ مجسم چشم ہوا۔
وہ مجسم نابینا ہوئی۔
"تم نے مجھے ہجر کے جنگل سے نکالا۔ زنجیر پا عشق آزاد ہو کے تمہارے ساتھ بہت اونچائی تک اڑا۔ یہ سفر بخت جنوری بارہ سال پہلے کے زمانوں کی مہمان ٹھہری۔ تمہیں قریب سے دیکھنا' تمہارے مقابل بیٹھنا' وقت کا زمین کا معجزہ ٹھہرا تو سنو' میرے مہربان' محبت کو اب اور کیا چاہیے۔"
اس کی گہری خاموشی پہ وہ حد سے سوا بے قرار ہوا اور چہرہ موڑ کے اسے آخری سانسیں لینے والوں کی طرح دیکھا جس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔
کوئی تو ہو جو تسلیوں کے حروف دے کر
رگوں میں بہتی اذیتوں کا غرور توڑے
"زندگی انتظار نہیں ہے شہرام۔ اپنے راستوں میں کھڑا ہونے والوں کی ناقدری نہیں کرتے۔ وہ چہرہ تمہاری آنکھوں میں اگے پتھروں کو گلابوں میں بدل سکتا ہے۔"
وہ ملائمت سے بولی کہ کوئی لفظ تو دل پہ اثر پذیر ہو۔
"جب ہمارے درمیان کوئی تیسرا ہے ہی نہیں تو پھر اس کا ذکر بھی کیوں۔" اس نے ان بے حساب آنسوؤں کو بے چین ہو کر دیکھا۔
"ہمارے درمیان تیسری وہ ذات موجود ہے جس کے فیصلوں کو صبر کے ساتھ ماننا پڑتا ہے۔" وہ دوبارہ نرمی سے بولی۔
"اس کے بعد گفتگو کے تمام پرندے کسی دوسرے

آسمان کی اوٹ تلے جا چھپے تھے۔"

میں تیری آنکھ کے موسم سے نکلا تو !
تمہارے خواب میرے ساتھ دربدر ہوں گے

وہ یوں لب بھینچے خاموش تھا کہ ایک صدی تک نہیں بول پائے گا' وہاں اب آنسوؤں کا ہلکا سا شور تھا۔ کیا وہ بیٹھے بیٹھے گہری نیند سے اٹھ چکا تھا' اس نے ہول کر نگاہیں اٹھائیں۔ وہ ان سرخ سوجی گیلی آنکھوں میں جھانک کر مسکرایا۔

اس نے ان بھیگے رخساروں پہ دونوں ہاتھ رکھ کر بہتے آنسوؤں کے آگے بند باندھا۔

"جب برف پگھلے گی تو میں کیسے جان پاؤں گا یہ پانی ہے کہ تمہارے آنسو۔" وہ دوبارہ مسکرایا۔ اس کی ہتھیلیوں نے تمام آنسو جذب کیے۔

"بس کرو مینو! تمہاری دیدہ بینا کا تپش زدہ پانی اس برف کو پانی' پانی کردے گا۔" وہ مدہم سرگوشی مرہم نما تھی۔

"کیا تمہیں وہ اولین گیت یاد ہیں؟" کاٹ دار ہواؤں نے اس لڑکی کی سماعت کو چھوا۔

"ہاں!" وہ مسکرائی۔ "وہ سارے گیت میں نے سنا دیے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

"تم ہر طرف اس کے راستوں میں آنا کبھی تو اس کی نگاہ اٹھے گی۔" سنبل نے اس عجیب لڑکی کو عجیب تر ہو کے دیکھا۔

"تمہیں اچھی لڑکی بننے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی ہر خواہش کو محبت سے منسوب کرتی رہنا۔" اس نے کندھے سے سرکتا بیگ سنبھالا۔

کل وہ سارے آنسو بہا چکی تھی۔ آج اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ "اس نے کہا تھا' یہاں موسم بہار میں درختوں کی کونپلوں سے پھوٹنے والی خمار زدہ خوشبو اپنی ضرب سے دلوں کے قفل کھول دیتی ہے' تم ان دنوں اس خوشبو کا رخ اس کے دل کی جانب موڑنا' دیکھنا وہ قفل کھل جائے گا۔" اس نے آنسو بہاتی سنبل کا ہاتھ تھاما۔

"وہ زمین بنجر نہیں ہے بس تم اپنے حصے کا پودا لگانا۔"

اسے پتا تھا کہ وہ آج مسکرا نہیں سکے گی سو اس نے ایسی کوشش بھی نہیں کی۔

"جیسا عشق شہرام نے آپ سے کیا' اگر کوئی مرد مبتلائے عشق ہو تو ایسا ہی ہو۔"

سنبل کے آنسوؤں میں روانی آئی۔

"جیسی محبت آپ نے اس سے کی' ہر لڑکی کو محبت ہو تو اتنی ہی بااختیار اور باوقار ہو۔"

سنبل نے ان خاموش آنکھوں کو اپنے آنسوؤں کی ذرا سی نمی دان کی۔

"اگر وہ خود کو تمہارا نہ بھی کر سکے' پھر بھی اس کا خیال رکھنا' اگر کبھی زیادہ اداس ہو تو اس سے میری' میرے خدوخال کی باتیں کرنا' اس سے میری آنکھوں

کے رنگ ڈسکس کرنا اور ہاں اسے یہ بھی کہنا کہ اب رامین کو تمہارا اکلوتا نہیں چاہیے۔ تم دیکھنا اس کا چہرہ بجھ سا جائے گا' پھر اسے دھیمی آواز میں بتانا کہ وہ کہہ رہی تھی اب آخری سانس تک تمہاری خوشبو میرے رخساروں سے پھوٹتی رہے گی۔ یہ سن کر وہ محظوظ سا ہو کر مسکرائے گا۔"

سنبل کی آنکھوں سے دکھ بہہ' بہہ کے نڈھال ہو چکا تھا۔

"تم اس کے سامنے مجھ سے محبت کا اظہار کرنا' وہ تمہیں چاہنے لگے گا۔ تم کہنا کہ میرے ہاتھ پہ رامین کا لمس تازہ ہے۔ وہ تمہارا ہاتھ تھام لے گا تم کہنا اس نے میری پلکوں کو چھوا' وہ تمہاری پلکوں پہ نثار ہو گا۔"

سنبل کا دم گھٹنے لگا تھا۔

"تم کہنا مینو کہتی تھی ہم دونوں مسکراتے ہوئے ایک جیسی دکھتی ہیں۔ وہ تمہیں مسکراتا ہوا دیکھنا چاہے گا۔"

کھڑکی کے پٹ سے لگی وردہ نے اپنے۔ اچھلتے دل کو منہ پہ ہاتھ رکھ کے روکا۔

یہ کیسی لڑکی تھی جو اسے اپنا رقیب بھی بنا رہی تھی اور اپنے محبوب کو اس سے محبت کرنے کے ڈھنگ سکھا رہی تھی۔ یہ اس شخص کو محبت کروانے کا کون سا انداز تھا۔ یہ وردہ اور سنبل دونوں نہیں جانتی تھیں مگر ان سے ہاتھ چھڑا کر رخصت ہوتی ہوئی وہ لڑکی جانتی تھی کہ اداسیوں کے دربدر موسم میں رامین کا تذکرہ اس کی گفتگو ہی اس شخص کی محبت کے لیے پناہ گاہ تھی۔

وہ سنبل کے گھر سے باہر آئی تو جیپ میں سامان رکھا جا چکا تھا۔ مبین نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ بت بنی کاشیہ اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس نے نظر اٹھائی اور اس سفید عمارت کو آخری بار آنکھوں سے چوما۔

"جب یہاں آنے والے سیاح اس گھر کو بطور گیسٹ ہاؤس استعمال کریں گے تو انہیں گیٹ کیپر پیسے وصول کر کے تمہاری اور شہرام کی داستان سنایا کرے گا۔"

اسے کاشیہ کی تلخ بات یاد آئی۔ اس نے چہار سو نگاہ کی' وہ کہیں نہیں تھا۔ نگاہ مفلس ہو کر پلٹی' وہ اپنے قدم گنتی جیپ کی طرف بڑھی..... مڑ' مڑ کے دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ جیپ میں سوار ہوئی' انجن پوری قوت سے غرایا۔

واپسی کے سفر کا آغاز ہوا۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کے دیکھا' نگاہ غنی ہوئی' وہ دونوں ہاتھ پہلوؤں میں گرائے بے دم سا کھڑا تھا۔

"میں تمہاری نگاہ کی آس بھی نہیں توڑ سکا مینو!" وہ بے آواز چلایا۔ جب برف پگھلے گی تو پانی میں صرف تمہارے آنسو ہی نہیں ہوں گے' اس کے رخسار بھیگے۔ (برف کی دیواروں سے بنا تھا پیار کا دو سرا شہر)

جیپ آگے بڑھ رہی تھی "میں کبھی نہیں ہنسوں گا مینو" وہ بلند آواز سے چلایا۔ "میں تمہیں بتا رہا ہوں۔" رامین نے اس کے ہلتے لب دیکھے۔ اب وہ بہت پیچھے رہ گیا۔

تیرا عشق جاڑے کی شام تھا سو ٹھٹھر گیا سو بکھر گیا
تیرا عشق وقت غروب تھا سو وہ ڈھل گیا سو اتر گیا
تیرا ہجر ایسی نماز تھا
جسے پڑھ کے کوئی نکھر گیا سو سنور گیا

اب اس نے الوداعی ہاتھ ہلایا نہ اس نے۔ اب وہ نکتے کی صورت بھی گم ہوا کہ بے رحم جیپ نے موڑ کاٹ لیا تھا۔ اس کی پلکوں سے جڑیں سفید بوندوں نے آخری سانس لیا۔

تیرا پیار زہر قدیم تھا جسے چکھتے ہی
کوئی مر گیا کوئی اپنی جان سے گزر گیا

"ڈریسز تو تمہیں میری ہی مرضی کے لینے ہوں گے۔ شادی میری ہے، اس لیے میری شادی میں میری ڈیئر کزن پلس فرینڈ میری مرضی کے نہ صرف ڈریسز لے گی بلکہ تیار بھی اسی بیوٹی پارلر سے ہوگی جہاں سے مس عائشہ نعمان تیار ہوں گی۔" وہ اترائی۔

اریشہ نے اسے گھورا۔ "میری بھی کوئی پسند ہے یار۔"

"تمہاری پسند کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا لیکن پرائریٹی میری چوائس ہوگی۔ ڈن۔"

"ڈن۔" اریشہ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

عائشہ اسے دیکھ کر کھلکھلائی۔ "موڈ نہیں، رانیہ کے بھی تو میں اپنی پسند سے ہی لاؤں گی نا، اسے تو کوئی اعتراض نہیں۔"

"اس کزن کا دیدار بھی کروا دو، جب سے آئی ہوں نام ہی سن سن کر پاگل ہو رہی ہوں۔"

"دیکھ کر تو حواس بالکل ہی جاتے رہیں گے۔"

"اتنی ڈراؤنی ہیں؟" اریشہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

عائشہ مسکرائی ضرور مگر بولی کچھ نہیں۔ اتنے میں ثانیہ ہاتھ میں فون لیے چلی آئیں۔ "تانیہ کا فون ہے، تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔" اریشہ نے بے تابی سے فون لیا اور شروع ہو گئی۔

"ماما! آئی مس یو آلاٹ آپ کب آئیں گی؟"

"اوں، اتنے دن بعد، ہاں انجوائے تو کر رہی ہوں مگر آپ کو مس بھی کر رہی ہوں نا۔" وہ بسوری۔

"اچھا زیادہ چنی منی بننے کی ضرورت نہیں، ایک تو آئی بھی ڈھائی سال بعد ہو اور دو دن میں خالہ بھی یاد آنے لگ گئیں۔" عائشہ نے گھر کا۔

"سن رہی ہیں نا کیسے ڈانٹ رہی ہے، زیادہ ہی بڑی بن رہی ہے، شادی کیا ہو رہی ہے، بہت معتبر ہو گئی ہے۔" اس نے ماں سے شکایت لگائی، ابھی بات مکمل نہیں کر پائی تھی کہ فون عائشہ لے کر کان سے لگا چکی تھی۔

ناولٹ

"جی خالہ' کہیے آپ تو ٹھیک ہیں نا' اور کیا ہو رہا ہے۔ ہم دونوں بس اب نکلنے ہی والی ہیں' ممی بعد میں آ کر ہمیں جوائن کریں گی' جی' جی بڑا لمبا پروگرام ہے آج کا تو' جی' او کے اللہ حافظ۔" فون بند کر کے ___ میز پر رکھ دیا۔

"مجھے ابھی بات کرنی تھی۔" اریشہ نے احتجاج کیا تھا۔ "ہاں تو واپس آ کر اپنے فون سے کر لینا' اب چلیں ورنہ لیٹ ہو جائیں گے۔"

"لیڈیز' لیڈیز' پلیز لسن ٹو می۔" زیان تیزی سے لاؤنج میں آیا تھا۔ سفید ٹی شرٹ' سفید شارٹس اور سفید موزے اور جاگرز میں پسینے' پسینے ہوتا ہوا ٹینس کھیل کر آ رہا تھا۔

"جلدی سے میرے لیے انرجی ڈرنک لایا جائے ورنہ میں بے ہوش ہونے والا ہوں۔" وہ سامنے والے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھا تھا۔

"یہاں کون فارغ بیٹھا ہے جو تمہارے لیے یہ اہتمام کرتا پھرے۔" عائشہ نے ناک چڑھائی۔

"ہیں! یہ دو' دو جوان جہان لڑکیاں جو یہاں بیٹھی نظر آ رہی ہیں' مجھے تو وہ دونوں بالکل فارغ ہی دکھائی دے رہی ہیں۔" اس نے آنکھیں پھاڑیں۔

"ہم کوئی نہیں فارغ وارغ' شاپنگ پر جا رہے ہیں۔" عائشہ نے اریشہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

"فریش جوس بنانے میں شاپنگ لیٹ ہو جائے گی۔"

"اچھا کچن میں نازک یا شریف تو ہوں گے۔ ان سے ہی کہہ دو۔"

"وہ تم خود بھی کہہ سکتے ہو۔" وہ بے مروتی سے کہتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔

"مام' مائے ڈیئر مام۔" وہ ثانیہ کو کچن میں جاتے دیکھ کر لپکا' وہ دونوں مسکراتی ہوئی باہر آ گئیں۔

ڈرائیور گاڑی پورچ سے نکال کر روش پر لا رہا تھا کہ باہر سے ایک بلیک کرولا تیزی سے اندر آئی تھی۔ دروازہ کھول کر ایک لڑکی باہر آئی تھی اور پہلی بار اریشہ کو پتا چلا کہ انسان کسی کو دیکھ کر یوں منجمد بھی ہو سکتا ہے' وہ تو سچ مچ سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔ ... لڑکی اتنی ہی حسین تھی کہ اسے دیکھ کر ارد گرد سب بھلا دیا جائے۔ کم از کم اریشہ نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔

اتنی گوری رنگت' نیلی آنکھیں' ستواں ناک اور بہت گلابی ہونٹ' گولڈن براؤن بال ایک پونی کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور خود وہ سیاہ پینٹ بلیو شرٹ اور سیاہ لیڈیز جیکٹ میں ملبوس تھی۔

انہیں دیکھ کر پہلے تو ٹھٹکی پھر قریب آ گئی "ہیلو" ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ہیلو۔" اریشہ نے بھی اس سے ہاتھ ملایا۔

عائشہ نے تعارف کروایا۔ "یہ میری کزن اریشہ ہے' کراچی سے آئی ہے اور یہ رانیہ ہے' یہ میری چچا زاد ہے یعنی یہ بھی کزن ہے۔"

اریشہ خیر سگالی کے طور پر مسکرائی تو رانیہ نے مبہم سے ہونٹ پھیلائے۔ "مجھے جلدی ہے' واپس بھی جانا ہے' ایکسکیوزمی۔" وہ معذرت کرتی اندر لاؤنج میں چلی گئی اور وہ دونوں گاڑی میں آ بیٹھیں۔

"اللہ' اتنی حسین لڑکی اف!" اریشہ نے دونوں ہاتھ چہرے کی دونوں طرف ___ رکھ کر آنکھیں موند کر جیسے کہا' عائشہ کو ہنسی آ گئی۔

"میں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ حواس کھو دو گی۔"

"یار! یہ گئی کس پر ہے' اتنی تباہ کن خوب صورتی۔"

"اپنی مام پر' ان فیکٹ ہماری چچی' سنا ہے بہت خوب صورت تھیں' ایسے ہی تو نہیں شایان انکل! ان کے پیچھے سب چھوڑ چھاڑ کر سوئٹزرلینڈ میں ہی رہائش پذیر ہو گئے تھے۔"

"سلم اور اسمارٹ بھی کتنی' چال کتنی خوب صورت' کس کس خوبی کی تعریف کی جائے؟"

"تعریف اس خدا کی جس نے اسے بنایا۔" عائشہ کے کہنے پر اریشہ بھی ہنس پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ٹائم دیکھ رہے ہیں' رات کے گیارہ بج رہے ہیں

اور رانیہ ابھی تک نہیں آئی، یہ آخر کون سی نوکری کرتی ہے؟"
"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے آخر، آج مجھے بتا ہی دو۔ کیوں تم اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو؟"
نعمان نے جھلا کر وہ کتاب سائیڈ ٹیبل پر پٹخ دی جو وہ پڑھ رہے تھے۔
"اس میں پیچھے پڑنے کی کیا بات ہے، جوان جہان لڑکی ہے، اتنی اتنی رات تک باہر رہتی ہے تو تشویش تو ہوتی ہی ہے، پرائی ذمے داری سر پر آن پڑی ہے تو نبھانی تو ہے نا کسی بھی طرح سے، اپنی بیٹی باہر ہوتی تو تب بھی آپ یونہی بے فکر بیٹھے رہتے۔"
"ہاں اگر مجھے یہ پتا ہو نا کہ وہ کہاں ہے اور کس کام میں مصروف ہے۔"
"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کو پتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور مجھے بتانا بھی گوارہ نہیں کیا۔" ان کی آواز میں گلہ تھا۔
"تم نے پوچھا کب ہے کہ میں بتاتا، تم تو پورے وثوق سے بات کرتی ہو کہ جیسے تمہیں کنفرم ہے کہ وہ کسی غلط کام میں ہی ملوث ہے۔"
"ہاں تو کس اچھے کام میں اس وقت تک لگی ہوئی ہے، یہ بھی تو بتائیں نا آپ؟" وہ چمک کر بولیں۔
وہ کتنی ہی دیر انہیں دیکھتے رہے، ان کی نظروں میں تاسف، غصہ، دکھ کیا نہیں تھا۔ "تمہیں اس سے پرابلم کیا ہے، صرف یہ بتا دو؟"
"مجھے کوئی پرابلم نہیں، صرف تشویش ہے کہ جوان بچی ہے، خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ ہو جائے....."
"بس۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر آگے بات کرنے سے روک دیا۔ "مزید ایک لفظ بھی نہیں، وہ میرے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے، میری ذمے داری اور میں اپنی ذمے داری نبھانا بخوبی جانتا ہوں، تم پریشان نہ ہوا کرو۔"
"تو دوسرے تو پوچھتے ہیں نا کہ یہ لڑکی ہوتی کہاں ہے؟"
"تم سے آئندہ جو بھی پوچھے، اس سے کہہ دو کہ مجھ سے آکر پوچھ لیا کرے، میں ان کی تسلی کروا دوں گا۔" اس بار ان کے لہجے سے واضح برہمی چھلکی تھی۔
ثانیہ خائف ہو کر کمرے سے ہی نکل آئیں۔
"توبہ ہے، ان کو تو چھیڑ کر میں پچھتائی، بھتیجی کی محبت میں کسی کی سننے کو تیار نہیں تو نہ سہی، مجھے کیا جو ہوتا ہے ہو۔" جلتی کڑھتی لاؤنج میں آئیں، وہاں سامنے سے رانیہ آتی دکھائی دی۔
"دل بھر گیا باہر سے جو گھر آنے کا خیال آ گیا بلکہ ابھی بھی نہ آتیں، صبح آ جاتیں، تمہیں کون سا کسی نے کچھ کہنا ہے، وہ تو ہمارے نصیب میں سب کی سننا لکھا ہے۔"
انہوں نے میاں کا غصہ بھی اس پر نکالا تھا، رانیہ نے ایک نظر انہیں دیکھا اور دھیمے سے کہا۔
"اب بھی اگر کام مکمل نہ ہوتا تو رکنا بھی پڑ سکتا تھا۔"
"اے ڈھٹائی تجھے سلام۔" ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
"تمہیں تو بی پاکستان آنا ہی نہیں چاہیے تھا، تم وہیں ٹھیک تھیں، بتاؤ رات رک جاتیں؟ ایسے کون سے کام چل رہے ہیں جو رات بھر نمٹتے ہی نہیں۔"
وہ تو شروع ہو گئی تھیں، رانیہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ثانیہ اسے کچھ زیادہ پسند نہیں کرتیں، اب تو وجہ بھی معلوم ہو گئی تھی کہ وہ شایان کی شادی اپنی بہن سے کروانا چاہتی تھیں اور انہوں نے جا کر سوئٹزرلینڈ میں بیاہ رچا لیا۔ دو سال قبل شایان اور ماریانہ کی ناگہانی وفات کے بعد نعمان رانیہ کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔
ثانیہ تو اس کا حسن دیکھ کر ہی ہول گئی تھیں۔ دو، دو جوان بیٹے تھے ان کے، ایک ہی گھر میں اتنی حسین لڑکی کے ساتھ رہتے ہوئے جذبات میں کبھی بھی کوئی ابال اٹھ سکتا تھا، پسندیدگی کا، محبت کا اور وہ اس فرنگن کی بیٹی کو ہرگز کسی مستقل رشتے میں قید کر کے گھر میں رکھنے کی روادار نہیں تھیں۔
انہیں ایسی مشرقی اقدار کی حامل بہو چاہیے تھی جو ان کی نسلوں کو پروان چڑھاتے ہوئے اپنی تہذیب و

روایات کو پیش نظر رکھتی تاکہ خود بھی مغربی لباس چڑھائے گاڑی میں سڑکیں ناپتی نظر آتی۔

"اب چل کر سکون سے سو جاؤ" آچکی ہے وہ جس کی وجہ سے تمہیں سخت بے چینی تھی۔" نعمان نے پیچھے سے مخاطب ہو کر انہیں چونکا دیا تھا۔ وہ سخت سا جواب دینا تو چاہتی تھیں مگر پھر نظرانداز کر کے اپنے بیڈ روم میں آگئیں۔ وہ بھی مسکراہٹ دباتے آکر لیٹ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"وزیراعظم کا عہدہ کہیں آپ ہی نے تو نہیں سنبھال لیا۔"

"خدانخواستہ میں کیوں سنبھالنے لگا۔"

"آپ کی مصروفیات تو یہی بتاتی ہیں۔"

"یعنی طنز فرمارہی ہیں آپ مجھ ناچیز پر۔"

عالیان کے منہ لٹکانے پر اریشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ "ایسی کون سی جاب ہے آپ کی' جس میں دن رات کا پتا نہیں چلتا' بندہ کسی وقت تو نظر آتا ہے گھر پر۔"

"اور یہ وہی وقت ہے۔" عالیان مسکرایا "ویسے تم واقعی بہت ذہین ہو اریشہ' میں بہت متاثر ہوا ہوں تمہاری ذہانت سے۔"

اریشہ ہکابکا رہ گئی تھی' یہ جو دو تین باتیں اس نے عالیان سے پوچھی تھیں' بہت ہی عام سی' اس کی مصروفیت کے حوالے سے' ان میں اسے ذہانت کہاں سے نظر آئی تھی؟

"عورت حسین ہو اور اوپر سے ذہین بھی تو کیا کہنے اس کمبینشن کے واہ۔"

جھٹکے پہ جھٹکا' عورت کہلوانا ایک جھٹکا (سب سے شدید جھٹکا ہی اصل میں یہی تھا) مگر حسن و ذہانت؟ وہ ابھی بحر تحیر میں ڈبکیاں لگا رہی تھی کہ مزید بم پھوڑے گئے۔

"تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں گہری سیاہ اور بڑی بڑی۔"

پہلے تو شاید اتنی بڑی نہیں تھیں' جتنی اب ہوتی ہی چلی جارہی تھیں۔

"تمہاری ناک ستواں ہے تو نوز پن اس پر کتنی اچھی لگ رہی ہے نا' یہ ہر کسی پر تھوڑی نا ایسی بجتی ہے۔" اریشہ کی آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیل گئی تھیں۔

اسی پل بڑی بے نیازی سے اس کے بالکل قریب سے گزر کر رانیہ کچن میں گئی تھی۔ زیان بھی جاگنگ سے ابھی لوٹا تھا اور آکر سیدھا ان کے قریب ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھا اور اریشہ نے جس جوس کے دو گھونٹ بمشکل پئے تھے' اسے اٹھا کر غٹاغٹ چڑھا گیا۔

"تمہارے بال کتنے گھنے اور کالے ہیں' بالوں کا تو اصل حسن ہی کالے پن میں ہے۔" عالیان پر تو کوئی دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ مزید بھی کچھ کہتا مگر زیان نے ٹوک دیا۔

"اب بس کردو' تاکہ اس کی آنکھیں اپنے اصل سائز میں واپس آجائیں' ورنہ اب اگر تھوڑی اور پھیلیں تو خدشہ ہے ڈھیلے تڑپ کر باہر آگریں گے اور مجھے تو یہ ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں والی ہی اتنی عجیب لگ رہی ہے تو بغیر ڈھیلوں کے کیسی لگے گی۔ اف!" اس نے تصور کر کے باقاعدہ جھرجھری لی تھی۔

"اور آپ پر یہ سارے انکشاف آج ہی ہوئے ہیں۔" وہ اب سچ مچ برا مان گئی تھی۔

"چائے پیو گی۔" رانیہ دو ابلے ہوئے انڈے اور چائے کے کپ کے ساتھ وہیں آبیٹھی تھی۔

"اتنا سا ناشتہ؟"

"ہوں' کافی ہے۔" وہ نفاست سے انڈہ کھانے لگی' ساتھ ہی چائے کے گھونٹ بھی لے رہی تھی۔

سیاہ جینز' سیاہ شرٹ اور لیدر کی کالی جیکٹ' بیحد سفید رنگت اور اس پر سیاہ آؤٹ فٹ' تباہ کن حسن تھا اس کا' نگاہوں کو خیرہ کردینے والا' وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی' یہاں تک کہ زیان کو چٹکی بجانی پڑی۔

"آجاؤ واپس' چلی گئیں وہ حسینہ عالم۔"

"وہ واقعی ہے حسینہ عالم۔ نوڈاؤٹ۔"
"اوکے گائیز! بائے۔ چلتا ہوں میں بھی۔"
"ہاں آپ نے اب کرنا بھی کیا ہے یہاں۔" زیان بڑبڑایا۔
"کیا مطلب؟" اریشہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"تم مطلب وطلب چھوڑو' تمہارے بس کی بات نہیں ہے یہ سب سمجھنا۔"
"کیوں' میں کیوں نہیں سمجھ سکتی' مثلاً" کیا نہیں سمجھتی میں۔" وہ بگڑ گئی۔
زیان نے چمکارا "خوامخواہ اپنے ننھے منے دماغ پر زیادہ لوڈ مت ڈالو' بس اتنا سوچو کہ پہلے تو تمہاری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملارہے تھے پھر کیا ہوا؟ ایک دم کیوں اٹھ کر چلے گئے؟"
"ہیں واقعی' یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔"
"سوچو بھی مت' خوامخواہ کمزور ہو جاؤ گی۔"
"میں جاؤں' عائشہ کو اٹھاؤں' بہت کام ہے۔"
"واہ' میرے آتے ہی سب اٹھنے لگے' میں اکیلا ناشتہ کروں گا۔" زیان نے ناراضگی دکھائی' وہ بے بس ہو گئی۔
"میں تو..... اچھا' میں بیٹھی ہوں یہیں تمہارے پاس۔" زیان نے مسکراتے ہوئے نازک کو ناشتے کے لیے آواز دی تھی۔

☆ ☆ ☆

عائشہ کی ساس اور نند آئی ہوئی تھیں۔ اریشہ پہلی بار ان سے ملی تھی۔ پُروقار سی صاعقہ آنٹی اور ان کی بیٹی ہنیزہ' بہت ہی اچھی عادت کی تھیں' وہ عائشہ کو ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ انہیں بازار جانا تھا تو عائشہ کے کپڑے' جوتے اور پرس وغیرہ اس کی پسند سے لینے کے لیے وہ اسے ساتھ لے جانے کے لیے آئی تھیں۔ عائشہ اور ثانیہ ان کے پاس بیٹھی تھیں کہ اریشہ چائے کے لیے نازک کی مدد کروانے کچن میں چلی آئی۔
"بس باجی' سب تیار ہے۔ آپ بس ٹرالی میں لگاتی جائیں۔" اریشہ برتن کو ٹرالی میں رکھنے لگی۔
"ایک چائے میرے لیے بھی۔" رانیہ کی آواز پر اریشہ مڑی۔
"آج آپ بے وقت کیسے؟"
"ہاں آج کچھ فرصت تھی تو گھر آگئی۔ کیا ہو رہا ہے' کوئی آیا ہے کیا؟" اس نے ٹرالی کا جائزہ لے کر پوچھا۔
"ہاں عائشہ کے سسرالی ہیں' آئیں نا آپ بھی وہیں چل کر چائے پیتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر آفر کی۔
رانیہ کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔ "نو تھینکس' میں اپنے روم میں جا کر کچھ دیر آرام کروں گی۔" وہ نازک سے اپنا کپ لے کر چلی گئی۔
"کچھ دیر مہمانوں کے ساتھ بیٹھ جاتیں تو کیا تھا' اپنی ہی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے رکھتی ہیں' زیادہ ہی غرور ہے خود پر۔" اریشہ نے ناگواری سے سر جھٹکا۔
"کیسے بیٹھ جاتیں' بیگم صاحبہ کو بالکل پسند نہیں آتی یہ بات۔" نازک نے دبے دبے لہجے میں کہا۔
اریشہ چونک گئی۔ "خالہ کو؟ مگر کیوں؟"
"وہ کچھ زیادہ پسند نہیں کرتیں نا رانیہ بی بی کو اور پھر وہ کپڑے بھی دیکھیں نا انگریزوں والے پہنتی ہیں تو انہیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔"
"تو اس بیچاری نے ساری عمر یہی لباس پہنا ہے تو اب کیسے وہ شلوار قمیص پہنے گی' وہ تو بالکل کمفرٹیبل فیل نہیں کرے گی۔"
"بس جی' بیگم صاحبہ نے سختی سے انہیں منع کیا ہوا ہے کہ عائشہ بی بی کے سسرال والوں کے سامنے نہیں آنا اور عالیان صاحب اور زیان صاحب سے فری ہو کر بات چیت نہیں کرنا' نہ ہی گھر کے معاملات میں مداخلت کرنا۔"
"اوہ' تو یہ وجہ ہے اس کے سب سے کٹے کٹے رہنے کی۔" اریشہ نے گہری سانس لی تھی۔
"باجی' آپ یہ سب اپنے تک رکھیے گا' بیگم صاحبہ کو نہیں بتایئے گا۔" اس نے ملتجی لہجے میں اریشہ سے کہا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی اور اس کا شانہ تھپکا۔
"تم فکر ہی نہ کرو۔"

☆ ☆ ☆

عائشہ اور اریشہ کھانا کھانے کے لیے آئیں تو ٹھٹک گئیں۔ آج تو بڑی رونق تھی ڈنر ٹیبل پر۔ نعمان' ثانیہ' عالیان اور زیان اور سب سے بڑی بات رانیہ بھی موجود تھی۔

"واؤ' آج تو سب ہی فیملی ممبرز موجود ہیں۔" عائشہ چہکی۔

عالیان خوش دلی سے مسکرایا "ہاں تم جب تک یہاں ہو ہم نے سوچا تمہارے ساتھ کھا پی لیں۔"

"چلیں شکر ہے آپ کو خیال تو آیا۔" وہ مسکراتی ہوئی اریشہ سمیت آکر بیٹھ گئی۔

"اور اریشہ' کیسی ہو بیٹا' دل تو لگا ہوا ہے نا؟"

"جی ابھی تو لگا ہوا ہے' جب تک عائشہ ہے' اس کی شادی کے فوراً بعد میں بھی چلی جاؤں گی۔"

"کیوں ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے۔" زیان تو تڑپ ہی گیا تھا۔ عالیان البتہ مسکراتا رہا تھا۔

"لگتے تو ہیں لیکن عائشہ تو میری دوست پلس کزن ہے نا اور ہم دونوں لڑکیاں ہیں' تو وہ بات تو نہیں رہے گی نا۔"

"لڑکی تو یہ بھی ہے اور دوست بھی بنائی جا سکتی ہے۔"

زیان نے رانیہ کی طرف اشارہ کیا' وہ اریشہ کو دیکھ کر مسکرا دی۔ اریشہ بھی مسکرانے لگی۔ "ہاں کیوں نہیں لیکن اب میں خود بھی تو سب کو مس کر رہی ہوں۔"

"ہوں ننھی بچی' مس کر رہی ہوں' شادی کے بعد بھی صبح صبح اٹھ کر رونے بیٹھ جانا' مجھے ممی یاد آرہی ہیں۔" وہ باقاعدہ منہ بسور کر بولا' سب ہنس پڑے تھے۔

"شریر۔" ثانیہ نے چپت لگائی۔

کھانے کے بعد عالیان اور نعمان کہیں چلے گئے تھے اور زیان کی تو نیٹ پر بے پناہ مصروفیات تھیں۔ رانیہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو اریشہ نے پکارا۔

"آپ بھی ہمارے ساتھ آئیں نا رانیہ۔" وہ کچھ سوچ کر رکی' پھر اثبات میں سرہلاتی لاؤنج میں ان دونوں کے ساتھ آبیٹھی۔

"آپ کو سوئس زبان تو آتی ہو گی۔"

"ہوں۔" وہ اثبات میں سرہلا کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"اف۔" دونوں گالوں میں ہلکے ہلکے سے ڈمپل پڑتے دیکھ کر اریشہ کا دل پھر سے لٹو ہو گیا تھا۔

"آپ نے اردو کیسے سیکھی؟"

"ڈیڈ اردو میں ہی بات کرتے تھے۔"

"آپ ان کی ایک ہی اولاد ہیں؟"

"ہاں دو بھائی ہوئے تھے مگر زندہ نہ بچ پائے۔"

"اوہ سیڈ' چچ چچ۔" اس نے باقاعدہ آواز نکال کر افسوس کیا تھا۔

"یہ کیا سیڈ باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ اچھی باتیں کرو' دیکھو رانیہ میں تمہارے لیے ایسٹرن ڈریسز لا رہی ہوں تمہیں وہ پہننے بھی ہیں۔"

"ہاں پہن لوں گی مگر پلیز ایزی والے ڈریسز لانا' وہ مت لے آنا کیا کہتے ہیں ان کو۔" اس نے ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

"شرارے' غرارے' لہنگے' ساڑھیاں۔"

"ہاں وہی' جتنے مشکل نام ہیں' اتنا ہی مشکل انہیں سنبھالنا بھی ہے۔"

"تو اپنی شادی پر بھی ان مشکل لباسوں کو نہیں پہنو گی کیا؟" عائشہ نے چھیڑا تو رانیہ کی رنگت تمتما سی گئی تھی۔ اریشہ کو یوں سرخ چہرے کے ساتھ وہ اتنی اچھی لگی کہ اسے دل میں چھپا لینے کو جی چاہا تھا۔

"رانیہ آپ سے ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو۔" وہ مکمل طور پر اریشہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ کہیں انگیجڈ ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلایا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا' آپ اب تک فری کیسے ہیں؟" اریشہ کے شرارت سے کہنے پر وہ بھی مسکرائی تھی۔

"تو آپ ہیں کیا؟"

"کیا انگیجڈ؟"
"ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"نہیں انگیجڈ تو نہیں مگر....؟" وہ رکی' رانیہ نے سوالیہ ابرو اچکائے۔ اریشہ نے عائشہ کو اشارہ کیا کہ وہ بتائے' وہ ہلکے سے کھنکھاری۔
"اسے ممی نے خالہ سے مانگ رکھا ہے؟"
"کس کے لیے؟" اس نے دونوں کو باری باری دیکھا۔
"عالیان بھائی کے لیے۔" عائشہ نے جواب دیا۔
رانیہ جھک کر ٹیبل پر کپ رکھ رہی تھی' کچھ لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی تھی' پھر سنبھل کر سیدھی ہو بیٹھی "نائس۔"
"کیسا کپل ہے دونوں کا" آپ کے خیال میں؟"
"لکنگ وائز تو بہت اچھا۔ مزید تو ان دونوں کو ہی ایک دوسرے کے خیالات اور پسند' ناپسند کا علم ہو گا۔"
"مطلب' میں سمجھی نہیں؟" اریشہ نے ابرو اونچا کر کے پوچھا۔
"میرا مطلب' آپ دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ سے ہے۔"
"وہ تو الحمدللہ بہت اچھی ہے۔"
"یہ تو بہت اچھی بات ہے' اب میں چلوں۔" وہ اٹھ گئی۔
"کچھ دیر تو اور بیٹھیں نا۔"
"ضرور بیٹھتی مگر بہت ضروری کام نمٹانے ہیں۔"
"چلیں پھر گڈ نائٹ۔"
"گڈ نائٹ اینڈ سوئیٹ ڈریمز۔"

☆ ☆ ☆

"ارے رانیہ! آپ اتنی جلدی آ گئیں۔" اریشہ نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔
"ہاں طبیعت کافی خراب ہو رہی ہے تو آ گئی' کچھ دیر آرام کروں گی۔" اس کی آواز بھی بھاری ہو رہی تھی اور چہرہ سرخ' ٹیبلٹ لے کر وہ لیٹ گئی تھی۔ اریشہ

اور عائشہ' ثانیہ کے پاس آ گئیں' انہوں نے بلایا تھا۔ اب وہ انہیں زیورات دکھا رہی تھیں جو رات ہی وہ نعمان کے ساتھ جا کر لائی تھیں۔
"بہت خوب صورت ڈیزائن ہے خالہ! بہت زبردست۔"
"تمہارے لیے بھی ایسا ہی بنواؤں گی' فکر مت کرو۔"
اریشہ جھینپ گئی' اور عائشہ کھلکھلا کر ہنس پڑی معا" کال بیل کی آواز سنائی دی تو خالہ چونک پڑیں۔
"اس وقت کون آ گیا؟"
"جمیل دیکھ لے گا ممی۔"
"دیکھ تو لے گا پر پتا نہیں ہے کون؟"
"ڈھولکی کب رکھوائیں گی خالہ؟"
"بس اب دیکھو' آئندہ جمعے کو مایوں کا ارادہ ہے اور ہفتے کو مہندی' اتوار کی بارات تو اب ایک دو دن میں اس کی ساری دوستوں اور کزنز کو بلا کر یہ ڈھولکی کا سلسلہ تو شروع کرواتے ہیں' ثانیہ تو جمعے کو آنے کا کہہ رہی ہے اب دیکھو' دوسرے کب کب آتے ہیں۔"
"کل سے مجھے بھی فیشل وغیرہ کے لیے دو تین دن تک پارلر جانا ہے' جیسمین نے کہا تھا' منی' پیڈی روز ہوا کرے گی۔ کہہ رہی تھی بازار کے چکر اب بند کر دو۔ دھول مٹی سے ساری اسکن خراب ہو جاتی ہے۔"
"تو اب رہ بھی کیا گیا ہے بازار سے لانے والا' بس کر دو اب تم بھی۔"
"بس آج دیکھتی ہوں کوئی چیز رہ نہ گئی ہو تو پھر کل سے پابندی شروع....."
دھاڑ سے دروازہ کھلنے کی آواز پر اس کی باقی بات منہ میں ہی رہ گئی تھی اور سامنے دیکھتے ہی دہشت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ جمیل کی پشت سے پستول لگائے وہ لمبا تڑنگا اجنبی مرد' جس نے اندر آتے ہی جمیل کو دھکا دے کر آگے پھینکا تو وہ ثانیہ کے قدموں میں آ گرا' وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہوئیں' اریشہ اور عائشہ چیخ مار کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ اب پستول کا رخ ان

کی طرف تھا۔

"ہینڈز اپ۔"

تینوں نے انتہائی خوفزدہ ہونے کے باوجود پہلے اپنے دوپٹے صحیح کیے پھر دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے تھے' بیڈ پر کھلے ہوئے سونے کے سیٹ' الماری کے پٹ کھلے ہوئے' عائشہ اور اریشہ بیڈ پر بیٹھی ہوئیں اور ثانیہ بیڈ کے پاس کھڑی تھیں اور ان کے قدموں میں گرا جمیل اب اٹھ کر بیٹھ جانے کے بعد ہاتھ اوپر کیے ہوئے تھا۔

"چاروں یہاں ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔"

کانپتی ٹانگوں کے ساتھ چاروں لائن میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے جیب سے فون نکال کر کان سے لگایا۔

"ہو گیا کام' سب کو کر دیا نا اشاٹ فلیٹ' ہاں تو اب آجا یہاں' ہاں میں بتاتا ہوں بس تو آجا۔"

اور چند لمحوں میں اسی کے ڈیل ڈول کا ایک اور آدمی اندر آچکا تھا۔ "چل اب ذرا انہیں بھی کچھ دیر کے لیے سلا دے۔" وہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب آئے اور پستول کا دستہ ان کی کھوپڑیوں کو سہلا تا گیا اور وہ چاروں زمین پر گرتے چلے گئے۔

✡ ✡ ✡

اریشہ کو ہوش آیا تو سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اس نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو یہ محسوس کر کے اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں کہ وہ بندھی ہوئی ہے۔ اس نے دیکھا کہ اسے کرسی کے ساتھ' کس کر رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ اتنی مضبوطی سے کہ وہ حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے نظریں گھمائیں تو یہ دیکھ کر اس کے لب بھنچ گئے کہ عائشہ اور ثانیہ بھی پاس ہی موجود دو دوسری کرسیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔

جمیل نہیں تھا۔ نہ معلوم اسے کہاں رکھا تھا انہوں نے اور رانیہ؟ وہ چونک گئی۔ رانیہ بھی تو تھی گھر پر' ابھی وہ ان کے ساتھ نہیں تھی تو پھر وہ کہاں تھی

معاً" دروازہ کھلا اور وہی آدمی اندر آیا' اس کے پیچھے آنے والے کے کندھے پر رانیہ تھی۔ وہ یقیناً" بے ہوش تھی اور اگر اریشہ کے دل میں ایک پل کے لیے بھی یہ خیال آیا تھا کہ رانیہ چونکہ ان کے ساتھ نہیں ہے تو وہ لازماً" ان کے لیے کچھ کرے گی تو وہ خیال اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ وہ آدمی رانیہ کو کرسی پر بٹھا کر ہٹنے لگا کہ وہ نیچے پھسل گئی۔

"ارے ویدو' تو بھی آ' یہ بے ہوش ہونے کی وجہ سے ٹھہر نہیں رہی' میں پکڑتا ہوں تو باندھ۔" وہ جیسے ہی جھکا۔

"اوغ" کی آواز کے ساتھ پلٹ کر پیچھے گرا تھا' ویدو جو آگے آ رہا تھا' حیرت سے ٹھٹکا ہی تھا کہ رانیہ کھلتے اسپرنگ کی طرح اچھلی اور سر کی ٹکر اس کے سینے میں دے ماری' وہ اتنی آسانی سے ہرگز شکار نہ ہوتا مگر حیران ہونے کی وجہ سے رانیہ نے فائدہ اٹھا لیا' اور پے درپے چوٹیں لگا کر اسے بے ہوش کر دیا مگر وہ ویدو کو بھول گئی جو پیچھے سے اس پر جھپٹا تھا۔

اس نے کپڑے کی گڑیا کی طرح رانیہ کو اٹھا کر منہ کے بل زمین پر دے مارا۔ رانیہ نے بروقت اپنے ہاتھ آگے رکھ کر منہ کو بچا لیا ورنہ تو اس کا منہ پچک جاتا۔ ویدو نے جھک کر اس کی ٹانگیں پکڑی ہی تھیں کہ رانیہ کا اوپر کا جسم یوں بل کھا کر مڑا جیسے وہ پلاسٹک کی بنی ہو۔

اس نے زوردار مکا اس کے پیٹ میں مارا تھا' وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اوندھا ہوا ہی تھا کہ رانیہ اس پر جھپٹی مگر یہیں وہ غلطی کر گئی۔ اس کے نزدیک آتے ہی وہ اچھلا اور اسے اپنے ساتھ رگیدتا ہوا دور لے گیا۔ جب کھڑا ہوا تو ایک ہاتھ رانیہ کی گردن میں اور دوسرا اس کے پیٹ کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

"ایک جھٹکے میں تمہاری گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ اس لیے اب بہتر ہے کہ ساکت ہو جاؤ۔" وہ غرایا تھا۔

اریشہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ یا اللہ سارے ملازمین کہاں ہیں کہ یہ ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں' خوانخواستہ کوئی نقصان' نہیں یا اللہ! رحم فرما۔ ہم چاروں عورتیں ہی عورتیں۔" اتنی دیر میں ویدو نے اس کے پیٹ کے گرد بازو ہٹا کر پستول نکال کر رانیہ کی

کنپٹی پر رکھ دی۔
"تم ہمیں بے وقوف سمجھ رہی تھیں۔"
رانیہ بالکل ساکت ہو گئی تھی۔
اریشہ چیخ پڑی "پلیز اسے کچھ مت کہنا پلیز، تمہیں جو چاہیے وہ لے جاؤ۔"
"اس کے لیے ہمیں تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"
"دیکھو تمہیں اللہ کا....."
"مجھے کسی کا واسطہ دینے کی ضرورت نہیں۔" وہ سفاکی سے جواب دے رہا تھا' اتنی دیر میں اس کا ساتھی بھی کراہتا ہوا ہوش میں آگیا۔
"اٹھ جا اب، بہت ہو گیا آرام، سارا سونا اور کیش لے آ پھر ان کا فیصلہ کریں۔"
"ہائے میری بچی کا زیور۔" ثانیہ رو پڑیں۔
"تو پھر بچی بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ تیری ساری فکر ہی ختم کر دیتے ہیں۔ کیا خیال ہے۔"
ثانیہ تو کانپ گئیں۔ "بند کرو بکواس۔"
"بکواس تو تو بند کر۔" اس نے رانیہ کو دھکا دے کر ایک طرف کیا اور ثانیہ کو کھینچ کر پستول دے مارا' ان کے گال پر پستول کی فولادی ضرب نے زخم ڈال دیا تھا۔ وہ اذیت سے چلا اٹھیں۔ اس نے ایک اور ضرب لگانے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر وہ رانیہ کو چھوڑنے کی غلطی کر چکا تھا سو سزا تو بھگتنی تھی۔
اس نے ایک زوردار لات اس کے پہلو میں جمائی تھی۔ شیرو' ویدو کی ہدایت کے بموجب سامان اکٹھا کرنے ثانیہ کے بیڈ روم جا چکا تھا' وہ سب لاؤنج میں تھے۔ ویدو کراہ کر پیچھے ہوا تو رانیہ نے اسے لاتوں کی زد میں رکھ لیا تھا۔ مگر بس ایک لمحے کی دیر ہوئی اور ویدو کے ہاتھ میں موجود پستول چل گئی۔
ایک گولی رانیہ کے بازو میں لگی اور دوسری پاؤں کے ٹخنے پر' وہ جیسے ہی گری' ویدو ہمت کر کے اٹھا' پستول کا رخ سیدھا رانیہ کے سینے کی طرف کر کے ٹریگر دبانا چاہتا تھا کہ پیچھے سے لگنے والے دھکے نے اسے منہ کے بل گرا دیا پھر اس کی کنپٹی پر لگنے والی ٹھوکروں نے اسے اندھیروں کے غار میں پھینک دیا تھا۔
"بھائی پلیز اسے اسپتال لے جائیں' اسے اٹھائیں جلدی کریں۔" عائشہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔
" زیان تم ان کی رسیاں کاٹو' میں اسے دیکھتا ہوں۔" وہ خون میں ڈوبی رانیہ کی طرف لپکا تھا۔
گلے سے ٹائی کھول کر اس کے بازو پر کس کر باندھی اتنی دیر میں زیان کرسی کے پیچھے جا کر عائشہ کی رسیاں کھول چکا تھا۔ اس نے بھی اپنی ٹائی عالیان کی طرف پھینکی' جسے جھپٹ کر اس نے رانیہ کے ٹخنے پر باندھ دیا اور جھک کر اسے بانہوں میں اٹھا لیا۔ اتنے میں زیان ثانیہ کو اور عائشہ' اریشہ کو کھول چکے تھے۔
"زیان! امی کے بیڈ روم میں بھی ایک آدمی ہے۔"
"ہاں اسے بھی پکڑ لیا ہے۔" وہ تیزی سے باہر لپکا' پھر کچھ یاد آنے پر مڑا "ممی! آپ لوگ عائشہ کے کمرے میں چلیں فی الحال' کچھ لوگوں کو بلوا کر انہیں لے جانا ہے۔" اس نے ویدو کی طرف اشارہ کیا۔
وہ تینوں گرتی پڑتی عائشہ کے کمرے میں آگئیں۔
"ہائے میرے اللہ' آج کچھ ہو جاتا تو میں تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاتی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑیں۔ عائشہ اور اریشہ تو پہلے ہی رو رہی تھیں کہ زیان کمرے میں آیا۔
"ممی پلیز! حوصلہ کریں کیا ہوا ہے' سب ٹھیک ہے۔ آپ اٹھیں' چلیں میں آپ کو ڈاکٹر کو دکھا دوں اور رانیہ کا بھی پتا کر لیں۔"
"اسے تو گولیاں لگی ہیں زیان' اس کا بہت خون بہہ گیا ہے' اسے تو بہت مارا ہے انہوں نے۔" وہ اور زیادہ رونے لگیں' زیان کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو رہا تھا' اس نے ماں کا سر اپنے ساتھ لگایا "ممی پلیز۔" بمشکل انہیں چپ کروایا اور اپنے ساتھ اسپتال لے آیا۔ ان کے چہرے کا معائنہ کروایا اور عالیان سے پوچھ کر وہ انہیں وہیں لے آیا۔
وہاں عالیان کے ساتھ نعمان بھی موجود تھے۔ ستے ہوئے چہرے کے ساتھ' دیوار سے ٹیک لگائے دونوں گم صم کھڑے تھے۔ ثانیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے۔"

"جی ممی خیریت ہے' آپ آئیں' بیٹھیں۔"

وہ ایک طرف رکھی کرسیوں پر آبیٹھے تھے۔ "کیسی ہے رانیہ؟"

"گولیاں نکال دی ہیں ڈاکٹرز نے' خطرے سے تو باہر ہے' بس کچھ کمپلیکیشنز ہیں۔"

"کیا کمپلیکیشنز ہے؟" وہ ہول گئیں۔

"ٹخنہ متاثر ہوا ہے' ہڈی چورا چور ہو گئی ہے تو....."

"تو؟ یہ تم بار بار رک کیوں جاتے ہو؟"

"شاید وہ کبھی ٹھیک سے نہیں چل پائے گی۔"

"ہائے!" انہوں نے دل پر ہاتھ رکھا۔ "اتنا بڑا نقص' نہیں اللہ نہ کرے۔"

"ابھی تو وہ بے ہوش ہے' روم میں بھی شفٹ نہیں کی گئی' جب ہوش آئے گا' اسے پتا چلے گا' تب پتا نہیں وہ کیسا ری ایکٹ کرے گی؟"

"وہ بہت بہادر ہے اور بہادری سے ہی فیس کرے گی اس اتنی کڑوی حقیقت کو۔" زیان نے عزم سے کہا۔

بعد میں ثانیہ کو پتا چلا تھا کہ سارے ملازمین کو انہوں نے بے ہوش کر کے کچن میں بند کر دیا تھا' چوکیدار کو اس کے کیبن میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت تو زیان انہیں گھر لے آیا' اریشہ اور عائشہ کی بھی فکر تھی اسے' دوسرے دن جب وہ انہیں لے کر گیا تو رانیہ نہ صرف کمرے میں منتقل ہو چکی تھی بلکہ ہوش میں بھی تھی۔ وہ سیدھی ساکت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔

"ہیلو رانیہ!" عائشہ نے قریب جا کر پکارا۔

اس نے صرف آنکھوں کو حرکت دی اور اسے دیکھا۔ "ہیلو۔"

آواز میں نقاہت تھی تو آنکھوں میں ایسی ویرانی جیسے صحرا میں اڑتی خاک اور ویران بیابان۔ عائشہ نے آگے بڑھ کر اس کے گال چومے' اریشہ نے بھی یہی عمل دہرایا۔

پھر ثانیہ آگے بڑھیں۔ "کیسی ہے میری بچی" انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس کی جذبات سے عاری آنکھوں میں حیرت لہرائی۔ وہ سمجھ کر شرمسار ہو گئیں۔ اس بچی سے انہوں نے بلاوجہ کی دشمنی پالے رکھی اور وہی انہیں' ان کی عزت' ان کی دولت کو بچانے کے لیے اپنا اتنا بڑا نقصان کروا بیٹھی بلکہ وہ تو اسے جان سے مار دیتا اگر بروقت عالیان اور زیان نہ آپہنچتے' یہ تو انہیں زیان نے بتایا کہ رانیہ نے عالیان کو فون کر کے بتایا کہ گھر میں گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے' پھر ان کا کوئی رابطہ نہیں ہو پایا مگر وہ دونوں بھائی جلد از جلد گھر پہنچے تھے۔

اریشہ اور عائشہ نے رانیہ کو کھانا کھلایا اور چائے پلائی۔ وہ خود بھی کوشش کر رہی تھی کہ نارمل نظر آئے مگر بہت مشکل تھا اپنے اتنے بڑے دکھ کو بھلا کر نارمل نظر آنا۔ ڈاکٹرز نے اپنی ساری کوششیں کر لینے کے بعد یہ اعلان کیا تھا کہ اب نہ ٹخنے کی وہ ساخت برقرار رہی ہے۔ نہ اب وہ پہلے کی طرح چل سکے گی۔ ایک لنگڑاہٹ اس کی چال کا حصہ بن چکی تھی۔ بازو والی گولی البتہ گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔

وہ بتدریج ٹھیک ہو رہی تھی' گھر آ چکی تھی مگر پہلے سے بہت زیادہ خاموش رہنے لگی تھی۔ عائشہ کی شادی پورے ایک ماہ کے لیے آگے بڑھا دی گئی تھی' فواد عائشہ کا ہونے والا دولہا۔ خود اپنے والدین کے ساتھ آیا تھا' ڈکیتی کا افسوس کرنے اور رانیہ کی عیادت کے لیے۔ اب تو اس واقعے کو بھی بیس دن ہو چکے تھے' سو اب پھر سے شادی کی ہلچل شروع ہو گئی تھی مگر اس بار وہ چونچال نہیں تھا' سب کچھ قدرے خاموشی سے ہو رہا تھا۔ اریشہ جو ایک ماہ کے لیے آئی تھی' اب دوسرا مہینہ ہو رہا تھا اور ابھی تک یہیں تھی۔

"اب بس خیر خیریت سے تمہاری شادی ہو جائے تو میں بھی گھر جاؤں۔" وہ دونوں رانیہ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"ہاں یار' ایسا خوفناک حادثہ ہوا ہے کہ ابھی تک دل سے خوف نہیں جاتا۔"

"بس شکر ہے کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا' خیر ہوا تو مالی بھی نہیں ہے' ہر طرح سے بچت ہی ہوئی ہے۔"

ممی بھی کل آرہی ہیں' کہہ رہی تھیں اتنا کچھ ہو گیا' میں یہیں کی یہیں رہ گئی۔"

"ہاں تو وریشہ کی پیپرز جو تھے ورنہ خالہ کہاں رکنے والی تھیں۔"

"ازین اتنا بے چین ہو رہا ہے کہ کب پہنچے اور زیان کے ساتھ ہنگامہ مچائے۔"

"ہاں مزہ بھی تو ان دونوں کے مل جانے کے بعد ہی آئے گا۔"

"کتنے بہن بھائی ہو تم لوگ؟" رانیہ نے پوچھا۔

"چار' بڑے فرزین بھائی ہیں' وہ میریڈ ہیں' ابوظہبی میں ہوتے ہیں' پھر ازین ہے' اس کے بعد میں اور آخر میں وریشہ میری چھوٹی بہن۔" اریشہ نے مسکرا کر بتایا۔

"ازین کی فرینڈ شپ زیان کے ساتھ ہے؟"

"شروع سے' بچپن سے' رشتہ تو ہمارا بعد میں طے ہوا....."

"رشتہ طے ہوا۔" رانیہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا "تمہارا رشتہ عالیان کے....."

"میری بات بچپن ہی سے زیان کے ساتھ طے ہے یہ تو ہم دونوں نے آپ کے تاثرات دیکھنے کے لیے آپ سے یہ بے ضرر سا جھوٹ بولا تھا' آپ کی اور عالیان کی چھپن چھپائی والی اسٹوری تو ہم کب کی سمجھ چکے تھے۔"

رانیہ کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔ "آنٹی مجھے پسند نہیں کرتیں۔"

"اب بہت زیادہ پسند کرنے لگی ہیں' بے جواز نفرت بے ستون چھت کی طرح ہوتی ہے' کمزور اور بودی' ایک ہی جھٹکے سے ختم ہو جانے والی اور آپ کو سب سے زیادہ عالیان بھائی پر بھروسہ ہونا چاہیے تھا' ان پر اعتماد رکھیں وہ آپ کا اعتماد کبھی نہیں توڑیں گے۔"

"وہ اعتماد دلائے تب نا' وہ تو مجھے ایک کھلونے کی طرح ٹریٹ کرتا ہے' جب اپنے خشک کام سے اکتا جاتا ہے تو مجھ سے ہلکا پھلکا ہنسی مذاق کر لیتا ہے اور بس' میری اہمیت یہی کچھ ہے اس کے نزدیک۔"

عائشہ تڑپ اٹھی۔ "ایسا تو نہ کہو رانیہ بھائی کی بے کلی تو ہم نے دیکھی ہے' جب آپ کو گولیاں لگیں اور آپ بے ہوش تھیں' ان کی بے چینی' بے قراری ان کا حال دل کھول کر بیان کر رہی تھی۔ جب سے آپ کی چال میں فرق آیا ہے' وہ تو گم صم ہی ہو گئے ہیں۔"

کرب کی ایک لہر رانیہ کے چہرے سے گزری تھی۔ وہ زیر لب کچھ بڑبڑائی بھی تھی۔

☼ ☼ ☼

نعمان نے رانیہ کو چھوٹی سی عمر میں دیکھا تھا اور تب ہی شایان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اسے ان کی بہو بنائیں گے۔ پھر وہ عالیان کو ساتھ لے کر سوئٹزرلینڈ شایان کے پاس گئے تھے' ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف عالیان کو ان سے ملوائیں بلکہ عالیان اور رانیہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیں۔ رانیہ کو دیکھ کر عالیان کی آنکھوں میں چمک لہرائی تھی' پھر یہ سن کر کہ رانیہ کراٹے کی بلیک بیلٹ ہولڈر ہے اور مارشل آرٹ میں بھی بہت کچھ سیکھ چکی ہے یہ چمک تیز ہو گئی تھی۔

بعد میں ان کی بہت لمبی بات ہوئی تھی شایان کے ساتھ جس کے بعد انہوں نے رانیہ کو پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ماریانہ اکلوتی اولاد کو اتنی دور بھیجنے کے لیے تذبذب کا شکار تھیں۔ شایان نے انہیں منا کر رانیہ کو نعمان اور عالیان کے ساتھ ہی پاکستان بھیج دیا تھا۔ خود' ماریانہ کے ساتھ ملائشیا کی سیر کے لیے گئے تو پلین کریش میں ایک ساتھ یہ دنیا ہی چھوڑ گئے۔ اس صدمے کو قبول کرنا آسان نہ تھا' نہ صرف رانیہ کے لیے بلکہ نعمان کے لیے بھی۔

عالیان نے نہ صرف باپ کی دلجوئی کی بلکہ رانیہ کا ذہن موڑنے میں بھی عالیان کا بہت بڑا کردار تھا۔ وہ ہمہ وقت اسے اپنے ساتھ مصروف رکھتا تھا۔ کسی کی نگرانی کرنی ہوتی یا دوسرے شہر حتیٰ کہ دوسرے ملک بھی جانا پڑتا' رانیہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔

عالیان ذہین ترین ایجنٹ تھا' انٹیلیجنس کو جس کام

کے لیے کسی پر اعتماد نہ ہوتا وہاں وہ بلا جھجک بھیجا جاتا تھا نعمان کے دوست ان کی خوش نصیبی پر رشک کرتے تھے کہ وہ عالیان جیسے ہونہار سپوت کے والد تھے۔ وہ خود بھی انٹیلی جنس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے مگر عالیان کا کام فیلڈ کا تھا' اسے ہر دم' ہر آن باخبر اور متحرک رہنا ہوتا تھا۔ رانیہ اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ دونوں ہر وقت ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔ نعمان نے دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے کی جو خواہش کی تھی' وہ یوں بھی تو پوری ہو رہی تھی' وہ خوش تھے۔ اس کے باوجود وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عالیان ان کا کتنا ہی فرماں بردار سہی مگر ماں سے اس کی محبت اور فرماں برداری بے مثال تھی اور اگر وہ رانیہ کو ناپسند کرتی ہیں تو وہ بھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دے گا۔

ان کا انتہائی خوب صورت اور قابل بیٹا' جس کے ساتھ سچ مچ رانیہ ہی جچتی تھی مگر ثانیہ کی نفرت بیچ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی تھی اور عالیان اس دیوار کو گرانے کی کوئی کوشش نہیں کرپاتا تھا۔ اگرچہ وہ اچھی طرح نعمان کی خود سے اور رانیہ سے متعلق خواہش کو جانتا تھا' نہ صرف یہ بلکہ نعمان کی شایان کو دی گئی زبان کی پاس داری کا بھی اسے احساس تھا مگر ماں کی محبت' ان کا احترام ہر جذبے پر حاوی ہو جاتا تھا۔

گھر میں ماں کو دل آزاری سے بچانے کے لیے وہ رانیہ سے یوں لاتعلق ہو جاتا' جیسے ان کے درمیان کبھی بات تک نہ ہوتی ہو۔ جواباً" رانیہ بھی بالکل اجنبی بن جاتی تھی' ایک بار دونوں کو انتہائی حساس علاقے میں بھجوایا گیا' وہ بیرون ملک ایک جزیرہ تھا۔ جہاں سے انہیں اہم معلومات لینی تھیں' وہ دونوں اس جگہ کے قریب پہنچ چکے تھے کہ انہیں چھاپ لیا گیا۔ انہیں فوری بے ہوش کر کے کھلی جگہ لے جایا گیا اور پہلے رانیہ کو ہوش میں لایا گیا۔

"تم تو فارنر ہو پھر اس پاکستانی کے ساتھ کیا کر رہی تھیں؟"

"او تو اس لیے اسے ہوش میں لائے ہیں کہ وہ اس کے یورپین ہونے کی وجہ سے الجھ گئے تھے" مم... میں بے قصور ہوں مجھے کیوں پکڑا ہے آپ نے' میں تو ٹورسٹ ہوں۔"

"جو پوچھا ہے اس کا جواب دو' تم اس کے ساتھ کیوں ہو؟"

"میں یہاں گھومنے آئی تھی۔ یہ مجھے کل ہی تو ملا ہے' بہت خوب صورت باتیں کرتا ہے' اتنی کہ میں اس کی گرویدہ ہی ہو گئی' اس نے مجھے بتایا کہ یہ جزیرہ جہاں ہم کھڑے ہیں' یہاں جگہ جگہ قیمتی موتی پائے جاتے ہیں' یہ موتی اس قدر قیمتی ہیں کہ اگر انہیں مارکیٹ میں فروخت کیا جائے تو باقی کی ساری زندگی عیش و آرام سے گزر سکتی ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ وہ اب میرے بغیر نہیں رہ سکتا' کل سے جتنا وقت بھی میرے ساتھ گزارا ہے' وہ اتنا خوب صورت اور یادگار ہے کہ وہ اس کے لیے مجھے یہ موتی گفٹ کرے گا' میں تو بس اس لیے اس کے ساتھ آئی ہوں۔"

وہ کچھ دیر کھڑا اسے گھورتا رہا پھر سر ہلایا "ابھی تمہارے جھوٹ سچ کا فیصلہ ہو جاتا ہے' یہاں ایک طرف کھڑی ہو جاؤ۔" رانیہ تیزی سے عالیان کو پھلانگ کر ان کی طرف بڑھی' وہ لمبا تڑنگا بندہ جو اپنے ساتھی سے مشورہ کرنے میں مصروف تھا اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر چلایا۔

"اے' وہیں رکو' آگے کہاں آ رہی ہو؟"

"دیکھو میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہی ہوں کہ میں بالکل بے قصور ہوں' مجھے یہاں سے جانے دو۔" وہ اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔

"اے رکو وہیں۔"

مگر رانیہ کو اتنا ہی قریب آنا تھا' وہ کسی پرندے کی طرح اڑتی ہوئی ان دونوں کے اوپر جا گری' وہ تو اچانک حملے کی وجہ سے گر پڑے مگر ایک نے سنبھل کر رانیہ کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی' جو اس کے دوسرے ساتھی کی ناک پر ٹکریں مار مار کر اسے ادھ موا کر چکی تھی' ایک دم ٹانگ کھینچنے سے پلٹی کہ پسلیوں میں اس بندے کی زوردار لات کھا کر اوغ کی آواز نکالتی اوندھی ہو گئی۔

اتنے میں وہ نیچے والا بھی کھڑا ہو کر جیب سے گن نکال چکا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا' کوئی چیز اس کے ہاتھ سے ٹکرائی اور گن نیچے جاگری۔ اس کی آنکھیں یہ دیکھ کر پھیل گئی تھیں کہ وہ نوجوان جو بے ہوش پڑا تھا' وہ اب مکمل ہوش و حواس میں ان دونوں پر پل پڑا تھا۔

رانیہ اتنی دیر میں گن اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ "ہینڈز اپ۔" پھر وہ اسی طرح گن تان کر کھڑی رہی اور عالیان نے انہیں باندھ کر ساری معلومات لے کر انہیں بے ہوش کر دیا اور ان معلومات کی روشنی میں مطلوبہ فائلز بھی لے لیں۔

واپسی میں جب وہ آفس کی طرف سے بھجوائی گئی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے تو عالیان نے ایک چھوٹا سا لفافہ اپنے کوٹ کی جیب سے نکال کر رانیہ کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے حیرت سے دیکھا اور تھام لیا۔

"یہ وہی قیمتی موتی ہیں جو تمہارے ساتھ گزارے ہوئے خوب صورت وقت کا تحفہ ہیں' یہی وعدہ کیا تھا نا میں نے تم سے۔" وہ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

رانیہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا' یعنی وہ اس وقت ہی ہوش میں آچکا تھا اور اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے غصے سے وہ لفافہ زور سے اسے دے مارا اور منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی' البتہ اس کے ہنسنے کی آواز بخوبی سنائی دی تھی۔

ایک شرمیلی سی مسکان اس کے لبوں پر بھی بکھر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

زیان نے بھی ان کا محکمہ جوائن کر لیا تھا مگر ابھی وہ فیلڈ میں نہیں اتارا گیا تھا' ان دنوں ایک مجرم کا پتا چلانے کے لیے اس کے سپرد اس سے متعلق ساری معلومات اکٹھا کرنے کا کام کیا گیا تو وہ رانیہ کو اپنی مدد کے لیے بلا لایا۔ عالیان وہاں سے گزرا تو ان دونوں کو دیکھ کر اندر آگیا۔ انہیں اس کے آنے کا علم نہیں ہو پایا' رانیہ نے اپنی طرف سے بڑے سرسری لہجے میں زیان سے پوچھا تھا۔

"یہ اریشہ کب واپس جائیں گی؟"

"کیوں' تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" زیان تو چونکا ہی پیچھے آتا عالیان بھی ٹھٹک گیا تھا۔

"ایسے ہی' ایکچولی اور تو کوئی نہیں آیا عائشہ کی شادی کے لیے اور یہ اتنے دن سے آئی ہوئی ہے۔"

"ہاں تو اس کی اور عائشہ کی دوستی بھی تو بہت ہے نا۔"

"ہاں بتا رہی تھیں دونوں اور۔۔۔" وہ رکی' زیان نے سوالیہ ابرو اچکائے "عائشہ بتا رہی تھی کہ آنٹی نے اسے بچپن سے ریزرو کیا ہوا ہے عالیان کے لیے۔"

"عالیان کے لیے؟" زیان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

عالیان نے آنکھ سے اشارہ کر کے اسے بات جاری رکھنے کو کہا۔ "ہاں ہاں وہ' صحیح کہہ رہی تھی۔"

رانیہ کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا تھا۔ عالیان وہیں سے پلٹ گیا۔ دوسرے دن صبح ناشتے پر اس نے رانیہ کو آتے دیکھ کر ہی اریشہ کی اتنی تعریف کی تھی۔ وہ اوپر سے تو بے نیاز نظر آنے کی بہت کوشش کر رہی تھی' مگر اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ عالیان سے چھپی ہوئی تو نہیں تھی۔ دوپہر کے کھانے کے وقفے میں وہ زیان کے پاس چلی آئی۔

"اگر میں بالوں کو بلیک ڈائی کروالوں تو کیسے لگیں گے۔" زیان کے دماغ میں کوندا سا لپکا تھا' بچ بچ مسکراہٹ روکنے میں اسے بڑی ہی دقت ہوئی تھی۔

"بالکل سوٹ نہیں کریں گے آپ پر۔"

"اوہ۔" وہ مایوس ہو گئی۔

"تو تمہیں یہ مشورہ کس نے دیا ہے' تم پر تمہارے یہی بال بہت سوٹ کرتے ہیں۔"

"مگر اسے تو۔۔۔" وہ بات بدل گئی "ویسے ہی میں اپنا لک چینج کرنا چاہ رہی تھی۔" وہ اٹھ کر چلی گئی۔

"عالیان یار! بہت ستا رہے ہو تم اس معصوم لڑکی کو۔" اس نے تاسف سے سوچا تھا۔

✡ ✡ ✡

زیان پی سی پر ڈیٹا بنا رہا تھا۔ جب عالیان تیزی سے اس کے پاس آیا۔ "جلدی کرو' گھر چلیں' وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" وہ چونکا اور کمپیوٹر کو شٹ ڈاؤن کرنے لگا۔

"یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا' رانیہ نے بتایا ہے کہ وہ کمرے میں ہے مگر باہر معاملات ٹھیک نہیں لگ رہے وہ بات کر رہی تھی کہ اس کا دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا تو اس نے فون بند کر دیا۔" زیان پھرتی سے اٹھ گیا۔

دونوں بھائی نعمان کو مطلع کر کے تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے آئے تھے اور بروقت پہنچ جانے کے باعث ہی رانیہ محفوظ رہی تھی ورنہ تو وہ غنڈہ سیدھا اس کے سینے میں گولی مارنے لگا تھا صورت حال تو ان کے اندازے سے زیادہ خراب تھی۔

ماں' بہنیں بندھی ہوئی' ملازم بے ہوش اور بندھے ہوئے' سارا زیور اور روپیہ جو گھر میں موجود تھا ایک بیگ میں بھرا ہوا' عالیان تو رانیہ کو اسپتال پہنچا کر صرف ایک بار زیان سے فون پر بات کر پایا تھا تو اس نے یہ سب بتایا تھا' پھر جب ڈاکٹر نے اس کا ٹخنہ ناقابل علاج ہونے کی خبر دی تو اسے کسی اور چیز کا ہوش ہی نہ رہا۔

رانیہ کا ٹخنہ ٹوٹ گیا اور وہ ہمیشہ کے لیے لنگڑا کر چلے گی' یعنی اپنی سروس سے بھی فارغ کر دی جائے گی۔

دکھ' صدمہ' اس نے نعمان کی طرف دیکھا' وہ تو صدمے سے نڈھال ہو گئے تھے۔

زیان بھی نہایت افسردہ تھا۔ وہ تو اپنی کزن کو صرف بھابھی کے روپ میں ہی نہیں بلکہ محب وطن پاکستانی' آرمی انٹیلی جنس آفیسر کے طور پر بھی بہت زیادہ پسند کرتا تھا مگر اب وہ جاب سے تو فوری طور پر سبکدوش کر دی جائے گی اور ان کی والدہ جو اتنی حسین لڑکی کو بہو کے روپ میں نہ دیکھنے کے لیے ہی اسے اتنا ناپسند کرتی تھیں تو اب تو اس میں جسمانی نقص بھی آ گیا تھا تو اب؛

بڑی مشکل ہوئی تھی اس کا سامنا کرنے میں' ممی' عائشہ اور اریشہ کے چلے جانے کے بعد وہ کمرے میں آیا تھا۔

"ہیلو گڈ گرل۔" وہ مسکرایا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟ درد وغیرہ تو نہیں ہو رہا نا؟"

"میرا ایک کام کر دو زیان۔" اس کی بات کو نظر انداز کر کے اس نے کہا تھا۔

"ہاں بولو' کیا کام۔" وہ آگے آ گیا۔

"مجھے انکل سے واپسی کی اجازت لے دو۔" اس نے تو زیان کے اعصاب پر بم دے مارا تھا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے' واپس جاؤ گی مگر کہاں' وہاں کون؟"

"سب ہیں وہاں' میرے انکلز اور آنٹیز تم بس مجھے اجازت لے دو۔"

"مگر تم کیوں جانا چاہتی ہو' پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ چوٹ پاؤں پر آئی ہے' کھسک دماغ گیا ہے۔ یہاں کیا ہوا ہے کہ تمہیں واپس جانے کی سوجھی ہے۔"

"انکل مجھے جس مقصد کے لیے لائے تھے' وہ تو اب میں پورا کر نہیں سکتی' تو اب یہاں رہ کر کیا کروں؟"

"وہ تمہیں صرف اس لیے یہاں لائے تھے۔" زیان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں عالیان نے بھی بابا سے یہی کہا تھا کہ رانیہ ہماری ٹیم کی ضرورت ہے مگر اب میں وہ ضرورت پوری نہیں کر سکتی' اس لیے یہاں رہنے کا بھی کوئی جواز نہیں بنتا۔"

"تو تم خود ڈیڈ سے بات کر لو' میں تو یہ سب نہیں کہہ سکتا۔" اس نے صاف جواب دیا۔

رانیہ نے ہونٹ بھینچ کر منہ پھیر لیا تھا۔ اظہار

ناراضی کے لیے۔

✲ ✲ ✲

"یہ صرف اور صرف تمہاری وجہ سے وہ کہہ رہی ہے، تم نے اس بچی سے بلاوجہ کا عناد پالے رکھا، اتنا روکھا رویہ رکھا کہ وہ خود کو بے کار جان کر واپس جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ میں اگر اسے جانے دے دوں تو روز قیامت اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا، جس سے بڑے مان سے میں نے اسے مانگا تھا۔ میں تو سمجھا تھا اتنی پیاری بچی، تمہارے سامنے رہے گی تو تم بھی رفتہ رفتہ اس سے محبت کرنے لگو گی مگر......"

"میں اس سے محبت کیوں نہیں کروں گی، جو میرے بچوں کے لیے میرے گھر کے لیے اپنی جان بھی داؤ پر لگا دے۔ جس نے ہمارے لیے گولیاں کھائیں، اتنی زخمی ہوئی کہ عمر بھر کی معذوری مقدر کرلی، میں اس سے اب بھی محبت نہیں کروں گی کیا؟" ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

نعمان کتنی ہی دیر کچھ بولنے کے قابل نہ رہے تھے۔ کایا یوں بھی پلٹتی ہے، وقت یوں بھی بدلتا ہے۔ انہیں تانیہ کو رانیہ کے لیے روتے دیکھ کر یقین آگیا تھا۔

"یہ آپ ہی کے محکمے میں کام کرتی تھی نا، عالیان کے ساتھ؟"

"ہاں یہ جاسوس تھی پاکستان کی، ہماری خفیہ سروسز کا قیمتی سرمایہ تھی لیکن......" ان کی آواز میں بھی نمی آ گئی "اب یہ ان کے لیے کار آمد نہیں رہی، اب آئندہ یہ اپنی ڈیوٹی نہیں دے پائے گی۔"

"ہاں نہیں دے گی یہ وہاں ڈیوٹی کیونکہ اب یہ دوسری ڈیوٹی دے گی۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی تھیں۔

"کون سی دوسری ڈیوٹی" نعمان نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"گھر سنبھالنے کی ڈیوٹی عالیان کی بیوی بننے کی ڈیوٹی۔" وہ مسکرا کر عزم سے بولیں اور نعمان کی حیرت ازحد مسرت میں بدل گئی۔

"ان شاءاللہ۔"

✲ ✲ ✲

خاموش فضا تھی کہیں سایہ بھی نہیں تھا
اس شہر میں ہم سا کوئی تنہا بھی نہیں تھا
کس جرم میں چھینی گئی مجھ سے میری ہنسی
میں نے تو کسی کا دل دکھایا بھی نہیں تھا

وہ کب سے ٹیرس پر کھڑی تھی، خلاؤں میں دیکھتی، جانے کیا کیا سوچتی، عالیان کمرے میں آیا پھر اسے ڈھونڈتا ہوا ٹیرس میں اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"ہیلو گڈ ایوننگ۔"

اس نے ایک نظر عالیان پر ڈالی اور پھر سے آسمان کو دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو اتنے انہماک سے، مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

اس نے جواب دینا تو درکنار گردن بھی نہیں گھمائی وہ ہلکا سا مسکرایا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے کس کر بندھے بالوں میں سے پونی نکال لی۔ سنہرے سلکی بال کھل کر شانوں پر بکھر گئے۔ اس نے ناگواری سے اسے گھورا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" عالیان نے جواب دیے بغیر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ رانیہ نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ؟"

"دل بہلا رہا ہوں یار۔"

"واٹ۔" وہ چیخی۔ عالیان کچھ اور قریب ہوا۔

"تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم میرا کھلونا ہو جس سے میں دل بہلاتا ہوں، تو اب بھی دل بہلا رہا ہوں تو تم کیوں ناراض ہو رہی ہو۔" اتنی گری ہوئی بات اور عالیان کے منہ سے، وہ ششدر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں کیا کچھ غلط کہہ دیا ہے میں نے؟"

اس نے رانیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا،

جہاں بے یقینی اور دکھ اضطراب کے مدوجزر تھے۔

"نہیں تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں نے یہ کہا تھا کہ تم مجھے کھلونا سمجھتے ہو' یہ تو نہیں کہا کہ میں بھی خود کو کھلونا سمجھ کر تمہیں ہر طرح کی آزادی دے دیتی ہوں۔" وہ چبا چبا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی پھنکاری تھی۔ سنہری بال' گلابی چہرے کے ارد گرد پھیل گئے تھے۔ بلاشبہ وہ کسی کو بھی مسحور کر سکتی تھی۔ بمشکل عالیان نے نظروں کا زاویہ تبدیل کیا تھا۔

دور افق میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی سرخی کناروں پر چھا رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی تھیں اس ڈوبتے ہوئے سورج میں؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا' ہلکا سا لنگڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

وہ بھی پیچھے آگیا۔ "کتنی اچھی لگ رہی ہو نا یوں چلتی ہوئی' تمہارے اس بے پناہ حسن نے بہت قیامت مچائی ہوئی تھی' اچھا ہے یہ ہلکا سا لنگ بھی آیا تو۔"

"اتنا بے رحم تبصرہ" رانیہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"بہت دکھ ہوا ہے چال میں فرق آنے سے پچ پچ" وہ افسوس سے کہتا اس کے پاس آبیٹھا۔ "تم لڑکیاں اپنے حسن کے بارے میں اتنی کانشس کیوں ہوتی ہو؟"

"نہیں مجھے اس چیز کا کوئی دکھ نہیں' یہ پوری ٹانگ ضائع ہو جاتی' مجھے دکھ نہ ہوتا' مجھے اپنے ملک کی مزید خدمت نہ کرنے کا دکھ ہے' پاپا نے بچپن سے مجھے یہی سکھایا تھا کہ تم پاکستان کی خدمت کرو گی' تمہیں بہت بہادر بننا ہے' بہت سے علوم حاصل کرنے ہیں' بہت سارے فنون سیکھنے ہیں اور میں تو آغاز میں ہی فیل ہو گئی' بے کار ہو گئی' میں اب کیسے پاکستان کی خدمت کر سکتی ہوں۔" بہت سے آنسو ایک ساتھ چھلکے تھے۔

"تم میری اور میرے بچوں کی خدمت کر لینا' یہی سمجھنا ملک و قوم کی خدمت کر لی ہے۔" عالیان نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا تھا مگر وہ تو بھڑک اٹھی تھی۔

"لعنت بھیجتی ہوں میں تم پر اور تمہاری خدمت کرنے پر۔" اس کی سانس کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ "کیا سمجھ کر تم نے یہ آفر کی ہے۔ میں بہت مجبور ہو گئی ہوں تمہارے خیال میں کہ تمہاری اور تمہارے بچوں کی نوکر بن جاؤں گی۔"

"جو یہ سب کرتی ہیں نا' وہ عموماً "بیویاں" کہلاتی ہیں' نوکرانی نہیں۔"

وہ تو رونا بھی بھول گئی "کیا؟"

وہ اس کے بالکل قریب ہو کر دھیمے مگر گہرے لہجے میں بولا "بیوی تو بنو گی نا میری؟" رانیہ کی پلکیں جھک گئیں۔

"آنٹی مان جائیں گی؟" "یقیناً۔"

"وہ تب ہی تم یہاں آئے ہو ما ما زبوائے۔"

رانیہ نے چڑ کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اگر ممی نہ مانتیں تو کیا تم واقعی رانیہ سے شادی کے لیے نہیں مانتے؟" زیان نے عالیان سے پوچھا۔

وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "کیا مجھ سے کسی نے پوچھا اور میں نے انکار کر دیا تھا؟"

"نہیں مگر تم نے اقرار بھی نہیں کیا تھا۔"

"میں ممی کی خوشی سے اسے اپنا ہم سفر بنانے کی خواہش رکھتا تھا اور بس۔"

"اور اگر یہ حادثہ نہ ہوتا اور ممی ابھی بھی راضی نہ ہوتیں تو۔"

"میں انتظار کرتا ان کی رضامندی کا' کبھی نہ کبھی تو انہوں نے مان ہی جانا تھا۔" وہ قمیص کے بٹن کھول رہا تھا۔

"اٹس مین۔" وہ چکرا گیا "تم انتظار کرتے رہتے' جب ممی ہر طرف سے مایوس ہو کر رانیہ کے لیے ہی مان جاتیں۔"

عالیان مسکراتے ہوئے واش روم چلا گیا اور زیان نے اپنا سر تھام لیا۔ حد تھی عالیان کی فرمانبرداری اور محبت کی' یعنی ماں کو بھی ناراض نہیں کرتا اور رانیہ کے

علاوہ کسی سے شادی بھی نہیں کرنا'واہ'سبحان اللہ'یا اللہ! تیرا شکر ہے کام بن گیا ورنہ ان کے چکر میں تو میں بھی کنوارہ بڈھا ہو جاتا۔" وہ پھریری لے کر اٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یار زیان'یہ تو پورا پاور ہاؤس تمہارے گھر میں موجود تھا'تم ان کے کرنٹ سے بچے کیسے؟"

ازین تو پاگل ہو گیا تھا رانیہ کو دیکھ کر'اتنا حسن؟

"پاپا نے اس کرنٹ کو ایک سپلائی لائن میں محفوظ کر دیا تھا'اس لیے میں بچ گیا۔" زیان کے اطمینان سے کہنے پر وہ اٹھا اور رانیہ کے پاس جا پہنچا۔

"آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جی؟" وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگی۔

"میرا مطلب ہے'میں اور آپ ایک ساتھ کیسے۔"

"آ.... آ....." پیچھے سے عالیان نے اس کی گردن شکنجے میں کسی تھی"میرے ہوتے ہوئے تمہاری یہ جرات؟"

"اچھی چیز سب کو اچھی لگتی ہے اور یہ تو بہت زیادہ اچھی ہیں۔" اس بار تو شکنجہ اتنا سخت ہوا کہ اس کی آنکھیں ابل آئیں۔

"کون اچھی ہے؟"

"..... رانیہ بھابھی۔"

"شاباش۔" عالیان نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

"آئندہ احترام سے پکارنا اور دیکھنا تو نظر جھکا کر احترام سے۔"

وہ اتنی دیر چپ رہا جب تک عالیان موجود رہا اس کے جاتے ہی وہ لپک کر رانیہ کے نزدیک آگیا۔"آپ اپنی رائے پر نظرثانی نہیں کر سکتیں'یہی عالیان سے شادی پر۔" رانیہ نے مسکراہٹ دبائی۔

"نہیں'اب تو بالکل نہیں۔"

اس نے منہ لٹکایا"دو سال سے آپ یہاں تھیں اور مجھے کسی نے بھنک نہیں پڑنے دی۔ قسم سے میں پہلے آپ کو دیکھ لیتا تو کسی عالیان کی مجال نہیں تھی کہ وہ آپ پر حق جماتا۔" ساتھ ہی گردن مسلی۔

اریشہ نے الگ افسوس کیا۔"میں نے بھی رانیہ کو دیکھ کر یہی کہا تھا کہ کاش ازین چھوٹا نہ ہوتا۔"

وہ تو سن کر تڑپ گیا۔"چھوٹا کہاں ہوں'ان سے تو بڑا ہی ہوں۔"

"پر اب کچھ ہو نہیں سکتا'کیونکہ عائشہ کے ساتھ ہی ان کی شادی بھی طے پا گئی ہے۔"

زیان نے صحیح معنوں میں اس کے ارمانوں پر اوس ڈالی تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر۔"روتے ہیں چھم چھم نین لٹا مورا چین رے۔" گانے لگے۔

"شکر ہے ان کی گاڑی کھسکی تو اب ہماری باری بھی ان شاء اللہ جلدی ہی آجائے گی۔" زیان نے اریشہ سے سرگوشی کی۔

اس نے جھینپ کر اسے پیچھے دھکیلا"بدتمیز۔"

"اب عالیان کا دماغ دیکھو'کہتا ہے ہنی مون کسی جزیرے پر مناؤں گا تو بتاؤ'جزیرے پر ہو گا کیا دیکھنے کو'انجوائے کرنے کو۔"

ثانیہ(اریشہ کی امی) نے بدمزگی سے کہا تو رانیہ کو اچھو لگ گیا۔

"ارے'ارے آرام سے۔" انہوں نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

"اور میں نے کہا منہ دکھائی کے لیے کچھ خریدنا ہے تو بتا دو تو کہنے لگا'وہ تو میں نے سوچ لیا ہے۔ میں نے کہا اگر کانفیڈنشل نہیں ہے تو بتا دو تو بتا ہے کیا بتایا؟"

ثانیہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا'ثانیہ نے گہری سانس لی"قیمتی پتھر'اب پتھر دیے جائیں گے منہ دکھائی میں۔"

رانیہ انہیں سر کھپاتے چھوڑ کر خود باہر آگئی تھی'شام ڈھل رہی تھی اور شام ڈھل ہی جایا کرتی ہے۔ وہ کبھی ٹھہرتی نہیں۔

ایک حسین مسکان اس کے ہونٹوں پر رقص کر رہی تھی۔

ختم شد

امِ ایمان قاضی

"ہاں..." راکھ میں تنکے سے کچھ ڈھونڈتی عائشہ کو مصطفیٰ نے ڈرانے کی ناکام کوشش کی، لیکن اس نے صرف ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ مصطفیٰ کا منہ بن گیا۔

"کیا ہے عائشہ بالکل ٹھس ہو رہی ہو۔ ذرا بھی مزا نہیں آرہا۔ کتنے دنوں بعد تو پیپرز کی ٹینشن سے چھٹکارا ملا ہے کیا کیا پروگرام تھے دل میں کہ عائشہ کے ساتھ خوب پتنگیں لڑاؤں گا۔ چھت پر جا کے خوب گڈیاں لوٹیں گے۔ لڈو اور کیرم کھیلیں گے، پر تیسرا دن ہے مجھے ہاسٹل سے آئے ہوئے، لگتا ہے کسی پرائے گھر میں آگیا ہوں۔ بی بی اور خالہ تو ویسے ہی چپ چاپ اپنے کام میں مگن رہتی تھیں، ایک تم ہی تھیں جس نے مجھے کبھی کسی دوست کی کمی نہیں محسوس ہونے دی اور اب پہلی بار مجھے گھر آنے پر لگ رہا ہے کہ جیسے میں بہت اکیلا ہوں، کوئی دوست ہی نہیں ہے میرا۔" وہ بھی پیڑھی کھینچ کے اس کے پاس کچن میں بیٹھ گیا۔

ناولٹ

"تنگ مت کرو مصطفیٰ! بس دل نہیں کر رہا کچھ کرنے کو۔ لازمی تو نہیں ہر وقت کھیل کود میں لگے رہو تب ہی موڈ ٹھیک ہو۔ کبھی دل نہیں بھی چاہتا کسی کام کو۔" اس نے بے زاری سے کہا۔

"اس کا مطلب واقعی کوئی بات ہوئی ہے۔ پھر تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ کیا بات ہے۔" مصطفیٰ نے اس کے ہاتھ سے تنکا لے کر دور پھینک دیا اور وجہ جاننے کو بضد ہوا۔

"کوئی خاص نہیں مصطفیٰ! لیکن کبھی کبھی خالق کائنات کی اس تقسیم پر بہت الجھن ہوتی ہے ایک وہ ہیں جن سے دولت سنبھالے نہیں سنبھلتی اور وہ ہے کہ دیے چلا جاتا ہے اور ایک ہم ہیں، ساری زندگی کولہو کے بیل کی طرح دو اور دو چار کی جمع تفریق میں گزار دیتے ہیں۔ ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرتے ہیں۔ بی بی اس عمر میں بھی اتنی محنت کرتی

ہیں۔ اماں کا سارا دن کینٹین کی چیزیں تیار کرنے میں گزر جاتا ہے۔ تم اور میں میٹرک کے بعد سے ٹیوشنز کر کر کے اپنی پڑھائی کے خرچے پورے کرتے ہیں۔

اماں اور بی بی کی اتنی کوششوں سے گھر کا بمشکل خرچ پورا ہوتا ہے اور ایسے میں اگر کوئی اضافی خرچا نکل آئے تو دونوں کے چہروں پر تفکر کے سائے مجھے ہولا دیتے ہیں۔" اس سے اپنی سوچیں بانٹتے ہوئے پل بھر کو آنکھوں میں نمی بھی چمکی تھی۔

اس جیسی من موجی لڑکی کے منہ سے مصطفیٰ کو یہ سب کچھ سن کر عجیب سی حیرت ہوئی۔ "عائشہ! یہ سب کچھ تو شروع سے ہماری زندگی کا حصہ ہے مالک کی اس تقسیم کی مصلحتیں وہی بہتر جانتا ہے لیکن تم یہ بھی تو دیکھو ناں اس نے جینے کا کچھ نہ کچھ سامان تو کر رکھا ہے نا۔ محنت کی ہی سہی کھاتے تو ہیں نا۔

تم مجھ سے زیادہ جانتی اور سمجھتی ہو پھر بھی مجھے حیرت ہے کہ یہ مجھے تمہیں کیوں بتانا پڑ رہا ہے؟" سنجیدگی سے کہتے کہتے وہ آخر میں حیرت سے بولا تو عائشہ بھی طویل سانس لیتی سیدھی ہو بیٹھی۔

"بہت دنوں سے فرحین کی سالگرہ کا گفٹ لینے کے لیے پیسے بچا رہی تھی پر پچھلے ہفتے کی بارشیں جو برسنا شروع ہوئیں۔ انہوں نے ساری چھت کا کباڑا کر دیا ہے' اماں اور خالہ کی ساری جمع پونجی ملا کے بھی کچھ روپے کم پڑے تو مجھ سے ان کی پریشانی دیکھی نہیں گئی' میں نے وہ سارے پیسے لا کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیے' جس کا مجھے کوئی ملال نہیں ہے' لیکن اب اس کا اصرار بڑھ رہا ہے اور میرے پاس اسے دینے کو چھوڑ تقریب میں پہننے کو کپڑے ۔۔۔ نہیں ہیں۔ ٹیوشن فیس بھی دس کے بعد ملتی ہے۔ منیر شیخ کے دو بچوں کو پڑھانے جاتی ہوں' وہ یکم کو ہی فیس تھما تو دیتی ہیں پر فرحین کی سالگرہ تین دن بعد ہے چوبیس تاریخ کو۔۔۔

اس کے بے حد اصرار پر آخر کار عائشہ کو اپنے شکوے کی اصل توجیہہ بتانی ہی پڑی۔

"بس اتنی سی وجہ ہے' میں سمجھا پتا نہیں کیا ہو گیا۔ یار! یہ تم لڑکیوں کی نیچر بھی عجیب و غریب ہی ہوتی ہے۔ خوش ہونے پر آئیں تو چھوٹی سے چھوٹی بات ان کو بہت بڑی خوشی سے ہم کنار کر دیتی ہے اور کبھی کوئی جو بات دوسرے لوگوں کے نزدیک بے حد معمولی ہوتی ہے' ان کے لیے' بہت بڑی ہوتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

"تمہارے نزدیک یہ چھوٹی بات ہو گی' میری تو دنیا میں بس ایک ہی دوست ہے۔ بس اس سے میں وعدہ کر چکی ہوں اس بار' ورنہ میں کہاں کہیں جاتی ہوں اور بائی داوے' تم کتنی لڑکیوں کو جانتے ہو؟" روٹھے پن سے کہتے اس نے آخر میں مشکوک ہو کر پوچھا۔

"پہلے تو بندہ دوستی کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لے کہ وہ اس کے تقاضے پورے کر سکتا ہے کہ نہیں۔ بلکہ دوستی ہی کیا ہر رشتہ ہی کچھ نہ کچھ تقاضوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ کیونکہ رشتے بنا لینا اتنا مشکل نہیں ہوتا' جتنا ان کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے' اس لیے تو میں ایسے کسی جھنجھٹ میں ہی نہیں پڑا اور بے وفا لڑکی تم تو کہتی ہو کہ صرف میں ہی تمہارا دوست ہوں' تمہاری سہیلی ہوں یہ رقیب کون آ گئی ہے درمیان میں۔۔۔"
اس نے ڈپٹنے والے انداز میں پوچھا۔

"وہ تو میں اب بھی کہتی ہوں' لیکن فرحین سے میری دوستی چھ ماہ پہلے ہوئی ہے' بہت اچھی اور مخلص لڑکی ہے' خود ہی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اتنی امیر ہے پر غرور نام کو نہیں اور جب کوئی اتنی محبت سے آپ کی طرف قدم بڑھا رہا ہو تو آپ کا بھی فرض بنتا ہے نا جواب محبت سے دیں۔" اس نے کہا تو مصطفیٰ بے اختیار مسکرا دیا۔

کاٹن کے زرد سوٹ میں دوپٹا سر پر ٹکائے وہ عام سی لڑکی اس پل بہت خاص لگی تھی اسے۔ "یہ ہی بات تو میں تمہیں بتا رہا ہوں عائشہ بی بی کہ محبت کا یہ کلیہ ہم پر تو کبھی اپلائی نہیں کیا آپ نے۔ تین دن سے اپنی فضول قسم کی پریشانی میں تمہیں یاد ہی نہیں کہ میری چھٹیاں صرف ایک ہفتہ کی ہیں اور تیسرا دن ہے' میں تو تمہاری

مصروفیات کا عالم ہی دیکھے جارہا ہوں' صبح کالج کے لیے نکل جاتی ہو۔ وہیں سے ٹیوشنز دینے۔ واپسی پر بھی تمہارے کچھ چہیتے اسٹوڈنٹس تمہارے منتظر ہوتے ہیں' ان سے فارغ ہوتے ہوتے تمہیں مغرب ہوجاتی ہے۔ مغرب کی نماز پڑھ کے تم اتنا غفیل۔ آج کہیں جاکر ہاتھ لگی ہو تو، بھی فضول سے موڈ میں' میں تو پچھتارہا ہوں چھٹی پہ آکر۔" وہ تو جیسے بوریت کی انتہا پر تھا۔

عائشہ بے ساختہ مسکرادی۔ "ارے ارے اتنا بھی مایوس نہیں ہوتے بھئی۔ کل کا دن میں تمہارے اعزاز میں چھٹی کروں گی۔ اماں کے ہاتھ کے مزے دار کھانے پکواکر کھائیں گے۔ لڈو کھیلیں گے۔ پر ایک تو ٹیوشنز سے چھٹی نہیں کرسکتی' مجبوری ہے دوسرا اماں نے گڈیاں اڑانے نہیں دینا' یاد ہے پچھلی دفعہ میرے بازو فریکچر ہوتے ہوتے بچ گیا تھا اور باقی چوٹیں بھی مہینہ بھر بعد جاکے ٹھیک ہوئی تھیں۔ اب تو مجھے خود بھی خوف آنے لگا۔ بے' ایسا لگتا ہے ابھی میں نے پتنگ کے تعاقب میں اوپر دیکھا اور ادھر میں دھڑام سے نیچے۔ اف توبہ کیا منظر تھا' وہ بھی....."

اس نے جھرجھری لے کر چھ ماہ پہلے کا وہ منظر یاد کیا' جب حسب معمول مصطفیٰ ہاسٹل سے گھر آیا ہوا تھا اور وہ دونوں سہ پہر میں اوپر چھت پر آگئے۔ ساتھ والوں کے ساتھ بوکاٹا کے چکر میں جوش میں ڈور کو ڈھیلا کرتی وہ پیچھے مڑی ہی تھی کہ ایک دم پیروں کے نیچے سے زمین ختم ہوگئی اور خلا کے محسوس ہوتے ہی فلک شگاف چیخ کے ہمراہ وہ سامنے کی منڈیر سے کچے صحن میں آگری۔ بازو پر کچھ زیادہ ہی چوٹ آئی تھی' جبکہ باقی جسم میں چوٹیں تو آئی تھیں' لیکن شدید نوعیت کی کوئی چوٹ نہ تھی۔ جسم اور ہڈیوں کے درد نے البتہ مہینہ بھر ساتھ نہ چھوڑا' ساتھ ہی ساتھ بسنت کے موسم میں کسی کی نہ سننے والی عائشہ نے خود بخود ہی پتنگ بازی سے توبہ کرلی تھی۔

"مس عائشہ! سو تو نہیں گئیں۔" رات کے کھانے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں گئی تو دستک دے کر مصطفیٰ بھی چلا آیا۔

"نہیں' کیوں کوئی کام تھا کیا؟" بستر جھاڑتے جھاڑتے وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

"ہاں کام تھا بہت ضروری' یہ لو یہ کچھ پیسے رکھو تم اپنی دوست کی سالگرہ میں جانے کے لیے سوٹ بنالینا اور اس کو گفٹ بھی دے دینا۔" ہزار ہزار کے چار نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑاتا ہوا وہ بالکل عام سے لہجے میں گویا ہوا۔

"مم... مگر مصطفیٰ اس طرح یہ میں کیسے.... تم خود بھی تو ٹیوشنز کرکے اپنے اخراجات پورے کرتے ہو۔ نہیں یہ تم رکھو۔ تمہارے کام آئیں گے۔" اس نے روپے اسے واپس کرنا چاہے۔

"میں کہہ رہا ہوں نا رکھو۔ خالہ آرہی ہیں اس طرف' ان کے آنے سے پہلے تم یہ سنبھال لو' ورنہ انہوں نے بھی تمہاری طرح کی باتیں شروع کردینی ہیں۔" وہ عجلت میں کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولا تو عائشہ اس کی پشت کو دیکھے گئی۔

☼ ☼ ☼

"اماں...." اس نے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اماں کو آواز دی تو وہ چونک اٹھیں۔

"بول گیتی آرا... کیا بات ہے؟" انہوں نے شفقت سے گیتی آرا سے دریافت کیا۔

"تم نے اور ابا نے میرا یہ نام کیوں رکھا گیتی آرا۔ خوب صورت لوگوں جیسا۔ ایسے نام یا تو بہت خوب صورت لوگوں کو سجتے ہیں یا شہزادیوں کو۔ شہزادیوں کا تو دور ہی نہیں رہا اور نہ میں شہزادی ہوں نا ہی خوب صورت' اس لیے تو اپنے نام سے نفرت ہوگئی ہے مجھے۔ جب تم یا کوئی اور مجھے اس نام سے بلاتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ تم سب میرا مذاق اڑا رہے ہو۔" اس کا لہجہ اور اس کی بات دونوں ہی کڑواہٹ لیے ہوئے تھے۔

اماں حیرت سے بس اسے دیکھے گئیں۔ "کیا ہوگیا

ہے گیتی آرا۔ ایسا نہیں بولتے میری جان۔ کس نے کہا تم خوب صورت نہیں ہو؟" وہ آگے بڑھ آئیں۔

"ہونہہ...... خوب صورت ہوتی تو آج آپ کی جان کا وبال نہ بنی بیٹھی ہوتی۔ ساجد یہ کہہ کر ٹھوکر نہ مار جاتا کہ اس بلا سے شادی کرنے سے بہتر ہے میں خودکشی کرلوں۔" استہزائیہ انداز میں اماں کا ہاتھ جھٹک کر اس نے جیسے اپنا مذاق اڑایا۔ اماں اس کا یہ انداز دیکھ کر دھک سے رہ گئیں، جس بات کو انہوں نے اس سے بہت چھپا کر رکھا تھا، اس نے اس کی سماعت تک رسائی حاصل کر کے اپنی تلخی کا گھونٹ اس کے اندر اتار دیا تھا۔

"وہ اس کی بدنصیبی تھی جو تجھ جیسے ہیرے کو ٹھکرا دیا اس نے۔ دیکھنا ایک دن ضرور پچھتائے گا جب تجھے اپنے گھر میں ہنستا بستا دیکھے گا۔" اماں گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"ہیرا مت کہو اماں! کوئلہ کہو کوئلہ، ہیرے کو لوگ اپنے تاج میں سجاتے ہیں۔ کوئلے کو ہاتھ لگانے سے ایسا ڈرتے ہیں جیسے لوگ مجھ سے رشتہ جوڑنے سے......" اس کی خود ترسی آج عروج پر تھی۔

"بس کرو گیتی آرا! ایسی باتیں کر کے مجھے دکھ مت دو بچے۔ گھر کا بسنا نہ بسنا یہ سب نصیب کے کھیل ہیں، بالکل ایسے ہی کسی بھی مخلوق کی کم روئی کا مذاق اڑانے کا حق ہمیں نہیں ہے، حتیٰ کہ اپنا بھی۔ یہ رب کے کام ہیں، اس کی مصلحتیں وہی جانتا ہے۔ جس کے نزدیک یہ سب ثانوی باتیں ہیں، سب سے بڑی چیز ہے آپ کا دل اور آپ کے اعمال خوب صورت ہوں اور میری بیٹی کے دل کی اچھائی کا عکس اس کے چہرے پر جھلکتا ہے۔ کتنی دفعہ کہا ہے فضول باتیں مت سوچا کرو۔"

اماں نے اس کے لہجے کی کڑواہٹ محسوس کرتے اس سے کہا تو وہ سر جھٹک کر چپ ہو گئی، پتا تھا کہ اس کی ایسی باتیں اماں کو بے حد دکھی کرتی ہیں، ایسا گزشتہ پانچ سالوں سے تھا، جب سے اس کے منگیتر ساجد نے اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ خودکشی تو کر سکتا ہے، لیکن گیتی آرا جیسی بلا سے شادی نہیں کر سکتا، بھلے وہ کتنی ہی دولت مند کیوں نہیں ہو۔

ساجد اصل میں ابا کے دور پرے کا رشتہ دار تھا جس سے اس کی بات بچپن سے طے تھی کہ اچانک ہی اس کی خالہ زاد نے اپنی سنہری آنکھوں کے جال میں جکڑا تھا کہ قبول صورت گیتی آرا اس کو بلا لگنے لگی تھی۔

گیتی آرا کا صرف رنگ دبتا ہوا تھا، لیکن ساجد نے اس کو اس کا عیب بنا دیا تھا۔ ساجد کے بعد بھی بہت سے رشتے آئے، پر ذات برادری کے تار عنکبوت میں پھنسی اماں کسی کو ہاں نہ کہہ پائیں کہ ایسا کرنے سے اپنے مرحوم شوہر کو کیا جواب دیں گی۔ یہ نہیں سوچا کہ ہر معقول رشتے کو اس فضول سی وجہ کے باعث انکار کرنے سے وہ اپنی بیٹی کے عمر کے سنہری سال بھی ضائع کر رہی ہیں اور اسے ایک ان دیکھے برزخ میں دھکیل رہی ہیں۔

مالی پریشانی کوئی نہ تھی کہ ابا ترکے میں مین بازار میں تین چلتی دکانیں چھوڑ کر مرے تھے، جن کا کام پہلے وہ خود سنبھالتے تھے، مگر اب وہ کرائے پر تھیں۔ ذاتی مکان تھا جو اچھے وقتوں کا بنا ہوا تھا۔ گیتی آرا نے ایف اے کالج سے کیا تھا، پھر ابا کی وفات کے بعد اس نے پرائیویٹ بی اے، پھر بی ایڈ کیا اور گورنمنٹ کی ٹیچرز اسامی کے لیے اپلائی کرتے ہی دو ماہ کے اندر اندر اس کی ایک گرلز ہائی اسکول میں نوکری ہو گئی تھی۔

خود اعتماد وہ شروع سے تھی، اس کی اس خود اعتمادی کو اسکول کی نوکری نے مزید بڑھایا تھا، اگرچہ اماں اس کے حق میں نہیں تھیں، وہ جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ گیتی آرا کی خود اعتمادی میں پہلی دراڑ اس وقت پڑی، جب اس کے منگیتر نے اسے ٹھکرا کر اپنی خالہ زاد سے شادی کر لی تھی۔ کچھ دن تک اسے صدمہ رہا۔ وہ روئی بھی۔ افسردہ بھی ہوئی، پر جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا، لیکن گزرے پانچ سال میں جس طرح کچھ لوگوں نے اس کی قبول صورت شکل کو محض

رنگ کی بنیاد پر مسترد کیا تھا' کچھ کو اماں نے ذات برادری کے زعم میں ٹھکرایا تھا' ان دونوں عوامل نے مل کر اس کی ذات میں پیدا ہونے والی دراڑوں کو ایک بہت بڑے خلا میں تبدیل کردیا تھا۔

اس کی ہم عمر سب بیاہی گئی تھیں اور اب ایک ایک' دو دو بچوں کی ماں تھیں۔ ہنستی کھیلتی گیتی آرا جو کبھی ابا کی بہت چہیتی۔ اماں کی دلاری تھی' وقت اور معاشرے کی اس ٹھوکر سے بکھر گئی تھی۔ اسکول میں بھی ساتھی ٹیچرز کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے گھر بار بچوں کے تذکرے اس کا جی جلاتے' اسے لگتا وہ سب اسے چڑانے کے لیے ایسی باتیں کررہی ہیں۔ یوں وہ سب سے الگ تھلگ ہوتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"مما مجھے کچھ نہیں پتا۔ مجھے بس بائیک چاہیے' ورنہ کل سے میں یونیورسٹی نہیں جاؤں گا۔" اسفر نے چائے کا کپ ٹیبل پر پٹخا تو انہوں نے اپنے خود سر بیٹے کو گھور کر دیکھا۔

"تم دن بہ دن کچھ زیادہ ہی بدتمیز نہیں ہوتے جارہے ہو؟ دیکھ بھی رہے ہو اپنے پاپا کی بیماری۔ ان کی بیماری پر ہی کتنا خرچ اٹھ جاتا ہے۔ کاروبار آج کل مندا ہے' جس کی وجہ سے اس مہینے تو بالکل گنجائش نہیں ہے بائیک لے کر دینے کی۔ پچھلے ہفتے ہی پینتالیس ہزار کا لیپ ٹاپ لے کر دیا ہے تمہارے پاپا نے۔ کتنی دفعہ کہا ہے ان کے ساتھ اسٹور کو ہی دیکھ لیا کرو۔ ملازم ہی سب کام سنبھالتے ہیں' لیکن تمہیں احساس ہی کہاں ہے۔" انہوں نے تیوریاں چڑھائے بیٹھے بیٹے کی کلاس لی تو وہ مزید بگڑ گیا۔

"لیپ ٹاپ لے کر دیا ہے تو کون سا احسان کیا ہے مجھ پر۔ میرے فرینڈز کے پاس دیکھیں نیو برانڈ لیپ ٹاپ ہیں' جن کی قیمتیں لاکھ سے بھی اوپر ہیں۔ پھر سب کے پیرنٹس کرتے ہیں ایسا' آپ لوگ انوکھا تو نہیں کررہے اور جہاں تک اسٹور کی بات ہے تو ساری زندگی پاپا ہی دیکھتے آئے ہیں۔ مجھے نہ تو یہ حساب کتاب کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں نہ میں ٹکے ٹکے کے گاہکوں کی فضول بکواس سن سکتا ہوں۔ مجھے اگلے ہفتے تک ہر صورت بائیک چاہیے' سن لیں آپ اور اپنے شوہر نامراد کو بھی بتادیجیے گا جن کو صرف گھوریاں ڈالنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنی آتی ہے۔ یہ بھی خیال نہیں کہ اکلوتی اولاد ہوں ان کی' اتنا ۔۔۔ کچھ ہے' ان کے پاس پراپرٹی' بینک بیلنس سب کچھ میرا ہی ہے' تو آرام سے پتا نہیں کیوں نہیں دے دیتے مجھے۔ ان کے مرنے کے بعد بھی مجھے ہی سنبھالنا ہے تو ابھی کیوں نہیں۔" درشتی سے کہتا وہ ان کا دل دہلا گیا۔

"خدا کے لیے چپ کرو اسفر' ہوش کے ناخن لو۔ تمہارے پاپا سن لیں گے تو کتنا برا لگے گا انہیں۔ اچھا تم اٹھو یونی جاؤ' میں کچھ کرتی ہوں۔" انہوں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا اور آخری بات قدرے مدافعانہ لہجے میں کی' پتا تھا کہ اس کا غصہ اگر سوا نیزے پر آگیا تو سنبھالنا بے حد مشکل ہوجائے گا۔

"سوچنا نہیں ہے' عمل بھی کرنا ہے۔ پاپا سے کہیں بینک بیلنس کو ہوا لگوائیں' بڑے بڑے گل سڑ جائے گا۔" استہزائیہ انداز میں ان کو وارننگ دے کر وہ باہر نکل گیا تو وہ سر تھام کر بیٹھ گئیں۔

بیٹے کے بعد شوہر کا نزلہ بھی ان پر ہی گرنا تھا' یہ انہیں معلوم تھا اور ہوا بھی یہ ہی' شام کو جب وہ اسٹور سے تھکے ہارے گھر آئے تو انہیں کھانا اور چائے دینے کے بعد ان کی دوائی دی۔ کچھ عرصے سے وہ شوگر اور بلڈ پریشر کا شکار تھے۔ ابھی حال ہی میں شوگر لیول بڑھنے کی وجہ سے انہیں اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

"وہ اسفر یونیورسٹی جانے میں بہت پریشان ہوتا ہے۔ دو' دو بسیں بدلنا پڑتی ہیں۔ بائیک کے لیے ضد کررہا ہے' اگر آپ اسے۔۔۔" ابھی ان کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ چیخ اٹھے۔

"تو کہاں سے لاؤں اتنے پیسے چوری کروں' ڈاکے ڈالوں' بتاؤ کہاں سے لا کر دوں۔ پانچ لاکھ اسپتال والوں نے بل بنا دیا۔ ابھی اسٹور میں پچھلے ماہ ہی نیا مال ڈالا

ہے۔ جانتی ہو ہاتھ کتنا تنگ ہے، پر تمہیں میری پریشانیوں اور مسائل سے کیا لینا دینا۔ تمہیں تو بس اپنے لاڈلے کی بے جا فرمائشیں پوری کرنی ہیں۔ کبھی بیٹھ کے اس کے رزلٹ کارڈز دیکھے گریڈ زوہ ہمیشہ سی اور ڈی ہی لایا ہے۔ مجھے بتاؤ ایسی پڑھائی اس کے کس کام کی ہے۔ یونی ورسٹی کے بہانے صبح جاتا ہے، شام ڈھلے گھر آتا ہے۔ روز کا جیب خرچ اسے کھلا مل جاتا ہے، آوارہ قسم کے دوستوں کا ہر وقت کا ساتھ ہے۔ جس اولاد کو ماں، باپ سے بات کرنے کی تمیز ہی نہ ہو ارے ایسی اولاد کس کام کی۔" بولتے بولتے انہیں کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ "اس سے میں بے اولاد ہی بھلا تھا۔" کھانستے کھانستے انہوں نے کہا تو وہ آگے بڑھ کر ان کی کمر سہلانے لگیں۔

"آپ بھی ذرا نرمی سے بات کیا کریں۔ جوان اولاد پر اتنی سختی بھی ان کو خودسری پر مجبور کر دیتی ہے۔" کچھ دیر بعد وہ آہستہ سے بولیں۔

"نرمی کا ہی تو نتیجہ ہے جو اتنا بگڑ گیا ہے۔ ارے دوسروں کی اولاد تو باپ کے کندھے برابر پہنچتے ہی گھر بار سنبھال لیتی ہے، یہاں ہمارے صاحب زادے ہیں، تیسرا سال ہے یونی ورسٹی میں ہی اٹک گئے ہیں۔ اس سے کہو بس چھوڑے یہ پڑھائی وڑھائی، میرے ساتھ اسٹور پر جایا کرے۔ جو چاند اس نے کالج میں جا کر چڑھائے ہیں وہی یونی ورسٹی میں بھی چڑھائے گا۔ یونی تو بہانا ہے آوارہ گردی کا۔" وہ بھی اسفر کی طرف سے اچھا خاصا جلے بیٹھے تھے۔

"اچھا اچھا.... بچہ ہے، میں سمجھا دوں گی۔ آپ غصہ مت کریں، پہلے ہی طبیعت خراب ہے آپ کی۔" انہوں نے شوہر کو دھیما کرنا چاہا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ غلط فہمیوں اور بے رخی کی جو دیوار ان باپ، بیٹے کے درمیان میں کھڑی ہو رہی ہے اسے کیسے دور کریں۔ اس کھینچا تانی میں ان کے گھر کا پرسکون ماحول خراب ہو کر رہ گیا تھا۔ بیٹا مشرق تھا تو باپ مغرب۔ وہ تو شکر ہے دوائیوں کے زیر اثر وہ سو چکے تھے۔ جب اسفر گھر میں داخل ہوا تھا، ورنہ باپ، بیٹے کی مڈبھیڑ جب بھی ہوتی ایک نیا معرکہ ضرور ہوتا تھا۔ مگر آج خیر یہ ہوئی کہ صبح جس بگڑے موڈ کے ساتھ اسفر گیا تھا اب اس کا موڈ اتنا ہی خوش گوار تھا۔

کھانا کھانے کے بعد اب وہ صوفے میں دھنسا کوئی میوزک چینل لگائے ہوئے خود بھی ساتھ ہی گنگنا رہا تھا۔ اس کا موڈ خوش گوار دیکھ کر انہوں نے سکون کی سانس لی اور خود کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

✲ ✲ ✲

"میں نہیں کھیل رہی مصطفیٰ۔ مجھے پتا ہے تم جان بوجھ کر ہار گئے ہو مجھ سے...." منہ بنا کر اس نے ساری گوٹیں بکھیر دیں۔

"کیا کروں یار! تم سے ہارنے میں بڑا اچھا لگتا ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "ورنہ تم یقین نہیں کرو گی عائشہ! ہاسٹل میں ان دو سالوں میں مجھ سے کوئی جیت نہیں پایا۔" بازی سمیٹتے اس نے کہا۔

"اچھا اٹھو، آج دھوپ زبردست سی نکلی ہے۔ کیا خیال ہے چاچا کرمو کے مالٹوں کے باغ کا جائزہ نہ لیا جائے۔" اس نے کہا تو عائشہ خوشی سے کھل گئی۔

"بہت ہی نیک خیال ہے۔ پر اماں...." وہ جوش سے اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

"خالہ سے میں پوچھ لیتا ہوں۔ تم اٹھو تو سہی، پھر میں نے دو ماہ بعد آنا ہے تو سوچا ہے آج کا دن ذرا بھرپور انداز سے گزار کے جاؤں۔ تم چادر لے کر باہر آجاؤ، میں خالہ جی سے پوچھ لیتا ہوں۔ آج تو وہ دونوں بہنیں بھی صبح سے لگی ہیں کدو، مولی کے باغ کو ٹھیک کرنے میں...." کہتا ہوا وہ باہر صحن میں نکل آیا، جہاں واقعی خالہ نے کیاریوں میں سے تازہ نکالی ہوئی گاجروں کو دھو دیا تھا، جبکہ بی بی ابھی بھی اپنے چھوٹے سے کھیت کی ناز برداریوں میں مصروف تھیں۔

"خالہ! میں اور عائشہ ذرا چاچا کرمو کے باغ تک جا رہے ہیں، کل مجھے ملے تھے تو دعوت دی تھی کہ مالٹے تیار ہیں، جاتے جاتے وہاں کا چکر لگاتا جاؤں۔"

اس نے گاجروں کے ساتھ نبرد آزما خالہ کو مخاطب کیا۔
"ٹھیک ہے، جاؤ، لیکن جلدی آنا۔ تازہ مولیاں ہیں، ان کے پراٹھے بنا رہی ہوں ابھی۔ پھر شام کو تمہارے لیے گاجر کا حلوہ بنا کر دوں گی، ساتھ لے جانے کے لیے۔ دیکھ لو ہمارے جس کھیت کا تم اور عائشہ مذاق اڑاتے ہو۔ اس نے کتنے فائدے دیے ہیں۔" خالہ نے تازہ اور سرخ گاجروں کے ڈھیر کو خوش ہو کر دیکھا تو مصطفیٰ سے کہا۔
"میں نے مذاق کبھی نہیں اڑایا خالہ! میں تو بس یہ کہتا ہوں کہ سارا دن کام میں مصروف رہتی ہیں۔ بی بی اور آپ۔ پہلے کینٹین کے لیے اتنا سب کچھ بنانا، پھر بچا کھچا وقت بھی آرام کے بجائے اس کھیت کو دیتی ہیں تو میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آرام کرنا بھی آپ کا حق بنتا ہے۔" وہ ان کی تصحیح کرتے ہوئے بولا۔
"بس بیٹا! یوں سمجھو کہ ان سے کچھ دلی لگاؤ ہو گیا ہے۔ اپنی اولاد کی طرح لگتے ہیں یہ پھل پودے انسانوں سے تو قسمت والا انسان ہی فیض پاتا ہے۔ ان کو اگر لگن، توجہ اور پیار دو تو آپ کو دگنا لوٹاتے ہیں۔ پر ہمیں تھکاتے نہیں، الٹا سکون ہی دیتے ہیں اور کئی ضرورتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں ان سے۔" گاجروں کو چھیلتے انہوں نے مصطفیٰ کو تفصیل بتائی اور تسلی کرائی، اتنے میں عائشہ بھی چادر اوڑھ کر آگئی تھی۔ دونوں نے بی بی اور اماں کو سلام کیا اور باہر آگئے۔
تھوڑے سے فاصلے پر ہی مالٹے کا باغ تھا، ذرا دیر بعد وہ دونوں وہاں پر تھے۔
"اچھے دن کتنی جلدی گزرتے ہیں نا مصطفیٰ۔" عائشہ نے درخت سے ایک مالٹا توڑا۔ "کل تم چلے جاؤ گے۔ میری بھی پھر سے وہی تھکا دینے والی روٹین شروع ہو جائے گی، مسز شیخ کے بچوں کا رزلٹ بہت اچھا آیا ہے۔ انہوں نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر دو چھٹیاں دے دی ہیں، ورنہ اتنا سخت رویہ رکھنے والی خاتون ہیں مصطفیٰ! کہ کبھی کبھی مجھے بے حد غصہ آتا ہے ان پر۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھوا کر گویا انہوں نے میری سات پشتوں پر ہی احسان کر دیا ہے۔ کئی بار دل چاہا کہ چھوڑ چھاڑ کے آجاؤں سب، لیکن جتنی فیس وہ دیتی ہیں۔ یہاں قصبے میں سب بچوں کی ملا کر بھی نہیں ہوتی۔ پھر اگلے سمسٹر کی فیس بھی منہ چڑا رہی ہے۔ اگلے ماہ۔ پچھلے سال سے ہی میری کوشش ہے کہ اماں اور بی بی کو تنگ نہ کروں، تو اچھا ہے۔" اس نے مالٹا چھیل کر مصطفیٰ کی طرف بڑھایا۔
"بس عائشہ یہ کچھ عرصے کی مشکل ہے، پھر دیکھنا ان شاء اللہ جب میری جاب ہو جائے گی تو ہمیں بھی سکون ہو گا۔ ہمارے بھی دن پھریں گے۔" اس نے اس کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلتے کہا۔
"میں اپنے حال پر راضی اور شاکر ہوں مصطفیٰ پر کبھی کبھی مسز شیخ اور ان کے گھروں کے ساتھ بنے بے شمار پکے اور خوب صورت گھر دیکھ کر دل میں خواہش اٹھ آتی ہے کہ کیا ہوتا جو کوئی ایسا ایک اچھا گھر ہمارے نصیب میں ہوتا۔ اماں اور بی بی کے چہرے بھی ویسے ہی مالی آسودگی کی چمک لیے ہوتے جیسے ان بیگمات کے۔ تمہیں اور مجھے پل پل اپنی فیس، پڑھائی اور دیگر اخراجات کی فکر نہ ہوتی۔ کیسی قسمت لے کر پیدا ہوئے ہیں ہم دونوں۔ تمہارے والد کو بچپن میں اللہ تعالیٰ نے پاس بلا لیا اور میرے والد پتا نہیں دنیا کے کن جھمیلوں میں الجھ گئے، جو کبھی پلٹ کر ہماری خبر ہی نہ لی۔
میری ہر بات اور ہر سوال کا جواب فوراً دے دینے والی اماں اس موضوع پر بات ہی نہیں کرتیں۔ ایک دفعہ بہت اصرار کرنے پر ان کی طبیعت بگڑ گئی کہ مجھے آج تک دوبارہ یہ سوال دہرانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ قانون فطرت ہے نا مصطفیٰ کہ جو چیز آپ کے پاس نہیں ہوتی، اس کو حاصل کرنے کو آپ کا من مچل جاتا ہے اور جن چیزوں یا باتوں کو چھپایا جائے ان کے بارے میں جاننے کی ہڑک انسان کو چین نہیں لینے دیتی۔" مالٹا اس کے ہاتھ میں ویسے ہی رہ گیا تھا۔
اپنے دل کی تمام باتیں وہ مصطفیٰ سے ہی بانٹا کرتی تھی۔ سو اس وقت بھی اپنی بہت سی الجھنوں اور خواہشوں کو بیان کر گئی۔

✡ ✡ ✡

”بہت سال پہلے تو آپ ایسی نہیں تھیں، جیسی اب ہو گئی ہیں؟“ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑا وہ خوبرو نوجوان اماں کی کسی دور پار کزن کا بیٹا تھا۔ جو دو تین ماہ پہلے اماں سے برادری کی کسی شادی میں ملا تھا' اس کی ماں اور باپ اس کے بہت بچپن میں انتقال کر گئے تھے۔ چچا نے اسے پالا تھا' جب چھوٹا تھا تو اماں نے اپنی خالہ زاد بہن کے ساتھ دیکھا تھا۔ اب تو اسے ایک بھرپور جوان کی صورت دیکھ آبدیدہ ہو گئیں اور انہیں اپنی خالہ زاد بہن بے حد یاد آئی تھیں۔ اماں بصد اصرار اسے اپنے گھر ہی لے آئی تھیں۔

پہلی بار گیتی آرا اسکول میں تھی۔ جب وہ آیا تھا۔ دوسری بار وہ گھر پر تو تھی' لیکن اماں کے بار بار بلانے پر بھی کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ آج تیسری بار وہ کسی کام سے شہر آیا تو اماں سے ملنے چلا آیا۔ چھٹی کا دن تھا اماں کپڑے دھونے میں مصروف تھیں، جبکہ گیتی آرا تخت پر بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کو تکے جا رہی تھی' جب اس شخص نے اسے مخاطب کیا۔ کتنا بدل گئی ہیں آپ! گیتی آرا نے سنا نہیں تھا یا اپنی بے زار طبیعت کے باعث خود ہی جواب نہیں دیا تھا۔ جو اس نے اس سے یہ سوال پوچھا۔

”کیسی ہوں اب؟ اور پہلے کیسی تھی؟“ اس نے کر ختگی سے سوال کیا۔

”بہت سال پہلے ہمارے گاؤں میں خالہ کے ساتھ آپ آئی تھیں تو مجھے یاد ہے کہ شادی کی رونق بھی آپ نے لگائی تھی۔ اپنی خوب صورت آواز میں گانے' ٹپے گائے تھے۔ آپ کے جانے کے بعد بہت دنوں تک آپ کا چرچا رہا کہ بانو (اماں) کی بیٹی میں شہری ہونے کے باوجود مزاج میں نخرا نہیں اور آواز بھی کتنی خوب صورت ہے؟“

اس نے سادہ سے انداز میں بتایا تو گیتی آرا کو یاد آیا واقعی تقریباً“ دس سال قبل وہ جب اماں کے ساتھ ان کے شریکوں کی شادی میں گئی تھی تو کیسی پراعتماد' بناؤ سنگھار کی شوقین چنچل سی لڑکی ہوتی تھی' تب ہی تو ابا کے رشتے داروں نے اس کو دیکھ کر اماں سے اس کا ہاتھ مانگا تھا۔

”میں تو حیران ہی رہ گیا آپ کو دیکھ کر' اس عمر میں کوئی بھی اتنا آدم بے زار نہیں ہوتا جتنا آپ ہو گئی ہیں۔“ اب وہ موڑھا کھسکا کر تخت کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔

وہ یقیناً“ باتوں سے دلوں کو جیتنے کا فن جانتا تھا جو جاتے جاتے گیتی آرا کے ماتھے کی سلوٹیں مٹا کے ہی گیا تھا' اگلی بار آنے کا وعدہ کر کے۔ اور محض چار دن بعد وہ ان کے گھر پر حاضر تھا اس نے آنے کے لیے وقت ہی ایسا چنا کیا تھا جب گیتی آرا چھٹی کے بعد گھر میں تھی۔ اس بار گیتی آرا نے خود آگے بڑھ کر اسے سلام کیا تھا۔

”آج لگ رہی ہیں آپ اپنے نام کی مکمل تفسیر گیتی آرا۔ کہیے کیسے مزاج ہیں؟ کون سی کلاس کو پڑھاتی ہیں؟“ باتوں سے باتیں نکال کر وہ اس کو شریک گفتگو کرتا چلا گیا۔ اماں' بیٹی کا خوش گوار موڈ دیکھ کر بہت خوش تھیں۔

”گیتی جی یہ دنیا ہے نا دکھے دلوں کو مزید دکھانے کا فریضہ بخوبی انجام دیتی ہے' سو اس کو ایسا موقع ہی نہیں دینا چاہیے' نہ ہی خود ترسی کا لیبل خود پر چسپاں کرنا چاہیے۔ مجھے دیکھیں میں اپنے دکھوں کو چھپا کر اتنا ہنستا بولتا ہوں کہ خود ہی فریب میں آ جاتا ہوں۔ یقین جانیں یہ خود فریبی بھی بڑی پیاری چیز ہے' لمحوں میں آپ کو دکھوں کے سمندر سے نکال کر سکھ کے خوابوں میں لا کھڑا کرتی ہے۔ بچپن میں اماں' ابا گزر گئے۔ تایا کے گھر میں پلا بڑھا۔ تائی کے بھاری بھرکم ہاتھوں کی مار کی چبھن آج بھی اپنے توانا بدن پر محسوس کرتا ہوں۔

مجھے پڑھنے کا شوق تھا اور تائی کو میرے اسی شوق سے بیر تھا۔ میرے اسکول جانے کے ٹائم ان کو ہزاروں کام یاد آ جاتے۔ تایا بس اتنا ہی دم مار سکے تھے۔ تائی کے آگے کہ مجھے اس گھر تک لے آئے تھے آگے

ان کی بیوی کا کام تھا' جو اس نے بخوبی کیا۔ بمشکل پانچویں پاس کی تھی کہ تایا کا ہاتھ گھاس کاٹنے کی مشین میں آکر بے کار ہو گیا' تب سے ان کے حصے کا کام بھی مجھ پر آن پڑا' یوں پڑھائی تو ایک خواب ہوئی' سال دو سال ایسے ہی گزرے تھے کہ پڑھائی کا شوق ایک بار پھر انگڑائی لے کر بے دار ہوا۔

یہاں وہاں سے کتابیں ادھار لے کر کبھی کسی بہانے اسکول ماسٹر سے' کبھی کسی لڑکے سے اپنے علم کے حصول کی تسکین کر لیتا تھا۔ ایسی ہی صورت حال میں آٹھویں کا امتحان دیا۔ تائی اب میرا قد کاٹھ دیکھ کر ڈرنے لگی تھیں۔ سو ہاتھ چلانے سے ذرا گریز کرنے لگیں' پر زبان پر پھر بھی کنٹرول نہ رہا۔ میں اگر ٹکا ہوا تھا تو صرف اپنے تایا کے لیے۔ پچھلے سال ان کے انتقال کے بعد تائی اپنے بھائی کے گھر چلی گئی' مجھے گھر سے نکال دیا۔ اب نہ ٹھکانا ہے' نہ زاد راہ۔ پرائیویٹ میٹرک کی تیاری کر رہا ہوں۔ ایک ورکشاپ میں کام بھی جاری ہے۔ بس زندگی کا سفر جاری و ساری ہے۔" ہنستا مسکراتا خاور سے اندر کتنا دکھی تھا آج پتا چلا تھا۔

"ارے بیٹا ٹھکانا ہے نا..... خالہ کے ہوتے ہوئے دربدر پھر رہا ہے میرا بچہ۔" اماں کے کانوں میں خاور کی گفتگو کے کچھ آخری جملے پڑے تھے' تو اس کی دربدری کا سن کر وہ تڑپ گئیں۔

"نہیں خالہ! میرا ارادہ اس وجہ سے بتانے کا نہیں تھا کہ میں آپ پر بوجھ بن جاؤں' بلکہ گیتی جی کو بتا رہا تھا کہ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو مکمل خوش ہو' آسودہ ہو' کوئی نہ کوئی دکھ ہر جان کو لگا ہوا ہے پر اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ ہم جینا ہی چھوڑ دیں۔ دکھوں سے سرنڈر کرنے کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے میں ہی زندگی کا مزا پوشیدہ ہے۔" اس کی باتیں ان کی بیٹی کے دل میں ہی اتر گئیں۔

"ارے بیٹا بوجھ کیوں خدانخواستہ..... ماں کی جگہ ہوں تمہاری اور حکم دے رہی ہوں تمہیں کہ آج ہی اپنا سامان لے کر آجاؤ....." اماں نے دھونس سے کہا۔

"ٹھیک ہے خالہ! پر ایک شرط پر آؤں گا کہ آپ کرایہ لیں گی مجھ سے....." وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

"اچھا اچھا تم آتو جاؤ کرایہ بھی دیکھ لیں گے۔" اماں نے کہا تو خاور اثبات میں سرہلا گیا۔

☆ ☆ ☆

کالج سے وہ سیدھی مسز شیخ کے گھر آئی تھی' بچوں کو پڑھا کر گھر جانے کا ارادہ کیا تو پتا چلا کہ صبح سے ابر آلود موسم پورے زور و شور سے برس رہا ہے۔ آسمان پر چمکتی بجلی اور موسلا دھار بارش کو دیکھ کر وہ بہت پریشان ہو گئی۔ الٹے قدموں وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئی' جہاں بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ عامر اور ماریہ کھیل رہے تھے۔

"عامر آپ بیٹا ذرا اپنی مما کو بلا کے لاؤ۔" اس نے گھڑی کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ مسز شیخ کے آجانے پر اس نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔

"بارش رکنے کے تو واقعی آثار نہیں نظر آرہے۔ ڈرائیور بھی نہیں ہے۔ اچھا تم رکو' میں کچھ کرتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے اندر چلی گئیں' تھوڑی دیر بعد آئیں تو ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔

"عائشہ! یہ اسفر ہے میرے بیٹے کا دوست ہے۔ تمہاری اچھی قسمت کہ یہ بھی عدیل (بیٹے) کے پاس کسی کام سے آیا تھا۔ بارش کی وجہ سے رک گیا۔ عدیل تو گھر میں ہے' اسفر تمہیں اسٹاپ پر چھوڑ آتا ہے' نہیں تو پھر بارش رکنے کا انتظار کرلو۔" مسز شیخ نے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھ کر قدرے بے رخی سے کہا۔

"ن..... نن..... نہیں میں چلی جاتی ہوں۔" اسے امی اور بی بی کی پریشانی کا خیال آیا تو وہ جھٹ جانے کو تیار ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد تیز برستی بارش میں وہ بظاہر بے نیاز بنے اس نوجوان کے ساتھ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ حالانکہ ان کا قصبہ یہاں شہر سے محض پچیس منٹ کی ڈرائیو پر تھا اور اپنی گاڑی وغیرہ ہو تو محض پندرہ منٹ کا۔ اسٹاپ سے ہر آدھا گھنٹہ بعد وین نکلتی تھی'

اگلے اسٹاپ کے لیے اور ان کا قصبہ درمیان میں آتا تھا' سو اس کو کبھی کالج جانے آنے کے لیے مسئلہ نہیں ہوا تھا۔

صبح اماں ٹفن ساتھ دے دیتیں' جو وہ کالج میں کھالیتی' چھٹی کے فوراً" بعد مسز شیخ کے گھر پیدل ہی آجاتی کہ کالج سے محض پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ لیکن مسز شیخ کے بچوں کو ایک گھنٹہ پڑھانے کے بعد اسے بس اسٹاپ کے لیے رکشہ کرنا پڑتا تھا اور کبھی کبھار مسز شیخ مہربانی کرتے ہوئے ڈرائیور کے ہمراہ اسے گاڑی میں اسٹاپ تک بھجوادیتیں۔ گرمیوں میں تو وہ چار بجے تک گھر بھی پہنچ جاتی اور محلے کے بچوں کو بھی تھوڑا سا آرام کرکے چائے پی کے تازہ دم ہونے کے بعد پڑھا دیتی' بلکہ اکثر تو اماں بھی ان کو پڑھا چکی ہوتیں' لیکن سردیوں میں اس کے لیے بہت مشکل ہوجاتی' گھر پہنچتے پہنچتے مغرب کی اذانیں شروع ہوجاتی تھیں اور آج تو موسم کی خرابی کے باعث ابھی سے شام کا سماں محسوس ہورہا تھا۔

"جی مس...! آگیا اسٹاپ' پر یہاں تو کسی وین یا گاڑی کا نام و نشان نہیں ہے۔" اسفر نے گاڑی روکتے ہوئے اسے خیالات سے باہر نکالا' وہ خود بھی ہراساں نظروں سے یہاں وہاں دیکھنے لگی۔

"اب... اب میں گھر کیسے جاؤں گی؟" اس نے بے حد پریشانی میں اس سے پوچھا۔ حالانکہ وہ اچھی خاصی پراعتماد تھی' پر اس وقت حالات ہی کچھ ایسے بن گئے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"آنٹی (مسز شیخ) بتارہی تھیں کہ فضل نگر کی حدود میں ہے آپ کا گھر۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو وہاں تک ڈراپ کرسکتا ہوں' کیونکہ بارش کا بھی یہ ہی حال اگلے دو گھنٹے رہنے کا لگ رہا ہے اور کوئی لوکل سواری موجود نہیں ہے' ہوتی بھی تو میرا ضمیر مطمئن نہ ہوتا' آپ کو اس موسم میں لوکل وین میں بھیج کر جبکہ آپ کا قصبہ کوئی خاص دور بھی نہیں ہے۔" اس نے کہا تو عائشہ ممنون نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

اسفر نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں شروع کردیں۔ عائشہ جو پہلے اس کے ساتھ آتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ اب اس کی مہربانی کی وجہ سے مطمئن ہوگئی تھی۔

"جی میں بی ایس سی پارٹ ٹو کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ مسز شیخ کے بچوں کو ٹیوشن دیتی ہوں۔ روزانہ ہی لوکل سفر کرتی ہوں یا یوں کہیں کہ عادی ہوگئی ہوں اب تو' لیکن ان گزرے دو سالوں میں پہلی بار ایسا ہوا ہے' اس لیے آپ کو زحمت دینا پڑی۔" اپنے متعلق پوچھے گئے سوال کے جواب میں عائشہ نے اسے تفصیل بتائی۔

"ارے نہیں زحمت کیسی۔ میں عدیل کے پاس آتا رہتا ہوں اکثر۔ ایک دو بار دیکھا ہے آپ کو وہاں اور یقین مانیں تو میں بہت امپریس ہوا ہوں آپ کی اسٹڈیز کے لیے اتنی اسٹرگل کو دیکھ کر۔ روزانہ سفر کرکے آنا' پھر تھکے ہونے کے باوجود ٹیوشن' جبکہ آپ کی اپنی پڑھائی بھی خاصی ٹف ہے تو ویل ڈن' مجھے تو بہت اچھا لگا۔ میں لڑکا ہوں' پر یقین مانیں اتنی اسٹرگل مجھے کرنی پڑتی تو شاید میں بھی تھک جاتا۔ گھبرا جاتا۔" اس کی زبان سے ادا ہوئے تعریفی الفاظ عائشہ کو جھینپنے پر مجبور کرگئے۔

"ارے نہیں اسفر صاحب۔ زندگی کا زاویہ نظر ہر انسان کے لیے ایک جیسا نہیں ہوتا' پھر زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لیے' کچھ بننے کے لیے کوشش تو شرط ہے نا۔" عائشہ نے اسے کہا تو اسفر کو سنجیدہ نظر آنے والی وہ سمٹی سمٹائی لڑکی اس وقت بہت متاثر کرگئی۔

"فادر کیا کرتے ہیں عائشہ آپ کے؟ کتنے بہن بھائی ہیں آپ لوگ۔" اسفر نے احتیاط سے موڑ کاٹا۔ بارش اب ہلکی ہوگئی تھی۔

"میں اکلوتی ہوں اور میرے فادر..." وہ بتاتے بتاتے رک گئی۔ "میرے پیرنٹس کی علیحدگی ہوچکی ہے۔" آہستہ سے کہا گیا وہ جملہ اسفر کو بمشکل سنائی دیا تو اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور معذرت کرنے لگا۔

"سوری' مس عائشہ! مجھے اس طرح آپ کے پرسنلز میں انٹرفیر نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ سچ مچ

شرمندہ ہو کر بولا۔

"کوئی بات نہیں۔" عائشہ نے کہا۔

"اب آپ بتادیں کہ کس طرف موڑوں۔" فضل نگر کے سائن بورڈ پر نگاہ پڑتے ہی اسفر نے کہا تو عائشہ اس کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے بتانے لگی۔ ایک کھلی گلی میں اس نے گاڑی رکوادی۔

"بس اسفر صاحب! یہیں روک دیں۔ میرا گھر دو گلیاں چھوڑ کر ہے اور معذرت کے ساتھ کہ آپ کو نہ تو وہاں تک لے جاسکتی ہوں' نہ ہی کسی چائے یا تواضع کی آفر کرسکتی ہوں۔ میں روز لوکل سے آتی ہوں' یہ یہاں سب جانتے ہیں اور مصطفیٰ میرا کزن یہاں ہوتا تو یقین مانیے مجھے آپ کو گھر بلا کر بہت خوشی ہوتی' اب کسی مرد کی غیر موجودگی میں۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی تو شرمندہ شرمندہ سی عائشہ کی بات سمجھتا اسفر تیزی سے بول اٹھا۔

"اٹس اوکے' مس عائشہ میں آپ کی پرابلم سمجھ گیا ہوں۔" اس نے نرمی سے کہا تو عائشہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہوئی نیچے اتری۔

جب کہ اسفر کافی دیر گاڑی میں بیٹھا اس لڑکی کو اس وقت تک دیکھے گیا جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

بارش اب ہلکی ہلکی پھوار میں تبدیل ہوگئی تھی پھر بھی گھر آتے آتے اس کی چادر اچھی خاصی بھیگ گئی۔

"بس عائشہ! اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی' تمہیں کالج جانے سے منع نہیں کرتی' لیکن یہ ٹیوشن وغیرہ چھوڑ دو اب بیٹا۔ صبح سے ہول ہول کر برا حال ہوگیا ہے میرا' بی بی الگ گلی میں جاکر دیکھ دیکھ کر آتی رہیں' اوپر سے تمہارا موبائل بند۔ اف میرے اللہ مت پوچھو' کتنا برا حال ہوا ہے میرا۔" اماں تو جب وہ کپڑے بدل کر کھانا کھانے کے لیے بیٹھی' تب ہی شروع ہوگئیں۔

"موبائل۔۔۔ ہاں وہ رات میں چارج کرنا بھول گئی تھی اور اماں میں نے آپ کو پہلے بھی کہا ہے' میری اپنی پڑھائی کا لاسٹ سمسٹر ہے' تو کافی ٹف ہے سب کچھ' لیکن مسز شیخ کے بچے کسی اور ٹیوٹر سے پڑھنے کو تیار ہی نہیں' پھر اچھا خاصا پے کرتی ہیں' مجھے تو بس اسی لیے رک جاتی ہوں۔" اس نے کھانا کھاتے ہوئے تفصیل بتائی۔ "پھر اماں یہ بھی تو دیکھیں نا' بی بی کی ساری تنخواہ مصطفیٰ کی پڑھائی پر لگ جاتی ہے۔ آپ کی پنشن سے گھر کا گزارا بھی کھینچ تان کر ہوتا ہے۔ وہ تو آپ کی محنت کام آجاتی ہے' ورنہ سبزیوں کی قیمتیں بھی آسمان کو چھو رہی ہیں۔ میں تو بی ایس سی کے فوراً بعد بی ایڈ کرلوں گی۔ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے۔۔۔ آج کل تو ہر سال ہی ٹیچرز کی اچھی خاصی اسامیاں نکال رہی ہے حکومت۔ جاب ہوگئی تو آگے پرائیویٹ پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری رکھوں گی۔ ورنہ ایک دو کمپنیز میں جاب کے لیے اپلائی کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب ہی تجربہ مانگتے ہیں۔ لو بھلا بتاؤ نوکری دو گے پہلے تو ہی تجربہ حاصل ہوگا۔ نا۔" چائے کے لمبے لمبے گھونٹ بھرتے وہ کہے گئی تو اماں خاموشی سے اس کی بات سنے گئیں۔

"بس بول لیا جتنا تمہیں بولنا تھا۔" اماں نے رسان سے پوچھا۔

"اب میری بھی سنو۔ میں نے ساری زندگی نہ تو تم سے پڑھائی کروانی ہے اور نہ نوکری کے لیے دھکے کھاتا دیکھنے کی ہمت ہے مجھ میں۔ مصطفیٰ کے امتحان ہورہے ہیں۔ ان شاء اللہ اچھی نوکری بھی مل جائے گی۔ تمہارے پیپرز ہوتے ہی ہم نے تم لوگوں کی شادی کا سوچا ہے۔ پھر مصطفیٰ کی اجازت ہو تو آگے پڑھتی رہنا' نہیں تو اتنی ہی پڑھائی کافی ہے' ویسے بھی میں نے پڑھ کر نوکری کر کے کیا پالیا تھا جو تم پانا چاہتی ہو۔" دو ٹوک انداز میں اپنی بات اس سے کہتے کہتے آخر میں بی بی کا لہجہ یاسیت بھرا ہوگیا۔ پر عائشہ نے بی بی کی آخری بات سنی ہی کہاں تھی۔ وہ تو جیسے صدمے میں تھی۔

"مصطفیٰ سے شادی۔۔۔" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

وہ اس کا کزن تھا۔ دوست تھا' پر دل کا مکین ہرگز

نہیں تھا، نہ ہی اپنے مستقبل میں کہیں اس کا گمان کرتی تھی۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں مصطفیٰ سے شادی کروں گی۔ زندگی کے جس محدود تنگ اور مفلس بھنور سے ابھرنے کی کوشش میں کئی سالوں سے ہوں۔ آپ مجھے دھکا دے کر دوبارہ اسی گرداب کی جانب دھکیل دینا چاہتی ہیں۔ میرے خوابوں میں نہ تو ایسی زندگی ہے، نہ یہ چھتیں ٹپکتا گھر اور نہ مصطفیٰ یہ میری زندگی ہے اور میں اسے زندگی کی طرح گزارنا چاہتی ہوں۔ سسک سسک کر نہیں جینا۔ اللہ تعالیٰ نصیب بناتا ہے، پر کوشش کرنے کا حکم بھی دیتا ہے۔ اس گھر میں پیدا ہونا میرا نصیب ٹھہرا، پر کوشش ہو سکتا ہے میرا نصیب بدل ڈالے۔ مجھے میری ترجیحات کے مطابق میری زندگی کا یقین کر لینے دیں۔" وہ جیسے پھٹ پڑی اور اماں بے چاری حیران پریشان رہ گئیں اس کے ایسے سخت رد عمل پر.....

وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ مصطفیٰ کے ساتھ کا سنتے ہی وہ خوش ہو جائے گی تو کیا ان کا خیال غلط تھا۔ مصطفیٰ کی مرضی جان کر ہی بی بی نے اماں سے بات کی تھی تو کیا مصطفیٰ نے اکیلے ہی خواب بن ڈالے، خوابوں کے اس سفر میں عائشہ اس کے ہمراہ نہیں تھی۔

"کیا بات ہے عائشہ! کیوں اتنا تیز تیز بول رہی ہے؟ ماں باپ کی ڈانٹ بھی فائدے کے لیے ہوتی ہے۔ پر بچہ اس بات کا فہم نہیں رکھتا۔" بھیگے کپڑوں میں ملبوس بی بی جو کہ اوپر چھتوں کا جائزہ لینے گئی تھیں، اندر آئیں۔ وہ سمجھیں کہ عائشہ کو ماں نے دیر سے آنے پر ڈانٹا تھا اور عائشہ اس لیے خفا ہو رہی تھی۔ اصل صورت حال سے وہ لاعلم تھیں۔

"کچھ نہیں بی بی۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔" عائشہ نے بی بی سے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دو ہی کمرے تھے جس میں پہلے ایک میں وہ تینوں اور دوسرے میں مصطفیٰ کی رہائش تھی۔ پر اب جب سے مصطفیٰ ہاسٹل چلا گیا تھا، اس کا کمرہ عائشہ کے تصرف میں تھا۔ پچھلے دنوں ہی ایک اور چھوٹا سا کمرہ بنا کر اسے بیٹھک کا نام دیا گیا تھا۔ جن دنوں مصطفیٰ گھر ہوتا، وہیں ٹھہرتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد اماں نے جب بی بی کو عائشہ کے رد عمل کے بارے میں بتایا تو ایک لمحے کو وہ چپ ہو گئیں، لیکن پھر خود ہی انہیں تسلی دی۔

"کوئی بات نہیں، تم نے اچانک بات کی ہے نا تو بچی پریشان ہو گئی ہے، تم پریشان نہ ہو۔" انہوں نے اماں کا کندھا تھپک کر انہیں تسلی دی تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"میں تو حیران ہوں اسفر کی کایا پلٹ پر۔ کہاں تو اس نے اپنی حرکتوں سے ہمارا ناک میں دم کر رکھا تھا، کہاں اس ایک ماہ میں اس میں اتنی تبدیلی آئی ہے کہ ریگولر یونیورسٹی جا رہا ہے۔ وہاں سے بھی آنے کے بعد آوارہ گردی کرنے کے بجائے اسٹور کی دیکھ بھال کے لیے آجاتا ہے میرے پاس۔ سچ پوچھو تو مجھے اب پتا چل رہا ہے کہ جوان بیٹے کی خوشی کیا چیز ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو توانا محسوس کرنے لگا ہوں میں جیسے۔" کافی عرصہ بعد آسودگی اور طمانیت کا احساس انہوں نے اپنے اندر محسوس کیا تھا۔

"میں تو اللہ کا لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے میرے بچے کو ہدایت دے دی ہے۔" وہ ایسے سرشار تھیں جیسے اس کے سدھر جانے میں ان کا کوئی عمل دخل ہو۔ پر شام کو کھانے پر اس نے نئی فرمائش کر کے ماں کو حیران کر دیا۔

"میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکی بھی پسند کر لی ہے۔ آپ دونوں نے رشتہ لے کر جانا ہے۔" بریانی کھاتے اس نے ایسے فرمائش کی جیسے نئی شرٹ پسند کر چکا ہوں، جلدی سے دلا دیں.... جبکہ ان دونوں نے کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا، پر کون لڑکی ہے؟ کیسی ہے؟ لوگ کیسے ہیں۔"

"آپ کے لیے اہم بات یہ ہونی چاہیے کہ آپ

کے بیٹے کی پسند ہے وہ ایک دو روز میں ایڈریس بھی بتا دوں گا۔" اس نے ماں کی طرف سے کیے گئے سوالوں کا دوٹوک جواب دیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

خالہ کے بہت زیادہ اصرار پر خاور کو اپنا سارا سامان لے کر ان کے گھر آنا پڑا تھا۔ اس کے آنے سے گیتی آرا کے اندر بہت بڑی تبدیلی آئی تھی، وہ خوش رہنے لگی تھی۔ روزانہ شام کو اسے انگلش اور میتھ کی ٹیوشن پڑھانے لگی تھی۔ محض دو ماہ کی محنت کے بعد اس نے اللہ کا نام لے کر میٹرک کا امتحان دے دیا تھا۔

"آپ کچھ کر نہ رہی ہوں تو میں اندر آجاؤں۔" دروازے سے جھانک کر اس نے کتاب پڑھتی گیتی آرا کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر مسکرادی۔

"کچھ کر بھی رہی ہوں، تب بھی آپ اندر آسکتے ہیں۔" کتاب بند کرکے اس نے ایک طرف رکھ دی۔ وہ اس کے بیڈ کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"گیتی آرا! میں ہمیشہ سیدھی اور صاف بات کرنے کا عادی ہوا، الجھی باتیں، الجھی رویے اور بڑے بڑے دعوے کرنا مجھے پسند نہیں، سیدھی سی درخواست ہے کہ میں آپ سے شادی کا خواہاں ہوں۔ میری زندگی، میں خود سب کچھ آئینے کی طرح آپ کے سامنے ہے، انکار مت کیجیے گا کہ میری طرح میرا غافل دل پہلی بار کسی لڑکی کو دیکھ کر سگنل دینے لگا ہے اور وہ لڑکی آپ ہیں۔ یقین کیجیے کہ میں آپ کی خوشیوں کی ضمانت تو نہیں دیتا، لیکن اپنی سی بھرپور کوشش ضرور کروں گا۔" اس نے آہستہ مگر دوٹوک انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

"لل... لیکن خاور ایسے کیسے، تم مجھ سے پورے آٹھ سال چھوٹے ہو۔ جوان ہو، خوب صورت ہو، زندگی میں آگے بڑھنے کی لگن رکھتے ہو، کوئی بہت اچھی لڑکی تمہیں مل جائے گی۔" وہ سنبھل کر بولی تو خاور مسکرادیا۔

"بہت خوبیاں آپ میں بھی ہیں، تو بس وہ اچھی لڑکی آپ کیوں نہیں ہوسکتیں۔" اس کی آنکھوں میں جھانک کر خاور نے کہا تو گیتی آرا کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔

"جلدی سے ہاں میں عندیہ دیں تو میں خالہ سے بات کروں گا کہ مجھے اپنی فرزندی میں لے لیں۔ ورکشاپ کے مالک نے بھی اب مجھے ترقی دے کر ورکشاپ کا سارا حساب کتاب میرے حوالے کرکے منشی بنادیا ہے۔ ابا کا خالی پڑا مکان ہماری راہ تک رہا ہے جسے ہم گھر بنائیں گے اور خالہ کو بھی میں ماں بنا کے اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اس کے خوابوں کو نہ کہہ کر توڑ دینا چاہتی تھی، پر اس کے چہرے پر سجے رنگ اور خود اس کا دل بھی بغاوت پر آمادہ ہوگیا تو وہ سارے خدشے جھٹک کر مسکرادی، اس کے بعد جب خاور نے اماں سے بات کی تو ان کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ ان کی بیٹی کے نصیب کھل گئے تھے۔

دو ماہ کے اندر اندر وہ خاور کی دلہن بن کر اس کے ہمراہ اس کے گھر سدھار گئی۔ خاور، خالہ کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ گیتی آرا نے نوکری چھوڑدی تھی۔ گیتی آرا نے اماں کے مشورے سے خاور کی ورکشاپ کی نوکری چھڑوا دی تھی اور تینوں دکانوں کی چابیاں اس کے ہاتھ میں دے کر کہا تھا کہ اس سمیت اب اس کی ہر چیز اس کی ہے۔ خاور پہلے تو ذرا ہچکچایا، پھر محبت بھرا اصرار سے آمادہ کرگیا۔

گیتی آرا اس کے ہمراہ بہت خوش تھی۔ اگرچہ وہ ایک نو آباد قصبے سے گاؤں آئی تھی، پر خاور نے اسے اتنا پیار دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہر جگہ پر رہ سکتی تھی۔ خاور اسٹور کے کام میں بہت مصروف ہوگیا۔ گیتی آرا کی قبل از وقت ملنے والی ریٹائرمنٹ کا پیسہ بھی اس نے خاور کو دے دیا کہ اپنے کام کو مزید بڑھالے۔

اماں ایک رات معمول کے مطابق سوئیں تو سوتی رہ گئیں اس صدمے کو جھیلنے میں اس کا خاور نے بہت ساتھ دیا تھا، پھر جب وہ امید سے ہوئی تو اس نے خاور کو اس خوش خبری کا بتایا، اس کا ردعمل اسے کچھ عجیب سا

لگا، جیسے اسے یہ بات پسند نہ آئی ہو، حالانکہ گیتی آرا کا خیال تھا کہ خاور یہ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا اور اس سے اگلے دن گیتی آرا کے لیے جو تاریک منظر نمودار ہوا اس کی تاریکی اس کی ساری زندگی پر چھا گئی۔

☼ ☼ ☼

عائشہ نے اماں سے سب کچھ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس تو نکال لی تھی، پر بعد میں ان کا ردعمل اس کے لیے بہت پریشان کر دینے والا تھا۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتیں، بس اپنے کاموں میں لگی رہتیں۔ بی بی تو اسکول چلی جاتیں، عائشہ کالج، وہ سارا دن اپنے کھیت کی آبیاری میں لگی رہتیں۔ مصطفیٰ کے فائنل امتحان تھے، ورنہ اس سے ہی بات چیت کر لیتی، حیرت انگیز طور پر وہ اس کی تمام پریشانیوں کا منٹوں میں حل نکال دیا کرتا تھا۔ اگر بات مصطفیٰ کی ذات کے متعلق نہ ہوتی تو وہ ضرور اس کے امتحانات کے باوجود اسے سنا چکی ہوتی کہ وہ اماں کو سمجھائے، کیونکہ بی بی سے زیادہ اماں کا لاڈلا تھا۔

"ہیلو مس عائشہ! کن سوچوں میں گم ہیں؟" اسفر نے چٹکی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اپنے خیالوں سے چونک کر اس نے سامنے بیٹھے اسفر کو چونک کر دیکھا۔

"مس عائشہ! کیا آپ کہیں انگیج ہیں؟" اس سے ایک دو باتوں کے بعد جب اسفر کو لگا کہ وہ اب جانے کے لیے پر تول رہی ہے تو اس نے جلدی سے پوچھ لیا، جبکہ عائشہ نے "نہیں" کہتے ہوئے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"دراصل میں آپ مجھے پہلی نظر میں ہی بے حد اچھی لگی تھیں اور میں اپنے پیرنٹس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔" اسفر نے اپنے مخصوص بے خوف انداز میں کہا، جبکہ عائشہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور ادھر ادھر دیکھا، جیسے کسی اور نے تو یہ بات نہیں سن لی، وہ اپنی ذات اور کردار کے حوالے سے بہت محتاط تھی۔

"میں سوچ کر جواب دوں گی۔" کہہ کر اس نے اپنی چادر ٹھیک کی اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

اسفر کا انداز، اس کے برانڈڈ کپڑے، جوتے گاڑی سب چیخ چیخ کر اس کی امارت کو بیان کرتے تھے۔ مسز شیخ کے بیٹے کا کلاس فیلو تھا۔ دونوں یونی ورسٹی کے بعد آج کل فارغ تھے۔ ایک دن مسز شیخ نے اسفر سے پوچھا تھا کہ عدیل تو اعلا تعلیم کے لیے باہر جانا چاہ رہا ہے، اس کا کیا پروگرام ہے؟ تو اس نے لاپروائی سے کہا تھا، کچھ دن انجوائے کرنے کے بعد اپنے والد کا بزنس سنبھالے گا۔ تب تو وہ ان کی بات کا نوٹس لیے بغیر بچوں کی طرف متوجہ رہی تھی، جبکہ مسز شیخ باتیں کرتے ہوئے اسے اندر لے کر گئی تھیں۔

اب یہ بات اسے یاد آئی تو وہ چونک اٹھی۔ کیا اسی کا، اسی رشتے کا انتظار تھا جس کو سیڑھی بنا کر وہ اس ماحول سے نکلنا چاہتی تھی۔

"یہ سب کیوں سوچ رہی ہو تم، جب تم نے مصطفیٰ کے رشتے سے فوراً انکار کرتے ہوئے کہا کہ تمہاری ترجیحات میں ابھی شادی نہیں ہے۔ گویا تمہاری ترجیحات میں مصطفیٰ سے شادی شامل نہیں تھی۔ ایک امیر کبیر لڑکا دیکھ کر تمہاری ترجیحات بدل گئیں۔"

"ہاں تو زندگی کی ترجیحات کو اپنی سہولت کے مطابق سیٹ کرنا ہر انسان کا حق ہے، میں اگر ایسا سوچ رہی ہوں تو کوئی غلط نہیں کر رہی ہوں۔" ضمیر کی لتاڑ پر اس کے دماغ نے تاویل پیش کی۔

"اور مصطفیٰ جس کی آنکھیں تمہیں دیکھ کر چمک اٹھتی ہیں اور چہرہ کھل اٹھتا ہے؟"

"ہاں تو مصطفیٰ کی اچھائی اور محبت کے رنگوں سے بھلا کب ناواقف ہوں، لیکن زندگی صرف محبت کے سہارے نہیں گزرتی ہے۔ مصطفیٰ کو اس مقام تک پہنچنے میں دس سال لگیں گے یا اس سے بھی لمبا عرصہ، جہاں اب اسفر ہے تو زندگی کا اتنا لمبا سفر محرومیوں میں گزار دوں۔ گھر کی ٹپکتی چھتوں کی فکر کرتے ہوئے۔"

دماغ اور ضمیر کی اس جنگ میں وہ گم تھی، جب کنڈیکٹر کی تیز آواز نے اسے چونکایا۔

"او بی بی جی اترو، تمہارا اسٹاپ آگیا ہے۔" وہ

چونک کر تیزی سے چادر اور بیگ سنبھالتی نیچے اتر آئی۔

گھر آنے پر اس کی حیرت کی حد نہ رہی کہ مصطفیٰ اس سے پہلے ہی موجود تھا زندگی میں پہلی بار اس کے والہانہ گرم جوش سلام اور حال چال کا ویسا جواب نہ دے پائی جیسا کہ دیا کرتی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ پیپرز کیسے ہوئے؟"

"اے ون جناب!" وہ خوش دلی سے بولا تو عائشہ سے مسکرایا بھی نہ جاسکا۔

کچن سے اشتہا انگیز خوشبوئیں بتا رہی تھیں کہ دونوں خانہ داری میں ماہر خواتین اپنی قابلیت کے سارے جوہر آزما رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے کی جانب چلی آئی۔

مصطفیٰ تھکا ہوا آیا تھا' سو جلد ہی سو گیا تھا۔ وہ بھی کھانا کھا کر اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔ پر ذہن کسی ایک نقطے پر یکسو نہ پا رہا تھا۔ نو سے گیارہ کا ٹائم اس نے اپنے پڑھنے کے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔ کمی بیشی وہ صبح نماز کے بعد پوری کر لیتی تھی' پر دس بج جانے کے باوجود کچھ خاص نہ پڑھ سکی تو دماغ کو آزاد چھوڑ کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔

اگلے روز چونکہ چھٹی تھی' سو نماز پڑھ کر دوبارہ جو سوئی تو بارہ بجے کے قریب ہی اس کی آنکھ کھلی مکئی بھننے کی سوندھی خوشبو ناک سے ٹکرائی' باہر آنے پر پتا چلا کہ مصطفیٰ نے اماں کے کھیت سے کافی سارے مکئی کے بھٹے نکالے تھے' اب بی بی انہیں انگاروں پر بھون رہی تھیں۔ وہ وہیں کچن میں ہی چلی آئی۔

"آؤ عائشہ بہت دیر سوئیں۔" بی بی نے شفقت سے کہا ساتھ ہی چمٹے سے بھٹوں کو الٹ پلٹ کرنے لگیں۔ "تمہاری اماں اور مصطفیٰ تو گئے ہیں' زمین کو سدھارنے اور فالتو بوٹیاں نکالنے میں۔۔۔ تم بیٹھو' میں مصطفیٰ کو یہ دے آؤں۔۔۔ پھر تمہیں ناشتا بنا کر دیتی ہوں۔" بی بی نے خاموشی سے پیڑھی پر بیٹھی عائشہ کو مخاطب کیا اور خود گرم گرم بھٹے اٹھا کر چلتی بنیں۔

اس عمر میں بھی بی بی کی صحت قابل رشک ہے' جبکہ اماں کے ساتھ بیماریاں چمٹی ہوئی ہیں' اس نے سوچا اتنے میں بی بی واپس آئیں۔ جلدی سے دہکتے انگاروں پر دو سوکھی لکڑیاں رکھ کر ایک دو پھونکیں ماریں۔ لکڑیوں نے آگ پکڑلی تو انہوں نے توا رکھ دیا۔

"تجھے اس لیے نہیں دیا کہ خالی پیٹ درد ہی نہ کرے۔ تھوڑی دیر بعد تازہ بھون دوں گی اپنی بچی کو۔" بی بی اس کی خاموشی کو پتا نہیں کیا سمجھیں کہ پراٹھے کے لیے پیڑے کے بل بناتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"بی بی۔۔۔ ایک بات پوچھوں' سچ سچ جواب دیں گی۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں بھڑکتی آگ پر نظر جمائے پوچھا۔

"ہاں ہاں عائشہ پوچھو کیا بات ہے؟ کوئی پریشانی ہے کیا۔" بی بی۔۔۔ پراٹھے پر گھی لگا کر اسے چمٹے سے پلٹ کر بولیں۔

ان کی ساری توجہ پراٹھے کی طرف تھی' کٹوری میں دہی۔ پلیٹ میں سالن اس کے سامنے رکھا اور پراٹھا اتار کر چنگیر میں رکھ کر اس کے سامنے رکھا' خود توا اتار کر سیدھی ہو بیٹھیں۔

"ہاں اب بتا تو کیا کہہ رہی تھی۔ چائے رکھوں تیرے لیے ہم تو بہت دیر ہوئی پی چکے۔" بی بی نے ایک ساتھ دو سوال کیے تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ ایک دیہاتی طرز کا کھلا سا کچن تھا' جس میں درمیان میں مٹی کا بنا چولہا موجود تھا۔ شدید سردیوں میں تو سارا دن ہی چولہے میں بی بی یا اماں انگاروں کا اہتمام کیے رکھتیں' ارد گرد پلاسٹک کی دو چٹائیاں بچھا کر اہل خانہ حرارت کا مزا لیتے ہوئے آگ کے ارد گرد ہی موجود رہتے۔ صرف یہاں نہیں تقریباً" گھروں میں یہی طریقہ تھا' گیس ابھی یہاں نہیں پہنچی تھی۔ اہل علاقہ نے اپنی سہولت کے لیے گیس کے سلنڈر لے رکھے تھے' بوقت ضرورت استعمال کے لیے' ورنہ عام طور پر لکڑیاں ہی استعمال کی جاتیں۔ ایک طرف لکڑی کے ریک میں ضرورت کا سامان اور برتن وغیرہ رکھے تھے۔

بی بی نے بیٹھے بیٹھے ہی کیتلی میں ایک کپ دودھ میں پتی اور ایک چمچہ چینی ڈال کر انگاروں پر اس کی چائے بننے کے لیے رکھ دی۔ پتا تھا کہ عائشہ کو پانی ملی چائے پسند نہیں۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ نوالے توڑتی عائشہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئیں۔

"اماں کی اور میرے والد کی علیحدگی کیوں ہوئی؟ وہ کون تھے؟ کہاں ہیں؟ اماں اس بارے میں مجھے کچھ بتاتی کیوں نہیں؟" ادھ کھایا پراٹھا ایک طرف رکھ کر اس نے لجاجت سے بی بی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ کچھ دیر بغور اسے دیکھتی رہیں۔

"کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں عائشہ! جنہیں پوشیدہ ہی رکھا جائے تو اچھا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے جان لینے میں تکلیف تو ہوتی ہی ہے اور بھرم ٹوٹ جانے کا خدشہ الگ۔" انہوں نے مبہم سی بات کی۔

"مگر بی بی! نہ جاننے سے بھی تو اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے تو کیوں نہ جان کر ہی تکلیف اٹھالی جائے۔" دل و دماغ میں جو ابہام اور شکوک کی دیواریں ہیں وہ تو ٹوٹ جائیں گی نا۔" اس نے اصرار کیا تو بی بی کچھ دیر چپ رہیں، پھر بولیں۔

"میں تمہاری امی کی ہمسائی تھی، ہمارے گھرانے کے کافی اچھے تعلقات تھے، تمہاری نانی اللہ بخشے بہت نیک عورت تھی۔ تمہارے نانا اور نانی نے تمہاری ماں کو بڑے شوق سے پڑھایا لکھایا۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ تمہارے نانا کے گزر جانے کے بعد تمہاری نانی نے بڑی ہمت سے زندگی گزاری، میں تمہاری اماں سے چھ سات سال بڑی تھی، جب تمہاری ماں کی نوکری لگی تھی ان دنوں میں بیاہ کر شہر چلی گئی۔ تمہارے نانا اپنے رشتے کے کسی بھتیجے سے تمہاری ماں کا رشتہ جوڑ گئے تھے۔ ان دنوں تمہاری ماں جیسے اڑی پھرتی تھی، متوقع تھا کہ جلد ہی شادی کی تاریخ بھی طے ہو جائے گی، پھر جب شادی کے پیغام کے بجائے انکار کا سندیسہ آیا تو گیتی آرا ٹوٹ گئی، بجھ گئی۔" بی بی غیر مرئی نقطے کو تکتے ہوئے یادوں کے خزانے سے ایک ایک کر کے راز کے موتی عائشہ کے ہاتھ پکڑانے لگیں اور وہ دم بخود بیٹھی غور سے سنتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ خاور کے بدلتے رویے کے بارے میں سوچ کر حیرت میں مبتلا تھی کہ اپنی اولاد کے ہونے کی خوش خبری پر خاور جیسے بندے کا ردعمل کتنا عجیب تھا۔ خاور نے آج دیر سے شہر جانا تھا۔ گاؤں میں اسے کسی سے ملنا تھا، سو وہیں گیا ہوا تھا۔ خاور کا گھر گاؤں کی حدود میں تو تھا، پر آبادی سے ذرا ہٹ کر سو گیتی آرا کسی سے واقف نہ تھی۔ ویسے بھی اسے آئے ابھی کچھ ماہ ہی ہوئے تھے اور اپنی نئی زندگی کو سیٹ کرنے پھر اماں کی وفات ان سب نے اسے کبھی ارد گرد جاننے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔

اماں کی وفات کے بعد ان کی میت بھی وہ اپنے آبائی گھر لے گئے تھے جہاں کے محلے دار اس کے رشتے داروں جیسے تھے، ہر دکھ سکھ میں شریک ہونے والے اماں کو دفن بھی وہیں کیا گیا تھا۔ ابھی اسے گھر کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ گیتی آرا نے دروازہ کھولا تو تیکھے اور جارحانہ تیور لیے ایک خوب صورت سی لڑکی اور اس سے کچھ بڑا خاور کی عمر کا ایک مرد اندر داخل ہو گئے۔ وہ ارے ارے کرتی رہ گئی۔

"کون ہیں آپ اور اس طرح اندر کیسے آ گئے۔"

"کیا خیال ہے ادا ریاض! اس کو بتاؤں کہ میں کون ہوں یا خاور کو آنے دیں۔" گیتی آرا کو تمسخرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے جس انداز میں اس آدمی سے کہا، گیتی آرا کا دل دھک سے رہ گیا۔

کچھ انجانے خدشوں نے گیتی آرا کے دل کو سہما دیا۔ وہ چپ سی کھڑی رہ گئی۔

"ویسے تو نے کبھی سوچنا بھی گوارا نہیں کیا کہ تجھ سے آٹھ سال چھوٹے خوب صورت، کھرو جوان خاور کو کیا پڑی تھی، جو تجھ جیسی پکی عمر کی عورت کو

بیوی بنا کے لے آیا۔ الٹی سیدھی باتیں کر کے۔" اس لڑکی کا اب کی بار کا وار زیادہ کاری تھا جو گیتی آرا کی آنکھیں ایک دم نمکین پانیوں سے بھر گئیں' پھر بھی اس نے خود پر قابو پایا اس لڑکی سے مخاطب ہوئی۔

"تم لوگ جو کوئی بھی ہو۔ میرے گھر سے ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ۔" اس کی بھرائی آواز پر وہ لڑکی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی' جبکہ وہ آدمی جسے اس لڑکی ادا ریاض کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ دھوپ میں پڑی چارپائی پر بیٹھ کر ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"تیرا گھر.....؟" ہنستے ہنستے اس لڑکی کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ "او بی بی..... یہ میرا گھر ہے میرا..... میں خاورے کی بیوی ہوں۔ اس کی چچا زاد اور اس کی محبوبہ۔" یک دم ساتوں آسمان گیتی آرا کے سر پر گر پڑے۔ اس نے سہارے کے لیے کسی چیز کو تھامنا چاہا' پر کچھ نہ ملنے پر زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

"تیری ماں اور میری کس (ساس) دور پرے کی رشتے دار تھیں۔ میری خاورے کی شادی کو چار ورے (سال) گزر چکے ہیں۔ پچھلے دنوں فضل نگر کسی شادی میں خاورے کو تیری ماں مل گئی اور اپنے گھر لے گئی۔ بے روزگاری اور غربت سے تنگ خاورے کو جب تیری ماں نے اپنی جائیداد کی تفصیل بتائی' ساتھ ہی باتوں باتوں میں ذکر کر دیا کہ سب کچھ اس کی اک واک بٹی کا ہے اور وہ اس کے رشتے کے لیے بہت پریشان ہے تو خاورے کا تو ذہن منصوبے بنانے کا بہت ماہر ہے' اس نے تم ماں بٹی کو شیشے میں اتارا اور تم لوگوں سے شادی کی بات کر کے آگیا۔ پھر اس نے مجھے سب بتایا' پہلے مجھے اعتراض ہوا پھر اس نے مجھے کہا کہ وہ جلد ہی تجھے چھوڑ دے گا۔

میں کچھ دنوں کے لیے اپنے بھا ریاض کے گھر چلی گئی تھی۔ اب تیرا سب کچھ خاورے کا ہے۔ اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ سب کچھ مل جانے کے بعد وہ تجھے چھوڑ دے گا' پر اب وہ تجھے چھوڑنے میں بہانے بنا رہا ہے' کل اس نے مجھے بتایا کہ تو اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس سے زیادہ برداشت کا حوصلہ میرے اندر نئیں ہے۔ خاورے کے بچے کی ماں صرف میں بنوں گی۔ تجھے خاور اب نئیں چھوڑنا چاہتا' تو اس کی خاطر تجھے اس گھر میں بھی برداشت کر لوں گی' پر اس بچے کا سلسلہ تجھے ختم ہوگا' نئیں تو اپنا بوریا بستر اٹھا اور نکل یہاں سے۔" اس سفاک لڑکی نے پانچ منٹ میں ایسا زہر گیتی آرا کی سماعتوں میں انڈیلا' جو اس کی نس نس میں زہر بھر گیا۔

اسی پل دروازہ کھول کر خاور اندر داخل ہوا' پر سامنے کی صورت حال دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ چارپائی پر بیٹھا اس کا سالا ریاض۔ زمین پر فرعونیت کے سے تاثرات لیے اس کی سرچڑھی بیوی اور اس کے سامنے زمین پر لٹے پٹے انداز میں بیٹھی گیتی آرا.....

"کیا بات ہے گیتی؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ اور..... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اس نے گیتی آرا کے پاس پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے پوچھا' ساتھ ہی خشمگیں نگاہوں سے گھور کر تن کر کھڑی نازو سے سوال کیا۔

"خاور..... کیا یہ عورت سچ کہہ رہی ہے؟" لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی زبان سے ادا ہوئے۔

"میں نے تجھے منع کیا تھا نا کہ تو ابھی یہاں مت آنا۔ کچھ مت کہنا۔" غصے میں مڑ کر اس نے نازو سے کہا تو گیتی آرا جس کے دل میں ابھی بھی یقین کا اک سرا گڑا تھا۔ نکل کر دور جا پڑا۔ اس نے سخت اذیت کے احساس سے آنکھیں میچ لیں۔

"اٹھو گیتی' میں تمہیں ساری بات بتاتا ہوں۔" اس کا ہاتھ پکڑ کر خاور نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

"میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتی' اب صرف ایک بات بتا دو کہ یہ عورت سچ کہہ رہی ہے۔ یہ تمہاری بیوی ہے اور تم نے مجھ سے شادی میری محبت میں نہیں بلکہ میری جائیداد کی وجہ سے کی۔" اس نے اپنی آنکھیں پونچھ کر دوٹوک انداز میں خاور سے پوچھا تو وہ نظر چرا گیا۔ گیتی آرا کھڑی ہو گئی۔

"یہ سچ ہے گیتی' پر یقین کرو میں تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

اس نے تیزی سے کہا۔ "تم نے میرا سودا کیا تھا خاور' پر میں نے تم سے محبت کی تھی اور اسی کے صدقے اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا۔ میرے

پیچھے آنے کی کوشش مت کرنا' میرا اب تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور جیسے کھڑی تھی' ویسے ہی کسی روبوٹ کی طرح چلتی بیرونی دروازے کی طرف چل پڑی۔

"گیتی.... گیتی آرا رکو۔" اپنے پیچھے اس نے خاور کی آواز سنی۔

"بس کردے خاورے' بہت برداشت کرلیا میں نے' تیرا اس عورت کی منت ترلے کرنا۔ کہاں جانا ہے اس نے.... کون ہے اس کا.... جانے دے' خود ہی دھکے کھا کھو کے مڑ آئے گی۔" خاور کی بیوی نازو نے خاور کا بازو پکڑ کر اسے اس کے پیچھے جانے سے روکا۔

تو وہ کمزور مرد کھڑا اس کو دروازے کی چوکھٹ پار کرتے دیکھتا رہا۔ گیتی کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ آگئی۔ دل میں اک موہوم سی خواہش تھی کہ وہ بازو سے پکڑ کر اسے زبردستی روک لے گا۔ اندر لے آئے گا۔ معافی مانگے گا' پر اس کی ساری خواہشیں ہوا ہوگئیں۔ گاؤں کی حدود سے باہر نکلتے اسے اپنے ننگے سر کا احساس ہوا تو اس نے دوپٹا کھینچ کر پھیلایا اور ہلکا سا نقاب کرکے ذیلی سڑک تک آگئی' یہاں سے ایک بیل گاڑی پر چڑھ کر پکی سڑک پر آئی اور وین میں بیٹھ کر اسے فصل نگر کا پتا بتایا۔ کرایہ مانگنے پر گیتی آرا نے پہلے خالی نظروں سے کنڈیکٹر کو دیکھا' پھر اپنی انگوٹھی اتار کر اسے دی۔ اس نے حیرت سے سامنے بیٹھی واحد سواری جو ___ عورت تھی کو دیکھا اور پھر اسے وہ واپس کردی۔

"کوئی بات نہیں باجی۔ آپ یہ انگوٹھی رکھ لو۔" مجبور سمجھ کر اس نے وہ انگوٹھی گیتی آرا کے حوالے کردی۔

میں اس وقت بیوہ ہو کر ایک بیٹے کے ساتھ اپنے اماں ابے کے گھر تھی۔ اماں گزر گئی تھی' پر ابا زندہ تھے' جب وہ لٹی پٹی سی گیتی آرا اپنے گھر واپس آئی' دیوار سے دیوار ملی تھی ہماری۔ ابے نے اسے اپنے گھر کے دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا تو سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ یہاں آکر تیری ماں بے ہوش ہوگئی تھی۔ دو دن تو اسے ہوش ہی نہیں آیا۔ بی بی کی گلوگیر آوازاس کی سماعتوں میں جیسے کوئی گرم گرم سیسہ انڈیل رہی تھی۔ پھر ابا بھی گزر گیا تو تو پیدا ہوئی۔ تیری ماں میرے ساتھ پھر اپنے اسکول گئی' پر سرکاری نوکری ایسے کیسے دوبارہ مل سکتی ہے۔ چھوٹی بچی کا ساتھ تھا۔ میڈم جی ہمدرد اور خدا ترس عورت تھی مجھے کینٹین کا ٹھیکا دے دیا۔ درمیان کی دیوار گرا کر ہم دونوں نے تیرے گھر کو اپنی سہولت کے لیے ایک چھوٹے سے کھیت کی صورت دے دی۔ گیتی آرا نے بھاگ دوڑ کر کے اپنی پینشن جاری کروائی۔ ریٹائرمنٹ سے ملنے والا پیسہ تو وہ تیرے باپ کے حوالے کر ہی چکی تھی۔ پھر چھ ماہ بعد اسے طلاق کے پکے کاغذ بھی مل گئے اسی پتے پر تو یہ قصہ بھی تمام ہوا۔

وہ دن اور آج کا دن گیتی آرا کے لیے خاور نام کا وہ باب' ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ اب اس کی کل کائنات تم ہو۔"

بی بی کی بات ختم ہوتے ہی عائشہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کا کلیجہ اپنی ماں کے دکھ پر پھٹ رہا تھا۔

"اب مجھے پتا چلا کہ ہر بار ابا کے بارے میں پوچھنے پر اماں کی حالت غیر کیوں ہوجاتی تھی۔"

☼ ☼ ☼

اسفر کی دنوں میں ہی حالت بدل گئی تھی' وہ جلد از جلد عائشہ کا جواب جاننے کو بے چین تھا' جو دو دن سے چھٹیوں پر تھی۔ عدیل کو اس کے بارے میں سب کچھ پتا تھا' سو اس کی مدد کے خیال سے اس نے اپنی ماما مسز شیخ کے سیل فون سے عائشہ کا نمبر اسے لاکر دیا تھا' وہ بھی اس شرط پر کہ نہ تو مسز شیخ کو اس بات کا پتا چلے' نہ ہی عائشہ کو۔ اسفر نے فوراً وعدہ کرلیا اور پہلی فرصت میں ہی فون بھی کردیا۔

"آپ کو احساس ہے کہ انتظار کا احساس کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ شاید نہیں ہے' ورنہ آپ مجھے انتظار کی سولی پر لٹکا کر غائب نہ ہوتیں۔" اس کے لہجے میں ہزار شکوے تھے۔

"اسفر؟" عائشہ کو خوش گوار سی حیرت ہوئی۔
"آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"دیکھ لیجیے جناب! ڈھونڈنے کی چاہ رکھتا ہو تو انسان دنیا بھی کھنگال ڈالتا ہے' آپ تو پھر تھوڑا ہی دور تھیں۔" اس نے کہا تو وہ چپ رہ گئی۔

"اصل میں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی' تو اس لیے دو دن نہ تو کالج جاسکی ہوں' نہ ہی مسز شیخ کے ہاں۔" اس نے آہستگی سے بتایا تو وہ پریشان ہوگیا۔

"کیا ہوا' خیر تو ہے نا اور ہاں کل آسکیں گی؟" بے قراری سے پوچھے گئے دونوں سوال نہ جانے کیوں عائشہ کو ایک سرشاری میں مبتلا کرگئے۔

"صرف اتنا بتادیں عائشہ کہ میں اپنے پیرنٹس کو کب بھیجوں؟ یقین کریں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ایسا کون سا جادو کردیا ہے آپ نے مجھ پر کہ نہ تو کسی کام اور بزنس میں دل لگتا ہے' نہ گھر پر۔ میں جلد از جلد آپ کو اپنی لائف میں اپنے بہت قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں جو چاہت اور شدت تھی' اس نے عائشہ کو جیسے مغرور سا کرڈالا۔

اسفر نے اپنے ماں' باپ کے بارے میں بتایا کہ وہ ان کو اس کے بارے میں بتاچکا ہے اور وہ اس کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں جس نے ان کے بیٹے کو اس قدر بدل ڈالا ہے' وہ ہنستے ہوئے بتارہا تھا اور عائشہ نے اسے یہ ہی بتایا کہ..... "اس کے والد حیات نہیں ہیں' صرف والدہ' ایک خالہ اور ایک کزن ہے۔ والد کے بارے میں بتاتے ہوئے پتھروں کی سی سختی اس کے لہجے میں در آئی تھی۔

"میں گھر میں بات کرکے پھر آپ کو انفارم کردوں گی' آپ کب اپنے پیرنٹس کو لے کر آئیں۔" اس نے آہستہ سے کہا تو اسفر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

"اور..... اور تم کب آؤ گی۔ میرا تم سے ملنے کو' تمہیں دیکھنے کو بہت دل کررہا ہے۔" اس کے اس طرح کہنے پر عائشہ کی بولتی بند ہوگئی۔

"میں نے فی الحال دو ماہ کے لیے مسز شیخ سے معذرت کرلی ہے' یہ عرصہ میں اپنی اسٹڈیز کو دینا چاہتی ہوں۔ ہاں کالج آؤں گی پر ملنا..... اسفر میں اس طرح کے ملنے کو پسند نہیں کرتی۔" کچھ ہچکچا کر اس نے کہا تو کچھ لمحے کو اسفر چپ ہوگیا۔

"اچھا..... فون پر بات تو ہوسکتی ہے نا....." وہ بے تابی سے بولا تو عائشہ جو فوراً" اسے منع کردینا چاہتی تھی' نجانے کیوں نہ کرسکی۔

"ٹھیک ہے' مگر کبھی کبھار....."

"اُفوہ یار! کیسی لڑکی ہو تم عائشہ..... فون پر میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گا۔" اسفر جو نہ سننے کا کبھی عادی نہیں تھا' بگڑ گیا۔

"میں بہت چھوٹی عمر سے ہی باہر کی دنیا میں نکل کر سروائیو کررہی ہوں اسفر..... یہ میری ماں کی تربیت اور ان کا دیا گیا اعتماد ہے اور ایسا کوئی بھی کام جو ان کے اعتبار کو ٹھیس پہنچائے' مجھے کرنا اچھا نہیں لگتا۔" اب کے اس نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بھی اس کا دوٹوک انداز سن کر کچھ نرم پڑگیا۔

"میں بھی سوچ رہا تھا کہ عائشہ کو ضرور کوئی دوست مل گئی ہے جو اس نے مجھ سے کچھ شیئر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔" مصطفیٰ پتا نہیں کب سے اسے سامنے سے دیکھ رہا تھا' جو فون بند کرتے ہی چھوٹی سی باڑھ پھلانگ کر اس کے پاس چلا آیا۔

"کیا شیئر نہیں کیا تم سے میں نے....." اس نے چونک کر پوچھا۔ ذہن میں یہ خیال فوراً" آیا کہ اماں نے اس کے خیالات تو مصطفیٰ تک نہیں پہنچادیے' پر اس کا جواب اسے مطمئن کرگیا۔

"آج کل چھٹی پر ہونے کے باوجود نہ کسی گیم میں حصہ لے رہی ہو' نہ باہر لے جانے کی ضد' چپ چپ سی عائشہ تو وہ عائشہ لگتی ہی نہیں نا۔" "ہر وقت تو بندہ ایک ہی موڈ میں نہیں رہ سکتا نا۔" اس کے فلسفیانہ انداز پر وہ دھم سے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"پھر فلسفہ..... اس کا مطلب ہے کوئی الجھن سوار ہے محترمہ کے دماغ پر..... بول چکیں' بندہ حاضر ہے آپ کی ٹینشن دور کرنے کو....." وہ واقعی اس کا مزاج

شناس تھا۔

"مصطفیٰ دھری زندگی کے سب سے بڑے اور اہم معاملے میں کبھی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہو تو تم میرا کتنا ساتھ دے پاؤ گے؟"

"ایں.... کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ تم کیا کہہ رہی ہو اور اصل میں کہنا کیا چاہتی ہو' لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا عائشہ! کسی ایک معاملے میں تو کیا زندگی کے ہر معاملے میں' میں تمہارے ساتھ کسی اور کے تو کیا اپنے خلاف بھی جا سکتا ہوں۔ اب اگر تسلی ہو گئی ہو تو پوری بات بھی بتا دو کہ کیوں پریشان ہو؟" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے بغور اس کو دیکھا تو عائشہ نے تشکر بھری نظروں سے اس کو دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"بتاؤں گی مصطفیٰ.... صرف تمہیں ہی بتاؤں گی.... کیا خیال ہے' ایک کیم کیرم کی نہ ہو جائے۔" اس نے کہا تو مصطفیٰ بھی اس کا گریز محسوس کر کے صرف مسکرا کر اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔

"چلو...." اور دونوں نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

اگلے روز مصطفیٰ پھر شہر چلا گیا کہ اس نے ہاسٹل چھوڑنے سے پہلے کچھ معاملات نمٹائے تھے۔ یونی ورسٹی میں ایک دو کام کرنے والے رہ گئے وہ نپٹانے تھے ایک آدھ ہفتہ لگ ہی جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس روز بی بی محلے میں کسی کے گھر درس میں گئی تھیں۔ عائشہ کالج کے بعد سیدھی گھر آ جاتی تھی۔ اب بھی وہ تھوڑی دیر پڑھنے کے بعد اٹھی اور بی بی کی عدم موجودگی محسوس کرتے ہی اماں اور بی بی کے مشترکہ کمرے میں آ گئی۔ پلنگ سے ٹیک لگائے اماں آنکھیں موندے بیٹھی تھیں۔ ہاتھ میں تسبیح تھی اور لب مسلسل ہل رہے تھے۔ وہ بغیر کوئی چاپ پیدا کیے دھیرے سے آ کر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

گیتی آرا نے آنکھیں کھول کر ذرا کی ذرا اسے دیکھا اور دوبارہ سے آنکھیں موند لیں۔ عائشہ کا اعتماد دم توڑنے لگا۔ لیکن اسفر کا مسلسل اصرار اسے پھر سے بات کرنے کی ہمت دلا گیا۔

"اماں ایک بات کرنی تھی آپ سے...." دل کڑا کر کے اس نے کہا۔

"ہوں.... کہو' میں سن رہی ہوں۔" انہوں نے انداز میں تبدیلی لائے بغیر جواب دیا۔

"مسز شیخ کے جاننے والے لوگ ہیں۔ کافی ویل آف ہیں۔ ان کا بیٹا مسز شیخ کے بیٹے کا دوست ہے' ایم بی اے کیا ہوا ہے' آج کل اپنے والد کا بزنس سنبھالتا ہے' تو وہ رشتے کے لیے آنا چاہ رہے ہیں۔" اس نے اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بات مکمل کی اور ایک گہری سانس لی۔ بہرحال پہلا مرحلہ اماں سے بات کرنے کا تو اس نے سر کر ہی لیا تھا۔

"میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ تربیت اچھی ہو تو خون کا اثر بے اثر ہو جاتا ہے' پر میری سوچ غلط تھی۔ میری تربیت ہار گئی' تم بھی اپنے باپ کی طرح نکلیں۔ محبت پر دولت کو ترجیح دینے والی۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا عائشہ! ہر انسان کو اس کے نصیب کا لکھا ہر صورت اور حالت میں ملنا ہے' تمہاری قسمت میں جو کچھ ہے مصطفیٰ کے ساتھ بھی تمہیں مل ہی جاتا۔ نہیں ہے تو اس ویل آف فیملی سے بھی نہیں ملے گا۔ انہیں بلا لو' جب چاہو میری دعاؤں میں تو شاید اثر ہی نہیں رہا' دعا کرنا کہ تمہارا نصیب بھی اپنی ماں جیسا نہ ہو۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھی تھیں اور اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا تھا۔

"اب جاؤ اور جاتے ہوئے دروازہ بند کرتی جانا۔" انہوں نے مزید کہا اور اپنی پہلی والی حالت میں چلی گئیں۔

نہ جانے کیوں عائشہ کو اماں کے اتنی جلدی مان لینے کی اتنی خوشی نہیں ہو رہی تھی' جتنی ہونی چاہیے تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور ایک نظر ان پر ڈالتی دروازہ بند کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسی وقت اس نے اسفر کو میسج کر دیا تھا کہ وہ جب چاہے اپنے والدین کو لے کر آ سکتا ہے' لیکن آنے سے پہلے اطلاع ضرور کر دے۔

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ نے کل ہی عائشہ کے گھر جانا ہے' ہر صورت اور ہاں کروا کے آنی ہے۔" وہ ماں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر لجاجت سے بولا' جبکہ پاپا سامنے بیٹھے غصے سے اسے گھور رہے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے پتا نہیں کیا کیا سوچ رکھا تھا اور وہ تھا کہ ہمیشہ کی طرح من مانی پہ اڑا ہوا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے' ہم لوگ رشتہ لے جانے کو تیار ہیں' لیکن اگر لڑکی ہمیں پسند نہ آئی تو پھر تمہیں ہماری ماننی پڑے گی۔" پاپا نے کہا تو وہ ان کی جانب مڑا۔

"جب ذہن میں یہ ہی سوچ لے کر جائیں گے کہ نہیں پسند کرنی تو کوئی کیسے پسند آسکتا ہے۔ پھر جب زندگی میری ہے تو پسند بھی تو میری ہونی چاہیے' آپ کو کیا اعتراض ہے۔" وہ بدتمیزی سے بولا' تو پاپا ایک جتاتی نظر بیوی پر ڈال کر رہ گئے۔

"اچھا... اچھا ٹھیک ہے' کل ہمیں لے چلو تم..." مما نے حتمی انداز میں کہا تو اس نے گریٹ مما کہا اور ان کے گلے لگ گیا۔

"ٹھیک ہے' اس نے ماننا تو ویسے نہیں ہے' تم کل جا کر لڑکی دیکھ آؤ' پھر آگے دیکھتے ہیں کیا کریں؟" پاپا نے مما سے کہا۔

"آپ نہیں چلیں گے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں... ابھی کوئی باضابطہ رشتہ تھوڑی طے کرنے جا رہے ہیں جو سب ہی اٹھ کر چل پڑیں۔ تم کل ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ' پھر دیکھیں گے۔" پاپا نے حتمی انداز میں بات ختم کی اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اسفر نے بہت کہا کہ وہ ساتھ چلے گا' لیکن مما نے سمجھایا کہ پہلی بار شاید ان لوگوں کو لڑکے کا ساتھ آنا مناسب نہ لگے' لیکن میں پوری کوشش کروں گی کہ ان لوگوں سے ہاں کروا کے آؤں۔ انہوں نے تسلی دی تو وہ رک گیا۔

بی بی' گیتی آرا کے کہنے پر اسکول سے جلدی واپس آگئی تھیں۔ تاہم ان کا چہرہ بے حد اترا ہوا تھا۔ عائشہ کو بہت بچپن سے ہی وہ اپنے مصطفیٰ کی دلہن کے روپ میں دیکھ کر خوش ہوتیں۔ دوسرے وہ اپنے بیٹے کے دل کی خوشی سے بھی واقف تھیں' پتا نہیں کیوں' صرف عائشہ ہی انجان رہ گئی تھی یا جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔ بہرحال انہوں نے عائشہ سے اس بابت کچھ نہیں کہا تھا۔

عائشہ جیسی پُراعتماد لڑکی بھی بہت گھبرا رہی تھی' اس نے گھر کی صفائی تو کرلی تھی' تاہم کچن میں وہ دونوں ہی لگی رہی تھیں' عائشہ پتا نہیں کیوں آج دونوں سے آنکھیں نہ ملا پا رہی تھی۔ سوا اپنے کمرے تک ہی محدود رہی۔ کچھ دیر بعد ہلچل پر اس نے دروازے کی اوٹ سے جھانکا تو سامنے بیرونی دروازے سے ہی بی بی کے ہمراہ ایک بہت خوب صورت اور سوبر سی خاتون اندر آتی دکھائی دیں' وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے ڈرائیور کو بھیج کر گھر کی محلے سے تصدیق۔ کی اور خود گاڑی سے اتر آئیں۔ ویسا ہی گھر تھا جیسا عام طور پر دیہاتوں میں ہوتے ہیں۔ ڈیوڑھی پار کرتے ہی کھلا سا آنگن' دائیں طرف پر چھوٹا سا سرسبز قطعہ' کچھ پیڑ پودے اس کے ساتھ ہی ایک پکا کمرہ۔ سامنے کی طرف سے دو پکے کمرے' بائیں طرف لگا ہینڈ پمپ۔ اس سے ذرا آگے ہی دھوئیں سے سیاہ ہوتا ایک باورچی خانہ تھا۔

ایک سادہ اور چہرے مہرے سے دیہاتی نظر آنے والی عورت نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور انہیں لے کر اس کمرے کی جانب بڑھیں۔ کمرے میں قالین بچھا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ اور پلنگ کے علاوہ ایک کتابوں سے بھرا ہوا ریک دکھائی دیا۔ صوفے کے سامنے جو میز پڑی تھی اس پر سجے گل دان میں تازہ گلابوں کا گلدستہ موجود تھا' تنقیدی نظر سے جائزہ لینے کے بعد جو پہلی سوچ ان کے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ اس گھر کی دیہاتی پس منظر رکھنے والی لڑکی سے آخر اسفر کہاں ملا ہو گا۔

دفعتاً" کمرے میں جو ہستی داخل ہوئی اسے دیکھ کر

ان کے سامنے زمین آسمان گھوم گئے' یہ ہی حال سامنے کھڑی ہستی کا تھا۔ وہ کھڑی ہو گئیں۔

"عائشہ تم دونوں میں سے کس کی بیٹی ہے؟" تیز لہجے میں کیا گیا سوال گیتی آرا کو تو فوراً" سمجھ میں آ گیا کہ کیوں کیا گیا ہے۔ پر بی بی فوراً" بول اٹھیں۔

"کیوں' ہماری بچی ہے آپ بیٹھیں تو سہی۔" انہوں نے بوکھلا کر جواب دیا تو گیتی آرا وقتی صدمے سے نکل کر دو قدم آگے بڑھ آئیں۔

"اس لیے بی بی کہ محترمہ! ایک بھائی کا اس کی بہن کے لیے رشتہ لے کر آئی ہیں۔" انہوں نے طنزیہ انداز میں کہا تو بی بی حق دق رہ گئیں۔ جبکہ باہر کھڑی عائشہ سن رہ گئی۔

"آج وقت نے تمہارے سامنے لا کھڑا کیا ہے' تو سن لو گیتی بیگم! اسفر میرے بھائی ریاض کا بیٹا ہے' جسے ہم نے گود لے لیا تھا اور تمہاری اس اولاد کے لیے تو میں نے اپنے گھر میں تمہارا وجود گوارا نہیں کیا' اب کیسے عمر بھر کے لیے اس کو اپنے سر پر مسلط کر لوں۔ اپنے ادائیں دکھانے والے گر بیٹی کو بھی سکھا دیے نا' گیتی تم نے جو میرا بیٹا تمہاری بیٹی کا نام لیتے نہیں تھکتا۔ پوچھنا ضرور کہ کہاں اس سے اپنی ملاقاتیں کیں کہ ماں باپ کے منہ کو ہی آ گیا میرا فرماں بردار بیٹا۔ کہتا ہے جب لڑکی والے' لڑکی خود راضی ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے۔" وہ چبا چبا کر بول رہی تھیں۔

اس عورت کی زبان اور انداز میں آج بھی اتنا ہی زہر تھا جتنا اٹھارہ سال پہلے' بس لب و لہجہ اور لباس بدل گیا تھا' کل ایک دیہاتی' ان پڑھ نے اس کی روح کو کچلا تھا۔ آج ایک شہری فیشن ایبل' امیر عورت نے ان کی تربیت پر انگلی اٹھا کر انہیں بے بس کر دیا تھا۔

باہر کھڑی عائشہ کو لگا کہ گرم انگارے کسی نے اس کی سماعتوں سے گزار کر دل پر گرا دیے ہوں۔ "زبان کو لگام دیں اپنی اور فوراً" سے پیشتر چلی جائیں آپ یہاں سے....." اذیت کے صحرا کو پار کرنے کے بعد وہ فوراً" اندر آئی اور تمسخرانہ نظروں سے اپنی ساکت کھڑی ماں کو دیکھتی اس عورت کو مخاطب کیا۔

"آپ کی یہاں موجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ سوالی بن کر آپ یہاں آئی تھیں' ہم نہیں اور مجھے آپ کے بیٹے سے شادی نہیں کرنی۔ آپ جیسی عورت کے گھر کا حصہ بننے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔"

اس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اونچی آواز میں اس عورت کو مخاطب کیا جو ہونہہ' کہہ کر چلتی بنی۔ عائشہ کے ہاتھ سے ماں کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ کھڑے قد سے نیچے آ گری تھیں۔ عائشہ اور بی بی فوراً" ان کی طرف بھاگیں۔

☼ ☼ ☼

"واٹ....." اسفر تو ان سے ساری صورت حال سن کر ششدر ہی رہ گیا۔ "آپ لوگ اتنے گھٹیا بھی ہو سکتے ہیں' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کل آپ دونوں نے مظلوم عورت پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے اور آج جب قسمت نے کفارے کا ایک موقع دے ہی دیا تو بجائے اس کا حق اسے دینے کے آپ اس لڑکی کو دھتکار کر آ گئیں۔ مما اور پاپا کل جو ظلم آپ نے چپ رہ کر کیا' آج اس کا پورا نہیں تو کچھ تو ازالہ کر ہی سکتے ہیں۔" اس نے کسی بت کی طرح چپ بیٹھے پاپا کو کہا تو وہ ایک زخمی نظر ___ نازو کی طرف ڈال کر گہری سانس بھر کر رہ گئے۔

"ہرگز نہیں' میں اس عورت کی بیٹی کو کبھی بہو نہیں بناؤں گی۔" نازو جو آج نازیہ بیگم تھی' آج بھی خاور پر حاوی تھی۔ سر کو نفی میں ہلایا۔ "تو پھر آپ کو اپنے بیٹے سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا تو خاور تڑپ اٹھے۔

"اب تو میں اسے طلاق دے چکا ہوں نازو۔ اب تمہیں کس بات کا ڈر ہے۔ انصاف سے سوچو تو مجھے تو اپنی بے اولادی کا سبب بھی گیتی کے ساتھ کیا گیا ظلم ہی لگتا ہے۔ وہ تین دکانیں' گیتی کی ریٹائرمنٹ سے ملنے والا پیسہ' اس کا زیور' یہ سب ہی تو تھا جس کو آگے بڑھا کر آج ہم ایک پلازہ کے مالک ہیں۔ اسفر ٹھیک کہہ رہا ہے کہ قدرت ہمیں تلافی کا ایک موقع دے رہی

ہے۔" وہ شکستہ سے بولے تو نازیہ بیگم بھڑک اٹھیں۔
"آپ نے ایسا سوچا بھی تو میرا مرا منہ دیکھیں گے۔" کہہ کر اٹھ کر اندر چلی گئیں' خاور کو تنہا پچھتاوے اور احساس جرم کے سمندر میں دھکیل کر۔

☆ ☆ ☆

ایک موت کی سی خاموشی تھی' جس نے ان سب کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ گیتی آرا ہوش میں آنے کے بعد کسی مورتی کی مانند ساکت اور چپ تھیں۔ عائشہ کا رو رو کر اور معافیاں مانگ کر برا حال تھا۔
"مجھے معاف کردیں اماں' ہر بار نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کے لیے مصیبت اور دکھ کا سبب بن جاتی ہوں میں۔"
"جاؤ عائشہ! مجھے تنگ مت کرو۔" کسی روبوٹ کے سے انداز میں ان کے منہ سے نکلا تو بی بی نے اشارے سے اسے جانے کو کہا۔ ہچکیاں لیتی شکستگی کے احساس کے ساتھ وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔
آج اس بات کو چوتھا روز تھا' گیتی آرا کی طبیعت کچھ بہتر تھی' بی بی انہیں باہر دھوپ میں لے آئیں۔ دسمبر کی نرم اور گرم دھوپ بھلی لگ رہی تھی۔ عائشہ وہیں چارپائی پر آنکھوں پر بازو رکھے سو رہی تھی یا ویسے ہی لیٹی تھی۔
"دیکھو تو گیتی! تمہارے پیڑ اور پودے تمہارے بغیر اداس ہی ہوگئے تھے۔ میرا لمس انہیں اجنبی لگتا' ہر پودا ایسے لگتا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو ہماری مالکن کو بلاؤ۔" بی بی نے انہیں تخت پر بٹھایا اور گیتی آرا سے کہا تو پھیکی سی مسکراہٹ لبوں تک لے ہی آئیں۔
دفعتاً" دروازہ کھلنے پر جو عورت اندر آئی اسے دیکھ کر گیتی آرا نے بی بی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا' ان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ کوئی نیا الزام' کوئی اور دکھ.... ان کے ذہن میں ابھرا۔ عائشہ بھی آہٹ پر اٹھ بیٹھی۔ نووارد کو دیکھ کر وہ تیزی سے کھڑی ہوگئی۔
"جی فرمائیے.... اب کیا لینے آئی ہیں آپ' کوئی الزام رہ گیا تھا کیا؟" وہ ہاتھ سینے پر باندھ کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی' تو وہ اس کو ہٹاتے ہوئے اماں کے پاس آگئیں۔
"گیتی.... گیتی آرا.... میری بہن! میرا بیٹا مر رہا ہے۔ اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے.... عائشہ.... عائشہ کو میری بیٹی بنادو۔ وہ مرجائے گا۔ میں اپنے سارے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں۔ تمہارا دل دکھانے کی معافی مانگتی ہوں.... وہ.... وہ مرجائے گا۔" وہ سنگ دل عورت اس وقت نہ تو نازو تھی' نہ نازیہ بیگم اور نہ خاور کی بیگم.... وہ صرف اسفر کی ماں تھی۔
"تو مرجائے ہماری بلا سے.... آپ اور آپ کا بیٹا سونے کے بن کے آجائیں تب بھی ہماری طرف سے انکار ہے۔ ہمارا آپ کا کوئی لینا دینا نہیں۔ یہاں سے چلی جائیے اور برائے مہربانی آئندہ یہاں تشریف مت لائیے گا۔" وہ لہجے میں کاٹ لیے بولی اور انگلی سے انہیں دروازے کا رخ دکھادیا۔
نازیہ بیگم نے ملتجی نظروں سے بی بی کی طرف دیکھا' انہوں نے اپنی نظروں کا رخ دوسری طرف کرلیا' جبکہ گیتی آرا کے لب کچھ کہنے کی کوشش میں پھڑپھڑا کر رہ گئے۔
"آپ جاتی ہیں یا میں آپ کو دھکے دے کر نکالوں۔" عائشہ نے اپنا پورا زور لگا کر کہا کہ اس کی سانس پھول گئی۔ واپس جاتے ہوئے انکار کی دھول اس عورت کے ہر قدم سے لپٹتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

مسٹر خاور اینڈ مسز خاور۔
آپ لوگ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں آپ کو ایسے کیوں مخاطب کر رہا ہوں' وہ اس لیے کہ ماں اور باپ وہ ایسے مقدس لفظ ہیں جن کے قابل آپ کو جب تخلیق کرنے والے نے نہیں سمجھا تو میں تو پھر اس کا حقیر سا بندہ ہوں۔ مالک کی مصلحتیں بھی دیر سے سمجھ میں آتی ہیں۔ میری بھی بہت دیر سے میں آیا کہ آپ کو بے اولاد کیوں رکھا گیا۔
عائشہ میرا زندگی میں دیکھا جانے والا پہلا خواب

تھی، جسے آپ میاں بیوی کے اعمالوں کے سبب مجھے اپنی آنکھوں سے نوچنا پڑا۔ آپ جیسے لوگوں کے ساتھ رہتے مجھے ڈر ہے کہ عذاب الٰہی کے اس قہر کی زد میں میں بھی نہ آجاؤں، جو جلد ہی آپ پر ٹوٹنے والا ہے، میں اپنے حقیقی ماں، باپ کے پاس سعودیہ عرب جارہا ہوں، کبھی واپس نہ لوٹنے کے لیے۔

اسفر

خط ان کے ہاتھ میں پھڑپھڑا رہا تھا اور وہ سفید چہرہ لیے دل پر ہاتھ رکھ کر نیچے گرتے چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

"ویسے یار! مجھے یقین نہیں آرہا کہ سچے دل سے مانگی جانے والی دعائیں اتنی جلدی مستجاب ہوتی ہیں۔" عائشہ کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے بعد وہ ایک جذب سے بولا۔

"یوں لگتا ہے کہ ایک حسین خواب دیکھ رہا ہوں جو جلد ہی ٹوٹ جائے گا۔ کوئی یقین بھی دلائے حقیقت کا تو کیسے دلائے۔" اس کی پلکوں کو انگلی سے چھو کر مصطفیٰ نے کہا تو عائشہ نے شرارت سے اسی انگلی کو پکڑ کر دانتوں سے کاٹ ڈالا۔

"اب آیا یقین۔۔۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ جبکہ مصطفیٰ سی کر کے برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔

"کیا ہے یار بیوی! ابھی تو رومانس کا موڈ دیر تک رہنے دیا کرو۔" آج ان کی شادی کو آٹھواں روز تھا۔

بی بی نے مصطفیٰ کو فوراً بلوا کر ہی شادی کی تاریخ مقرر کردی تھی۔ ان کو جہاندیدہ نظریں عائشہ کی شرمندگی بھانپ چکی تھیں۔

پھر ایک دن مصطفیٰ نے کسی کال کے آنے کے بعد عائشہ اور گیتی آرا کو فوراً اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور ٹیکسی کروا کر دونوں کو شہر کے ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لے آیا۔ وہ دونوں پوچھتی ہی رہ گئیں، پر خاور کے بیڈ کے پاس پہنچ کر ان دونوں کو چپ لگ گئی۔

نحیف و نزار سا وہ وجود ماضی کا خاور نہ تھا۔ گیتی آرا کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ تاہم عائشہ ویسے ہی سپاٹ چہرہ لیے کھڑی رہی۔ انہوں نے اشارے سے انہیں اپنے پاس بلایا اور آکسیجن ماسک کو اشارے سے اتارنے کا کہا۔ نرس نے ڈاکٹر کے اشارے پر وہ اتار دیا تو انہوں نے معافی کے انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔ گیتی آرا نے روتے روتے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عائشہ کو بھی مصطفیٰ نے ان کے اشارے پر ذرا سا جھکایا تو انہوں نے اس کے سر پر اپنا کپکپاتا ہاتھ رکھا، ساتھ ہی لمحوں میں ان کی طبیعت بگڑ گئی اور کچھ ہی دیر بعد ان کا جسم ساکت ہو گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد عائشہ کو بھاری رجسٹری کے ساتھ ایک خط موصول ہوا، جس میں ان کے پلازہ کی ملکیت کے کاغذات موجود تھے۔ اس نے تہ کیا ہوا کاغذ کھولا۔

عائشہ میری پیاری سی بیٹی!

دنیا کی وہ پیاری سی نعمت جس کے لیے میں تڑپتا رہا، پر اظہار نہ کرسکا۔ ساری عمر جو تم نے باپ کے ہوتے ہوئے محرومی میں گزاری، اس پر تو اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ میری بہن نازو کی بھابھی یعنی اسفر کی ماں تھی اور نازو کا ہمیشہ ڈراوا کہ اگر گیتی یا اس کی اولاد سے تعلق رکھا تو وہ اس کو طلاق دلوا دے گی۔ اس ڈر نے مجھے چاہتے ہوئے بھی کبھی تمہارے پاس نہ آنے دیا۔

تمہیں خود سے محروم رکھا تو اللہ نے مجھے بھی محرومی کی سزا دی۔ تم سے معافی کی گزارش بھی نہیں کہ یہ میری سزا ہے اور مجھے بھگتنی ہے۔ اپنی ماں سے کہنا مجھے معاف کردے۔ اس عورت سے تو میں نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں۔ تمہارا حق تمہیں دینے کی کوشش کی ہے قبول کرنا۔ ہوسکتا ہے اس چھوٹے سے عمل سے میری سزا میں کچھ تخفیف ہو جائے۔

تمہارا بدنصیب باپ۔

نم آنکھوں کے ساتھ اس نے کاغذ تہ کیا اور دراز میں رکھ دیا۔ اماں نے کہا تھا جو تمہارا نصیب ہے وہ تمہیں مصطفیٰ کے ساتھ بھی ضرور ملے گا اور بڑوں کی باتیں یقیناً "حکمت اور دانائی رکھتی ہیں۔ بس چھوٹے ہی اپنی نادانی میں ان کا فہم نہیں رکھتے۔

☆

صائمہ اکرم چوہدری

شہرزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے، تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے۔ جس کا نام درشہوار ہے۔

خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو، تو ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی

پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

طوبیٰ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے' لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ثمینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں' بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہرزاد کی آمد ثمینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے' لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ثمینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

ثمینا بیگم' شہرزاد کے ساتھ ایک آستانے پر جاتی ہیں۔ واپسی پر گھر کے گملے ٹوٹے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے تیسرے شوہر ہارون رضا بتاتے ہیں کہ رومیصہ نے پھر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ نیب دکھاتے ہیں تو ثمینا بیگم کا سر گھوم جاتا ہے۔

دوسری قسط

بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گھن گھرج میں دیوتاؤں کا سا غضب تھا۔ لگتا تھا موسلا دھار بارش آج اپنے ساتھ ہر چیز کو ہی بہا کر لے جائے گی۔ شہرزاد کے دل نے شدت سے تمنا کی کہ یہ طوفان اپنے ساتھ اس ساری ذلت اور رسوائی کو بھی بہا کر لے جائے، جو اس کے خاندان کا مقدر بننے والی تھی۔

وہ سر اٹھائے شیشے کی دیوار کے پار بارش، شور مچاتے درختوں اور جھومتی ہوئی شاخوں کو دیکھ رہی تھی، اس کی نگاہیں باہر کے مناظر پر اور ذہن کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔

کمرے میں موت کا سا سناٹا تھا۔ ہر طرف خوف کے نادیدہ سائے رقصاں تھے۔ شہرزاد اور ٹینا بیگم کے وجود کو آنے والے لمحوں کا خوف کسی دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ دونوں کبھی بے چین انداز سے ٹہلنے لگتیں اور کبھی سر تھام کر صوفے پر بیٹھ جاتیں۔

دیوار گیر گھڑی کی ٹک ٹک ان کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی، شام کے سات بجنے والے تھے اور رومی کا دور دور تک کچھ پتا نہیں تھا۔ عموماً" اس کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ زیادہ تر گھر میں ہی پائی جاتی تھی، اور آج تو اس نے اپنا سیل فون بھی بند کر رکھا تھا۔

"کہاں رہ گئی ہے وہ؟" شہرزاد بے چین ہوئی۔

"وہ کہیں بیٹھ کر پھر کوئی اور نیا بے ہودہ کارنامہ سرانجام دے رہی ہوگی..." ٹینا بیگم کا تلخ لہجہ اس کی کنپٹیوں میں گرم سیال مادہ دوڑا گیا۔

"میں سمجھاؤں گی اسے..." انہیں رومی کے متعلق ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔

اسی وقت ٹینا بیگم کے سیل فون کی مترنم گھنٹی بجی، وہ دونوں خوف سے ایسے اچھلیں جیسے کمرے میں کسی نے بم کی موجودگی کی اطلاع دے دی ہو۔

"ہیلو۔" انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی مرے مرے انداز میں کال اٹینڈ کی۔

"ٹینا! کہاں ہو تم؟ دوسری جانب مسز افتخار کے بے چین انداز پر ان کا دم بری طرح دھڑکا۔

"وہیں ہوں، خیریت...؟" انہوں نے دانستہ محتاط انداز اپنایا۔

"سماول تو بہت ہی عجیب بات بتا رہی ہے مجھے رومیصہ کے متعلق، سوچ پوچھو مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا۔" دنیا کا منہ کھل چکا تھا اور مسز افتخار کی کال اس بات کا پہلا ثبوت تھی۔ ان کی بیٹی سماول، رومیصہ کی کلاس فیلو تھی اور دونوں گھرانوں کے آپس میں اچھے تعلقات تھے۔

"کیا..." اذیت سے ٹینا بیگم کا چہرہ تاریک ہوا، اس کا مطلب تھا کہ یہ بات ان کے حلقہ احباب میں پھیل چکی تھی۔

"کیا تمہیں، نہیں پتا...؟" دوسری طرف وہ حیران ہوئیں۔

"نہیں..." انہوں نے بری طرح دھڑکتے دل پر قابو پا کر بمشکل کہا۔

"یہی کہ رومیصہ نے فیس بک پر "رومی سہگل" کے نام سے کوئی پیج بنایا ہے اور..." وہ ہلکا سا جھجک کر رکیں۔

"او اچھا، مجھے علم نہیں۔ کیا ہوا؟" وہ صاف مکر گئیں۔

"تمہیں فوراً" دیکھنا چاہیے ٹینا، وہ تو لگتا ہے اس لڑکی سے بہت انسپائر ہے، کیا نام تھا اس کا بھلا سا جس کا اس کے بھائیوں نے مرڈر کر دیا تھا، وہ جو سوشل میڈیا کو مین بنی رہی تھی بہت عرصہ..." مسز افتخار جس کا نام لینا چاہ رہی تھیں، ٹینا بیگم جانتے ہوئے بھی وہ نام اپنے لبوں پر لانا نہیں چاہتی تھیں۔

"او کے میں دیکھتی ہوں..." انہوں نے اپنی طرف سے بات ختم کرنی چاہی۔

"تمہیں لازمی دیکھنا چاہیے' سہگل فیملی کا ایک نام ہے شہر میں' روبی کی اس حرکت سے بہت برا امپریشن جائے گا۔" مسز افتخار نے اس دفعہ کھل کر کہا۔
"تمہیں پتا تو ہے' وہ ہمیشہ سے پرابلم چائلڈ بنی رہی ہے میرے لیے' انتہا کی ضدی ہے۔" وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئیں۔
"اینی ہاؤ' وہ اگر شوبز میں آنا چاہتی ہے تو اس کو کسی اچھے پراجیکٹ کے ذریعے لانچ کرو' تمہارے لیے تو یہ بائیں ہاتھ کا کام ہے' لیکن اس طرح کی بولڈ وڈیوز کے ذریعے دوسروں کی توجہ حاصل کرنا کسی طور بھی مناسب نہیں' اور ویسے بھی شہر میں تمہارا ایک نام ہے' بلکہ تم تو ایک برینڈ نیم بن چکی ہو۔"
ان کی بات سن کر ٹینا بیگم کو یوں لگا جیسے کسی نے ان کے وجود میں چنگاریاں بھر دی ہوں۔
"جی جی مسز افتخار..... دیکھتی ہوں' کیا معاملہ ہے' اس وقت ایک ضروری میٹنگ کے لیے نکلنا ہے مجھے' کل کلب میں ملاقات ہوگی۔" انہوں نے بمشکل جان چھڑا کر فون بند کیا' لیکن ان کا دھواں دھواں چہرہ شہزاد کو ساری ان کہی کہانیاں سنا گیا تھا۔
"مام' کیا ہوا.....؟" وہ فوراً اٹھ کر ان کے قریب آن بیٹھی۔
"مائی گاڈ..... کیسے فیس کروں گی میں دنیا کو.....؟" اسے لگا جیسے وہ ابھی اپنے بال نوچنے لگیں گی۔
"ٹیک اٹ ایزی مام....." شہزاد ان کے یخ بستہ ہاتھوں کو اپنے نرم گداز ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی۔
"اس قدر ڈی گریڈ کرلے گی وہ خود کو' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" ٹینا بیگم کے لبوں سے ایک سلگتی ہوئی سانس نکل کر دم توڑ گئی۔
"میں نے کہا تھا اسے کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔" اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔
"اور مجھے لگتا ہے اب اس سے زیادہ مجھے ضرورت ہے' دماغ گھما دیا ہے میرا' اللہ جانے کس گناہ کی سزا ہے۔" شہزاد کو بے ساختہ ان پر رحم آیا۔
"باپ تو مر گیا اس کا' اور عذاب ڈال گیا میرے سر پر....." وہ سر پکڑے ایک دفعہ پھر شیشے کی دیوار کے پاس آن کھڑی ہوئیں۔
"لیکن مام اب طریقے سے ہینڈل کرنا ہوگا اسے....."
"ایسا ہینڈل کروں گی کہ یاد رکھے گی ساری زندگی۔" وہ تلخ لہجے میں مزید گویا ہوئیں۔ "میری دی گئی ڈھیل کا ہی نتیجہ ہے یہ سب' جی چاہتا ہے ٹانگیں توڑ کر بستر پر ڈال دوں اسے' تاکہ ایسی حرکتیں کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔"
"مام پلیز....." ان کے لہجے سے چھلکتی سفاکی شہزاد کو ہلا گئی۔
اسی وقت ٹینا ہاؤس کے گیٹ پر روبی کی گاڑی کا ہارن تیز آواز میں بجا اور بجتا ہی چلا گیا' اس کی پارہ صفت طبیعت کسی کام میں تاخیر برداشت نہیں کرتی تھی۔ چوکیدار نے بڑی مستعدی سے گیٹ کھولا اور روبی کی ہنڈا سوک میزائل کی طرح اڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح بڑی قوت سے بریک لگایا اور فضاؤں میں ٹائروں کے چرچرانے کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔
"لوکی بچی....." ٹینا بیگم غصے میں وہ سارے آداب بھول جاتی تھیں جو وہ اکثر و بیشتر روبی کو یاد کروانے کی کوشش کرتی تھیں۔
"مام پلیز ڈونٹ لوز یور ٹیمپر....." شہزاد کی سرگوشی ابھری۔
"شٹ اپ....." وہ اسی پر برس پڑیں۔ "دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے اس پاگل لڑکی نے میرا اور تم کہہ رہی ہو میں نارمل رہوں' ہاؤ از اٹ پاسبل؟" وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوئیں۔

"سچویشن مزید خراب ہو جائے گی۔" وہ حتی الامکان انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"سو واٹ؟" ان کے لہجے میں بیزاری در آئی۔
لاؤنج کا دروازہ کھلا' رومی اندر داخل ہوئی' ایک لمحے کو تو دونوں کو لگا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ متورم آنکھیں' ملگجی سی شرٹ کے ساتھ اس نے کئی دن پرانی جینز پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں قیمتی غیر ملکی برانڈ کا سگریٹ تھا۔
شہرزاد کو اس کا حلیہ دیکھ کر دھچکا لگا جبکہ ٹینا بیگم کا دل چاہا کہ اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیں۔ اس نے سوئی سوئی آنکھوں سے اپنی ماں اور بہن کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑی کی چین سامنے صوفے پر اچھال دی۔ ٹینا بیگم کے تو گویا تن بدن میں آگ لگ گئی۔
"کہاں سے آرہی ہو؟" ان کا لہجہ درشت اور جھنجلایا ہوا تھا۔
"جہنم سے....." اس نے ایک گہرا کش لے کر دھواں' بدتمیزی سے ٹینا بیگم کے چہرے پر پھینکا۔
"شٹ اپ۔" وہ اتنی زور سے دھاڑیں کہ ایک دفعہ تو شہرزاد کا دل بھی دہل گیا۔ جب کہ رومی بے خوفی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"آپ کا کیا خیال ہے اس طرح شاؤٹ کر کے آپ دبالیں گی؟" اس کا انداز سراسر چڑانے والا تھا۔
"بکواس بند کرو اپنی۔" غصے کی شدت ان کے پورے جسم کو جھلسا رہی تھی۔
"چچ چچ۔ ایسے غصہ کریں گی تو وقت سے پہلے بوڑھی ہو جائیں گی۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی اور ٹینا بیگم کی ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ وہ تیر کی طرح رومی کی طرف بڑھیں اور ایک زوردار تھپڑ گھما کر اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ شہرزاد نے خوف زدہ انداز سے اپنا ہاتھ لبوں پر رکھ لیا۔
جب کہ رومیصہ پر اس تھپڑ کا ذرا برابر بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طنطنے کے ساتھ انہیں نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے تھپڑ اس کے نہیں' سامنے والی دیوار پر مار گیا ہو' وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلی تھی۔
"بس..... یا کچھ اور.....؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔
"تم....." ان کے لب خفیف سے کانپے اور لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔
"کوئی حسرت رہ گئی ہے تو وہ بھی پوری کرلیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ٹینا بیگم کو ایک دم یوں لگا جیسے کسی نے ان پر سرد پانی انڈیل دیا ہو۔ وہ سن ہو کر رہ گئیں۔ ان کے چہرے کے تنے ہوئے تاثرات اور بھینچے ہوئے لبوں کو دیکھ کر رومی کو عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔
"کیوں کر رہی ہو تم ایسا.....؟" وہ پورا زور لگا کر صدمے بھرے انداز میں گویا ہوئیں۔
"میری مرضی۔" وہ سپاٹ لہجے میں اس طرح بولی کہ شہرزاد کو اس پر سرد خانے میں رکھی کسی بے جان اور بے حس و حرکت لاش کا گمان ہوا' وہ اسے پلک جھپکے بغیر دیکھنے لگیں۔
"تم شوبز میں آنا چاہتی ہو تو مجھے بتاؤ' میں تمہیں اچھے اور باوقار طریقے سے کسی موو ی یا سیریل میں لے آؤں گی۔" انہوں نے اسے لالچ دیا۔
"یہ باوقار طریقہ کیا ہوتا ہے۔" اس نے استہزائیہ انداز میں قہقہہ لگایا۔
"کم از کم وہ نہیں ہوتا' جو تم اپنی ولگر ویڈیوز کے ذریعے دکھانا چاہتی ہو دنیا کو۔" وہ خود پر قابو پا کر دانستہ تحمل بھرے انداز میں بولیں' اتنا تو انہیں بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی آنکھوں اور لہجے سے چھلکتی بغاوت کو غصے کی چھڑی سے قابو نہیں کیا جا سکتا۔

"فرق کیا ہے، ماما' وہی حرکتیں آپ اپنے سوشل سرکل میں کرتی ہیں' جو میں نے ساری دنیا کے سامنے کردیں' میں آپ کی طرح ڈبل اسٹینڈرڈ لائف نہیں گزار سکتی' مجھے جو اچھا لگے گا' وہی کروں گی' اگر زیادہ پرابلم ہے آپ کو تو بتادیں' میں یہ گھر چھوڑ دیتی ہوں۔"

ٹینا بیگم نے ایک دفعہ پھر خود کو ضبط کے پل صراط سے گزارا' لیکن شہزاد کے اعصاب آج جواب دے گئے تھے۔ اس کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ اس نے رومیصہ کی گاڑی کی چابی صوفے سے اٹھائی اور مضبوط قدموں سے چلتی ہوئی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کا بہت اچھا طریقہ ڈھونڈا ہے تم نے' کیپ اٹ اپ۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولتی ہوئی ملامت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھ کر لاؤنج سے نکل گئی۔ رومیصہ بری طرح سے گڑبڑا گئی۔ اسے شہزاد سے اس ردعمل کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

نیلا آسمان' سرمئی بادلوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مغرب سے آنے والی سیاہ گھٹاؤں کو ایک دم ہی جوش آیا اور کالی سیاہ بدلیاں کھل کر برسنے لگیں..... بارش کی جلترنگ' مری کی فضاؤں میں کانوں میں رس گھولتی موسیقی کی صورت محسوس ہو رہی تھی۔

ہادی اور سعد موسم کی دل فریبی سے لطف اٹھانے کے بجائے پچھلے ایک گھنٹے سے ایک پراجیکٹ پر مغزماری کرنے میں مصروف تھے۔ سعد کی انگلیاں لیپ ٹاپ کے کی پیڈ پر بڑی سرعت سے چل رہی تھیں اور محمد ہادی اپنی ڈائری پر کچھ نوٹس اتارنے میں مصروف تھا۔

"گھوڑے جیسی چال' ہاتھی جیسی دم....." میر ہاؤس کی جانب سے ایک دم میوزک بجا' اور دونوں نے کوفت بھرے انداز میں بے ساختہ کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔

"یار دو تو بند کرو۔ لگ رہا ہے کسی سنی پلیکس سینما میں بیٹھے ہیں۔" ہادی کے چہرے سے بے زاری ٹپکی' سعد نے فوراً اٹھ کر کھڑکیاں بند کیں' لیکن دوسری طرف سے ساؤنڈ سسٹم کی آواز فل کردی گئی تھی۔

"واٹ دا ہیل ہار۔" محمد ہادی نے ہاتھ میں پکڑا بال پوائنٹ پاس رکھی ڈائری پر پٹخا۔

گانے کے بول اس کے اعصاب پر کسی چابک کی طرح برس رہے تھے' اور اس سے بھی زیادہ جھنجلاہٹ اسے اس وقت ہوئی جب ایک ہی گانا دوسری سے تیسری دفعہ پھر فضاؤں میں گونجنے لگا۔

گھوڑے جیسی چال' ہاتھی جیسی دم
او ساون راجا' کہاں سے آئے تم.....؟
چک دھم دھم..... چک دھم دھم.....

"یار' کیا مصیبت ہے۔" ہادی نے جھنجلا کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"لگتا ہے ان آفتوں نے پھر لان پر یلغار کردی ہے۔" سعد کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔

"چک دھوم دھوم' چک دھوم دھوم....." گانے کے بولوں نے ہادی کا دماغ مزید خراب کیا۔

"تم مانو نہ مانو' چوتھی دفعہ ایک ہی گانا لگانے کے پیچھے ان لڑکیوں کی کوئی نہ کوئی شرارت ہے۔" سعد نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"یہ شرارت نہیں' خباثت ہے اس گینگ کی' قسم سے ایک سے بڑھ کر ایک' چھچھوری لڑکیوں سے بھرا ہوا ہے میر ہاؤس۔" محمد ہادی ضرورت سے زیادہ ہی تپا ہوا تھا لڑکیوں کی اس فوج پر۔

"اس نقار خانے میں کام تو ہونا نہیں' ذرا دیکھیں تو سہی' آخر کس ساون راجا کو بلا رہی ہیں میر ہاؤس کی شہزادیاں....." سعد ہنستے ہوئے اٹھا اور کھڑکیوں کے پردے پیچھے سرکائے۔

"یہاں تو باقاعدہ فلم کا شوٹ چل رہا ہے' ذرا آکر دیکھو....." سعد منہ پر ہاتھ رکھ کر بے اختیار ہنسا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں۔" اس نے اٹھ کر الیکٹرک کیٹل جلائی' گرین ٹی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی۔

"کم آن یار....." سعد نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر کھڑکی کے پاس گھسیٹا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا شدت سے دل چاہا کہ وہ میر ہاؤس کی لڑکیوں کو کشمیر پوائنٹ پر کھڑا کر کے زور سے نیچے دھکا دے دے' تاکہ وہ ساری لولی لنگڑی ہو کر اپنے کمروں تک محدود ہو جائیں۔

در شہوار اپنے دونوں بازو فضا میں پھیلائے' آسمان کی برستی بوندوں کے نیچے گول گول دائرے میں گھومتی ہوئی خود کو کسی ہیروئن سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔ بارش کے قطرے ایک تواتر کے ساتھ اس کے شفاف چہرے پر سفید موتیوں کی صورت میں برس رہے تھے۔ اس کی کزن طوبیٰ اپنے سیل فون کے ذریعے اس کی وڈیو بنا رہی تھی اور ثمیرہ چھتری کھولے' ایک اسٹول پر بیٹھی تھی اور برآمدے میں چھوٹی میز پر ساؤنڈ سسٹم رکھا ہوا تھا' فضاؤں میں بلند آواز میں بجنے والے گانے کو گویا اس وڈیو میں پس منظر کی موسیقی کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔

کوئی لڑکی ہے' جب وہ ہنستی ہے.....
بارش ہوتی ہے' چھنک چھنک چھم چھم.....

"کیا چیزیں ہیں یہ....." محمد ہادی کی شریانوں میں خون کھولنے لگا۔

"فل ٹائم انٹرٹینمنٹ....." سعد قہقہہ لگا کر ہنسا۔

"اور ان کے دادا کے بکواسی بیانات سنا کرو۔ ٹی وی پر' جیسے شرافت اور عزت کے سارے پیمانے ان کے خاندان سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہو جاتے ہوں۔" محمد ہادی جل کر بولا۔

"خیر ایسا بھی کوئی حاجیوں کا خاندان نہیں' میر خاقان کی عشق و عاشقی کی داستانیں اکثر ہی میڈیا کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں ایمرٹس ایئر لائن کی ایئر ہوسٹس کی زلفوں کے اسیر ہو گئے تھے موصوف....." سعد نے اسے تازہ ترین معلومات سے آگاہ کیا۔

"یہ ایف 16 ان کی کیا لگتی ہے؟" ہادی نے بے زاری سے در شہوار کی طرف اشارہ کیا' جو اس وقت اپنا سیاہ رنگ کا گھیردار فراک لہرا لہرا کر خود کو مادھوری ڈکشت ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی۔

"اللہ ہی جانتا ہے یار....." سعد نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔ دوسری طرف ثمیرہ نے اٹھ کر گانے کی آواز مزید بلند کر دی۔

کوئی لڑکا ہے' جب وہ گاتا ہے.....
ساون آتا ہے' گھمر گھمر گھم گھم.....
چک دھوم دھوم' چک دھوم دھوم.....

نیچے لان میں در شہوار کی پرفارمنس میں تیزی آگئی۔ وہ سب آج داجی اور میر محتشم کے ملتان جانے کی خوشی میں پچھلے لان میں جشن منا رہی تھیں۔ اس وقت گھر میں کوئی بڑا موجود نہیں تھا' اس لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

"دل تو کر رہا ہے وڈیو بنا کر اس کے دادا حضور کو واٹس ایپ کر دوں۔" سعد کو شرارت سوجھی اور اس نے واقعی

کیمرہ آن کرلیا۔
"ٹیواٹ یار! اچھی بات نہیں ہے یہ....." ہادی کو برا لگا۔
"بے فکر رہو' نہیں بھجواتا انہیں' اب میرے کون سے والی وارث تمہارے پیرنٹس جیسے تگڑی پوسٹس پر بیٹھے ہیں' جو ان سے بغیر سوچے سمجھے پنگا لے لوں۔" وہ ہادی کے منع کرنے کے باوجود ویڈیو بنانے لگا جب کہ ہادی اکتا کر گرین ٹی بنانے لگا۔
سعد کی بدقسمتی کہ گینگ ہیڈ در شہوار کی اس پر نظر پڑ گئی۔ جس کی نظر ویسے ہی سکس بائے سکس تھی' سونے پہ سہاگہ وہ سعد کے ہاتھ میں سیل فون بھی دیکھ چکی تھی۔
"شیم آن یو....." وہ نیچے سے چیخی تو سعد کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔
"مارے گئے یار....." سعد اس کے دھمکی آمیز لہجے پر بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔
"ان کی تو ایسی کی تیسی میں کر کے آتی ہوں۔" اس سے پہلے کہ طوبیٰ اور نمیرہ اسے منع کرتیں' اس نے کسی چھلاوے کی طرح مشترکہ منڈیر عبور کی اور کسی میزائل کی طرح اڑتی ہوئی ہادی کے سٹنگ روم تک پہنچ گئی۔
"شرافت سے وہ سیل فون دیں مجھے' جس میں تصویریں یا ویڈیو بنا رہے تھے ہماری۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھے کینہ توز نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی' جو اس وقت لاؤنج کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔
"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' میں تو کال سن رہا تھا وہاں کھڑے ہو کر۔" سعد فوراً مکر گیا۔
"شرم آنی چاہیے آپ لوگوں کو' شریف گھرانوں میں تانک جھانک کرتے ہوئے۔" اس کا کٹیلا سا جملہ سن کر ہادی کا دماغ گھوم گیا۔
"محترمہ! شریف گھرانے کی لڑکیاں کھلے آسمان کے نیچے فل میوزک کے ساتھ پرفارمنس نہیں دیتیں۔" ہادی کون سا کسی سے کم تھا۔
بے تحاشا غصہ' ضبط' اشتعال اور غصہ پینے کی کوشش میں در شہوار کی آنکھوں میں لاوا اتر آیا۔ "ہم اپنے گھر میں اچھلیں' کودیں' ناچیں' گائیں' آپ سے مطلب.....؟" وہ بے باکی سے گویا ہوئی۔
"اور ہم بھی اپنے گھر کی کھڑکی میں کھڑے ہوں یا ٹیرس پر' آپ سے مطلب۔" ہادی سیڑھیاں اتر کر بالکل اس کے مدمقابل آن کھڑا ہوا۔
"کسی خوش فہمی میں مت رہیے گا' یہ تانک جھانک مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔" اس کے دھمکی آمیز انداز پر ہادی کے کان کی لوئیں سرخ ہوئیں۔
"محترمہ' یہ دھمکیاں کسی اور کو جا کر دیجیے گا' ہمارا ٹائم ویسٹ مت کریں' باہر کا راستہ سامنے ہے۔" ہادی کا سرد انداز در شہوار کو سلگا گیا۔
"دوبارہ یہ شکلیں مجھے اپنی سائیڈ پر نظر آئیں تو داجی سے کہہ کر بوریا بستر ہی گول کروا دوں گی مری سے....." وہ انگلی اٹھا کر دھمکی کے انداز میں بولی۔
"مری آپ کے دادا کی جاگیر نہیں ہے۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔
"لگتا ہے اس شہر میں نئے آئے ہیں آپ' ورنہ ایسی بات کرنے سے پہلے ہزار دفعہ سوچتے۔" وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔
"اور لگتا ہے آپ بھی جانتی نہیں ہیں مجھے۔ دوبارہ میرے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے انشورنس کروا لیجیے گا یا پھر اپنے ہمراہ کوئی وہیل چیئر لے آئیے گا' کیونکہ میں بھی زیادہ دیر تک لحاظ کرنے کا قائل نہیں۔" اس نے آگے بڑھ کر سٹنگ روم کا دروازہ کھولا اور انتہائی بے رخی سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ توہین کے گہرے احساس سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

در شہوار کا چہرہ سرخ ہوا۔

"در شہوار' دوستی نبھائے نہ نبھائے' دشمنی بہت اچھی طرح نبھاتی ہے۔" وہ جاتے جاتے پلٹی اور متنفر لہجے میں کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

"یار! یہ اچھی بات نہیں ہوئی" سعد سچ مچ پریشان ہو گیا۔

"تو تمہیں بھی وہ فضول حرکت کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔" ہادی نے اس کی کلاس لی۔

"مجھے کیا پتا تھا اس کی اتنی عقابی نگاہیں ہیں۔" وہ خفت زدہ انداز میں کہتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اس کی نگاہیں ہی عقابی نہیں بلکہ زبان کی دھار بھی وزیر آباد کی چھریوں کو مات دیتی ہے۔" ہادی نے مزید اضافہ کیا۔

"اگر اس نے اپنے دادا جی کو بتا دیا تو؟" اس کو ایک نئی فکر لاحق ہو گئی۔

"اب اتنی بھی بے وقوف نہیں ہے وہ' جو پہلے انہیں بتائے کہ وہ لان میں کیا کارنامہ سرانجام دے رہی تھی اور پڑوس کے لڑکے اس وجہ سے تانک جھانک کر رہے تھے۔ بے فکر رہو' کچھ نہیں پھوٹے گی وہ۔" ہادی کی بات اس کے دل کو لگی تھی' پہلی دفعہ اس کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔

"ہادی داوے تم اتنے خلاف کیوں ہو اس کے۔" سعد مسکرایا۔

"مجھے ایسی مردمار لڑکیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں' جو خوامخواہ دوسروں کے حواسوں پر سوار ہونے کی کوشش کریں۔" اس نے کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو سعد نے شرارتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"خیر تم تو لڑکوں کے معاملے میں بھی ایسے ہی ہو۔" اس نے کشن اٹھا کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور صوفے پر دراز ہو گیا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں' اپنا تو ایک ہی نظریہ ہے۔۔۔۔" ہادی نے ہاتھ میں پکڑا کپ میز پر رکھا۔

"وہ کیا۔۔۔۔؟"

"ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔" اس کے ہلکے پھلکے لہجے پر سعد بے ساختہ ہنسا۔

"اور تمہارا تو حلقہ یاراں ہی مختصر ترین ہے۔" سعد نے اسے چھیڑا۔

"ہاں گنتی کے صرف تین یا چار لوگ' زیادہ بھیڑ بھاڑ سے کوفت ہوتی ہے مجھے۔" ہادی نے سنجیدگی سے جواب دیا' وہ واقعی محدود حلقہ احباب رکھتا تھا اور زیادہ تر لوگ اسے کم گو' اپنے آپ میں مگن اور کسی حد تک مغرور سمجھتے تھے۔ جب کہ حقیقتاً وہ ایسا نہیں تھا۔

"ویسے تم کچھ بھی کہو لڑکی مزے کی ہے۔" سعد کے چہرے کی معنی خیز مسکراہٹ پر محمد ہادی کے اندر خطرے کی گھنٹی بہت تیزی سے بجی اور بجتی ہی چلی گئی کیونکہ سعد سیل فون پر بنائی ہوئی وڈیو بڑے ذوق و شوق سے دیکھنے میں مگن تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی قوس قزح اس کے اندرونی جذبات کی بھرپور عکاسی کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات سرد اور سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک بالکل ویران تھی۔

شہزاد کی اسٹیئرنگ پر جمی گرفت خاصی مضبوط تھی لیکن اس کے دل و دماغ میں ایک حشر برپا تھا۔ گھر میں ٹینا بیگم اور رومیصہ کے زوردار معرکے کے بعد اس کا دل ایک دم ہی اچاٹ ہو گیا۔ وحشت اور بے چینی کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

وہ دو گھنٹے بے مقصد مختلف سڑکوں پر گاڑی گھماتے کسی ذیلی سڑک سے بالکل انجان راستے پر نکل آئی اور اسے

پتا ہی نہیں چلا کہ ریزرو پیٹرول کا اشارہ دینے والی گاڑی اب فیول ختم ہونے کے بعد احتجاجاً ”رک گئی تھی۔

شہزاد کی نظر جیسے ہی فیول کی سوئی پر پڑی‘ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ وہ گاڑی کے رکنے کی اصل وجہ سمجھ چکی تھی اور اس سڑک پر کوئی پیٹرول پمپ تو دور کی بات کوئی چرند پرند بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

سردیوں کی رات کا گہرا سناٹا اور خاموشی اس ویران راستے پر کسی آسیب کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے خوفزدہ انداز سے دائیں بائیں دیکھا۔ سڑک کے دائیں طرف ایک چھوٹا سا قبرستان اور بائیں طرف گھنا جنگل تھا اور ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔

فضا میں چھائی ہوئی چاندنی میں ہر چیز پراسرار لگ رہی تھی‘ اور دور دور تک نظر آتی قبریں ‘شہزاد کے مضبوط اعصاب کے لیے ایک کڑا امتحان بنی ہوئی تھیں۔

”اوہ مائی گاڈ‘ اب کیا ہوگا.....؟“ وہ گھبرا گئی کیونکہ گاڑی کی فرنٹ لائٹ کی روشنی میں اس کی نظر ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر پڑ گئی۔ جنگلی گھاس اور خود رو پودوں کے درمیان گھرے قبرستان میں جھینگروں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں عجیب سا دہلا دینے والا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ سناٹا اس جگہ کی ہر چیز کو اپنے پنجوں میں دبائے ہوئے تھا۔

اس نے گھبرا کر اپنا سیل فون اٹھایا اور ٹینا بیگم کا نمبر ڈائل کیا‘ وہ بند جا رہا تھا۔ اس نے تیزی سے رومی کو کال ملائی ۔ اس کا سیل فون فی الوقت جواب موصول نہیں ہو رہا کی ریکارڈنگ سنا رہا تھا‘ اس کے رابطے میں گنتی کے صرف دو چار نمبر تھے۔ وہ بری طرح خوف زدہ ہوگئی۔

سیاہ رات کے اندھیرے میں اس کی نظر ایک ہیولے پر پڑی۔‘ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں وہ دیکھ سکتی تھی کہ سادھوؤں کے سے حلیے والا ایک شخص لالٹین اٹھائے اسی کی گاڑی کی طرف آرہا تھا۔ وہ متوحش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اتنے سرد موسم میں اس نے دھوتی باندھ رکھی تھی اور اس کا اوپر والا دھڑ ننگا اور گلے میں ریٹھوں والی مالا تھی ۔ اس کے غیر معمولی لمبوترے چہرے کی ابھری ہوئی نوکیلی ہڈیاں اس کے چہرے کو عجیب سا تاثر بخش رہی تھیں۔ جبکہ سر گنجا اور آنکھوں میں بڑی پراسرار سی چمک تھی۔

وہ چلتا چلتا شہزاد کی گاڑی کے بالکل پاس آکر رکا اور اپنے گلے میں پہنی ہوئی مالا میں سے ایک ریٹھے کو ہاتھ کی انگلیوں سے گھمانے لگا۔ شہزاد کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا‘ چاند کی پراسرار چاندنی میں یہ منظر خاصا دہلا دینے والا تھا۔

شہزاد کو پہلی دفعہ یہاں کا اندھیرا اور خاموشی غیر فطری محسوس ہوئی۔ اس سادھو نے انگشت شہادت سے گاڑی کا شیشہ بجاتے ہوئے اس خاموشی کی چادر میں شگاف ڈالا۔ دہشت کی لہریں شہزاد کے وجود میں سرائیت کر گئیں ‘اس نے چیخنا چاہا مگر آواز گلے میں ہی دم توڑ گئی۔

وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا مگر گاڑی کے شیشے بند ہونے کی وجہ سے وہ اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ شہزاد نے کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھا‘ اس کی آنکھوں سے نکلنے والی تیز روشنی میں اسے اپنی ٹانگیں بے جان ہوتی محسوس ہوئیں۔

فضا کے گھمبیر‘ بوجھل سناٹے میں آئی فون کی گھنٹی کی آواز اسے کسی مسیحا کی مانند اپنی سماعت میں اترتی محسوس ہوئی۔ اس نے نمبر دیکھے بغیر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فوراً ہی کال اٹینڈ کی‘ وہ شخص اب اس کی گاڑی کے شیشے پر جھکا‘ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شہزاد کو اپنے دل کے بری طرح سے دھڑکنے کی آوازیں اپنی کنپٹیوں میں محسوس ہو رہی تھیں۔

”شہزاد.....!!!“ دوسری طرف وہی دل چُراتا لہجہ تھا جو آج اسے زندگی بخش گیا تھا۔

"ہم زاد....." اس کے منہ سے نکلنے والا یہ نام دوسری جانب موجود شخص کو ڈھیروں توانائی بخش گیا۔
"کیسی ہو؟" وہ مسکرایا۔
"میں گھر سے باہر راستہ بھول چکی ہوں اور کوئی شخص خوف زدہ کر رہا ہے مجھے....." اس کے منہ سے لفظ ٹوٹ کر نکلے۔
"کہاں ہو تم لوکیشن بتاؤ مجھے' کون ہے تمہارے ساتھ۔" اس کی نرم آواز میں ایک فطری سی پریشانی تھی۔
"آئی ڈونٹ نو' میری گاڑی کا فیول بھی ختم ہو چکا ہے اور وہ مسلسل میری گاڑی کا شیشہ ناک کر رہا ہے۔" خوف سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔
"بی بریو..... دروازہ مت کھولنا....." وہ دوسری طرف اب ذرا بلند آواز میں بولا۔ "تم ہو کہاں؟"
"میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا' یہ کون سا راستہ ہے.....؟" شہرزاد کا چہرہ دہشت سے لٹھے کی طرح سپید پڑتا جا رہا تھا۔
دوسری طرف وہ اس کی کیفیت سمجھ چکا تھا۔ "ڈونٹ وری' وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' اپنی گاڑی کا دروازہ کسی قیمت پر مت کھولنا' میں تمہارے ساتھ ہوں۔" اس نے دلاسا دیا۔
"پلیز' ہیلپ می....." اس کے لہجے میں خوف ہی خوف تھا۔ "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"
"اپنے سیل فون کا نیوی گیشن سسٹم آن کرو' ہری اپ۔ اسے دیکھ کر لوکیشن بتاؤ اپنی' اور پلیز گاڑی کا دروازہ نہیں کھولنا۔" وہ فکر مند انداز میں بولا۔ اس نے بڑی تیزی سے گوگل میپ آن کیا اور سامنے ہی اس کی لوکیشن "کیانی روڈ کوٹ ہتھیالی' کے طور پر آرہی تھی۔
"اوہ! تو تم لنک روڈ پر ہو' ڈونٹ وری میں ریسکیو کرواتا ہوں تمہیں۔" وہ سیکنڈوں میں اس کی لوکیشن سمجھا تھا۔
"فون مت بند کرنا پلیز....." شہرزاد کے التجائیہ لہجے پر اس کا اپنا فون منقطع کرتا ہاتھ رک گیا۔ وہ اب شاید پی ٹی سی ایل فون پر انگلش میں کسی کو عجلت بھرے انداز میں ساری صورت حال بتا رہا تھا۔ دوسری طرف شہرزاد پر ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا۔
"شہرزاد' ڈونٹ وری' میرا ایک فرینڈ پولیس موبائل بھیج رہا ہے' جسٹ ٹین منٹ لگیں گے۔" وہ اب اسے تسلی دے رہا تھا۔
"ٹین منٹ!!" شہرزاد نے خوف زدہ نگاہوں سے باہر کھڑے شخص پر نظر ڈالی' جو اس وقت انتہائی بے چین انداز میں ایک دفعہ پھر اس کی گاڑی کے شیشے پر زور زور سے ہاتھ مار رہا تھا۔ شہرزاد کی دھڑکنوں میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔
"ڈونٹ ڈسٹرب می....." اس نے ہمت کر کے چیخ کر کہا' گاڑی کے باہر کھڑا شخص چونک گیا' جیسے اس کی بات سمجھ گیا ہو۔
"کیا ہوا شہرزاد؟" وہ ریسیور کے دوسری جانب پریشان ہوا۔
"کچھ نہیں' یہ شخص خوامخواہ — میرے سر پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔" وہ کھڑکی کی طرف سے تھوڑا رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔
"ڈونٹ وری' پولیس آتی ہی ہو گی' بی بریو۔" وہ فکر مند لہجے میں اسے حوصلہ دے رہا تھا۔
جب کہ شہرزاد کی سمجھ میں اس کی کوئی بات نہیں آرہی تھی' اس کا سارا دھیان باہر کھڑے شخص کی جانب تھا۔ جسے نظر انداز کر کے وہ خود کو مصروف ظاہر کر رہی تھی۔ اچانک بجلی کے کڑکنے کی آواز پر اس نے دہل کر دوبارہ

شیشے کی طرف دیکھا اور اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا' وہ شخص جا چکا تھا۔

"چلا گیا وہ" شہزاد کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔

"جہاں "ہم زاد" آجائے' وہاں کوئی دوسرا کتنی دیر ٹھہر سکتا ہے۔۔۔" اتنے اعصاب شکن لمحات میں یہ بات وہی کر سکتا تھا۔

"وہ لوگ آئے کیوں نہیں رہے؟" اس نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے پوچھا' ویسے بھی اسے قبرستان اور ارد گرد کے ماحول سے وحشت ہو رہی تھی۔

"اتنے کمزور نروز کی حامل تو نہیں تھیں تم۔۔۔" اس کی بات پر وہ خفت کا شکار ہوئی۔

"تم کیسے جانتے ہو مجھے؟" یہ سوال بے ساختہ اس کے ذہن میں ابھرا اور اس سے پہلے کہ وہ اس سے استفسار کرتی۔ پولیس موبائل کے تیز ہارن کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

اس نے لاشعوری طور پر کال منقطع کی اور اپنی گاڑی کی طرف آنے والے پولیس آفیسر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جو اس کی گاڑی کا شیشہ نیچے کرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ پولیس اسٹیشن سے گھر سے بیڈ روم تک پہنچنے کے دوران اس کے اعصاب اچھے خاصے مضمحل ہو چکے تھے۔ گھر میں طوفان گزرنے کے بعد کی بوجھل خاموشی کا راج تھا۔ رومی کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی آئی اور ایک درد کی گولی کھانے کے بعد اس نے اسٹرانگ سی کافی بنائی اور اپنے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر دن بھر کی روداد کو ذہن میں دہرانے لگی۔

"مجھے کم از کم اس کا شکریہ تو ادا کرنا چاہیے۔۔۔" اس نے جلدی سے اپنا سیل فون اٹھایا اور ریسیو کالز میں اس کا نمبر تلاش کرنے لگی۔

آج کی تاریخ میں مطلوبہ وقت پر آنے والی کال دیکھ کر اسے جھٹکا لگا' اس وقت تو وہ سخت پریشانی میں یہ دیکھ نہیں سکی تھی لیکن اب ریسیو کالز میں "ہم زاد" کے نمبر کی جگہ نامعلوم لکھا ہوا تھا' اور اس بات نے اسے اچھی خاصی الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"کوئی دیکھے نہ دیکھے شاہ میر تو دیکھے گا۔۔۔" طوبیٰ نے ہاتھ میں پکڑا کیلا مزے سے کھاتے ہوئے عوام الناس کو آگاہ کیا۔

اس وقت درشہوار کے کمرے میں انتقامی ایجنڈے پر ایک گول میز کانفرنس جاری تھی جس میں ایک فول پروف پلان ترتیب دیا گیا تھا' اور اس وقت اس پر بحث جاری تھی کہ طوبیٰ کے بیان کردہ خدشے کے بعد ایک لمحے کو کمرے میں مایوسی میں لپٹی ہوئی خاموشی پھیل گئی۔

"ہاں میرو بھیا کی طرف سے تو مجھے بھی خطرہ ہے۔۔۔" درشہوار نے کافی کا آخری کڑوا گھونٹ پیتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

"اس کو تو آج چائے میں کوئی ٹرینکولائزر ڈال کر دے آؤ۔" نمیرہ نے مونگ پھلی سے انصاف کرتے ہوئے مفت مشورہ دیا۔

"کوئی فائدہ نہیں' وہ نیند میں بھی اٹھ کر چل پڑے گا کمینہ۔۔۔" طوبیٰ نے برا سا منہ بنایا۔

"اوں ہوں۔۔۔" درشہوار کے بہنوں والے جذبات انگڑائی لے کر بیدار ہوئے۔

"مانا کہ میرا بھائی واقعی بہت کمینہ ہے لیکن پلیز اس کے بارے میں منفی رائے کا اظہار یوں منہ پھاڑ کر سرعام نہ کیا جائے تاکہ ان کی اکلوتی بہن کے جذبات مجروح نہ ہوں۔" سیاہ کارڈیگن کے ساتھ میرون شال اوڑھے

در شہوار شرارتی لہجے میں گویا ہوئی۔
"زیادہ ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں' تم اچھی طرح جانتی ہو ہم تمہارے بھائی کے بارے میں جو کہتے ہیں وہ روز ازل کی طرح روشن اور کسی بھی قسم کے شک و شبے سے بالاتر ہوتا ہے۔" نمیرہ کے طنزیہ لہجے پر در شہوار کے جذباتی غبارے سے ساری ہوا نکل گئی۔
"اس کی کمینگیوں پر تو پی ایچ ڈی کا پورا تھیسس لکھا جا سکتا ہے۔" طوبیٰ کے بھی سارے پرانے زخم ایک ساتھ جاگ اٹھے۔
"وہ تو بالکل ٹھیک ہے پیاری بہنو۔ لیکن تم لوگ بھی ذرا ہاتھ ہولا رکھو میں بھی بندہ بشر ہوں اور تین بھائیوں کی اکلوتی بہن والی میری گم شدہ غیرت جاگ اٹھی تو نقصان تو ہم تینوں کا ہی ہو گا ناں۔" در شہوار کی بات پر ان دونوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آگئی۔
"تین سے مجھے یاد آیا' بیا آپی کہاں غائب ہیں صبح سے؟" نمیرہ نے کسی چالاک لومڑی کی طرح آنکھیں گھما کر طوبیٰ کی طرف دیکھا۔
"وہ داجی سے تازہ ترین بے عزتی کروانے کے بعد تین روزہ سوگ پر ہیں' صبح ہی یہ پریس ریلیز جاری کیا تھا انہوں نے۔" طوبیٰ نے پھلوں کی ٹوکری سے چن کر ایک موٹا تازہ کینو چھیلتے ہوئے اطلاع دی۔
"فی الحال تم یہاں سے نکلو اور جا کر میبو بھیا کے بارے میں تازہ ترین اپ ڈیٹ لے کر آؤ' تاکہ مشن زیرو زیرو سیون پر کام شروع کیا جا سکے۔" در شہوار نے اس کے ہاتھ سے مالٹا چھینا اور واپس پھلوں کی ٹوکری میں رکھ دیا۔
"کیوں تمہیں جاتے ہوئے موت پڑتی ہے کیا۔" وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوئی۔
"مجھے تو اس وقت دیکھتے ہی وہ سمجھ جائیں گے کہ آج پھر کسی خفیہ مشن پر ہوں کیونکہ پوری دنیا جانتی ہے کہ مجھے نیند کتنی پیاری ہے اور میں وہ صرف اسی صورت میں قربان کرتی ہوں جب میرے اندر کوئی کھلبلی مچی ہوئی ہو۔" در شہوار اپنی ننھی سی خوب صورت ناک سکوڑ کر بولی۔
"ہاں تو میرا چہرہ مبارک دیکھ کر کون سا انہیں لگے گا کہ میں تہجد کے نفل پڑھنے کے لیے اٹھی ہوں۔" طوبیٰ کون سا کسی سے کم تھی۔
"نمیرہ تم چلی جاؤ پلیز۔" در شہوار نے دنیا جہاں کی معصومیت اپنے لہجے میں سمو کر اپنی کزن کی طرف دیکھا' جو ہنوز مونگ پھلی کے لفافے میں اس امید پر ہاتھ مار رہی تھی کہ شاید کچھ ہاتھ لگ ہی جائے۔
"توبہ کرو' ندرت امی کی نظر پڑ گئی تو اپنے گھٹنوں کی مالش کا آرڈر دے دیں گی' ویسے بھی آدھی رات کو ان کے سارے نامعلوم درد جاگ اٹھتے ہیں۔" نمیرہ کے صاف انکار پر در شہوار کا منہ بن گیا۔
"اب یہ کسی یتیم خانے کے منیجر جیسی شکل مت بناؤ' جاتی ہوں میں اور یاد رکھنا نیکسٹ ٹائم میں ہرگز نہیں جاؤں گی شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے۔" طوبیٰ کو اس پر ترس آگیا اور اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر در شہوار مسکرا دی۔
"شاباش میری بہن! تم "میبو ہاؤس" کا فخر ہو' آنے والی نسلوں کے لیے "بہادری" "ہمت" اور "جرأت" کا سمبل ہو۔" در شہوار نے لہک لہک کر اس کے گن گانے شروع ہی کیے تھے کہ نمیرہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے زبردستی روکا۔
"بس بس بہن' آدھی رات کو اتنے جھوٹ بولنے پر کہیں کوئی زلزلہ نہ آجائے مری میں' باقی تقریر پھر کسی اور دن کر لینا۔"
"تم سب لوگ انسانوں کی طرح بیٹھ کر آیت کریمہ کا ورد کرو' میں ذرا نیچے کے حالات کا جائزہ لے کر آتی ہوں

اور خبردار تم میں سے کسی نے میری پھلوں کی ٹوکری پر ہاتھ صاف کیا۔" طے شدہ پروگرام کے مطابق طوبیٰ نے پہلے سر نکال کر باہر جھانکا اور پھر دبے پاؤں درشہوار کے بیڈ روم سے نکلی۔

وہ دھڑکتے دل اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دل ہی دل میں آل تو جلال تو پڑھتی ہوئی پہلی منزل کی سیڑھیاں اترنے لگی اور آج تو ویسے بھی داجی اور تایا ابا کی غیر موجودگی میں امن سکون کا دور دورہ چل رہا تھا۔

"اف ..." چلتے چلتے اس کا پاؤں سیڑھیوں میں رکھے آرائشی گملے سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا گئی تو گرل کو پکڑ کر اس نے خود کو گرنے سے بچایا۔

"اف یہ کم بخت درشہوار کی انٹیریئر ڈیزائننگ۔" اس نے غصے میں گملے کو ٹھوکر ماری، جو خاصی مہنگی پڑی۔ اس کے پیر کا ناخن ہلکا سا ٹوٹ گیا۔

"یہ تم کیا آدھی رات کو گملوں اور دیواروں سے ٹکراتی پھر رہی ہو۔" شاہ میر کی آواز نے گویا صورِ اسرافیل پھونک دیا تھا۔

ایک ہاتھ میں کافی کا مگ ــــ اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میں فرنچ فرائز کا پہاڑ بنائے وہ کچن سے نکلتے ہوئے اس کی یہ حرکت نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ اس کے چہرے پر وہی دل جلاتی مسکراہٹ تھی جس سے طوبیٰ سخت خار کھاتی تھی۔

"خبیث، ابھی تک الوؤں کی طرح جاگ رہا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں شاہ میر کو کوسا۔

"یہ دل ہی دل میں کون سا ڈھائی کا پہاڑا دہرا رہی ہو۔" وہ اس کی خاموشی پر اکتا کر بولا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے..." طوبیٰ کے سارے موڈ کا ستیاناس ہو گیا۔

"تکلیف مجھے نہیں، تمہیں ہو رہی ہے، جو اس طرح لنگڑا لنگڑا کر چل رہی ہو۔ "حال" تو خیر پہلے ہی خراب تھا تمہارا اب تو "چال" کی بھی بری حالت ہو گئی ہے، اف کیا بنے گا تمہارا..." شاہ میر کی زبان پھسلی۔

"آج تک کالا باغ ڈیم کا کچھ بنا ہے پاکستان میں۔" طوبیٰ نے کھا جانے والی نگاہوں سے اپنے تایا زاد کی طرف دیکھا، جس کی بولتی نگاہیں اور شرارتی لہجہ اسے سلگا کر رکھ دیتا تھا۔

"ایک دفعہ مجھے حکم کرو، کالا باغ ڈیم کیا، طوبیٰ ڈیم بھی بنا دوں گا۔" وہ شرارتی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا کپ سائیڈ میز پر رکھ کر خود مزے سے فرنچ فرائز کھانے لگا۔ گرما گرم فرنچ فرائز پر کیچپ کے نقش و نگار دیکھ کر طوبیٰ کے منہ میں بھی پانی آ گیا۔

"اے طائرِ لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی۔" اس نے دل ہی دل میں یہ مصرع یاد کر کے اپنی ہمت خود بندھائی اور منہ میں آئے پانی پر بمشکل بند باندھ ہی لیا، اگرچہ یہ انتہائی مشکل کام تھا۔

"ویسے آج کیا جنگل میں اکیلے چہل قدمی کا ارادہ ہے تمہارا، اگر تم کہو تو میں ساتھ دینے کو تیار ہوں۔" شاہ میر کے لبوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جبکہ طوبیٰ کی نظریں ہال کمرے میں لگے وال کلاک پر تھیں، وقت ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا ہی جا رہا تھا۔

"تمہاری یونٹ والے بلاتے کیوں نہیں ہیں تمہیں، عورتوں کی طرح آ کر بیٹھ گئے ہو گھر میں۔" وہ تیکھے لہجے میں ابرو چڑھا کر بولی تو شاہ میر کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ خاصا بلند تھا۔

"اللہ کے فضل سے میرا تو آئی سی بہت مہربان ہے مجھ پر۔ سوچ رہا ہوں جوائننگ دے کر پھر کسی بہانے آ جاؤں واپس۔" وہ اسے چڑانے کو بولا۔

"پتا نہیں کون سے پاک فوج کے جوان ہوتے ہیں جنہیں محاذ پر جانے کا شوق ہوتا ہے، ادھر ایک ہی نمونہ ہے ہمارے گھر میں، جو ہر وقت یہیں محاذ آرائی کھولے بیٹھا رہتا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف واپس مڑی

اور شاہ میر اس کا ارادہ بھانپ کر بڑی تیزی سے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔
"کیا کہا تم نے.....؟" اس نے لاشعوری انداز میں طوبیٰ کا بازو پکڑا' وہ سٹپٹا گئی۔
"بازو چھوڑو میرا....." اس کے بوکھلانے اور نظریں چرانے پر وہ ہلکی سی خوشگوار حیرت کا شکار ہوا۔
"میری طرف دیکھ کر بات کرو۔" اس کے لہجے کی تپش پر ایک پل کو طوبیٰ کا دل بھی جیسے بھنور کھا کر رہ گیا۔
"بولتی کیوں نہیں ہو اب....." شاہ میر کے گمبھیر لہجے پر طوبیٰ کے صبیح چہرے کی رنگت ایک پل کو متغیر ہوئی۔
"ہاں بولو' میں نے کون سا قرضہ لے رکھا ہے تم سے۔" وہ جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر اب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے ضبط کا کڑا امتحان لے رہی تھی۔ شاہ میر کے اندر چھن کر کے کچھ ٹوٹا۔
"کیا واقعی چلا جاؤں واپس.....؟" شاہ میر نے سرگوشی کی۔
"میری بلا سے۔" اس نے بیزاری سے کندھے اچکا کر کہا۔ "پہلے کون سا میں نے دعوت دے کر بلوایا تھا۔" اس کے انداز میں اکتاہٹ تھی۔
"ایک وقت آئے گا کہ تم خود منتیں کیا کرو گی میری کہ واپس آجاؤ اور میں نہیں آؤں گا۔" وہ گہری نظروں سے اسے تکتا ہوا سنجیدہ ہوا۔
"اور یہ وقت ان شاء اللہ کبھی نہیں آئے گا۔" طوبیٰ جبراً" مسکرائی تو اس کے گالوں پر بڑے گہرے ڈمپل بنے اور شاہ میر کو اپنا دل ان گڑھوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا چکی تھی اور شاہ میر کا میز پر رکھا کافی کا کپ ٹھنڈا ہو کر بدذائقہ ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

سرد موسم کی شدت سے زیادہ اس دن کی تلخی نے شہزاد کو تھکا دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے آنے والے لمحوں کا خوف کسی زہریلے سانپ کی صورت میں کنڈلی مار کر اس کے کمرے میں آن بیٹھا ہو۔ رومیصہ کے کارنامے کے اثرات پوری سہگل فیملی کو بھگتنے تھے۔
اس کے اندر حبس اور گھٹن کا احساس ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔ اس نے بے اختیار اٹھ کر کھڑکیوں کے بلائنڈز ہٹا کر شیشہ پیچھے کر دیا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی کن من کے ساتھ موسم سرما کی ٹھنڈی یخ ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ کچھ دیر آسمان کی تاریکیوں میں اپنی قسمت کے روشن ستارے کو کھوجنے کے بعد تھک ہار کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی اور اس کے کراؤن سے ٹیک لگالی۔
سائیڈ میز پر رکھا آئی پیڈ اٹھا کر اس نے اپنی فیس بک آئی ڈی آن کی اور رومی سہگل کے نام سے بنے پیج کو سرچ کیا' جو تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے مل گیا تھا۔ اس پر رومی کی پوسٹ کردہ خرافات جوں کی توں موجود تھیں' جس کے لیے وہ دل ہی دل میں ڈھیروں دعائیں کر چکی تھی کہ کاش رومی خود اسے ڈیلیٹ کر دے۔ چند گھنٹوں میں اس پیج پر ہزاروں کی تعداد میں لائیکس اور بے شمار فضول کمنٹس کی بھرمار تھی۔
"ہم بھی بیمار ذہنیت کے لوگ ہیں جن چیزوں کو اخلاقیات کے دائرے سے باہر دیکھتے ہیں اس پر غیر اخلاقی کمنٹس کرنا بھی اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہیں۔" شہزاد نے بیزاری سے وہ پیج بند کر کے اپنی پروفائل کھولی۔
اچانک اس کی نظر اپنی فرینڈ لسٹ پر پڑی' اس لسٹ میں ہم زاد کا نام دیکھ کر اسے شاک لگا۔ وہ رک گئی۔ یہ آئی ڈی اس نے مری کانونیٹ کے زمانے میں بنائی تھی اور لندن جانے کے بعد بند کر دی تھی بیچ میں وہ کبھی کبھار اسے اوپن کر کے سرسری نظر ڈال لیتی لیکن اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ اس نے ہم زاد نام کی کسی آئی ڈی کو اپنے پاس ایڈ نہیں کیا تھا' اس کا مطلب تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا' پہلے اپنے اصل نام سے اس کی فرینڈ لسٹ میں ایڈ ہوا تھا اور

پھر اس نے اپنی پروفائل کا نام تبدیل کر دیا تھا۔
اس نے جلدی سے اس کی وال چیک کی' وہ کبھی کبھار سوشل ایشوز اور ملکی حالات پر انتہائی دلچسپ اسٹیٹس لگاتا تھا اور اس کے پاس تقریباً" سات سال پہلے ایڈ ہوا تھا۔ اسی فرینڈ لسٹ میں اس کے اسکول کے زمانے کے کئی کلاس فیلوز موجود تھے۔ جن کے نام اس کے ذہن سے نکل چکے تھے لیکن کسی کسی کی شکل تھوڑی بہت یاد تھی۔
"کیا یہ لوگ جانتے ہیں کہ "ہم زاد" نام کے پیچھے کون ہے۔۔۔؟" اس کے ذہن کی سلیٹ پر ایک سوال ابھرا۔
"یقیناً" جانتے ہوں گے۔" اس سوچ نے اس کے اندر توانائی کا ایک جہان بھر دیا۔
اس نے کچھ سوچ کر اپنی مری کانونٹ کے زمانے کی فرینڈ رودابہ کا نمبر ملایا' جس سے اس کی کسی زمانے میں اچھی دوستی تھی اور لندن جانے کے بعد بھی کچھ عرصہ سوشل میڈیا پر رابطہ رہا اور پھر دونوں اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن ہو گئیں۔
"شیری! تم زندہ ہو ابھی۔۔۔؟" دوسری طرف رودابہ اس کی آواز سن کر خوش گوار حیرت کا شکار ہوئی۔
"زندہ ہوں تو بات کر رہی ہوں ناں۔" وہ اس کے والہانہ انداز پر مسکرائی۔
"کب آئیں پاکستان اور بے وقوف لڑکی' آکر رابطہ کیوں نہیں کیا؟" وہ اپنے ازلی بے تکلفانہ انداز میں گویا تھی۔
"ابھی آئے ہوئے ٹوٹل تین چار دن ہی تو ہوئے ہیں مجھے۔۔۔" وہ چاہ کر بھی ویسی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کر پائی۔ ریزرو تو وہ شروع ہی سے تھی لیکن اب ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گئی تھی۔
"چلو پھر کل کالج میری طرف' بیٹھ کر کہیں کانونٹ دور کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔" رودابہ نے فوراً" ہی اسے دعوت دی جو اس نے کچھ سوچ کر قبول کر لی۔ دس پندرہ منٹ پرانی یادیں دہرانے کے بعد شہرزاد نے اچانک وہ سوال پوچھ ہی لیا جس کے لیے اس نے اسے کال کی تھی۔
"یہ فیس بک کے میچوئل فرینڈز میں "ہم زاد" کے نام کی آئی ڈی کس کی ہے؟"
"شیطان کی۔۔۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
"مطلب۔۔۔؟" وہ الجھ گئی۔
"آئی ڈونٹ نو یار' کوئی کلاس فیلو لگتا ہے' سب ہی کے بارے میں جانتا ہے' لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا' بہت مزے مزے کی پوسٹس لگاتا ہے' اس لیے ابھی تک ان فرینڈ نہیں کیا۔" رودابہ بڑی لاپروائی سے بتا رہی تھی۔
"لیکن اس طرح اپنی شناخت چھپانے کا فائدہ؟" شہرزاد کو مایوسی ہوئی۔
"ہو سکتا ہے اسے ہو' ویسے بھی ہر کسی کو اپنی لائف اپنے طریقے سے گزارنے کا حق ہے' ہم کسی کو اپنی رولز اینڈ ریگولیشنز کے پابند تو نہیں کر سکتے تم بتاؤ' کب پریکٹس اسٹارٹ کر رہی ہو۔" رودابہ نے اپنے مخصوص لاپروا انداز میں بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔
"ہاں' سوچ رہی ہوں کوئی فرم جوائن کر لوں۔" شیری نے سنجیدگی سے بتایا۔
"اگر ایسا کوئی پروگرام بن رہا ہے تو مجھے بتانا' ہو سکتا ہے میں تمہاری کچھ ہیلپ کر سکوں۔" رودابہ کے خلوص پر اسے کبھی کوئی شک نہیں ہوا تھا۔ اسی وقت شہرزاد کے کمرے کا دروازہ ہلکا سا بجا' رومیصہ تھکے تھکے سے انداز سے اندر داخل ہوئی۔
"شیور' وائے ناٹ' او کے روادبہ' کل ملتے ہیں' پھر بات ہو گی' ٹیک کیئر' بائے۔" اس نے جلدی سے فون بند کیا۔

"کیسے آنا ہو....؟" شہزاد نے دانستہ سپاٹ نظروں سے رومیصہ کی طرف دیکھا۔
"تم خفا ہو مجھ سے۔" رومی نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے پوچھا۔
"کیوں.... "شہزاد کا پرسکون انداز اسے مزید اضطراب کا شکار کر گیا۔
"اسی بات پر جس پر مام خفا ہیں۔" وہ ہلکا سا جھجک کر بولی۔
"تمہیں پتا ہے رومی میں کسی کی پرسنل لائف میں اس وقت تک انٹرفیئر نہیں کرتی جب تک وہ چیز کم از کم میری لائف پر افیکٹ (اثر انداز) نہ کرے، تمہاری زندگی ہے، تم اگر ایسی ہی گزارنا چاہتی ہو تو ایزیوش میں تمہیں منع نہیں کروں گی جیسے میں مام کو نہیں کرتی۔" شہزاد نے اس دفعہ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس کا دو ٹوک انداز اور سنجیدہ لہجہ رومیصہ کے لیے خاصی مایوسی کا باعث بنا۔
"تم ماما کی چیپ حرکتوں پر ہرٹ نہیں ہوتی ہو؟ کیا انہیں یہ سب سوٹ کرتا ہے؟" وہ متنفر لہجے میں گویا ہوئی۔
"کیا تمہیں سوٹ کرتا ہے وہ سب جو تم کر رہی ہو؟" شیری کے الٹا سوال کرنے پر وہ سٹپٹا گئی۔
"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔" وہ برا مان گئی۔
"انہوں نے بھی ایسا کچھ نہیں کیا۔" شیری نے ان کا دفاع کیا۔
"اس ایج میں آئے دن کے اسکینڈلز اور شادیاں، تمہارے نزدیک کچھ نہیں ہیں۔" وہ ہلکا سا جھنجلائی۔
"لائف پارٹنر کی ضرورت تو انسان کو ہر عمر میں رہتی ہے اور ان کی بدقسمتی کہ ان کی پہلی اور دوسری شادی کامیاب نہیں ہو سکی، دنیا میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ وہ دنیا سے کنارہ کشی کر کے ساری خوشیوں کو اپنے اوپر حرام کر لیں۔"
"وہ جان بوجھ کر ایسے کرپٹ لوگوں کا انتخاب کرتی ہیں۔" رومی تلخ لہجے میں گویا ہوئی۔
"کوئی بے وقوف انسان ہی جان بوجھ کر اپنے لیے کوئی برا انتخاب کر سکتا ہے اور کم از کم مام جیسی پریکٹیکل اور پروفیشنل وومن سے میں اس چیز کی توقع نہیں کرتی، یہ الگ بات ہے کہ اس معاملے میں ان کی قسمت ان کا ساتھ نہیں دیتی۔" شہزاد نے اس دفعہ کھل کر کہا۔
"تم مام کو ڈیفینڈ (دفاع) کر رہی ہو۔" وہ بیزار ہوئی۔
"نہیں میں تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں۔" وہ اپنے ازلی پرسکون انداز میں گویا ہوئی۔
"تمہیں نہیں پتا ان کے یہ فیصلے کتنے برے رہے ہیں میرے لیے۔" وہ ان سے حد درجہ خفا تھی۔
"انسان کے اپنے فیصلے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اپنے لیے۔" شیری نے اس کی تصحیح کی۔
"مام نے اپنی جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر تمہیں بھی اپنی طرف مائل کر لیا ہے، میں اچھی طرح جانتی ہوں انہیں دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا فن آتا ہے۔" وہ اب شہزاد کی طرف سے بھی بدگمان ہوئی۔
"تم بھی مجھ سے شیئر کر سکتی ہو ٹرسٹ می میں تمہیں بھی کبھی برا نہیں کہوں گی۔" شہزاد نے اسے اب نرمی سے گھیرنا چاہا۔
"مجھے ضرورت نہیں ہے۔" وہ ناراضی سے پاؤں پٹختی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی، لیکن شہزاد کو اس احساس نے طمانیت بخشی تھی کہ کم از کم اس کے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ موجود تھا۔ وہ اب رومیصہ کو اپنے طریقے سے سمجھانے کا تہیہ کر چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ڈانسنگ فلور تیز جلتی بجھتی بتیوں کے حصار میں تھا۔

انگلش میوزک کا تیز اور بے ہنگم شور' سماعتوں میں پہنچ کر نوجوان نسل کے جوش و جنون اور ولولے میں اضافہ کر رہا تھا۔

فلور پر تھرکتی' نامناسب لباس میں موجود لڑکیاں' دیکھنے والوں کے صبر کا امتحان بن رہی تھیں۔ وہاں موجود سبھی لوگوں کو اپنے اندر ایک ہیجان سا برپا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یہاں سکون کی تلاش میں آئی تھی۔

شہزاد کا مام کی حمایت کرنا اسے بری طرح سے **چبھا تھا**' اس کا خیال تھا کہ اس کی بہن کو بھی اس معاملے میں اسی کا ساتھ دینا چاہیے' لیکن اس کے رویے نے اسے نہ صرف مایوس کیا تھا بلکہ اچھا خاصا ڈپریشن میں مبتلا کر دیا تھا۔ تبھی وہ رات کے اس پہر اپنی دوست کنزہ کے ساتھ اس کلب میں موجود تھی۔ یہاں آکر بھی وہ انتہائی ذہنی خلفشار کا شکار تھی۔

اسکن ٹائیٹ جینز پر پنک شرٹ کے ساتھ اس نے ایک چھوٹا سا مفلر گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے' وہ پچھلے دو دن سے بالکل نہیں سو سکی تھی' اور اس وقت کنزہ اسے چھوڑ کر مکمل تفریح کے موڈ میں تھی' تبھی اسے ایک کونے میں اکیلے بیٹھنا پڑا۔

"ہائے ہنی..." ایک چوبیس پچیس سال کا لڑکا لڑکھڑاتا ہوا اس کے بالکل پاس آن کھڑا ہوا اور اس کے چہرے پر گری لٹ کو چھو کر بدتمیزی سے بولا۔

"ہائے..." رومی نے بیزاری سے اسے دیکھا' وہ یقیناً "نشے میں تھا۔

"آؤ' جوائن کرو مجھے..." وہ زبردستی اس کا بازو پکڑ کر ڈانسنگ فلور پر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں۔" **رومیصہ** کا چہرہ سرخ ہوا اور وہ جھنجلا کر اپنا بازو اس کی مضبوط گرفت سے چھڑانے لگی۔

"تو پھر یہاں کیا جھک مارنے آئی ہو۔" اس کا طنزیہ لہجہ **رومیصہ** کو آؤٹ کر گیا' اس نے گھما کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

"یو بچ (Bitch)..." وہ لڑکا مشتعل ہوا۔ "آئی ول کل یو..." وہ خطرناک ارادوں کے ساتھ **رومیصہ** کی طرف بڑھا' لیکن اس سے پہلے ہی اس کے دو ساتھی درمیان میں آ گئے۔

"روحیل' ڈونٹ لوز یور ٹیمپر۔" اس کے ایک ساتھی نے زبردستی اسے پکڑا۔

"اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا' جسٹس محمود کے بیٹے پر' اوقات کیا ہے اس کی۔" اس کا لہجہ درشت اور جھنجلایا ہوا تھا' سارا نشہ بھی ہرن ہو گیا تھا۔

"آپ پلیز جائیں یہاں سے۔" اس کے اسی دوست نے التجائیہ لہجے میں **رومیصہ** سے کہا۔

"نہیں جاتی' کیا کر لیں گے آپ..." اس نے بھی ہٹ دھرمی دکھائی' لیکن اسی وقت کنزہ کو ساری صورت حال سمجھ میں آ چکی تھی۔

"آر یو میڈ...؟" **رومیصہ** کی دوست کنزہ اسٹیج سے بوکھلا کر اتری اور اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی۔

"جانتی ہو' وہ جسٹس محمود کا بیٹا ہے' روحیل محمود..." کنزہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"جسٹس کا بیٹا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس ہر بے ہودہ حرکت کرنے کا پرمٹ ہے۔" **رومیصہ** کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے اس کی دماغی کھولن کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ تیز بارش میں بغیر کسی سوئٹر یا کوٹ کے پارکنگ میں کھڑی تھی۔

"میں گھر جا رہی ہوں..." اس کا دل ایک دم ہی یہاں کے ماحول سے بھی اچاٹ ہو گیا۔

"ادھر دو گاڑی کی چابی' آدھی رات کو مارو گی کہیں۔ ویسے بھی موسم اتنا خراب ہے۔" کنزہ نے اسے اگلی نشست کی طرف دھکیلتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور برق رفتاری سے گاڑی مین روڈ پر لے آئی۔

تیز بارش کے تسلسل میں کچھ کمی آگئی تھی' لیکن اب ژالہ باری کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ رات کی تیرگی میں' اس موسم میں گاڑی چلانا واقعی مشکل تھا' لیکن کنزہ بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہی تھی۔

موسم سرما کی سخت اور کہر جما دینے والی سردی کا لطف لینے کے لیے چند منچلے بھی میدان میں اتر آئے۔ اسلام آباد ایکسپریس وے پرون ویلنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا' رات کے اس پہران منچلوں نے پیٹرولنگ پر موجود پولیس والوں کو ایک دم ہی پریشان کر دیا تھا' یہ سب بڑے گھرانوں کی بگڑی ہوئی اولادیں تھیں جن کو منع کرنا بھی ایک درد سری تھی۔

رومیصہ بیگ سے لائٹر نکال کر سگریٹ سلگانے لگی۔ اس کے اندر اپنی ہی سوچوں کا ایک جہنم آباد تھا جس نے اسے باہر کے موسموں سے لاتعلق کر دیا تھا۔ اس نے ایک دم ہی گاڑی کا شیشہ نیچے کیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کنزہ کو کپکپی میں مبتلا ہو گئے۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو....." کنزہ نے اپنی طرف لگے بٹن سے گاڑی کا شیشہ اوپر کر کے ہیٹر چلایا۔

"مجھے suffocation (گھٹن) فیل ہو رہی ہے۔" اس کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"کیا پرابلم ہے تمہارے ساتھ رومیصہ! جو چاہتی ہو' کرتی ہو' پھر بھی ریلیکس نہیں ہوتی ہو۔" وہ حیران ہوئی۔

کنزہ کے ساتھ اس کی دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور ویسے بھی رومیصہ لمبے عرصے کے تعلق پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ وہ چیزوں کے ساتھ ساتھ بہت جلد لوگوں اور رشتوں سے بے زار ہو کر انہیں چھوڑ دیتی تھی۔ یہ اس کی شخصیت کی سب سے بڑی خامی تھی۔ جو چیز اسے بہت زیادہ متاثر کرتی' وہ کچھ ہی دن کے بعد بے قدری سے اس کے کمرے میں رُل رہی ہوتی۔

"پتا نہیں' کچھ کمی ہے' کچھ نہ ہونے کا احساس ہے' جو مجھے کھل کر خوش ہونے نہیں دیتا....." اس نے پہلی دفعہ بے تکلفی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"مثلاً"....؟" کنزہ نے جیسے ہی گردن موڑ کر رومیصہ کی طرف دیکھا' اسے جھٹکا لگا' کیوں کہ اس کی نظر رومیصہ کی طرف کے کھڑکی کے شیشے سے ہوتی ہوئی باہر سڑک پر جسٹس محمود کے بیٹے کی ہیوی بائیک پر پڑی۔ وہ نہ جانے کب سے ان کے تعاقب میں تھا۔ اس نے رومیصہ کو بتائے بغیر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ اسے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم....." کنزہ نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے یوں ہی پوچھا۔ وہ پچھلے شیشے سے روحیل کو دیکھ رہی تھی جو تھوڑا پیچھے رہ گیا تھا۔

"تقدیر کا ہاتھ بہت بے رحم ہوتا ہے' وہ جن لوگوں پر بے دریغ دونوں ہاتھوں سے لٹاتی ہے' ان کو بھی مکمل خوش ہونے نہیں دیتی' ان کی زندگیوں کا بھی کوئی نہ کوئی ایک کونہ تشنہ رکھتی ہے تاکہ لوگ بھکاریوں کی طرح سر جھکائے اس کے سامنے گڑگڑاتے رہیں' ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس سے مانگتے رہیں' لیکن پھر بھی خواہشوں کی تکمیل کے زم زم ہر کسی کے لیے جاری نہیں ہوتے۔" کنزہ گاڑی چلاتے ہوئے اس کی بھڑاس سن رہی تھی۔

روحیل محمود اپنی بائیک کو دوبارہ اس کی گاڑی کے عین برابر لے آیا تھا' کنزہ نے کن اکھیوں سے دیکھا' وہ اپنی لیدر کی جیکٹ سے ایک چھوٹا اور جدید قسم کا پسٹل نکال رہا تھا۔

"او مائی گاڈ' یہ باسٹرڈ تو وہی ہے اور اس کے ہاتھ میں پسٹل ہے۔" رومیصہ کی بھی اچانک اس پر نظر پڑی اور

اور وہ بوکھلا گئی۔
"ٹیک اٹ ایزی۔۔۔" کنزہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اسے تسلی دینا چاہی۔
"گاڑی روکو۔۔۔" روحیل بلند آواز میں چیخا۔ وہ اپنا پسٹل والا ہاتھ فضا میں لہرا رہا تھا۔
کنزہ نے ایک دم خوف زدہ ہو کر بریک لگائی اور روحیل جو اچانک ہی اپنی بائیک ان کے سامنے لے آیا تھا' تیز بارش اور پھسلن زدہ سڑک پر اس کی بائیک قابو سے باہر۔ ہو کر ان کی گاڑی سے ٹکرائی اور وہ اچھل کر بری طرح سڑک پر جا گرا۔

بارش سے زیادہ تیز اس کے سر سے نکلنے والا خون کا فوارہ تھا۔ اس کا سر بہت بری طرح زمین سے ٹکرایا تھا اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد اس کا جسم بالکل ساکت ہو گیا۔ اس کی ہیوی بائیک بھی دور جا گری تھی۔
کنزہ اور رومیصہ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی اور ان کی بدقسمتی تھی کہ پولیس کی پٹرولنگ پر موجود گاڑی لنک روڈ سے اچانک ہی مین روڈ پر آن نکلی اور انھوں نے روحیل محمود کو اپنی آنکھوں سے ان کی گاڑی سے ٹکرا کر بہت بری طرح سڑک پر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔
دو پولیس آفیسرز جلدی سے گاڑی سے اترے اور بڑی سُرعت سے روحیل کی طرف پہنچے کنزہ اور رومیصہ بھی گاڑی سے باہر نکل چکی تھیں۔ ٹھنڈا یخ موسم ان کی رگوں میں خون جما رہا تھا' لیکن وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔
"آئی تھنک ہی از نو مور۔" پولیس آفیسر کے منہ سے نکلنے والے اس فقرے کو سن کر ان دونوں کو لگا جیسے مارگلہ کی ساری پہاڑیاں ان کے وجود سے ٹکرا کر ان کے پرخچے اُڑا گئی ہوں اور وہ دونوں منہ پر ہاتھ رکھے سخت صدمے سے روحیل کے تیز بارش میں زمین پر پڑے ۔۔۔۔۔۔ مردہ وجود کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے پیچھے تھا اور موت اس کے تعاقب میں تھی اور جیت اجل ہی کی ہوئی تھی۔

✲ ✲ ✲

مری کے بادلوں کے ساتھ فضاؤں میں رقص کرنے والے اولے' اب روئی کے گالوں کی صورت میں ہر چیز پر سفید چادر بچھا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پورے شہر نے چاندی کا لباس زیب تن کر لیا ہو۔ سڑکوں' عمارتوں' درختوں اور ہر چیز پر برف ہی برف تھی۔
میر ہاؤس کا پچھلا دروازہ کھلا اور برساتیاں پہنے وہ تینوں لڑکیاں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے باہر نکلیں' موسم کی شدت بھی ان کے آہنی ارادوں میں کوئی دراڑ نہیں ڈال سکی۔ وہ زمین پر بچھے برف کے فرش پر احتیاط سے چل رہی تھیں۔
درشہوار کے ہاتھ میں چھاتا جب کہ طوبیٰ نے ہاتھ میں ایک ٹارچ اٹھا رکھی تھی اور نمیرہ کے پاس ایک شاپر تھا' جس میں اس مشن کی تکمیل کا سامان موجود تھا۔ ان تینوں نے بڑی احتیاط سے محمد ہادی کے گھر کی چھوٹی سی دیوار پھلانگی' وہ تینوں اب اس کے گھر میں موجود تھیں۔
"جلدی کرو۔۔۔" سردی کی شدت سے طوبیٰ کے دانت بج رہے تھے۔
"تو کیا اُڑنا شروع کر دیں۔۔۔" درشہوار جھنجلا گئی۔
"بکو مت۔ جلدی لاک لگاؤ۔" طوبیٰ نے غصے سے درشہوار کی طرف دیکھا' جو بڑی احتیاط سے محمد ہادی کے گھر کے داخلی دروازے کی کنڈی چڑھا رہی تھی اور منصوبے کے تحت اب اسے باہر اپنا قفل لگانا تھا۔ ہادی کے گھر میں داخل ہونے کا واحد یہی دروازہ تھا جس پر لگا بھاری بھر کم قفل' اب گھر میں موجود مکینوں کو اندر قید کر چکا تھا۔

"پوسٹر نکالو....." درشہوار نے مشن کی کمانڈ سنبھالتے ہوئے اگلا حکم جاری کیا۔
طوبیٰ نے شاپر سے ایک درمیانی سائز کا پوسٹر نکالا اور دروازے پر چسپاں کردیا۔ جس پر بڑے بڑے حروف میں "گوانتاناموبے" لکھا ہوا تھا۔
"نمیرہ باہر کے گیٹ پر لگے تالے میں ایلفی ڈال کر آؤ جلدی سے....." درشہوار نے سرگوشی میں اگلا حکم جاری کیا۔
"یار "اسنو فالنگ" بہت زیادہ ہے۔" ہادی کے برآمدے میں کھڑی نمیرہ جھجک کر بولی۔
"بے فکر رہو' یہ برف' تمہارے بھاری بھرکم جسم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہم لوگ اپنا کام کرچکے ہیں۔" طوبیٰ نے غصے سے کہا۔
"بکواس مت کرو' جاتی ہوں' تم دونوں سب سے اوکھا کام مجھے دیتی ہو۔" رات کے اندھیرے میں برف کے فرش پر احتیاط سے قدم رکھتی ہوئی نمیرہ بڑی مشکل سے ہادی کے گیٹ تک پہنچی اور اندر کی طرف لگے تالے میں ایلفی ڈال کر جیسے ہی پلٹی' اس کا پاؤں پھسلا اور وہ بڑی سرعت سے لان کے نچلے حصے میں جاگری' درشہوار اور طوبیٰ نے اپنے حلق سے نکلنے والے قہقہوں کو بمشکل لبوں پر ہاتھ رکھ کر اندر ہی دبایا۔
"ہائے منحوسو تم لوگوں کی انتقامی کارروائیاں مروا گئیں مجھے....." وہ زمین پر لیٹی دہائیاں دے رہی تھی۔
"ہمت کرو' ورنہ برف کی قبر میں دفن ہوجاؤگی۔" طوبیٰ اور درشہوار نے بمشکل اسے اٹھایا اور کمرے تک پہنچا کر ان کی اپنی حالت بری ہوگئی' لیکن وہ منظر یاد کرتے ہی ان دونوں کے منہ سے دوبارہ ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا جو نمیرہ کو سخت ناگوار گزرا۔
"اللہ کرے تم دونوں کی داڑھ میں درد ہو....." آتش دان کے عین سامنے بیٹھی نمیرہ بلند آواز میں انہیں بددعائیں دے رہی تھی۔
"ایک تو اتنی بڑی لاش کو ہم اتنی مشکل سے گھسیٹ کر کمرے تک لائے ہیں' اوپر سے تم ہمیں ہی بددعائیں دے رہی ہو۔" طوبیٰ نے اپنے بازو دباتے ہوئے اپنی کزن کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔ جو دو کمبل لیے بھی ابھی تک کانپ رہی تھی۔
"ہاں تو تم دونوں کے انتقام کی جلتی بھٹی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کون ساتھ دیتا ہے تمہارا۔" نمیرہ غصے سے بولی۔
"چلو اس خوشی میں یہ گرماگرم چائے پیو....." درشہوار نے الیکٹرک کیٹل سے بنائی چائے کا بھاپ اڑاتا کپ اس کے سامنے رکھا۔
"میں ساتھ تین بوائل انڈے بھی کھاؤں گی۔" نمیرہ کی اگلی فرمائش پر درشہوار کا دماغ گھوما۔
"میں نے کون سی مرغیاں پال رکھی ہیں کمرے میں....." وہ تڑخ کر بولی۔
"تھوڑا انتظار کرلو' رزلٹ آنے والا ہے' بہت انڈے مل جائیں گے فری میں۔" طوبیٰ نے چائے کی بلند آواز میں چسکی لی۔
"دوبارہ چائے پیتے ہوئے یہ شوں کی آواز نکالی تو گلا دبادوں گی تمہارا....." درشہوار جھنجلا کر طوبیٰ کی طرف پلٹی۔
"گلا تو تمہارا صبح وہ ہیرو دبائے گا' جب "گوانتاناموبے" جیل کا دروازہ توڑ کر باہر نکلے گا۔" طوبیٰ نے مسکرا کر یاد دلایا۔
"ہاں تو پنگا کس نے لیا تھا اس نے....." درشہوار اب چائے میں رس بھگو بھگو کر مزے سے کھا رہی تھی۔
"گوانتاناموبے' دنیا کی خطرناک جیل....." طوبیٰ یاد کرکے بلند آواز میں ہنسی۔

"ایسے انتقامی منصوبے تمہارے ذہن میں خود سے آجاتے ہیں یا کوئی اسپیشل آن لائن کورس کیا ہے تم نے۔۔۔" نمیرہ نے اپنی کہنی پر لگی رگڑ پر کریم لگاتے ہوئے یوں ہی پوچھا۔ اس سے پہلے کہ درشہوار اس کی بات کا کوئی تیکھا سا جواب دیتی۔ اس کے کمرے کا دروازہ بجا' تینوں کی روح فنا ہو گئی' دیوار گیر گھڑی رات کے ڈھائی بجا رہی تھی۔

"کون۔۔۔؟" درشہوار نے انہیں چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے نیند بھری آواز نکالی۔

"ارسل۔۔" نمیرہ کے بڑے بھائی کی سنجیدہ آواز سن کر تینوں نے سکون کا سانس لیا۔

"توبہ ہے ڈرا ہی دیا' آپ کب آئے اسلام آباد سے۔۔۔؟" درشہوار نے منہ بناتے ہوئے دروازہ کھولا' اندر داخل ہوتے ہی وہ سامنے کا منظر دیکھ کر حیران ہوا' نمیرہ قالین پر کمبل اوڑھے نیم دراز تھی اور اس کے ساتھ فلور کشن پر طوبیٰ براجمان تھی۔

"شام میں ہی آ گیا تھا' یہ بتاؤ' میری یو ایس بی تھی تمہارے پاس۔" ارسل قائد اعظم یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس کر رہا تھا اور زیادہ تر نور محل میں وہاج بھائی اور فارحہ بھابھی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ دوستانہ مزاج کا حامل ارسل' اپنی بہن نمیرہ کے برعکس بہت نرم فطرت کا حامل تھا۔

"ہاں ہاں میرے ہی پاس ہے' لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم لوگ جاگ رہے ہیں۔" درشہوار حیران ہوئی۔

"تم لوگوں کے کمرے سے آنے والی آوازیں سن کر اندازہ ہو گیا تھا' ساری فوجیں ہیڈ کوارٹر میں اکٹھی ہیں۔" ارسل نے درشہوار کے کمرے کو ہیڈ کوارٹر کا نام دے رکھا تھا' کیوں کہ شرارتوں کے سارے منصوبے یہیں بیٹھ کر بنتے تھے۔

"آجائیں آپ بھی' چائے پئیں گے۔۔۔" نمیرہ نے کہنی کے بل اٹھتے ہوئے اپنے بھائی کو دعوت دی۔

"نہیں تم لوگ انجوائے کرو' مجھے اپنی ایک اسائنمنٹ مکمل کرنی ہے' درشہوار کہاں ہے میری یو ایس بی۔۔۔" ارسل کو یاد آیا کہ وہ کس کام سے آیا تھا۔

"اس کے لیے تمہیں میرو بھیا سے کونٹیکٹ کرنا ہوگا کیوں کہ ان ہی کے لیپ ٹاپ پورٹ میں لگی ہوئی ہے۔" درشہوار نے مسکرا کر بتایا۔

"وہ تو لیپ ٹاپ تو لے گیا وہ کھاریاں۔۔۔" ارسل ہلکا سا مایوس ہوا۔

"کھاریاں' کیا مطلب۔۔۔؟ ابھی دو ڈھائی گھنٹے پہلے تو نیچے ملاقات ہوئی ہے ان کی طوبیٰ سے' کیوں طوبیٰ؟" درشہوار کے ایک دم پوچھنے پر وہ ہلکا سا گڑبڑا گئی۔

"ہاں' ہاں بالکل۔۔۔" طوبیٰ نے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔

"آئی ڈونٹ نو' میرے ساتھ بھی اس کی دو گھنٹے پہلے ہی بات ہوئی تھی اور تب وہ مری سے نکل رہا تھا۔" ارسل نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"لیکن اس طرح اچانک کیوں؟ انہوں نے تو سنڈے کو جانا تھا۔" درشہوار پریشان ہوئی اور جسے اصل میں فکرمند ہونا چاہیے تھا وہ مزے سے بیٹھی خشک میوے کھا رہی تھی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں' مجھے کچھ نہیں بتایا اس نے۔۔۔" ارسل نے اپنا دامن بچایا۔

"یہ کیسے ممکن ہے' آپ کو نہ بتایا ہو۔۔۔" درشہوار کو بالکل یقین نہیں آیا کیوں کہ وہ جانتی تھی شاہ میر اور ارسل ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے دوست بھی تھے اور ایک دوسرے کے گہرے رازداں بھی۔

"بھئی' میں اس کا پرسنل اسسٹنٹ تھوڑی ہوں۔ طوبیٰ سے پوچھو' شاید اسے کچھ بتایا ہو۔" ارسل کے شرارتی انداز پر طوبیٰ بوکھلا گئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی چلغوزوں کی پلیٹ چھوٹ کر نیچے قالین پر جا گری۔ ارسل

اور در شہوار کے ساتھ ساتھ نیمونے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر ایسے ہوائیاں اڑ رہی تھیں جیسے وہ چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔

☆ ☆ ☆

مری میں محمد ہادی کی صبح کا آغاز بڑے ہنگامہ خیز انداز سے ہوا تھا۔
ملازم گل خان نے انہیں بتایا کہ باہر کا دروازہ کسی نے لاک کر رکھا ہے۔ کچن کی کھڑکی کی سلاخ توڑ کر گل خان باہر نکلا تو ایک موٹا تازہ تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا اور جب اس نے گھر کے گیٹ کو کھول کر باہر جانا چاہا تو معلوم ہوا کہ پہلے سے اندر لگے لاک کے ساتھ بھی کوئی کارستانی ہو چکی ہے۔
اس برفانی موسم میں دو دو تالوں کو توڑنا اور پھر تالا توڑنے سے گیٹ کی کنڈی ہی اکھڑ گئی تھی' گل خان بڑی مشکل سے کسی بندے کو ڈھونڈ کر لایا تھا جس نے گیٹ کی کنڈی کو دوبارہ اس کی اصلی حالت میں جوڑا تھا۔ دوسرا گل خان رات کو گیزر جلانا بھی بھول گیا تھا اور اس سارے چکر میں دن کے بارہ بج چکے تھے اور اس وقت آفس جانا خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا کیوں کہ ڈی ایف او کے دورے کی اطلاع انہیں مل چکی تھی۔
"تم مانو یا نہ مانو' ساری بے ہودگی اسی "در شہوار گینگ" کی ہے۔" محمد ہادی نے غصے میں بالکل درست اندازہ لگایا۔
"ظاہر ہے اور کون کر سکتا ہے ہمارے ساتھ یہ حرکت؟" سعد کمبل میں بکل مارے دونوں پاؤں صوفے پر رکھے بیٹھا ہاتھوں کو رگڑ کر سردی کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"خواہ مخواہ آفس سے بھی چھٹی کرنا پڑ گئی' اب سنڈے کو اس ڈی ایف او کی جھاڑ سننا پڑے گی مفت میں۔" ہادی بے زاری سے گویا ہوا۔
"ویسے بڑے ہی شیطانی دماغ ہیں ان لڑکیوں کے....." سعد نے مسکراتے ہوئے تھرماس سے گرما گرم چائے کپ میں انڈیلی۔
"یہ تو کھلی غنڈہ گردی ہے۔" ہادی کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہوا۔
"غنڈا گردی نہیں داداگیری۔" سعد نے ہنس کر لقمہ دیا۔
"ان کو ذرا بھی کسی کا خوف نہیں..." ہادی نے غصے میں گرما گرم چائے کا کپ منہ سے لگایا۔
"ویسے گھر کو نام بہت مزے کا دیا ہے "گوانتاناموبے"..." سعد کو ایک دم ہی یاد کر کے ہنسی آگئی۔
"میں آج ہی میر حاکم علی کو بتا کر آتا ہوں ان کے گھر کی عورتوں کی کارستانیاں...." ہادی کا دوران خون ایک دفعہ پھر بلند ہوا۔
"ٹیواٹ یار' خواہ مخواہ۔ بات بڑھ جائے گی۔" سعد نے بوکھلا کر اس کی شکل دیکھی' وہ واقعی سنجیدہ تھا۔
"اگر اس سلسلے کو یہیں نہ روکا گیا تو ان کی بے ہودگیوں کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا۔" ہادی نے ناشتے کی ٹرے کو اپنی طرف کیا۔ اس سارے ہنگامے میں صبح کا ناشتا بھی خاصا لیٹ ہو گیا تھا۔
"ڈونٹ وری' میں ارسل سے بات کروں گا' اس سے اچھی گپ شپ ہے میری...." سعد نے اسے تسلی دی۔
"اب یہ ارسل صاحب کون ہیں....؟" ہادی نے بے زاری سے ٹوسٹ پر جیم لگایا۔
"میر حاکم علی کا نواسا اور میر محتشم کا بھانجا' اسی گھر میں رہتا ہے اور اکثر واک پر اس کے ساتھ گپ شپ رہتی ہے میری۔" اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

"ضرور بات کرنا' ورنہ میں زیادہ دیر تک لحاظ نہیں کروں گا۔" ہادی کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

"اچھا چھوڑو' ذرا ٹی وی اسکرین پر دیکھو' عالیہ آنٹی' کتنی گریس فل لگ رہی ہیں۔" سعد کے ہلکے پھلکے انداز پر اس نے ٹی وی پر نظریں دوڑائیں اور اپنے والدین کو سامنے دیکھ کر اس کا سارا اشتعال اور غصہ جھاگ بن کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔

بیرسٹر عالیہ قریشی' سرمئی رنگ کے سوٹ کے ساتھ نیلی شال میں ڈائس پر کھڑی انتہائی پروقار لگ رہی تھیں۔ اسلام آباد کرینیٹ لائنز کلب میں سیمی نار کی فوٹیج چل رہی تھی۔ عالیہ قریشی کے بعد کیمرہ عبداللہ قریشی صاحب کو بھی خطاب کرتے ہوئے دکھا رہا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے لگے بینر پر آج کے سیمی نار کا موضوع تحریر تھا۔

"بدعنوانی کے خاتمے میں نوجوان طبقے کا کردار" سیمی نار کے اختتام کے بعد بھی بے شمار ٹی وی کیمروں کی روشنیوں نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ وہ دونوں ہی بڑی متاثر کن شخصیت کے حامل تھے۔ عالیہ قریشی خود تو بیرسٹر تھیں اور ان کے شوہر قومی احتساب بیورو میں ڈائریکٹر جنرل کے اہم عہدے پر فائز تھے اور دونوں ہی کئی انسانی حقوق کی تنظیموں کے ساتھ کام کر چکے تھے۔

کیمرہ اب عبداللہ قریشی کو فوکس کیے ہوئے تھا۔ سیاہ سوٹ میں ان کی کنپٹی سے جھانکتی سفیدی ان کے وقار میں کئی گنا اضافہ کر رہی تھی۔ ان کی گفتگو کا انداز اور لہجہ متاثر کن تھا اور ان کے دلائل میں بہتے دریا کی سی روانی ہوتی تھی' اس کی بڑی وجہ ان کا وسیع مطالعہ اور متاثر کن تعلیمی ریکارڈ تھا۔ ہادی نے جلدی سے ٹی وی کی آواز کو بڑھایا۔ اپنے والدین کو ہمیشہ ایک ساتھ دیکھنا اس کو بڑی فطری سی خوشی کا احساس بخشتا تھا۔

"میم اینٹی کرپشن ڈے پر کیا آپ ہمارے ناظرین کو سادہ اور آسان الفاظ میں بتائیں گی کہ اصل میں کرپشن ہے کیا....؟" ایک نیوز چینل کی رپورٹر کے سوال پر مسز عالیہ قریشی کے ہونٹوں پر بڑی دھیمی سی مسکراہٹ ابھری۔

"ایک مہذب معاشرے میں رہتے ہوئے آپ کا ہر وہ عمل جو قانونی' اخلاقی' معاشرتی' سماجی اور مذہبی حدود سے تجاوز کر جائے' کرپشن کے زمرے میں آتا ہے۔" وہ اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"ہم اپنی سوسائٹی سے آخر کیسے کرپشن کا خاتمہ کر سکتے ہیں....؟" ایک اور نیوز رپورٹر نے ان کے شوہر عبداللہ قریشی کو گھیرا۔

"دیکھیں کرپشن کا خاتمہ کسی ٹارگٹ سے نہیں بلکہ ایک مسلسل عمل سے ہونا چاہیے۔" عبداللہ قریشی کا انداز خاصا بارعب تھا' شاید اس کی وجہ وہ پوسٹ تھی جس پر وہ کافی عرصے سے تعینات تھے۔

"وہ کیسے.... آپ اس پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟۔"

"کرپشن کبھی بھی چند سیاست دانوں یا کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے کرپٹ لوگوں کو جیل کی سلاخوں میں ڈالنے سے ختم نہیں ہو گی' اس کے لیے ہمیں اپنی اخلاقی اقدار کو فروغ دینا ہو گا۔ معاشرتی تفریق کو ختم کرنا ہو گا اور لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال کو سب کے لیے یکساں کرنا ہو گا۔" اس سوال کا جواب بیرسٹر عالیہ قریشی کی طرف سے بڑے تحمل اور متانت بھرے انداز میں آیا تھا۔

"یہ بات تو طے ہے کہ آنٹی عالیہ جہاں بھی ہوں' پورے ماحول پر چھا جاتی ہیں۔" سعد نے کھلے دل سے انہیں سراہتے ہوئے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کی آواز کم کی۔

"ماشاء اللہ بہت کمپوزڈ اور اسٹرونگ نروز کی حامل ہیں تمہاری مدر۔"

"یہ اپنی پروفیشنل لائف میں جتنی کمپوزڈ اور اسٹرونگ نروز کی حامل نظر آتی ہیں' اپنی پرسنل لائف میں اتنی ہی ایموشنل ہیں۔" ہادی نے ہنس کر تصحیح کی۔

"لیکن صرف تمہارے معاملے میں۔" سعد نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں میرے معاملے میں تو بہت پوزیسو ہیں۔" وہ بڑے دل سے مسکرایا۔

"تمہیں پتا ہے میں پری میچورڈ بے بی تھا اور ایک ماہ مجھے نرسری میں رکھنا پڑا اور وہ ایک مہینہ ماما نے پر اپر کھانا نہیں کھایا تھا اور میری پیدائش میری سگی پھپھو کے ہاتھوں ہوئی تھی جو بہترین گائناکولوجسٹ تھیں' لیکن جب تک میری کنڈیشن اسٹیبل نہیں ہوئی ماما روزانہ' پھپھو سے لڑتی تھیں کہ تم نے میرا کیس خراب کردیا۔" ہادی نے ماضی کی چند چیزوں کو پہلی دفعہ سعد سے بانٹا۔

"ہاں اتنا تو پتا ہے مجھے' پورے تیرہ سال بعد قدم رنجہ فرمایا تھا تم نے دنیا میں۔" سعد نے مسکراتے ہوئے توسٹ پر جیم لگایا۔

"ماما نے میرے ایک ایک دن کی تصویروں کا ایک پورا ریکارڈ مرتب کر رکھا ہے۔" ہادی کی بات پر وہ خوش گوار حیرت کا شکار ہوا۔ اسی وقت ہادی کے سیل فون کی گھنٹی بجی' دوسری طرف منااہل تھی اس کی پھوپھی زاد کزن۔

"ہاں بھئی منو' پہنچ گئی ہو گھر....." ہادی نے اس کی کال اٹینڈ کرتے ہی اسے چھیڑا۔ سعد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت کم لوگوں کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے بات کرتا تھا۔

"جی جناب' میں تو پہنچ گئی ہوں' تم اپنی خیر مناؤ۔" منااہل کھلکھلا کر ہنسی۔

"کیا مطلب.....؟" وہ اس کی شرارت بھری ہنسی پر الجھا۔

"عالیہ ممانی کا موڈ سخت آف ہے' پتا ہے ناں آج ویڈنگ اینور سری ہے ماموں' ممانی کی۔" منااہل کی بات پر وہ ہلکا سا بوکھلایا۔

"او مائی گاڈ' میرے تو ذہن ہی سے نکل گیا تھا' ابھی پہنچتا ہوں میں گھر' تم ماں کو ذرا ریلیکس کرو۔"

"میں تو کرلوں گی' لیکن تم ان کے لیے گفٹ لینا مت بھولنا۔" اس کی اگلی بات پر وہ ہلکا سا پریشان ہوا۔

"تمہیں پتا ہے ناں' مجھے لیڈیز شاپنگ کا کوئی ایکسپرینس نہیں' گھر پہنچ کر میں تمہیں بیل دوں گا' فوراً" باہر نکل آنا' سپر مارکیٹ سے کچھ لے آئیں گے۔" اس نے جلدی جلدی پلان بتایا۔

"اوکے' جلدی پہنچو' میں نے کیک بیک کرلیا ہے۔" منااہل نے مسکراتے ہوئے فون بند کیا۔

"کیا ہوا.....؟" سعد نے پریشانی سے پوچھا۔

"یار ماما' پاپا کی ویڈنگ اینور سری تھی اور میرے ذہن ہی سے نکل گیا' اب بھی منو نہ بتاتی تو ماں تو مجھے سچ مچ قتل کردیتیں۔"

"منو؟ یہ کون ہے' پہلی دفعہ سنا ہے یہ نام....." سعد نے حیرانی سے دریافت کیا۔

"میری کویت والی پھپھو کی بیٹی ہے' اکنامکس میں ماسٹرز کررہی ہے اور بچپن سے ہمارے ہی گھر میں رہ رہی تھی' لیکن اب کچھ عرصے سے ہاسٹل شفٹ ہوگئی ہے' لیکن آنا جانا لگا رہتا ہے۔" ہادی کی اطلاع پر وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"خاصی فرینک لگتی ہے تمہارے ساتھ....." اس نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔ "کوئی چکر و کر تو نہیں.....؟"

"گدھے' رضاعی بہن ہے میری....." ہادی نے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

"رضاعی بہن' وہ کیسے.....؟"

"میری پیدائش پر ماما بہت بیمار ہوگئی تھیں اور باہر کا دودھ سوٹ نہیں کررہا تھا مجھے تو میری پھپھو نے پورے دو ماہ اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی فیڈ کروایا تھا اپنا....." ہادی نے اس بار ذرا تفصیل سے بتایا۔

"او سوری یار....." سعد ایک دم شرمندہ ہوا۔

"اب تم بیٹھ کر شرمندہ ہوتے رہو، مجھے فوراً نکلنا ہے ورنہ ماما کا پارہ مہنگائی کی طرح بڑھتا جائے گا۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچا اس کے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور دوسری طرف درشہوار کے کمرے کی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی۔ ساؤنڈ سسٹم پر بلند آواز میں پھر وہی منحوس گانا گونج رہا تھا۔ جس سے ہادی کو چڑ ہو گئی تھی۔

گھوڑے جیسی چال، ہاتھی جیسی دم۔۔۔

او ساون راجا، کہاں سے آئے تم۔۔۔؟

مجھے کمرہ تبدیل کر لینا چاہیے۔۔۔ اس نے بے زاری سے کھڑکی بند کرتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا اور واپسی پر اس پر عمل درآمد کرنے کا بھی تہیہ کر لیا کیوں کہ درشہوار کے کمرے کی کھڑکی سے اسے بہت سی ان کہی کہانیوں کی سرگوشیاں آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ ایسی کسی داستان کا مرکزی کردار نہیں بننا چاہتا تھا۔

✲ ✲ ✲

ایف ایٹ سیکٹر میں واقع نور محل کے اندر کا موسم آج باہر کے موسم سے زیادہ سرد تھا۔ وہاج کا موڈ انتہائی بگڑا ہوا تھا اور فارحہ، سہمے ہوئے انداز میں اپنی الماری کے اندر سے ان کی جامنی رنگ کی شرٹ ڈھونڈ رہی تھی۔ جس کی آج اس کے مجازی خدا کو اچانک ہی یاد ستانے لگی تھی۔

"آج کی تاریخ میں ملے گی شرٹ یا فاتحہ پڑھ لوں اس پر۔۔۔" ان کا تلخ لہجہ فارحہ کے ہاتھ پیر پھلا رہا تھا۔

"یہیں رکھی تھی میں نے۔۔۔" وہ خوف زدہ انداز میں گویا ہوئی۔

"پیچھے ہٹو، تم سے کوئی کام ڈھنگ سے ہوتا ہے بھلا، عجیب نحوست پھیلا رکھی ہے میری زندگی میں پچھلے چار سال سے۔۔۔" وہاج نے غصے سے اپنی بیوی کا بازو پکڑ کر پیچھے دھکیلا اور خود وارڈروب میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔

"امی نے بھی ملازموں کی ساری فوج اکٹھی کر رکھی ہے مری میں، یہ نہیں ہوتا کہ دو چار ڈھنگ کے نوکر یہاں بھی بھجوا دیں، بہو تو ان کی دنیا جہان کی سست اور بیمار روح ہے، اس سے تو اپنا آپ نہیں سنبھالا جاتا، مجھے اور گھر کو کیا خاک سنبھالے گی۔" وہاج کا فشار خون بلند ہوتا جا رہا تھا۔

"آپ دوسری شرٹ پہن لیں۔۔۔" فارحہ نے ہلکا سا جھجک کر مشورہ دیا۔

"بکواس بند کرو اپنی، ورنہ منہ توڑ دوں گا تمہارا۔۔۔" انہوں نے پلٹ کر غضب ناک نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جس پر آج کل انہیں کچھ زیادہ ہی غصہ آنے لگا تھا۔ وہ سر جھکا کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

فارحہ ظہیر کو چار سال پہلے جاننے والا کوئی بھی شخص اب دیکھتا تو حیران رہ جاتا، پنجاب یونیورسٹی کے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی گولڈ میڈلسٹ لڑکی کا سارا اعتماد اس کے شوہر وہاج نے شادی کے پہلے چار مہینوں میں ہی ختم کر دیا تھا۔ بات بے بات لڑائی جھگڑے، طنزیہ لہجہ اور چار لوگوں میں بیٹھ کر اس کی عزت نفس کو مجروح کرنا اس کے شوہر کا مرغوب مشغلہ تھا۔

شادی کے چھ ماہ بعد ہی فارحہ کو پتا چل گیا تھا کہ اس کے ہاں اولاد نہ ہونے کی اصل وجہ وہ خود نہیں اس کے شوہر کی میڈیکل رپورٹس تھیں، اس بات کے بعد تو وہاج نے اسے اس قدر دبا دیا تھا کہ میر فیملی کی سب ہی خواتین اس کی ذمے دار فارحہ کو ہی ٹھہراتی تھیں، کیوں کہ اس کے بولنے سے پہلے ہی وہاج ایک ایک بندے کو پکڑ کر اپنی بیوی کو مورد الزام ٹھہرا چکا تھا اور فارحہ کے ہونٹوں پر جمی خاموشی نے خود بخود اس بات کی سچائی پر اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔

فارحہ کی کمزوری اور خاموشی کی ایک وجہ اس کے میکے کے حالات تھے۔ اس کے والد نے بڑھاپے کی دہلیز پر

پہنچی اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی ایک ادھیڑ عمر ایکٹریس سے کرلی تھی اور وہ خاتون اپنے تین بچوں کے ساتھ اس کے گھر پر قبضہ جما چکی تھی' چنانچہ اس کے والد نے افراتفری میں اپنی دونوں بیٹیوں کو کسی بوجھ کی طرح سر سے اتار پھینکا اور بیٹے کو باہر پڑھنے کے لیے بھجوا دیا۔ اس کی دوسری بہن بھی اپنے گھر میں خوش نہیں تھی' لیکن دونوں کو گلے میں پڑا ڈھول ہر حال میں بجانا تھا' کیوں کہ میکے میں واپسی کا کوئی رستہ نہیں تھا اور یہ بات وہاج بہت اچھی طرح سے جانتا تھا اور اسی کا فائدہ اٹھاتا تھا۔

"جاہل عورت' یہ ہے وہ شرٹ' جو تم گولا بنا کر وارڈروب میں پھینک چکی تھیں۔" وہ اپنی مطلوبہ شرٹ نکال کر سامنے لے آیا' فارحہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"کرتا ہوں تمہارا ابھی علاج۔۔۔" اس نے سیل فون پر اپنی والدہ تاجدار بیگم کا نمبر ملایا۔

"امی یا تو اپنی اس پھوہڑ اور دنیا جہان کی سست بہو کو مری بلوالیں اپنے پاس یا پھر صندل کو شام سے پہلے بھجوا دیں یہاں۔" وہ اپنے منصوبے کی راہ کامیابی سے ہموار کر چکا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا' کیا پھر کوئی جھگڑا ہو گیا تمہارا فارحہ سے۔۔۔" دوسری طرف وہ گھبرا گئیں۔

"اس سے پہلے کہ کوئی لمبا پنگا ہو جائے اور واپسی کی کوئی راہ نہ بچے' اس منحوس عورت کو سمجھا دیں اپنی زبان میں' اگر اس سے گھر نہیں سنبھلتا تو چلی جائے اپنے باپ کے گھر' مجھے اس کی ضرورت نہیں۔۔۔" وہاج کا مشتعل لہجہ تاجدار بیگم کے ہاتھ پیر پھلا گیا۔

"آخر ہوا کیا ہے' کچھ پتا بھی تو چلے۔۔۔"

"اس عورت سے میری چیزیں تک سنبھال کر نہیں رکھی جاتیں' ہر تیسرے دن کوئی نہ کوئی چیز گم کر دیتی ہے' سارا دن اسے کیبل اور ٹی وی دیکھنے سے فرصت نہیں ملتی اور آخر کام ہی کیا ہے اسے۔۔۔" وہ متنفر لہجے میں مزید گویا ہوا۔

"شکر نہیں کرتی کہ میر وہاج علی کی بیوی ہے یہ' پیر دھو دھو کر بھی پیے تو تب بھی کم ہے' ابھی تین حرف بھیج کر اس کے باپ کے گھر بھجوا دوں تو اس کی ایکٹریس ماں تین دن میں دماغ درست کر دے گی اس کا۔" اس کا زہر آلود لہجہ فارحہ کے دل کو آری کی طرح کاٹ رہا تھا۔

"اچھا اچھا' تم بھی تھوڑا تحمل سے کام لیا کرو۔ بھجواتی ہوں صندل کو شام تک' بہت پھرتیلی لڑکی ہے' سارا کام سنبھال لے گی۔" ارجمند بیگم کے منہ سے نکلنے والی اس بات نے وہاج کی روح کو اندر تک سرشار کر دیا تھا' لیکن یہ موقع نرمی دکھانے کا نہیں تھا۔

"اس صندل کو بھی اپنی زبان میں سمجھا کر بھجوائیے گا' ذرا سی کوتاہی بھی برداشت نہیں کروں گا میں۔۔۔" وہاج نے ابھی بھی اپنی ٹانگ اوپر ہی رکھی تھی۔

"تم خود بھی تھوڑا سمجھ جاؤ تو بہتر ہے۔ ہر وقت اپنے واجی کی طرح توپ کے دہانے پر بیٹھے رہتے ہو۔" ارجمند بیگم اپنی اولاد کی زیادہ طرف داری کی قائل نہیں تھیں۔ "فارحہ کہاں ہے' فون دو اسے۔۔۔"

"بات کرو امی سے۔۔۔" اس نے بدتمیزی سے اپنا سیل فون بیڈ پر اس کی طرف پھینکا۔

"جی پھپھو۔" فارحہ نے گرم گرم آنسوؤں کے گولے کو بمشکل نگلا۔ دوسری طرف ہمیشہ کی طرح تاجدار بیگم نے اسے نرمی سے سمجھانا شروع کر دیا تھا اور یہ وہی باتیں تھیں جو وہ پچھلے چار سال سے سنتی آرہی تھی۔ ان میں کچھ بھی نیا پن نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

قریشی ولا' بوگن ویلیا کی گلابی بیلوں سے ڈھکا ایک خوب صورت بنگلہ تھا۔ جو اسلام آباد کی مارگلہ کی پہاڑیوں

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کے عین سامنے واقع تھا۔ اس گھر کے وسیع و عریض لان کے عین درمیان میں ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول تھا۔
اس گھر میں مقیم تین افراد محبت کی ایک مضبوط ڈور میں بندھے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے یہاں آنے والا کوئی بھی نیا بندہ ان کی آپس کی ذہنی ہم آہنگی اور بے تکلفی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔
سیاہ گیٹ سے باہر عبداللہ قریشی کی ہنڈا اکارڈ گاڑی کا ہارن بجا' چوکیدار نے بڑی مستعدی سے گیٹ کے دونوں پٹ وا کیے۔ گاڑی سبک رفتاری سے سرمئی تارکول کی سڑک پر گویا بہتی ہوئی پورچ تک پہنچی اور وہاں پہلے سے موجود ہنڈا سوک کو دیکھ کر ان کے چہرے پر بڑی پدرانہ شفقت بھری مسکراہٹ دوڑی تھی۔ ان کا پی اے جلدی سے ان کا بریف کیس اور فائلیں گاڑی سے نکالنے لگا۔
"خاور گاڑی کی بیک سائیڈ پر رکھا فولڈر بھی میری اسٹڈی میں رکھ دینا۔" انہوں نے بغیر مڑے اپنے پی اے سے کہا اور شاہ بلوط کی لکڑی کا بنا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ سامنے ان کی بھانجی منال' ملازمہ سے کھانے کی میز لگوا رہی تھی۔
"السلام علیکم ماموں....." وہ بڑے پر جوش انداز میں ان کی طرف بڑھی۔
"وعلیکم السلام' کیسی ہے میری منو.....؟" انہوں نے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگایا۔
"فائن' آپ کو پتا ہے' محمد ہادی صاحب بھی تشریف لا چکے ہیں۔" اس نے اپنی طرف سے انہیں اطلاع دی۔
"دیکھ چکا ہوں اس نالائق کی گاڑی' بمپر تھوڑا ٹوٹا ہوا ہے' لگتا ہے پھر کہیں سے ٹھکوا لایا ہے۔" ان کے لہجے میں بیٹے کے لیے محبت ہی محبت تھی۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے اور جیسے ہی بیڈ روم کا دروازہ کھولا' اندر وہی منظر ان کا منتظر تھا جو وہ پچھلے کئی سالوں سے دیکھتے آ رہے تھے۔
"جینٹل مین! خیال آ گیا تمہیں اپنی ماں کا....."
قریشی صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے اسے چھیڑا' ہادی کی یہ بچپن کی عادت تھی' وہ ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ چمٹا رہتا تھا اور وہ بھی جاب سے آنے کے بعد ایک لمحے کو بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑتی تھیں۔
"اپنی پیاری ماں کا خیال بھولتا ہی کب ہے مجھے....." اس نے بھی دو بدو جواب دیا۔ ویسے بھی قریشی ولا وہ واحد جگہ تھی جہاں' محمد ہادی کو دیکھنے والے بھی اس بات کا یقین نہ کرتے کہ وہ اس قدر ہنس مکھ' شرارتی اور نرم دل بھی ہو سکتا ہے۔ باہر کی دنیا میں اس کا امیج بہت سنجیدہ اور کسی حد تک اکھڑ مشہور تھا اور اس نے کبھی اس کی تصحیح کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔
"عالیہ! مسکہ لگا رہا ہے تمہیں' پتا ہے نا پورے سات دن بعد آیا ہے یہ گھر....." قریشی صاحب نے کوٹ اتارتے ہوئے شرارتی انداز سے اپنی بیگم کو بھڑکانے کی کوشش کی۔
"بابا' ویسے بڑے ہی کوئی افسوس کی بات ہے۔" وہ فوراً" اٹھ کر تاسف بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔
"خود آپ اینٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ میں جاب کرتے ہیں' اس طرح کسی کے جذبات کو مشتعل کرنا بھی جذباتی کرپشن کے زمرے میں آتا ہے۔" اس نے برابر دھری میز پر رکھی پھلوں کی ٹوکری سے سیب اٹھایا اور مزے سے کھانے لگا۔
"تو میں نے کون سی غلط بات کی' آخر مری ہے ہی کتنا دور' تمہیں اپنی ماں کی فیلنگز کا خیال ہونا چاہیے" آخر کو اکلوتی اولاد ہو اس کی۔" وہ بظاہر عالیہ بیگم کی طرف داری کر رہے تھے' لیکن وہ مسکراتے ہوئے ان کی شرارت سمجھ چکی تھیں۔
"ماما' آپ کو شرپسند عناصر کی باتوں میں آنے کی قطعاً" ضرورت نہیں' آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ "کچھ" لوگ ماضی میں بھی ایسی حرکتیں کر کے ہمارے تعلقات کو خراب کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔" اس نے ماں کا

ہاتھ مضبوطی سے دبا کر شوخی سے کہا۔

"میں سب جانتی ہوں بیٹا۔" انہوں نے محبت سے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

"خواتین و حضرات، کھانا لگ چکا ہے ٹیبل پر، آپ لوگ تشریف لا سکتے ہیں۔" مناہل نے ہلکا سا اندر جھانک کر بلند آواز میں اعلان کیا۔

"دیکھ لو منو، آج اپنا بیٹا آیا ہے تو آپ کو بھی کوئی لفٹ ہی نہیں....." قریشی صاحب کا موڈ آج خاصا خوش گوار تھا۔

"ماما، آپ کے شوہر نامدار گھر کا ماحول خراب کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔" ہادی نے عالیہ بیگم کو بھڑکایا اور اس میں کافی کامیاب بھی رہا۔

"عبداللہ صاحب! اپنی عمر دیکھیں اور حرکتیں دیکھیں....." وہ مسکراتے ہوئے بیڈ سے اٹھیں۔

"کیوں، کیا ہوا ہے میری عمر کو، کل تمہارے چیمبر میں تمہارے کلائنٹ کے ساتھ آنے والی بچی بھی کتنے غور سے دیکھ رہی تھی مجھے۔"

"ماموں، آپ کی شکل ملتی ہوگی اس کے فادر سے۔" مناہل نے اپنا نچلا ہونٹ دبا کر شرارت سے کہا تو ہادی اور عالیہ بیگم بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"بھانجی، آپ سے مجھے اس طوطا چشمی کی امید نہیں تھی۔" وہ مصنوعی ناراضی سے گویا ہوئے۔

"سوری ماموں....." مناہل نے کان کھجاتے ہوئے معذرت کا اظہار کیا۔ وہ قریشی صاحب کی کویت میں مقیم اکلوتی بہن کے تین بچوں میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی تھی اور پڑھائی کے سلسلے میں گزشتہ بہت سالوں سے پاکستان میں مقیم تھی۔ قریشی صاحب اور عالیہ بیگم نے پوری کوشش کی وہ ان ہی کے ساتھ اس گھر میں رہے، لیکن وہ دونوں ہی اپنی نوکری اور پیشہ ورانہ مصروفیات کی بنا پر مصروف رہتے تھے۔ اس لیے کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد وہ بیزار ہو کر ہاسٹل میں مقیم ہوگئی تھی۔ اس کی ہادی کے ساتھ گہری دوستی تھی، حالانکہ وہ اس سے دو تین سال چھوٹی تھی، لیکن اسے دھڑلے سے صرف ہادی کہتی تھی۔ اب تو اس کی والدہ نے بھی اس بات پر اسے ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔

"ہاں بھئی منو، کیا کیا بنایا ہے؟" ہادی ڈونگے اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"تمہاری فیورٹ حلیم، قیمہ مٹر اور نہاری۔" مناہل کی بات پر وہ مسکرایا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ جب بھی گھر پر ہوتی، اس کی پسند کا کھانا بنانا اس پر واجب ہو جاتا تھا۔

"چلو ہم بوڑھے لوگ....." قریشی صاحب نے مسکرا کر بیچ میں لقمہ دیا۔

"آپ کی آج ویڈنگ اینور سری ہے بابا، لے کر جائیں ناں ماما کو کوئی مووی شووی دکھانے یا لانگ ڈرائیو پر، کم از کم آپ کو آج کے دن تو ماما کو امپورٹینس دینی چاہیے، ویسے تو پورا سال ذرا خیال نہیں ہوتا آپ کو ان کا۔" ہادی نے انہیں چھیڑا اور وہ اس کی شرارت سمجھ کر قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"ہاں ہاں، ہنس کر ٹال دیا کریں ایسی باتوں کو، بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے وہ۔" عالیہ بیگم حقیقتاً" برا مان گئیں۔

"بہت خبیث روح ہو تم..... لگا دیا نا اپنی ماں کو میرے پیچھے۔"

"الحمدللہ..... اپنی صلاحیتوں پر کبھی غرور نہیں کیا، آخر کو بیٹا کس کا ہوں۔" ہادی نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا جو کھانا بھول کر اب عالیہ بیگم کو منانے میں لگے ہوئے تھے۔ جب کہ مناہل بھی مزے سے عبداللہ صاحب کو منتیں کرتا دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

طوبیٰ آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔
سامنے آتش دان کے قریب رکھی راکنگ چیئر پر انابیہ اپنی گود میں مظہرالاسلام کی کتاب "محبت مردہ پھولوں کی سمفنی" رکھے، آنکھیں بند کرکے کسی گہری سوچ میں گم تھی، اسے طوبیٰ کی آمد کا پتا نہیں چلا تھا۔ اس نے چپکے سے کتاب اٹھائی، سامنے چند لائنوں کو انڈرلائن کیا ہوا تھا۔ اس نے خاموشی سے انہیں پڑھنا شروع کردیا۔
"محبت بڑی شفاف چیز ہے کسی آئینے کی طرح' اس پر ہلکا سا ناگواری کا کوئی میلا چھینٹا' بھی فوراً" دکھائی پڑجاتا ہے' ہر سچی اور خاص چیز کے ساتھ یہی مسئلہ ہے۔ تھوڑا سا ناخالص احساس بھی یک دم برا لگنے لگتا ہے۔ اس لیے کسی بھی میلے لفظ' جملے' کج ادائی' یا دل کی کسی غافل دھڑکن کی وجہ سے محبت کے سیب کو کیڑا لگ جاتا ہے۔" طوبیٰ نے سر اٹھا کر اپنی بہن کے افسردہ چہرے کو غور سے دیکھا' وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے دنیا و مافیہا سے بے نیاز گہری سوچوں کے سمندر میں غلطاں تھی۔
"بیا.....!!!" اس نے آہستگی سے اسے پکارا۔
"ہوں....." انابیہ نے آنکھیں کھولیں' جو دہکتے ہوئے' انگارے کی طرح سرخ تھیں۔
"یہ اتنی مشکل باتیں کیسے سمجھ میں آجاتی ہیں آپ کے؟" اس نے مظہرالاسلام کی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔
"اس میں مشکل کیا ہے.....؟" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔
"مجھے محبت کے اتنے پیچیدہ فلسفے سمجھ میں نہیں آتے....."
"محبت جس کی سمجھ میں آجائے' اسے کچھ اور سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔"
"ذرا اس پر روشنی ڈالنا پسند کریں گی؟" طوبیٰ نے منہ بنایا۔
"جب محبت کسی دل پر اترتی ہے تو کائنات کے سارے راز اس پر آشکار ہونے لگتے ہیں۔ ان کہی کہانیوں کے رمز سمجھ میں آنے لگتے ہیں' افسانوی کرداروں کی حقیقتیں کھلنا شروع ہوجاتی ہیں' محبت میں کیا' کیوں اور کب نہیں ہوتا' صرف "ہاں" اور "جی" کی گردان ہوتی ہے۔ محبت "انا" کے مقبرے پر بیٹھ کر ہر وقت خود کو مٹانے کا نام ہے۔" وہ خلا میں کسی نادیدہ نقطے پر آنکھیں جمائے کسی اور جہان میں پہنچی ہوئی تھی۔
"برہان بھائی سے محبت کرتی ہیں ناں آپ؟" طوبیٰ نے اس دفعہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"کیا اب بھی اس سوال کے جواب کی ضرورت ہے؟" انابیہ نے اسے لاجواب کیا۔
"اور وہ کرتے ہیں آپ سے؟" طوبیٰ کا عجیب سا لہجہ اسے وہ بات سمجھا گیا' جسے وہ جان بوجھ کر سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔
"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے نظریں چرا کر کہا۔
"کس دور میں رہتی ہیں بیا آپ' اب یک طرفہ محبتوں کا زمانہ گزر گیا' محبت کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی پر چلتی ہے۔" طوبیٰ اس سے چھوٹی لیکن زیادہ حقیقت پسند تھی۔
"کیا اب مجھے جا کر ان سے چاہت کی بھیک مانگنی چاہیے.....؟" ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔
"بھیک کیوں' اپنا حق مانگیں۔ آخر کو نکاح ہوا ہے آپ کا ان کے ساتھ۔" اسے بہن کی حالت دیکھ کر برہان پر غصہ آیا۔
"نکاح کے چند بولوں سے اگر دلوں میں چاہتوں کی فصل اگ آتی تو آج دنیا کے سارے شادی شدہ جوڑے بڑی خوشگوار زندگی گزار رہے ہوتے۔" انابیہ پھیکے سے انداز میں زبردستی مسکرائی۔
"تو پھر چھوڑ دیں انہیں' اپنی زندگی پرسکون بنائیں' قریب رہ کر سلگنے سے بہتر ہے' بندہ کسی مقام پر بچھڑ جائے۔"

طوبیٰ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، جو اسے خاصی مہنگی پڑی۔
"جب خود اس سچویشن سے گزرو گی تو تب پوچھوں گی۔" وہ برا مان گئی تھی۔
"کیا مطلب.....؟"
"ترکِ محبت کا مشورہ دینا آسان ہوتا ہے، لیکن اس پر عمل درآمد کرنے سے پہلے ہی بندہ کوئلوں کے دہکتے فرش پر ننگے پاؤں آن کھڑا ہوتا ہے، محبت سے جتنا دور بھاگو، وہ اتنا ہی آپ کے تعاقب میں آتی ہے، تھک ہار کر کہیں بیٹھ جاؤ، تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہے، اپنے دل میں اس کی قبر بنالو تو ہر روز پہلے خود مرنا پڑتا ہے۔" انابیہ تلخ لہجے میں گویا ہوئی۔
"بے فکر رہیں، میں ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتی، کیا فائدہ ایسی ان دیکھی آگ میں سلگنے کا۔" وہ بے فکری سے مسکرائی۔
"تم کہہ سکتی ہو، کیونکہ تم خود ابھی اس اسٹیج سے نہیں گزریں، بہان کی طرح تم بھی کسی اور کے تڑپنے کا تماشا دیکھ رہی ہو ابھی۔" انابیہ کی بات پر اسے کرنٹ لگا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑاکا انداز میں بالکل اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔
"کس کے تڑپنے کا تماشا دیکھ رہی ہوں میں؟؟"
"شاہ میر کے....." انابیہ کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ سے طوبیٰ کو لگا جیسے میر ہاؤس کی چھت اس پر آن گری ہو۔ وہ بات جو اس نے اپنی طرف سے زمانے بھر سے چھپا رکھی تھی، وہ اس کی ماں جائی کو نہ صرف معلوم تھی، بلکہ اس حوالے سے پہلا طعنہ بھی اسی کی طرف سے مل چکا تھا اسے۔

☆ ☆ ☆

خنک ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے نے اس کے چہرے کو چھو کر طمانیت کا احساس بخشا۔
شالیمار کرکٹ گراؤنڈ میں بنے جاگنگ ٹریک پر بھاگتی ہوئی شہرزاد نے ہینڈ فری کانوں سے لگا رکھا تھا۔ اس کا سیل فون اس کی جیکٹ کی جیب میں تھا۔ یہ اس کا چوتھا چکر تھا، جب اسے احساس ہوا کہ وہ کسی کی گہری نظروں کے حصار میں ہے۔
وہ چلتے چلتے رکی اور اس نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا، اس وقت کافی لوگ یہاں موجود تھے اور ہر کوئی اپنی دھن میں ٹریک پر بھاگ رہا تھا، اور کسی کی بھی توجہ اپنی طرف نہ پا کر وہ سنگ مرمر کے بینچ پر بیٹھ گئی۔ جیکٹ کی جیب سے پانی کی چھوٹی بوتل نکال کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ اسی وقت اس کے سیل فون کی مترنم گھنٹی بجی۔
اس نے فون نکال کر دیکھا، فیس بک میسنجر سے آنے والی "ہمزاد" کی کال دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک جاندار مسکراہٹ ابھری۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ یہ کال اسی کی ہو گی۔
"آپ تو لڑکیوں سے بھی زیادہ محتاط ہیں۔" شہرزاد نے کال اٹینڈ کرتے ہی طنزیہ لہجے میں کہا۔
"سیدھا سادا بزدل بھی کہہ دیتیں تو میں مائنڈ نہ کرتا....." وہ قہقہہ لگا کر اپنی بات پر خود ہی ہنسا تھا۔
"ہاں وہ تو اندازہ ہو رہا ہے مجھے، ورنہ اپنے ڈائریکٹ نمبر سے کال کرتے۔" وہ مسکرائی۔
"ڈائریکٹ ڈائلنگ بھی کر لیں گے، جس دن کوئی گرین سگنل ملے گا۔" وہ معنی خیز لہجے میں گویا ہوا۔
"ہاں، خوش فہمی اچھی چیز ہوتی ہے، کم از کم اس کی وجہ سے زندگی تو آسان لگنے لگتی ہے۔"
"کہہ سکتی ہیں آپ۔" وہ اس کا طنز سمجھ کر مسکرایا۔

"اچھا تو شالیمار کرکٹ کلب بھی آتے ہیں جاگنگ کرنے۔" شہرزاد نے اس دفعہ براہ راست حملہ کیا۔
"ایک باؤلر وہاں نہیں آئے گا تو اور کہاں جائے گا۔" دوسری طرف وہ اس کے اندازے کی درستی پر دل سے مسکرایا۔
"تو چھیں گے نہیں کہ کیسے پتا چلا مجھے۔" شہرزاد کو حیرانی ہوئی۔
"ایک انٹیلی جنٹ بیرسٹر سے ایسا سوال کرنے کی حماقت کم از کم میں نہیں کر سکتا۔" اس دفعہ اس نے شہرزاد کو لاجواب کیا۔
"تو کونے کھدروں میں چھپ کر گھورنے کی بجائے سامنے آکر بات کریں، اتنی بھی خوفناک نہیں ہوں میں۔" وہ ہلکا سا چڑ کر بولی۔
"میرے فیورٹ فان کلر میں کوئی لڑکی بھلا کیسے خوف ناک لگ سکتی ہے۔" اس کے شرارتی انداز پر شہرزاد نے چونک کر دیکھا، وہ اس وقت نیوی بلیو کلر کی جینز پر فان کلر کی جیکٹ پہنے ہوئی تھی۔
"بہت خوب اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ درست تھا۔" وہ تھوڑا سنجیدہ ہوئی۔
"جناب، آپ اندازوں کی درستی کو چھوڑیں اور اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند کریں ورنہ بیٹری ختم ہونے کے بعد پرابلم ہوگی۔" اس کی بات پر وہ فوراً بوکھلا کر کھڑی ہوئی، صبح جب وہ گھر سے نکلی تھی تو ملگجا سا اندھیرا تھا اور گاڑی کی لائٹس جلانے کے بعد وہ شاید بند کرنا بھول گئی تھی۔
"بائی داوے، یہ میری نہیں میری مام کی گاڑی ہے۔" وہ بات کرتے کرتے پارکنگ کی طرف چل پڑی۔
"جی مجھے پتا ہے، دو گاڑیاں ہیں آپ کے گھر میں، ایک مسز ٹینا کے استعمال میں ہوتی ہے اور دوسری آپ کی چھوٹی سسٹر رومیصہ کے پاس، اگر کہیں تو رومیصہ کی گاڑی کا نمبر بھی بتا دوں۔" اس کے لہجے میں شرارت کی فراوانی تھی۔
"اس کی ضرورت نہیں، آپ صرف اپنی گاڑی کا نمبر بتا دیں۔" شہرزاد کی فرمائش پر وہ بے ساختہ انداز میں ہنسا۔
"میں تو غریب سا بندہ ہوں، کہاں افورڈ کر سکتا ہوں گاڑی، چھوٹی موٹی بائیک ہے میرے پاس۔" اس نے صاف ٹالا تھا۔ وہ بات کرتے کرتے اپنی گاڑی کے پاس آن رکی، اس کے بونٹ پر ایک سفید رنگ کا کھلتا ہوا گلاب پڑا تھا۔ اس نے پھول اٹھاتے ہوئے چاروں طرف گھوم کر دیکھا، پارکنگ میں کافی گاڑیاں تھیں اور زیادہ تر لوگ واپس جا رہے تھے۔
"یہ پھول آپ نے رکھا ہے میری گاڑی پر؟" اس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری در آئی۔
"معذرت خواہ ہوں، آپ کی آمد کنفرم نہیں تھی، ورنہ بکے لے کر آتا، یہ بھی یہیں سے توڑا ہے، آفٹر آل روٹین لائف کی طرف پہلا دن تھا آپ کا۔" اس سے پہلے کہ وہ اس کی بات کا جواب دیتی ٹینا بیگم کی صبح صبح آنے والی کال نے اسے حیران کیا، کیونکہ ان کی صبح بارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔
"ایکسکیوزمی، میری مام کی کال آرہی ہے، بائے۔"
شہرزاد نے جلدی سے ٹینا بیگم کی کال اٹینڈ کی، جو حواس باختہ انداز میں بول رہی تھیں۔ "شیری، تم کہاں ہو۔ فوراً پہنچو گھر۔"
"مام، خیریت تو ہے نا۔" وہ تھوڑا سا بوکھلائی۔
"تمہیں پتا ہے، رومی کو پولیس نے اریسٹ کر لیا ہے، بیرسٹر محمود کے بیٹے کے مرڈر کے جرم میں۔" ٹینا بیگم کی بات پر اس کا دماغ بھک کر کے اڑا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

منظر جیسے سڑک کنارے کے درخت' جھاڑ' جھنکار' رواں دواں ٹریفک' چلتے پھرتے لوگ' عمارتیں' دکانیں' گدھا گاڑیاں یوں سرعت سے تبدیل ہو رہے تھے جیسے نگین کی روزمرہ کی زندگی۔۔۔ اور دور کے مناظر جیسے دور دور تک پھیلے کشادہ کھیت کھلیان' ان سے بہت پیچھے کھردرے چٹیل پہاڑ۔۔۔ اور آسمان پر چھائے سفید اور سرمئی بادل۔۔۔ بالکل اس کے ماضی کی طرح۔۔۔ جو قدرے پیچھے چلا گیا تھا۔

ڈرائیور نے کار کی رفتار کم کی تو نگین نے بے ساختہ سامنے دیکھا۔ ایک بوڑھا آدمی پیٹھ پر بوری لادے سڑک پار کر رہا تھا۔ نگین کی آنکھوں نے بلاوجہ ہی دور تک اس بوڑھے آدمی کا تعاقب کیا۔ "کتنے اچھے

فرح بخاری

سہیلی

زندگی میں کچھ دکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں روزمرہ کے جھنجٹ میں عارضی طور پر ہم بھول جاتے ہیں اور وقت کی دھول کچھ ایسے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے کہ ان پر سوچنے کے لیے ہمیں فرصت ہی نہیں ملتی' لیکن پھر اچانک حالات ہمیں ایسے موڑ پر لا کھڑا کرتے ہیں کہ بھولا ہوا وہ دکھ اور کھوئی ہوئی یاد عین آنکھوں کے سامنے پوری شدت سے تازہ ہو جاتی ہے۔ تب حال کا ہر منظر اپنی رعنائی کھو دیتا ہے۔

نگین کی گاڑی شہر سے نکل کر اب گاؤں جانے والی مضافاتی سڑک پر آ گئی تھی۔ اس نے ایک تھکی تھکی آہ بھر کر کھڑکی کے پار بدلتے مناظر کو دیکھا۔ قریب کے

ہوتے ہیں وہ بوجھ جو مزدور اپنے کندھوں پر لادے پھرتے ہیں۔ تھک جانے پر جنہیں وہ دوسروں سے بانٹ بھی لیتے ہیں۔ اتار بھی پھینکتے ہیں اور بالآخر منزل پہ پہنچ کر جس سے مکمل نجات بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ دلوں پہ رکھی سلیں۔۔۔ اور پچھتاووں کے بوجھ۔۔۔" نگین نے نظر ہٹائی۔

"کیا آج کم ہو پائے گا یہ درد۔۔۔ یا کچھ اور بڑھ جائے گا۔۔۔ گزرے سولہ سال۔۔۔ جو کبھی لگتا۔۔۔ یوں مٹھی کھولتے ہی ہاتھ سے پھسل گئے۔۔۔ اور کبھی۔۔۔" شافعہ کے تصور سے پہلی مرتبہ اس کے لب مسکرا اٹھے۔

"کتنی دور کھڑی لگتی ہے۔۔۔ سولہ برسوں میں جس کا ایک۔۔۔ نقش کبھی آنکھ کے پردے سے اوجھل نہیں

ہوا۔ جانے اب کیسی لگتی ہوگی۔ جانے وہ اب وہاں ہوگی بھی یا نہیں۔ اس سے ملنے کا یہ ایک موقع اگر چلا گیا تو..." نگین اچانک ہی بے چینی اور گھبراہٹ محسوس کرنے لگی۔ گزرے سولہ برسوں میں گاؤں واپس آنے کی خواہش جیسے ایک حسرت سی بن کر رہ گئی تھی... لیکن آج وقت اور حالات نے خود یہ موقع اس کی جھولی میں ڈالا تو یہ حسرت دعا بن کر لبوں پہ مچل رہی تھی کہ کاش اس ایک دن کے مختصر سے وقت میں وہ شافعہ سے ملاقات کرپائے... معافی مانگ پائے' اس ایک غلطی کی جو نادانی میں اس سے سرزد ہوئی تھی۔

گاؤں ابھی بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کی دوری پر تھا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ پرانے دنوں کی یاد میں کھوگئی۔ سولہ سال پہلے جب وہ محض سترہ برس کی شوخ اور کھلنڈری سی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ اس کی گیارہویں جماعت کی نئی نئی کلاسز شروع ہوئی تھیں' جب فردوس باجی کے بطور سی ٹی ٹیچر آرڈرز آگئے۔ گاؤں کا نام ابو سمیت ان سب کے لیے نیا تھا۔ انہیں حیرت ہوئی کہ شہر سے ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ایک ایسا دیہات بھی ہے۔ جس کے وہ نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ابو نے فوری طور پر محکمہ ایجوکیشن میں اپنے کچھ جاننے والوں سے علاقے کے متعلق معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ وہ تو خطرناک بچھوؤں' اژدہوں سانپوں اور مفرور' ڈاکوؤں کا علاقہ ہے۔ ابو کے لیے یہ ابتدائی معلومات اتنی پریشان کن تھیں کہ وہ فردوس کو ایک مرتبہ بھی وہاں بھیجنے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن اسکول کی پرنسپل صاحبہ جو کہ خود بھی شہر سے وہاں جاتی رہتی تھیں' سے فردوس کی ملاقات قدرے تسلی بخش رہی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے علاوہ شہر سے تین ٹیچرز اور بھی وہاں جاتی ہیں۔ البتہ سفر کی طوالت کی وجہ سے دو روز بعد واپس آتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صبح ساڑھے چھ بجے ساری ٹیچرز بس اسٹینڈ پہنچتی ہیں اور اکٹھی اسکول جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ بھی ایسا ہی کرے تو ہر قسم کی پریشانی سے خود کو بچاسکتی ہے۔ پرنسپل صاحبہ کے اطمینان دلانے پر ابو فردوس کو بھیجنے پر راضی تو ہوگئے' لیکن اکیلے نہیں... انہوں نے کہا کہ شروع کے دنوں میں نگین بھی اس کے ساتھ جائے گی۔

گاؤں کی طرف وہ پہلا سفر نگین کو آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔ حالانکہ ایک سال کے دوران نگین کا بے شمار بار گاؤں جانا ہوا تھا۔ لیکن وہ پہلا سفر نگین کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ دل میں سانپوں' بچھوؤں اور ڈاکوؤں کا خوف لیے وہ لوگ ڈیرہ اسماعیل خان سے روانہ ہوئے۔ ٹانک شہر پہنچ کر وہ لوگ بس سے ڈاٹسن میں بیٹھے اور گاؤں کی طرف رواں دواں ہوگئے۔ ٹانک سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر عین بھٹنی کی پہاڑیوں سے ادھر وہ بیچ بیچ ایک دور افتادہ گاؤں تھا۔ شیشم اور دھریک کے درختوں کی بہتات راستے کی ہولناکی میں کچھ اور بھی اضافے کا باعث تھی۔ علاقے کی زمین زیادہ تر بنجر اور پتھریلی تھی۔ کھیت بھی تھے تو سہی' لیکن کہیں کہیں... آبادی بھی بہت فاصلہ طے کرنے کے بعد آتی تھی۔

بالآخر ایک بہت بڑے قلعہ نما پولیس اسٹیشن کے آتے ہی ان کی ڈاٹسن رک گئی اور ساتھی ٹیچرز نے انہیں اترنے کا اشارہ کیا... ڈاٹسن دھول اڑاتی آگے بڑھ گئی اور وہ لوگ پولیس اسٹیشن کے مخالف سمت والے کھیتوں میں اتر کر پیدل اسکول کی طرف بڑھنے لگے۔ تب ہی ایک الجھے بکھرے بالوں اور لمبے میلے سے چولے والا پاگل سا لڑکا اچانک ان کے سامنے آگیا۔ فردوس کی تو باقاعدہ چیخ نکل گئی۔ مس آمنہ نے ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کی تنبیہہ کی... وہ دیوانہ کچھ دیر تو ان کے پیچھے چلتا رہا اور پھر نہ جانے کدھر کو مڑ گیا۔ نگین کی دیر سے اٹکی سانس بھی قدرے بحال ہوئی اور بالآخر اسکول کا گیٹ بھی دکھائی دینے لگا۔

باجی کا اسکول چھٹی سے دسویں جماعت تک تھا۔ لڑکیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور اسکول کی عمارت بھی کافی بڑی تھی۔ بڑے سے اسٹاف روم میں کرسیاں بھی

تھیں اور چارپائیاں بھی۔۔۔۔ یعنی اسکول ٹائم کے بعد یہی کمرہ ٹیچرز رہائش کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ نگی اپنے ساتھ کورس کی چند کتابیں بھی لائی تھی۔ باجی اور دوسری ٹیچرز جب پیریڈ ۔۔۔۔ لینے چلی گئیں تو وہ اپنی کتابیں لے کر لان میں آگئی۔ چوتھے پیریڈ میں البتہ اسے پرنسپل راشدہ نے کہلا بھیجا کہ مس عائشہ آج غیر حاضر ہیں۔ چھٹی جماعت ان کی غیر موجودگی میں کافی شور کررہی ہے۔ لہٰذا وہ ذرا کلاس روم میں چلی جائے اور انہیں چپ کرادے۔ وہ نگین کی لائف کی پہلی ٹیچنگ پریکٹس تھی اور کلاس کنٹرول کرنے کی یہ ذمہ داری آنے والے دنوں میں اسے اکثر ہی انجام دینا پڑی۔ نگین یہ ذمہ داری نہ صرف خوشی خوشی انجام دیا کرتی' بلکہ حسب استطاعت بچیوں کو پڑھا بھی دیا کرتی۔

نویں اور دسویں جماعت کی لڑکیاں البتہ کافی لاڈلیاں تھیں۔۔۔۔ ہمیشہ ہی نہ صرف پڑھنے سے انکار کردیتیں' بلکہ نگین کے ساتھ خوب گپ شپ بھی لگاتیں۔ وہ بھی انہیں آہستہ بولنے کی تنبیہہ کرکے بولنے کے موڈ میں آجاتی۔ دیہات کے لوگ واقعی بہت مخلص اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ جب بھی باجی کے ساتھ گاؤں آتی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا' لڑکیاں بہت شدت سے اس کی آمد کی منتظر ہوتیں۔ باجی اب چونکہ یہاں کے ماحول کے ساتھ کافی ایڈجسٹ ہوگئی تھیں۔ اس لیے نگین دوبارہ اپنے کالج کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔۔۔۔ لیکن ہفتے ڈیڑھ کے بعد ایک آدھ چکر ضرور وہاں کا لگالیا کرتی' کیونکہ گاؤں والوں کی محبت اسے بھی اپنی جانب کھینچتی تھی۔ سچ ہے کہ دل کی خوشی کا مادی اشیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کی خوراک صرف محبت ہے اور وہ اسے جہاں سے ملے یہ اسی طرف ہمکتا ہے۔

سانپوں' بچھوؤں اور مفرور ڈاکوؤں سے بھرے اس گاؤں کے لیے نگین کے دل میں محبت دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی تھی۔ نگین نہ صرف لڑکیوں' بلکہ ٹیچرز میں بھی خاصی مقبول تھی۔ فردوس کی نسبت وہ زیادہ سوشل' ایکٹیو اور باتونی تھی۔ اس لیے جلدی توجہ حاصل کرنے کا باعث بن جاتی تھی۔ گاؤں میں گزرا وہ ایک سال' نگین کے ماضی کے چند حسین ترین واقعات میں سے ایک تھا۔ مثبت سوچ رکھنے والوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ جب وہ ماضی میں جھانکتے ہیں تو صرف خوب صورت دنوں کی یاد سے دل ودماغ کو سیراب کرتے ہیں۔ پھر ایسی جگہ جہاں وہ چاہے اور سراہے بھی گئے ہوں' انہیں کبھی نہیں بھولتی۔ نگین بھی فرصت کے لمحات گئے دنوں کی یاد میں بسر کرکے بہت خوشی اور سکون محسوس کرتی تھی اور جہاں اس کی یادوں میں گاؤں پوری آب وتاب سے چمکتا تھا۔ وہاں شافعہ کی یاد بھی پہلے دن کی طرح نئی اور تروتازہ تھی۔

شافعہ جس سے نگین کی دوستی دوسری لڑکیوں کی نسبت بڑے غیر محسوس انداز میں گہری ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ اونچی لمبی' سفید اور پیاری سی شافعہ باقی لڑکیوں کی نسبت ذرا کم گو تھی' لیکن نگین نے نوٹ کیا تھا اس کی محفل میں وہ ہمیشہ بڑے شوق سے بیٹھتی تھی۔ کبھی دور سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہتی جیسے دوستی کی خواہاں تو ہو' لیکن نگین کی ماڈرن پرسنالٹی سے مرعوب ہوکر کہہ نہ پاتی ہو۔

دوستی کا نقطہ آغاز دیکھا جائے تو کچھ ایسا خوش گوار بھی نہیں تھا۔ نگین اس روز مس زاہدہ کی غیر حاضری کی وجہ سے نویں جماعت کا پیریڈ لے رہی تھی جب لڑکیوں نے سانپوں اور ڈاکوؤں کے قصے سنانا شروع کردیے۔ مہتاب نے بتایا کہ بہت سال پہلے اسی اسکول کی ایک طالبہ جو صحن کے آخری کونے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کوا ڑن سانپ نے عین اس کے ماتھے پر آکر ڈسا اور وہ بے چاری موقع پر ہی ہلاک ہوگئی تھی۔۔۔۔ اس کے بعد عنبرین نے ایک رات ڈاکوؤں کے اسکول میں آکر چھپنے کا قصہ سنایا۔۔۔ وہ بتانے لگی کہ اس رات کم از کم چار ٹیچرز اسکول کے اندر موجود تھیں۔۔۔۔ لیکن موسم سرما کی وجہ سے اندر کمرے میں سو رہی تھیں۔ پولیس کے ساتھ ڈاکوؤں کا فائرنگ کا تبادلہ اور اذانوں تک چلنے والی ساری کارروائی انہوں نے چھپ

کر کھڑکیوں سے خود دیکھی تھی۔ لیکن اپنے حواس بہرحال اتنے بحال ضرور رکھے کہ ڈاکوؤں کو اپنی وہاں موجودگی کی خبر تک نہیں ہونے دی۔

"آج تو تم سب نگین کو ڈرا کر ہی چھوڑو گی۔ کہیں ایسا نہ ہو آئندہ وہ یہاں آنا ہی چھوڑ دے۔" نائلہ نے گھور کر سب کو تنبیہہ کی تو نگین کو ہنسی آگئی۔

"نہ میں سانپوں سے ڈرتی ہوں نہ ڈاکوؤں سے.... مجھے تو یہاں صرف ایک ہی چیز سے خوف آتا ہے۔" اس نے مسکرا کر تجسس پھیلایا تو لڑکیوں نے بیک زبان سوال کیا۔

"وہ کیا....؟"

"وہ ایک پاگل سا لڑکا پولیس اسٹیشن والی سائیڈ پہ گھومتا رہتا ہے نا.... قسم سے.... کبھی اگر نظر آجائے.... میری تو جان ہی نکل جاتی ہے۔ ڈاٹسن سے اترتے وقت ہر بار میری پہلی دعا یہی ہوتی ہے کہ کم از کم اس سے بالکل سامنا نہ ہو۔" نگین نے ــــ روانی سے تفصیلی جواب دیا، لیکن جملے کے اختتام تک اسے محسوس ہوا کہ کلاس کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہے اور اس سے پہلے کہ وہ کسی سے کچھ پوچھتی، شافعہ اچانک اٹھ کر باہر چلی گئی۔ نگین نے حیران ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اگرچہ وہ ان سب کی ٹیچر نہیں تھی، لیکن یہاں کوئی بھی لڑکی ہرگز اتنی بدتمیز نہیں تھی کہ بنا اجازت باہر چلی جاتی۔

"یہ کیا کر دیا نگین...." تیز طرار سی مہتاب نے باقاعدہ ماتھے پہ ہاتھ مار کر تاسف کا اظہار کیا۔ نگین ابھی ابھی کچھ نہیں سمجھی تھی۔

"ارے وہ دیوانہ، شافی کا بھائی ہے۔"

"ہائیں...." نگین کے حواسوں پر بجلی گری۔

"او میرے خدا...." وہ فوراً" کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک منٹ...." اور کلاس روم سے باہر آگئی۔ شافعہ کمرے کی داہنی دیوار کی طرف پیٹھ موڑے اپنی آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

"آئی ایم سوری شافعہ۔ مجھے بالکل پتا نہیں تھا۔"

"میرا بھائی پاگل ضرور ہے مس.... لیکن کبھی کسی کو کچھ نہیں کہتا۔" اس نے اپنی سرخ ناک رگڑی۔

"میں تمہاری مس نہیں ہوں۔" دن بھر کے دوران یہ تصحیح نگین کو کئی بار کرنی پڑتی تھی، کیونکہ کافی لڑکیاں اسے یہاں مس کہہ کر بلاتی تھیں۔ چھوٹی بچیوں کو تو وہ کچھ نہیں کہتی تھی کہ بہرحال ان سے وہ کافی بڑی تھی، لیکن اپنی ہم عمر لڑکیوں کو ضرور ٹوک دیا کرتی۔

"تو اور کیا کہوں...." وہ تڑخ کر مڑی۔ آنکھوں میں، چہرے پر خفگی ہی خفگی تھی۔

"نویں، دسویں کی ساری لڑکیاں میرا نام لے کر بلاتی ہیں۔ کیونکہ کبھی ایک لفظ بھی تم لوگوں نے مجھ سے پڑھا نہیں۔" اس نے بات بدلنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئی۔

"اچھا اندر چلیں.... لڑکیاں شور کر رہی ہیں اور اندر تم اس موضوع پر کچھ نہیں بولو گی مس...." حکمیہ انداز میں کہتی وہ اس سے پہلے اندر بڑھ گئی۔

"احترام سے بات کرتے کرتے ایک اپنائیت بھری "تم" ڈال دینا پٹھانوں کی بہت پیاری عادت ہے۔" نگین مسکراتے ہوئے خود بھی پیچھے آگئی اور لڑکیوں کے کچھ بھی بولنے سے پہلے اس نے مہارت سے موضوع تبدیل کر دیا۔ بعد میں البتہ دیر تک وہ شافعہ اور اس کی گھریلو زندگی کے متعلق سوچتی رہی تھی۔

اگلی مرتبہ نگین کا دو ہفتے بعد واپس گاؤں آنا ہوا۔ فردوس کے ساتھ اسے بھی دیکھ کر لڑکیاں خوشی سے بھاگیں اور گیٹ پر ہی جمگھٹا لگا لیا۔ مس راشدہ نے ہنس کر فردوس کی طرف دیکھا۔

"بھئی فردوس اگر تمہاری جگہ نگین یہاں ٹیچر ہوتی تو میرے اسکول کا تو اللہ ہی حافظ تھا۔" فردوس خوش دلی سے مسکرا دی، جانتی تھی کہ مس راشدہ مذاق کر رہی ہیں اور وہ بھی نگین کو بہت پسند کرتی ہیں۔ نگین کی متلاشی نگاہیں البتہ شافعہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کہیں ابھی تک وہ اس سے خفا تو نہیں، لیکن جب برآمدے سے اترتی شافعہ نے مسکرا کر

جوش سے ہاتھ ہلایا تو نگین نے بھرپور اطمینان کا سانس لیا۔

دونوں کی دوسری ملاقات اسٹاف روم میں ہوئی۔

دوسرے پیریڈ میں جب نگین اسٹاف روم میں اکیلی بیٹھی تھی۔ شافعہ ہاتھ میں کچھ رجسٹر لیے اندر داخل ہوئی۔ نگین نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ بھی اپنی کتابیں اٹھائے لان میں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

"تم سے ایک بات کرنی ہے نگین۔۔۔" شافعہ نے کچھ جھجکتے ہوئے اجازت طلب کی تو نگین کا دل انجانے خدشے سے دھڑک اٹھا۔ وہ ہرگز اس موضوع پر بات نہیں چاہتی تھی جس پر پچھلے دو ہفتے سے اپنے آپ سے بھی شرمندہ رہی تھی۔

"تم نقاب والا برقع پہن کر آیا کرو' یہ چادر صحیح نہیں ہے۔"

"ہیں۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟" نگین نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"ہاں بھئی۔۔۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

"جس قسم کا تم پردہ کرتی ہو تو آنکھیں ہی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ کسی دن کوئی ڈاکو اغوا کر لے گیا تو بڑا پچھتاؤ گی۔ تمہیں شاید پتا نہیں' پر یہاں خوب صورت سترگے (آنکھیں) کی بڑی ڈیمانڈ ہے۔" آخر میں وہ بھرپور شوخی کے انداز میں منہ چڑا کر بھاگی تو نگین نے مارنے کے انداز میں اس پر کتاب اٹھائی۔

"خوب صورت سترگے کی بچی۔ جان نکال دی میری۔" وہ اب بے تحاشا ہنستے ہوئے اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ایک لحظے کو واقعی وہ ڈر گئی تھی کہ اللہ جانے کس نے اس کے پردے پر اعتراض اٹھایا ہے۔

"اچھا بابا۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔" شافعہ نے ہنستے ہوئے ہاتھ کھڑے کیے۔

"مانا تمہاری آنکھیں بہت پیاری ہیں' پر اتنا نہ اتراؤ۔"

"ارے۔۔۔ میں کب اترائی؟" نگین کمر پہ ہاتھ رکھ کر ٹھٹکی۔

"اب اسے اترانا ہی کہیں گے نا۔۔۔ بھئی جو بندہ اپنی آنکھوں کا خیال نہ رکھے اور دھلے منہ کے ساتھ پھیکی' سوجی سی آنکھیں لے کر کہیں بھی چل پڑے' اس کا مطلب ہے خواہ مخواہ خود کو کوئی چیز سمجھے ہوئے ہے۔"

وہ اپنی دھن میں نہ جانے کیا پٹر پٹر کرتی دوپٹے کے کونے پر بندھی گرہ کھولنے لگی۔ نگین نے تنگ آکر ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

"پتا نہیں کیا مصیبت ہو تم بھی۔"

"یہ لو۔۔۔" اس نے گرہ کھول کر ایک پڑیا اور سلائی برآمد کر کے نگین کی طرف بڑھائی۔

"یہ ہمارے ہاں کا خاص سچا سرمہ ہے۔ گھروں میں تیار کیا جاتا ہے۔ روزانہ لگایا کرو۔ پھر آنکھیں ایسی تھکی سوجی سی نہیں لگیں گی۔"

"نہ بابا!" نگین فوراً بدکی۔ "میں نہیں لگاتی یہ سرمے کاجل۔۔۔" جواباً شافعہ نے نتھنے پھلائے۔

"ابھی میرے سامنے لگاؤ' اچھی بھلی آنکھوں کا ستیاناس کر رکھا ہے۔" اس نے جھپٹ کر پڑیا اور سلائی دوبارہ اپنے ہاتھ میں لی اور باقاعدہ سرمے میں سلائی پھیر کر اس کی طرف بڑھائی۔

"وہ شیشہ ہے' جاؤ اور ابھی لگاؤ۔" شافعہ اسی رعب سے مصر تھی' ناچار برے برے منہ بناتی نگین نے دونوں آنکھوں میں سرمہ لگالیا۔

"توبہ۔۔۔ قسم سے۔۔۔ ٹرک ڈرائیور لگ رہی ہوں۔" وہ خفا خفا سی مڑی۔

"ڈرائیور نہیں۔۔۔" شافعہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"بلکہ بہت پیاری ٹرک ڈرائیور۔" اور بنا جواب کا انتظار کیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ نگین نے بے بسی سے پیر پٹخے۔ اب ان ہی آنکھوں کے ساتھ سب کا سامنا کرنا تھا۔۔۔ لیکن اسے حیرت ہوئی کہ دن بھر کے دوران تقریباً سب نے۔۔۔ پہلے رک کر کچھ دیر حیرت سے اس کے چہرے پر کیسی تبدیلی کا نوٹس لینے کی کوشش کی اور پھر بے ساختہ تعریف کی۔ کچھ فوراً بوجھ گئے کہ آج اس نے سرمہ لگایا ہے اور کچھ نے فقط اتنا کہا کہ

تمہارے چہرے میں آج کچھ نیا پن ہے' لیکن بہت اچھا ہے۔ مس رفعت نے بتایا کہ یہاں کا سرمہ آنکھوں کی تھکاوٹ' سوجن اور دھوپ کی شدت سے بچاؤ کے لیے بہت سود مند ہے۔ اور نگین نے اس دن تعریف ملنے پر جو اس سرمے کا باقاعدگی سے استعمال شروع کیا تو سولہ برس گزر جانے پر بھی آنکھیں کبھی بنا کاجل یا سرمے کے دکھائی نہیں دیں۔

گاؤں میں نگین کا زیادہ وقت اب شافعہ کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اپنی پچھلے دنوں والی کوتاہی کا کچھ ازالہ وغیرہ کرنا چاہتی تھی' بلکہ شافعہ "حقیقتاً" اسے بہت پسند تھی۔ رعب ڈال کر بات کرنے والی اس صاف دل لڑکی کی محبت 'بے ساختہ نگین کو اپنی جانب کھینچتی تھی۔ حالانکہ محبت تو یہاں سب ہی اس سے بہت کرتے تھے۔ لیکن شافعہ صرف محبت نہیں کرتی تھی' وہ اس کا خیال بھی رکھتی تھی۔ جیسے گھر کا کوئی فرد یا کوئی بہت اپنا۔

اپنائیت بھرے ایسے کچھ جذبات نگین نے شافعہ کے لیے اس دن محسوس کیے جب وہ ایک بار فردوس باجی کے ساتھ اسکول آئی تو پتا چلا کہ شافعہ آج غیر حاضر ہے۔ نگین کا وہ پورا دن خالی پن کا احساس لیے گزرا۔ تب پہلی بار نگین کو محسوس ہوا کہ آج کل تو وہ صرف شافعہ سے ملنے کی خاطر ہی گاؤں آنے کا وقت نکالا کرتی تھی۔ شافعہ کو بھی اس روز کی غیر حاضری کا بہت قلق ہوا۔ اسے مہتاب کی زبانی نگین کی آمد کا پتا چلا تو وہ اگلے روز تک کا بھی انتظار نہیں کرپائی اور اسی شام ڈھیر ساری چیزیں پکا کر اسکول اس سے ملنے کے لیے آگئی۔ آس پاس رہنے والی کافی ساری لڑکیاں تو پہلے ہی سیکنڈ ٹائم پڑھنے کے لیے آیا کرتی تھیں' لیکن شافعہ دور رہنے کی وجہ سے نہیں آپاتی تھی۔ لیکن اس دن کے بعد سے شافعہ نے عادت بنالی کہ جب بھی نگین گاؤں آتی وہ ضرور اس سے ملنے کے لیے سیکنڈ ٹائم بھی اسکول آتی۔

نگین نے کشیدہ کاری اور پتلی روٹیاں پکانا ان ہی دنوں میں شافعہ سے سیکھے تھے۔ زندگی محبت اور دوستی کے رنگوں سے بچی بہت خوب صورت' بہت حسین ہوگئی تھی۔ سچی بے ریا اور پر خلوص دوستی بھی جینے کے لیے آکسیجن سے کم نہیں ہوتی' شافعہ سے ملنا' گاؤں جانے کے لیے وقت نکالنا جیسے نگین کے معمولات میں شامل ہوگیا تھا۔ کاش کہ سب کچھ یوں ہی رہتا۔ پرسکون اور رواں.... لیکن بہرحال جھیل سی رواں زندگی میں بھی آخر ایک پتھر گر ہی گیا۔ فردوس کو اسکول میں کام کرتے ہوئے ایک سال ہونے والا تھا جب اچانک نگین کی زندگی میں ایک طوفان آیا۔ اپنے حساب سے نگین نے جسے بہار کے جھونکے سے تعبیر کیا۔ وہ اس دن اپنے گھر پر تھی۔ موسم تبدیل تو ہو رہا تھا لیکن ابھی ٹھنڈ قدرے باقی تھی۔ فردوس گاؤں گئی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ جب ایک رانگ کال نے اس کی زندگی میں تہلکہ مچا دیا۔ غلطی سے اس کا نمبر ملا لینے والے اجنبی سے نگین کی پہلی گفتگو خاصی دلچسپ رہی تھی۔ اجنبی مصر تھا کہ اس نے تنگ کرنے کی غرض سے کال نہیں ملائی اور نگین بھڑک رہی تھی کہ اس پرسکون دوپہر میں بلاشک وشبہ اس کا ارادہ لڑکیوں سے وقت گزاری کرنے کا ہی تھا۔ بحث و تکرار بمشکل پانچ یا سات منٹ جاری رہی اور پھر نگین نے تنگ آکر فون رکھ دیا۔ پھر دوبارہ اس کا فون نہ آیا اگلے پورے ایک ہفتے تک....

اور جب نگین دل میں یہ سوچ کر پشیمان ہوئی کہ اس نے بلاوجہ ایک شریف آدمی کو جھاڑ پلا دی تو عین اسی دوپہر کو اس کا دوبارہ فون آگیا اور جب چھوٹتے ہی اس نے اعلانیہ کہا کہ "آج خالص تنگ کرنے کی نیت سے ہی میں نے فون کیا ہے" تو نگین کو ہنسی آگئی۔ اجنبی بہت ہی دلچسپ بندہ تھا۔ بلکہ کسی حد تک ڈھیٹ بھی... بنا کسی لگی لپٹی کے صاف کہہ دیا کہ....

"اس وقت وہ روزانہ ہی فارغ ہوتا ہے اور کافی بوریت محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا وقت گزاری کے لیے واقعی اس سے دوستی کا خواہش مند ہے۔" اب پتا نہیں نگین اس کی سچائی سے متاثر ہوئی تھی یا دلچسپ

گفتگو سے کہ بنا سوچے سمجھے دوستی کی یہ آفر قبول کرلی۔ دونوں کا رسمی تعلق تعارف کے مراحل سے گزر کر ہنسی مذاق 'شوخیوں' شرارتوں 'سرگوشیوں اور دیکھتے ہی دیکھتے دھواں دار محبت میں تبدیل ہوگیا۔ اجنبی نے اپنا نام احمر بتایا تھا۔ وہ انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ احمر نے اپنے خاندان 'گھر' علاقے سے متعلق ہربات نگین کو بتادی تھی۔ نگین نے بھی جوابا" اپنے متعلق کچھ نہیں چھپایا.... بے کیف شب و روز پر گویا کسی نے دھنک کی چھڑی گھمادی تھی۔ ہر لحہ خوب صورت اور ہر پل اپنے اندر رومانویت سمیٹے ہوئے تھا۔ تین ہفتوں سے وہ گاؤں بھی نہیں گئی تھی۔ اس شام فردوس باجی اسکول میں دو دن گزار کر لوٹیں اسے شافعہ کا خط دیا۔ خط پڑھ کر نگین سخت شرمندہ ہوگئی۔ اسکول میں سب بڑی شدت سے اس کی راہ دیکھتے تھے۔ اس سے پہلے کبھی بھی وہ اسکول سے اتنے لمبے عرصے کے لیے غیر حاضر نہیں رہی تھی۔ نگین نے پیر کو ہی باجی کے ساتھ گاؤں جانے کا ارادہ کرلیا۔ شافعہ نے خط میں نہ صرف باربار آنے پر اصرار کیا تھا بلکہ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اسے کچھ بتانا چاہتی ہے اور شدت سے اس کی منتظر ہے۔ نگین بھی ذہنی طور پر جانے کے لیے تیار ہوگئی' لیکن اس دوران ایک اور عجیب بات ہوگئی۔

اتوار کے دن امی کے پیٹ میں درد شروع ہوا اور انہیں وہم ہونے لگا کہ درد شاید گردے کا ہے۔ وہ فورا" انہیں لے کر ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال آگئی۔ ویٹنگ روم میں انہیں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک اسے کاؤنٹر پر احمر دکھائی دیا۔ احمر سے اب وہ صرف نام کی حد تک واقف نہیں تھی' بلکہ صورت سے بھی جان چکی تھی۔ تین ہفتوں کی مختصر ترین مدت میں محبت نے کافی مدارج طے کرلیے تھے۔ نہ صرف دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا' بلکہ احمر کے دوست کے گھر ایک مرتبہ مل بھی چکے تھے۔ نگین اس وقت چونکہ پردے میں تھی تو احمر کے اسے پہچاننے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ احمر کے ساتھ بھی پردے میں ایک عورت تھی اور اس نے ایک بچی بھی اٹھا رکھی تھی۔ احمر کی آواز بہت صاف اور واضح طور پر اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ اس نے گائناکالوجسٹ کا پوچھا اور مسزاحمر کے نام کی پرچی بنوائی۔ نگین کے کانوں میں تو ہے کسی نے سیسہ انڈیل دیا ہو۔

گھر واپسی تک کا وقت اس نے آندھیوں کی زد میں گزارا۔ اکیلے ہوتے ہی فورا" احمر کا نمبر ملایا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ مجبورا" احمر کو اقرار کرتے بنی کہ نہ صرف وہ شادی شدہ ہے' بلکہ ایک بچی کا باپ بھی ہے۔ نگین نے نہ صرف اسے خوب کھری کھری سنائیں بلکہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرکے فون بند کردیا۔ دل اتنا بوجھل' اتنا اداس تھا کہ سوائے وقفے وقفے سے رونے کے اس کا اور کوئی کام نہیں تھا اور مصیبت تو یہ بھی تھی کہ اپنے آنسو اسے گھر والوں سے بھی چھپانے پڑرہے تھے۔ اس نے جیسے تیسے خود کو گاؤں جانے کے لیے تیار کیا۔ فردوس آج ایک دن کے لیے اسکول جارہی تھی' کیونکہ اگلے روز اسے شہر میں ہی دفتر کی ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ شافعہ نے سوچا کہ سب سے ملنے ملانے اور شافعہ کے گلے دور کرنے کے لیے ایک دن کافی ہے۔ آج البتہ وہ پرانا جوش اور خوشی بالکل مفقود تھی۔ خالی خالی نگاہوں سے راستوں کو تکتی وہ قطعا" اس بات سے لاعلم تھی کہ آج وہ آخری بار گاؤں جارہی ہے۔

مارننگ اسمبلی ختم ہونے کے بعد سب ہی طالبات اور ٹیچرز اپنی اپنی کلاسز میں چلی گئیں۔ نگین اسٹاف روم میں آج بھی اکیلی بیٹھی تھی۔ جب شافعہ حاضری کے رجسٹر لینے اندر داخل ہوئی۔ نگین نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بھاگ کر دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئیں۔ شدید دکھ کی کیفیت میں جب کوئی بہت اپنا اور پیارا گلے سے لگے تو درد آنسو بن کر بھلنے کو بے تاب ہوجاتے ہیں۔ شافعہ کے انداز سے اگر ملنے کی خوشی جھلکتی تھی تو نگین اس لمحے صرف ٹوٹ کر رونا چاہتی تھی۔ دل کا غبار اسے سب کچھ بتا کر اور رو کر ہلکا کرنا چاہتی تھی' لیکن یہ موقع اور وقت ہرگز

موزوں نہ تھا۔ وہ بمشکل اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر اتار کر شافعہ سے الگ ہوئی۔ زبردستی کی مسکراہٹ بھی لبوں پر سجائی۔ لیکن شافعہ اس کی سہیلی تھی اور اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس نے حیرت سے پہلا سوال یہی کیا کہ وہ پریشان کیوں ہے۔

"کچھ نہیں....." نگین نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھاما۔ "شاید سفر کی تھکان ہے۔"

"اور آنکھیں.....؟" شافعہ ہرگز مطمئن نہیں تھی۔ نگین کی سرخ سوجی آنکھیں بہت ویران لگ رہی تھیں۔

"بعد میں بتاؤں گی۔" اس نے جانے کیا سوچ کر حامی بھری۔

"تم بتاؤ کیا کہنے والی تھیں؟"

"ارے ابھی نہیں..... مس رفعت انگلش پڑھا رہی ہیں۔ کسی فارغ پیریڈ میں آؤں گی۔" مسکرا کر وضاحت دیتی وہ جلدی سے پلٹ گئی اور نگین بھی کتابیں لیے لان میں آگئی۔ بریک تک اس نے چھٹی اور ساتویں کے دو پیریڈ بھی لیے کیونکہ مس زاہدہ آج نہیں آئی تھیں۔ بریک میں جب وہ اور شافعہ لان میں آکر بیٹھیں تو نویں کی تقریباً آدھی جماعت اس کے گرد آجمع ہوئی۔ سب ہی اس کی طویل غیر حاضری سے خفا تھیں۔ وہ خاصی خوش دلی سے ان سب سے باتیں کرنے لگی، جبکہ شافعہ شکوہ کناں آنکھوں سے اسے گھورتی رہی۔ نگین کبھی کبھی مسکرا کر اسے دیکھ لیتی تو وہ مزید منہ پھلا لیتی۔ دونوں کو بات کرنے کا موقع آخری پیریڈ میں ہی مل پایا۔ نویں جماعت کا وہ پیریڈ فری تھا۔ کچھ لڑکیاں کلاس روم میں تھیں، کچھ دھوپ میں آبیٹھیں۔ شافعہ اسے لیے ایک پرسکون گوشے میں آبیٹھی۔

"اب بتاؤ..... کیا کہنے والی تھیں۔ دس پندرہ منٹ تو پہلے ہی ضائع ہوگئے۔ کچھ ہی دیر میں چھٹی کا شور بھی اٹھنے لگے گا۔" نگین نے گھڑی دیکھی۔

"میرا رشتہ آیا ہے۔" پہلے ہی جملے پر شافعہ کے گال دہکنے لگے۔

"اچھا....." نگار بے ساختہ کھلکھلائی..... "اتنی کم عمر میں کس کو جلدی پڑ گئی۔ رشتہ دار ہے کیا؟"

"رشتہ دار نہیں ہے۔" وہ شرمیلے انداز میں نیچے دیکھے جارہی تھی۔

"تو پھر کیا جواب دیا تمہارے گھر والوں نے....."

"گھر والوں کو نہیں پتا۔" وہ ذرا سا جھجکی۔

"ہیں..... کیا مطلب....." نگین بالکل نہیں سمجھی۔

"وہ چھٹی جماعت کی فاطمہ ہے نا..... اس کا بھائی ہے۔ جمال نام ہے۔ میرا ان کے ہاں آنا جانا ہے..... اس نے خود مجھ سے کہا کہ وہ....." شافعہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"او..... یعنی وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔" نگین مسکرائی۔ "اور تم.....؟ دیکھو جھوٹ مت بولنا۔"

"ہوں..... میں بھی کرتی ہوں..... لیکن ہمارا مسئلہ کچھ اور ہے۔" وہ کچھ افسردہ نظر آنے لگی۔

"جمال شادی شدہ ہے اور اس کے بچے بھی ہیں۔" نگین کے دل کو دھکا سا لگا۔ یہ کیا کہہ دیا تھا اس نے.....

"شش..... شادی شدہ اور پھر بھی تم....." اس کی آواز گلے میں پھنسنے لگی۔

"کیا کروں۔" شافعہ نے تھکی تھکی سی آہ بھری..... گھر والوں نے زبردستی کم عمری میں اس کی شادی کردی تھی۔ وہاں اس کی مرضی بھی نہیں تھی۔ وہ کہتا ہے اگر زندگی کے اس عجیب موڑ پر مجھے تم سے محبت ہوئی تو اس میں میرا کیا قصور..... وہ بہت اچھا ہے نگین..... بہت سیدھا اور سچا ہے۔ میرے بغیر جی نہیں سکتا۔ بہت جذباتی ہے میرے معاملے میں..... بالکل بچوں کی طرح....." شافعہ اس کے بارے میں بتاتے ہوئے جذباتی ہوگئی۔ سختی سے لب کاٹتے ہوئے وہ اپنے آنسو روکنے کی کوشش کررہی تھی۔ نگین کی اپنی حالت غیر تھی۔ کیا کیا نہ یاد آنے لگا تھا۔ اس نے جب احمر سے کہا تھا کہ آج ان کی آخری گفتگو ہے اور وہ پھر کبھی اس کی طرف پلٹ کر نہیں آئے گی تو احمر بے ساختہ رو دیا تھا۔ اس نے نگین کو سو طرح سے یقین دلایا کہ آئندہ وہ کبھی اس سے جھوٹ نہیں بولے گا۔ بس وہ اسے

اتنی بڑی سزا نہ دے' لیکن اس نے احمر کی ایک نہیں سنی تھی۔

"تو تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا نگین؟" وہ بے بسی سے اپنے ہاتھ مل رہی تھی۔ "میں نے سوچا کہ تم سے مشورہ کروں گی۔ تم اتنی سمجھ دار ہو۔ تم ہی بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"اور اگر میں کہوں اسے چھوڑ دو تو..." نگین نے سوالیہ نگاہ اٹھائی۔

"ہاں... ضرور مان لوں گی' کیونکہ تمہاری دوستی پر میرا بھروسا ہر شے پہ بھاری ہے۔ تم جانتی ہو میرے دل میں تمہارا کیا مقام اور کتنی محبت ہے۔" وہ جذباتی سی ہو کر رو پڑی اور نگین بھی اس مرتبہ خود کو روک نہیں پائی۔

"ہم سہیلیوں کی قسمت بھی اللہ نے ایک جیسی لکھی ہے۔" روتے ہوئے بے ساختہ اس کے منہ سے پھسلا تو شافعہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ایک جیسی قسمت... کیا مطلب...؟ کیا تمہیں بھی کوئی ایسا شخص پسند ہے جو..." تواتر سے سوال پوچھتے ہوئے وہ ایک دم سے رکی تو نگین نے مجرموں کی طرح سر ہلایا۔ شافعہ کی طرف دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ بہت دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

"کیا وہ بھی تم سے پیار کرتا ہے۔ وہ کون ہے نگین' بتاؤ نا۔" شافعہ بے تابی سے استفسار کرنے لگی تو نگین نے خود پر گزرنے والی پچھلے چند ہفتوں کی روداد اس کے گوش گزار دی۔"

"ایسا ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوا نگین؟" شافعہ نے ایک آہ بھری۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ محبت ہماری جھولی میں اسی طرح ہی آنی ہو۔ دنیا میں بے شمار عورتیں ہیں' جو اپنے شوہروں کی دوسری بیویاں ہیں۔ کیا پتا ہم بھی ان ہی میں سے ایک ہوں۔ پھر وہ ہم سے پیار بھی بہت کرتے ہیں۔ اب زندگی کے ایسے موڑ پر ان کا ہم سے ملنا ایک اتفاق ہی تو ہے۔ کیا پتا ہماری زندگی سکھی رہے اور یہ بلاوجہ کے وہم خواہ مخواہ ہمیں ہماری محبت سے دور کردیں۔" شافعہ انجانے میں اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھانے لگی اور نگین کی زبان کو جیسے تالے لگ گئے۔ چپ چاپ وہ اس کی ہر منطق سنتی چلی گئی۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی۔

"کیا پتا یہی راستہ ہماری تباہی کی طرف بھی جاتا ہو۔ کیا پتا یہ محبت تنکوں کا ایسا فرش ہو جس پر قدم پڑتے ہی ہم گہرے کنویں میں جا گریں۔ کیا پتا ہمارے ہاتھ سوائے پچھتاوں کے کچھ نہ آئے..." لیکن سارے خدشے... سارے خیال گھنٹی کی تیز ٹرن ٹرن میں کہیں تحلیل سے ہو گئے۔ دونوں نے بوکھلا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ باتوں میں پتا ہی نہیں چلا اور آخری پیریڈ ختم بھی ہو گیا۔ گیٹ کھل گیا اور بچیاں باہر جانا شروع ہو گئیں۔ فردوس نے اسے چلنے کے لیے آواز لگائی تو ناچار دل کی باتیں دل میں دبائے اس نے شافعہ سے اجازت لی البتہ بہت جلد واپس آنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔

طے یہی پایا کہ دونوں اگلی مرتبہ اس معاملے کو تفصیل سے ڈسکس کر کے کوئی نتیجہ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھیں کہ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات اور آخری گفتگو تھی۔ جانے قدرت نے ایسے موڑ پر کیوں دونوں کو جدا کر دیا تھا جب بہت سی باتیں ان کہی اور ادھوری رہ گئی تھیں۔ آنے والے سالوں میں اسی ایک بات پر نگین سوچ سوچ کر جلتی اور سلگتی رہی کہ کاش وہ اپنے خدشوں کا اظہار زبان سے بھی کر دیتی تو دل پر آپڑنے والے بوجھ میں کسی قدر کمی ضرور محسوس کرتی۔

گھر واپس آنے کے دو دن بعد فردوس کو ٹرانسفر کی خوش خبری ملی۔ جہاں یہ خبر فردوس سمیت سب ہی گھر والوں کے لیے نہایت خوشی کا باعث تھی... نگین کے لیے شدید دکھ اور افسردگی لیے ہوئی تھی۔ پہلی بار اسے ابو جی پر سخت غصہ آیا۔ ان ہی کی بھاگ دوڑ کی وجہ سے

محض سال بھر میں ہی فردوس کو قریب کا اسکول مل گیا تھا۔

فردوس نے اگلے روز آخری مرتبہ چارج دینے کے لیے اسکول واپس جانا تھا۔ نگین نے سنا تو دل میں امید کی کرن جاگی۔ چلو آخری مرتبہ سہی، کم از کم شافعہ سے آخری ملاقات کا بہانہ تو پیدا ہوا۔ اس نے فردوس کو اپنے ساتھ جانے کا بتایا اور مطمئن ہو گئی۔ لیکن رات کو سونے سے پہلے ابو نے یہ بتا کر اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ صبح وہ خود فردوس کے ساتھ گاؤں جائیں گے اور گھنٹے بھر میں ہی کام نپٹا کر وہ اسے ساتھ لیے واپس آجائیں گے۔ نگین نے فردوس کی خوب منت کی کہ وہ اسے بھی ساتھ لے جائے، لیکن وہ ابو کو نہیں منا سکی۔ الٹا نگین کو ابو سے ڈانٹ بھی پڑی کہ آئے روز کالج سے چھٹی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجبوراً اس نے شافعہ کو خط لکھنے کا ارادہ کیا اور یہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی بھول ثابت ہوئی۔ ایسے خط سے تو وہ ان کہی ادھوری گفتگو ہی بہتر تھی۔ لیکن تب یہ بات نگین کی ناقص عقل میں نہیں آسکتی تھی۔ تب ہی اپنی دانست میں ایک بہترین فیصلے کا ارادہ کرتے ہوئے اس نے کاغذ قلم سنبھالا۔ آخری بار شافعہ سے مل کر آنے کے بعد پچھلے دو دنوں میں نگین کے ذہن میں بڑی تبدیلی آئی تھی۔ گاؤں سے واپسی کے راستے میں ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ احمر سے اپنے برے رویے پر وہ جی بھر کے پشیمان ہوئی تھی۔ بھلا محبت بھی کوئی جرم ہے کہ اس کی سزا دی جاتی۔ نگین نے آتے ہی احمر کو فون کر کے اپنے رویے کی معافی مانگی تھی۔ اور وہ مارے خوشی کے کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔ اور جب بولنے کے قابل ہوا تو نگین کا اتنا شکر گزار ہوا کہ وہ اپنے آپ میں شرمندہ ہو گئی اور اب دوستی کے ناتے اس نے شافعہ کو بھی ایسے مشوروں سے نوازنے کا پختہ عزم کرتے ہوئے لکھنا شروع کیا۔

"بہت پیاری شافعہ......

پچھلی بار گاؤں سے آنے اور تم سے ملنے کے بعد سوچا بھی نہیں تھا کہ اگلی مرتبہ بجائے ملاقات کے مجھے خط کے ذریعے تم سے مخاطب ہونا پڑے گا۔ باجی کی اچانک ٹرانسفر سے میں کتنی اداس ہوں، تم تصور بھی نہیں کر سکتیں اور اس وقت یہ خبر سن کر تمہاری کیا حالت ہے اس کا تصور بھی میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ آج باجی کے ساتھ گاؤں آنے کی بہت کوشش کی، لیکن افسوس کہ میری بات نہیں مانی گئی۔ آج میرا تم سے آخری بار ملنا کتنا ضروری تھا۔ میں کسی کو سمجھا نہیں سکی۔ میری دعا ہے کاش ہم دوبارہ مل سکیں۔ وہ بھی بہت جلد، اسکول میں گزرا، یہ ایک سال میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ تم سب کے ساتھ گزارے دن بہت خوب صورت، بہت یادگار تھے۔ کاش ہماری دوستی کو ابھی اور بھی زیادہ وقت مل پاتا۔ ابھی تو ایک دوسرے کے متعلق بہت کچھ جاننا اور ایک دوسرے کو بہت کچھ بتانا تھا۔ تمہاری دوستی میرے لیے بہت قیمتی، بہت انمول تحفہ ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔

اور ہاں اس دن تم نے پوچھا تھا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے تو بہت سوچنے پر مجھے احساس ہوا کہ ہاں، محبت ہی دنیا میں ہر شے سے بڑھ کر اہم ہے۔ اسے کھونا سراسر بے وقوفی ہے۔ تم اور جمال ہرگز اپنے خوب صورت جذبوں کو قربانی کی بھینٹ مت چڑھانا۔ قدرت نے اگر محبت کا تحفہ دیر سے تمہاری جھولی میں ڈالا ہے تو یقیناً اس میں کوئی مصلحت ہوگی۔ محبت کی راہ میں آنے والی ہر دیوار کو پھاند کر اپنے محبوب کو حاصل کر لینا ہی سچی محبت ہے۔ میں بھی دنیا کی مجبوری کے آگے ہار نہیں مانوں گی۔ ہم دونوں ہی ان شاء اللہ اپنی اپنی محبت حاصل کر کے رہیں گے۔

دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھنا اور اسکول میں سب کو میرا بہت بہت سلام کہنا۔ خط کا جواب ضرور دینا اور اپنا ایڈریس بھی ضرور لکھنا، تاکہ اگلا خط میں تمہارے بتائے پتے پر پوسٹ کرسکوں۔ بہت ساری نیک خواہشات کے ساتھ دعاگو......

نگین زہرا......

اس روز نگین بہت خوش اور مطمئن تھی کہ اس نے اپنی عزیز از جان دوست کو بروقت بہت صحیح راہ دکھائی تھی۔ فردوس باجی اس کا خط شافعہ کو پہنچا کر واپس آ گئی تھیں۔ لیکن ابا کی جلدی کی وجہ سے وہ جوابی خط شافعہ سے نہیں لے پائی تھیں۔ نگین نہایت اداس دل لیے اپنے کالج میں مصروف ہو گئی۔ یہ جانے بغیر کہ محض پندرہ دنوں بعد یہ ہی صحیح راستہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی بھول بننے والا تھا جو اس نے نادانی میں شافعہ کو دکھایا تھا۔

اور پھر پندرہ روز بعد جو کچھ نگین کے ساتھ ہوا اس نے جھنجوڑ کر ایک گہری نیند سے نگین کو جگا دیا۔ خواب نگر کا طلسم کسی چھو منتر کی طرح آنکھ سے اوجھل ہو گیا اور سپنوں سے خالی دامن میں رہ گئے صرف پچھتاوے اور ڈھیر ساری ندامت۔۔۔ بے وفا سپنے دامن چھڑا کر جاتے جاتے اس کے لبوں پر ایک ''کاش'' ثبت کر گئے۔۔۔ کہ کاش اس نے باجی کے ہاتھ شافعہ کو خط لکھ کر گمراہ کن مشورے نہ دیے ہوتے۔ جانے اب اس فریب کی انگلی تھامے شافعہ کس غلط راہ پر چل پڑی ہو گی جو نگین نے اپنی دانستہ میں ایک درست فیصلے کی صورت اس تک پہنچایا تھا۔

''آگ لگے اس خط کو۔۔۔ اور ایسی ''سچی دوستی'' کو جس نے میری بھولی بھالی سہیلی کو جانے کس راہ کا مسافر بنا دیا ہو گا۔'' سر ہاتھوں پر گرائے وہ اندر کے طوفان سے نبرد آزما تھی۔ ہوش آیا تو نگین نے اپنا دھیان باقی تمام اطراف سے ہٹا کر صرف شافعہ کی جانب لگا لیا۔ اب اسے ہر صورت شافعہ سے رابطہ کرنا تھا، لیکن جب فیصلے پر عمل درآمد کا وقت آیا تو اسے دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ شافعہ کا ایڈریس تو اب اس کے پاس تھا نہیں۔ اس نے باجی کی پرانی کولیگز سے رابطہ کر کے شافعہ کا ایڈریس حاصل کرنے کا ارادہ کیا، لیکن فردوس نے اس معاملے میں کسی بھی قسم کا تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک تو نئے اسکول کی مصروفیات میں اس کے پاس وقت کی شدید کمی تھی۔ دوسرے گزرے ایک سال کے دوران اس نے اپنی کولیگز سے صرف اسکول کی حد تک ہی ملنا جلنا رکھا تھا۔ نہ ہی اس کے پاس کسی کولیگ کا ایڈریس تھا، نہ ہی فون نمبر۔۔۔

موبائل فون کے تو خیر نام سے بھی سولہ برس پہلے کوئی واقف نہیں تھا۔ اب دوسری کوشش کے طور پر اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سنبھالی۔ مطلوبہ گاؤں کے کالم میں اسے کچھ پچیس، تیس نمبر مل تو گئے، لیکن وہ بار بار تمام نمبرز پر نظریں دوڑاتی اور سوچتی کہ کون سا نمبر ملائے اور کیا کہے۔۔۔ نہ تو اسکول میں فون تھا اور نہ ہی شافعہ کے گھر۔۔۔ نگین کو بس اتنا یاد تھا کہ کبھی کبھار مس رفعت اور زاہدہ عنبرین نامی طالبہ کے ہاں سے اپنے گھر فون کر کے خیریت کی اطلاع دے آتی تھیں۔ اب عنبرین کے والد کا کیا نام تھا، یہ تو نگین نہیں جانتی تھی، ہاں یہ ضرور معلوم تھا کہ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ نگین نے فوراً ''ڈاکٹر'' کے حوالے سے ملنے والے تین نمبرز باری باری ڈائل کر کے عنبرین کا پوچھا، لیکن کسی نمبر پر عنبرین نہیں ملی۔ جانے اس کے والد نے کس نام سے ٹیلی فون لگوایا تھا۔ پتا نہیں اس کی کوئی بھی کوشش کامیاب کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ بس پھر ایک آخری کوشش کے طور پر اس نے ایک خط لکھ کر اسکول کے پتے پر روانہ کر دیا۔ خط اس نے شافعہ کے نام ہی لکھا تھا، لیکن اس میں صرف حال احوال کے بعد اس کا ایڈریس طلب کیا تھا۔۔۔ لیکن اس خط کا جواب نگین کو کبھی موصول نہیں ہوا۔ یعنی گاؤں اور شافعہ اب سچ مچ اس کی دسترس سے بہت دور جا چکے تھے۔

تھک ہار کر اسے پڑھائی کی طرف متوجہ ہونا پڑا کہ فرسٹ ایئر کے امتحان بالکل سر پر آ گئے تھے اور پھر گاؤں تو ایک سہانی یاد بن کر رہ گیا اور شافعہ۔۔۔ ایک درد بھری چبھن جسے بالآخر وقت کی دھول نے کئی دوسری یادوں کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا اور آج۔۔۔ گاڑی رکنے پر وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آئی۔

''میڈم۔۔۔ یہاں سے اسکول کا راستہ پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔'' ڈرائیور نے مؤدبانہ اطلاع دی تو نگین کے

لب مسکرا اٹھے۔

سولہ برس بعد بھی اسکول تک سڑک نہیں بنی تھی۔ آج بھی اسے کھیتوں کے راستے اسکول تک جانا تھا۔ گاڑی سے اتر کر نگین نے اونچے قطعہ نما پولیس اسٹیشن پر ایک نظر ڈالی تو ذہن لمحوں میں سالوں کا سفر طے کرتے کہیں بہت پیچھے چلا گیا۔ سر جھٹک کر اس نے کھیتوں کی پگڈنڈی پر قدم رکھے تو بے ساختہ ہی نگاہوں نے ایک دیوانے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن حیرت انگیز طور پر آج اس کی آنکھوں میں خوف نہیں تھا۔ بس ایک پرانی یاد کو مجسم پالینے کی خواہش۔۔۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ البتہ اسکول کا گیٹ دکھائی دینے لگا تھا۔ سوائے چند ایک معمولی تبدیلیوں کے سب کچھ جوں کا توں لگ رہا تھا۔

کاش اس مختصر سے وقت میں، میں شافعہ سے بھی ملاقات کرپاؤں۔۔۔ دل ہی دل میں دعا مانگتے ہوئے اس نے قدم اسکول کے اندر رکھا۔

☆ ☆ ☆

دونوں اس وقت ایک دوسرے کے سامنے بیٹھی تھیں۔ گزرے سولہ سالوں میں نگین نے یوں تو کئی طرح کے اندازے اس کے بارے میں لگائے تھے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی، لیکن کبھی ایک بار بھی بھولے سے یہ خیال چھو کر نہیں گزرا تھا کہ وہ اسے اسی اسکول میں ایک ٹیچر کی حیثیت سے مل جائے گی۔ حالانکہ وہ ذہین تھی، لائق تھی اور کئی مرتبہ اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کرچکی تھی کہ مستقبل میں وہ ٹیچر بننے کا ارادہ رکھتی ہے۔ بہرحال خوشی کی بات تھی کہ اس وقت وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور اسی کی طرح اس اچانک اور اتفاقیہ ملاقات پر حیران تھی۔ سولہ برسوں نے دونوں میں کئی ظاہری تبدیلیاں پیدا کردی تھیں، لیکن بہرحال یہ تبدیلیاں ان کی شخصیت پر اس قدر بھی حاوی نہیں ہوئی تھیں کہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہ پاتیں۔

شافعہ عرصہ آٹھ سال سے ٹیچنگ کے شعبے سے وابستہ تھی اور اپنے ہی اسکول میں پچھلے تین سالوں سے پڑھا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں نے نہ صرف فوراً" ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا، بلکہ بے حد جوش اور خوشی سے بغل گیر ہوئی تھیں۔ دیگر اسٹاف کو بھی سن کر بہت حیرت ہوئی کہ وزٹ پر آنے والی ایجوکیشن آفیسران کی کولیگ کی بیسٹ فرینڈ نکلی تھی۔

"اف۔۔۔" کمرہ خالی ہونے پر دونوں اکیلی رہ گئیں تو شافعہ نے بے ساختہ سر ہاتھوں میں گرالیا۔

"اس روز اچانک بچھڑنے پر سوچا بھی نہیں تھا، نگین کہ سولہ برس بعد دوبارہ ملنا ہوگا۔" وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر کبھی حیرت سے اسے دیکھتی، کبھی مسکراتی اور کبھی اچانک سنجیدہ ہوکر گویا بہت پیچھے چلی جاتی۔

"سولہ برس کم نہیں ہوتے نگین۔۔۔ پچھتاوے کی آگ میں جلنے کے لیے۔۔۔ کسی سے معافی مانگنے کے لیے اتنا طویل انتظار۔۔۔" شافعہ کی پلکوں پر ستارے چمکنے لگے۔۔۔ نگین نے چونک کر سر اٹھایا۔

"معافی۔۔۔ پچھتاوا۔۔۔" شافعہ انجانے میں اسی کے الفاظ دہرا رہی تھی۔ "لیکن کیوں۔۔۔؟"

"اس روز کے بعد کیا ہوا تھا نگین۔ کیا کچھ بیتی تم پر۔۔۔" شافعہ نے بے ساختہ دونوں ہاتھ تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ سوال جو بڑی دیر سے نگین کے لبوں پر مچل رہا تھا۔ پہلے شافعہ نے پوچھ لیا۔ آخری دن کی ملاقات کے بعد سولہ برس کا طویل وقفہ۔۔۔ لیکن ان کی بات جیسے آج بھی وہیں رکی تھی۔۔۔ مکمل ہونے کے انتظار میں۔۔۔

"معافی تو مجھے مانگنی تھی شافی۔۔۔" نگین نے بجائے جواب دینے کے حیرت سے اسے دیکھا۔

"پچھتاووں کی آگ میں تو میں جل رہی تھی۔ برسوں سے دل پر بوجھ لیے۔۔۔ تم سے ملنے کے بے تاب۔۔۔"

"لیکن کیوں۔۔۔" شافعہ نے تعجب سے پلکیں اٹھائیں۔

"میرا خیال ہے نگین ہماری بات وہیں سے شروع

ہونی چاہیے۔ جہاں ختم ہوئی تھی، پہلے تم بتاؤ۔۔۔ اس روز کے بعد تمہارے ساتھ کیا کچھ پیش آیا؟" شافعہ نے جیسے برسوں کے طویل وقفے کو ترتیب سے سمیٹنے کی کوشش کی۔

"پیش کہاں آئی۔۔۔ افتاد پڑی تھی سر پر۔۔۔" نگین نے مسکراتے ہوئے کچھ سوچا۔۔۔ اور پھر بولنے لگی۔

"گاؤں سے لوٹتے ہی پہلا حملہ تو باجی کی ٹرانسفر کی صورت میں ہوا۔ اس کا افسوس کم کرنے کے لیے تمہیں خط لکھا' لیکن تمہارا جواب نہ پاکر کافی مایوسی ہوئی۔ جیسے تیسے خود کو پڑھائی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ تقریباً بارہ یا تیرہ دن بعد کی بات ہے جب اچانک میری خالہ اپنے بیٹے فرخ کا رشتہ میرے لیے لے کر آگئیں۔ سب ہی گھر والے حیران تھے کہ فردوس سے پہلے میرے رشتے کی جلدی۔۔۔ بھلا کس لیے۔۔۔ لیکن روبینہ خالہ نے معذرت کے ساتھ اس کی بھی وضاحت کردی۔ انہوں نے کہا کہ فرخ اپنے دل میں میرے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے اور وہ نہیں چاہتیں کہ اپنوں میں سے کوئی اور۔۔۔ ان سے پہلے میرا رشتہ مانگ لے اور وہ صرف پچھتاتی رہ جائیں۔ اس لیے وہ میری اور فرخ کی منگنی کردینا چاہتی ہیں۔ ویسے بھی فرخ' فردوس باجی سے چھوٹا تھا اور میرا ہم عمر تھا۔

فرخ انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ تھا۔ بہت لائق اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ میرے ابو بھی اسے پسند کرتے تھے۔ انہوں نے باقی گھر والوں سے صلاح مشورہ کرکے باہمی رضامندی سے خالہ کو رشتے کے لیے ہاں کردی' لیکن میں تو فرخ کے نام کی انگوٹھی بھی پہننا نہیں چاہتی تھی۔ دل و دماغ پر احمر ان دنوں اس بری طرح سوار ہوچکا تھا کہ ہر جائز' ناجائز طریقہ مجھے درست لگ رہا تھا۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ ابو کسی صورت ایک شادی شدہ مرد سے میری شادی کے لیے رضامند نہیں ہوں گے۔ اس لیے سوائے گھر سے بھاگنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ ذہن میں ساری پلاننگ ترتیب دے لینے کے بعد میں نے اگلے روز ہی احمر کو فون

کر کے صورت حال سے آگاہ کیا، لیکن احمر کے منہ سے نکلنے والے پہلے جملے نے ہی مجھے شاکڈ کر دیا۔ کہنے لگا۔

"میں اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر کیسے کہیں بھاگ سکتا ہوں۔" اور میری عقل دیکھو' جواباً" اسے سمجھانے لگی کہ.....

"کوئی بات نہیں' پھر میں ہی تمہارے گھر آجاتی ہوں۔ مجھے تمہاری وائف کے ساتھ رہنے میں کوئی پرابلم نہیں ہے۔" احمر کی تو آواز ہی لرزنے لگی۔ کانپتی آواز میں کہنے لگا۔

"نہیں..... سعدیہ تو مر جائے گی۔ وہ میرے بارے میں ایسا نہیں سوچتی..... پھر مجھے ڈانٹنے لگا کہ..... آخر مجھے ہو کیا گیا ہے۔ محض منگنی ہی تو ہے۔ کیا حرج ہے انگوٹھی پہن لینے میں۔ چند سال گزر جانے دو اسی طرح..... آرام سے کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لیں گے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا کہ "کیا وہ میرے بغیر یہ چند سال گزار لے گا۔"

تب اچانک ہی احمر کی زبان کا شہد لوٹ آیا۔ وہ مجھے سمجھانے اور پچکارنے لگا کہ ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔ باتیں بھی کریں گے اور ملاقاتیں بھی۔ بیچ کے چند سال کیسے گزر جائیں گے' پتا ہی نہیں چلے گا۔ میں حیرت سے اس کے پل پل بدلتے رویے کو دیکھ رہی تھی اور اس کے اعتماد کی وجہ بھی میری سمجھ میں آرہی تھی۔ وہ جن ملاقاتوں کا ذکر کر رہا تھا ان کی ایک جھلک میں پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ احمر اپنے ایک دوست سے اس کے خالی گھر کی چابی مانگ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اس کی دیوانہ وار محبت کے کئی رنگ مجھ پر آشکار ہوئے تھے۔ لیکن تب اسے میں صرف اور صرف محبت سمجھی تھی۔ چونکہ وہ تنہائی کی پہلی ملاقات تھی' تو احمر قدرے محتاط سا تھا' اسی لیے شکر ہے کہ میری عزت بھی محفوظ رہی تھی۔ لیکن بھلا کب تک..... مستقبل کے حوالے سے بھی اس کے ذہن میں ایسی ہی ملاقاتوں کے خاکے تھے۔ مجھے اپنانے کا کہیں دور دور تک اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ محبت کی جو نئی دنیا اس نے مجھے دکھائی ہے' اس سے دور رہنا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ ویسے تو میں اس کی ساری بکواس میں چپ چاپ سنتی رہی تھی' لیکن دماغ میں اس کے ایک ہی جملے کی بازگشت جاری تھی کہ میں اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر کیسے کہیں بھاگ سکتا ہوں۔ سعدیہ مر جائے گی۔ وہ مجھے ایسا نہیں سمجھتی اور بس....." نگین نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"بے ساختگی میں بنا سوچے بولے گئے ان..... چند جملوں کی حقیقت یوں ہر لگی لپٹی پر بھاری آئی کہ مجھے زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ احمر کی دھوکا دہی کا پول کیا کھلا..... دھواں دھار محبت تو سوچ مچ دھواں بن کر اڑ گئی..... اور میں بے وقوف۔ جو چند ہی روز میں یہ سوچنے لگی تھی کہ احمر میرے بغیر سانس تک نہیں لے سکتا' ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔ بیوی کے سامنے دیوتا کا روپ دھار کر رہنے والا میرے ساتھ محض ٹائم پاس کر رہا تھا۔ اپنی ہی نظروں میں نادم اور شرمندہ ہونے کے بعد چپ چاپ فرخ سے منگنی کر لی۔"

"اوہ....." شافعہ نے پرسکون انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "تو یعنی تمہاری شادی خالہ زاد سے ہو گئی۔"

"ہاں میں خوش ہوں کہ آج مسز فرخ احمد کے نام سے جانی جاتی ہوں..... لیکن تم شافی....." نگین نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔

"پلیز اپنے بارے میں بتاؤ نا..... تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا اس روز کے بعد....."

"میرے ساتھ....." شافعہ نے سنجیدگی سے ایک آہ بھری.....

"میرا معاملہ قدرے مختلف رہا..... احمر اگر دوسری شادی کے نام سے بھاگ رہا تھا تو جمال کے دماغ کا فتور ہی دوسری شادی تھی اور وہ اس معاملے میں مہلت دینے کو بھی ہرگز تیار نہیں تھا۔ حالانکہ میں ان دنوں میں فردوس کی ٹرانسفر اور تم سے دوری کی وجہ سے بہت

پریشان تھی۔ اوپر سے شدید افسوس تمہیں خط کا جواب نہ دے پانے کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ حالانکہ تمہارا خط پڑھتے ہی میں نے فوراً" جواب لکھنا شروع کردیا تھا... لیکن جب مس فردوس کو دینے کے لیے اسٹاف روم میں آئی تو پتا چلا کہ وہ جا چکی ہیں۔ میں نے خط میں اپنا ایڈریس بھی لکھا تھا... سب سے زیادہ دکھ بھی اسی بات کا تھا کہ رابطے کا اب کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا تھا۔ دوسری طرف یہ سوچ بھی پریشان کررہی تھی کہ جمال کے معاملے میں اب کس سے مشورہ کروں گی۔

آخری ملاقات میں ہمارے درمیان طے پایا تھا کہ اگلی مرتبہ ان معاملات پر تفصیل سے بات کریں گے۔ ادھر جمال بری طرح میرے سر پر سوار تھا کہ وہ جلد از جلد رشتہ بھیجنا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی کو بھی اس نے لڑ جھگڑ کر میکے بٹھا دیا تھا۔ اب اس کی غیر موجودگی میں ہر قیمت پر مجھ سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میرا دھیان ان دنوں صرف تمہاری طرف لگا ہوا تھا' اس طرح اچانک تم سے دوری ہوئی کہ اور کسی بات میں میرا دل ہی نہیں لگ رہا تھا اور پھر جمال نے بنا مجھ سے صلاح مشورہ کیے دوپار کی ایک بوا کے ہاتھ میرا رشتہ بھیج دیا اور بس... رشتے کا گھر میں آنا تھا کہ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک شادی شدہ بال بچے دار آدمی کا رشتہ آنا اتنا غیر متوقع اور بے جوڑ تھا کہ سب کو پہلا شک ہی ہم دونوں کی باہمی دلچسپی پر گزرا۔ مجھے جمال کی عجلت پر بہت غصہ آیا' لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ابا نے جھٹ پٹ نہ صرف میرا رشتہ پھوپھو کے بیٹے سے طے کردیا' بلکہ دو ماہ بعد شادی بھی کردی۔ تمہیں حیرانی ہوگی سن کر کہ جس روز نویں کلاس کا بورڈ کا آخری پیپر دے کر آئی۔ اسی روز میری رخصتی تھی۔"

"اور جمال..." نگین نے بے ساختہ سوال کیا۔

"اس بے چارے کا تو برا حال ہوگا تمہارے بغیر..."

"ہاں..." شافعہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنسی۔

"اتنا برا حال کہ میری شادی کے بعد وہ محض ایک ماہ ہی انتظار کرپایا اور پھر دوسرے گاؤں سے ایک لڑکی بیاہ لایا۔ جانتی ہو کیوں...؟" شافعہ نے مسکرا کر نگین سے سوال کیا تو اس نے محض کندھے اچکا دیے۔

" زندگی کی آخری سانس تک ساتھ نبھانے والے کے دماغ میں صرف دوسری شادی کا کیڑا گھسا ہوا تھا۔ ہمارے ہاں کچھ مرد اپنے بڑوں کی مرضی کے آگے سر جھکا کر مارے باندھے ارینج میرج تو کرلیتے ہیں' لیکن محبت کی شادی کا خواب تب تک دیکھتے رہتے ہیں جب تک کہ اسے پورا نہ کرلیں... اور محبت کا یہ صفحہ بھی بیک وقت کئی ناموں سے بھرا ہوتا ہے۔ جمال کی شادی کے بعد صحیح معنوں میں میری آنکھوں سے نادانی کی پٹی اتری۔ تب پہلا خیال تمہیں ڈھونڈنے کا آیا۔ اب میں ہر قیمت پر تمہیں احمر کے قرب سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ میرے شوہر عابد کا اللہ بھلا کرے... اس موقع پر میرا بڑا ساتھ دیا اس نے... اگرچہ اسے میں نے صرف اتنا بتایا تھا کہ اپنی ایک بہت پیاری سہیلی کو ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے ساتھ لے کر دو مرتبہ ڈی آئی خان گیا۔ مس رفعت کو تمہارے گھر کے متعلق تھوڑا بہت اندازہ تھا۔ میں اسی آدھے ادھورے پتے پر تمہیں ڈھونڈنے خود وہاں گئی' لیکن بس مقدر میں ملنا نہیں لکھا تھا۔

"لیکن شافعہ... تم نے پچھتاوے اور بوجھ وغیرہ کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس سے تمہاری کیا مراد تھی؟"

"تمہیں انجانے میں ایک غلط مشورہ جو دے بیٹھی تھی۔ یاد نہیں میں نے تم سے کہا تھا کہ کیا پتا محبت ہماری زندگی میں اسی طرح ہی آئی ہو اور دوسری بیوی بن کر شاید ہماری لائف سکھی رہے' وغیرہ وغیرہ... لیکن جب جمال کی اصلیت سامنے آئی تو اپنے کہے یہ ہی چند الفاظ میرے لیے زندگی بھر کا روگ بن گئے۔ اگر تم میری باتوں کے زیر اثر نادانی میں کوئی ایسا ویسا قدم اٹھا بیٹھتیں تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہ کرپاتی... بلکہ معاف تو ایک بھی دن خود کو نہیں کیا تھا۔ تمہارے حالات سے چونکہ لاعلم تھی تو روز ہی یہ سوچ میرے دماغ کو چوکے لگاتی کہ کہیں میری وجہ سے تمہاری

زندگی میں کچھ برا نہ ہو چکا ہو۔ جس سہیلی سے اتنی محبت کی۔ اسی کے لیے تباہی کا راستہ چن لیا۔"

"اوہ..." نگین مسکرانے لگی... عجیب انکشاف کیا تھا شافعہ نے کمال اتفاق تھا کہ سولہ برس سے وہ بھی اسی غم میں مبتلا تھی کہ اس نے اپنی دوست کو بھٹکانے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں... اثر تو ضرور ہوا تھا تمہاری باتوں کا اور اسی وجہ سے بھاگنے کا پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا تھا' لیکن بھلا ہوا احمر کا... جس کا دور دور تک مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

"لیکن نگین... تم بھی تو بوجھ اور پچھتاوے کا ذکر کر رہی تھیں۔ تم نے ایسا کیوں کہا؟" شافعہ کو اچانک خیال آیا۔

"کیوں کہا؟" نگین نے حیرت سے دہرایا۔ "اب تم تو یہ نہ پوچھو شافعہ... میرا خط پڑھنے کے بعد بھی ایسا سوال..."

"تمہارا خط... ہاں مجھے آج بھی اس کا ایک ایک لفظ اچھی طرح یاد ہے۔ مہینوں تمہارے خط کی ہر لائن کو بار بار پڑھا تھا' لیکن نگین... اس میں ایسا کیا تھا۔"

"میرے سب ہی گمراہ کن مشورے' جیسے گھر سے بھاگنے کی صلاح' محبت حاصل کرنے کے لیے ہر جائز ناجائز طریقہ اختیار کرنے کا مشورہ... ہر بات..."
نگین اس کی حیرت پر حیران تھی۔

"نہیں نگین... ایسا کچھ نہیں تھا خط میں... بلکہ ہاں... اسے اچانک کچھ خیال آیا... تمہارا خط تو بے شمار کٹنگز سے بھرا ہوا تھا۔ بس ایک ہی پیراگراف تھا جسے میں بار بار پڑھتی تھی۔ جس میں صرف حال احوال اور دور ہو جانے کا افسوس تھا... مجھے بہت غصہ آیا تھا تم پر کہ لائف میں ایک ہی خط تم نے مجھے لکھا اور وہ بھی ایسا آدھا ادھورا..."

"اوہ..." نگین نے تھک کر سر ہاتھوں پہ گرایا۔

"تو یہ بات ہے۔"

"کیا نگین... میں ابھی بھی نہیں سمجھی۔"

"ہمارے درمیان رابطے کا کام فردوس باجی نے کیا تھا تو یقیناً" کٹنگ بھی انہوں نے کی ہو گی۔ حیرت ہے کہ سولہ سالوں سے میری بہن میرے راز کی امین ہے اور آج تک کبھی اس نے نہ تو مجھے اس بات کا طعنہ دیا' نہ کوئی حوالہ... بلکہ محض بارہ' پندرہ دنوں میں میرا رشتہ فرخ کے ساتھ کرانے میں بھی ضرور ان ہی نے اہم رول ادا کیا ہو گا۔ کیونکہ فرخ بارہا یہ بات دہرا چکا ہے کہ ہماری شادی کے معاملے میں وہ بطور خاص فردوس باجی کا ممنون ہے' لیکن تب میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔"

"کیسے نادان تھے نا ہم..." شافعہ کھسیا کر ہنسی۔

"ہاں... نادانی میں ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو ایسے مشوروں سے نوازنے کی کوشش کی تھی جن کا انجام سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں تھا اور اپنی دانست میں وہ ہمارے مخلصانہ مشورے تھے۔ کیونکہ اس عمر... اس جذباتیت کے حساب سے ہمیں وہی درست لگے تھے۔ یہ تو سراسر قدرت کی مہربانی تھی ہم پر کہ حالات اس کے موافق نہیں ہوئے۔ پھر فردوس باجی نے بھی ذمہ دار بہن ہونے کا پورا حق ادا کیا... بڑی بہن ہونے کے ناتے انہوں نے اپنے فرض سے غفلت نہیں برتی اور میرے الٹے سیدھے مشورے بنا مجھے کچھ بھی کہے مہارت سے خود ہی کاٹ دیے۔"

"یعنی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرنے میں ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔" بیتے دنوں کی یاد میں کھوئی شافعہ کا چہرہ ندامت سے سرخ پڑ گیا۔

"نہیں..." نگین نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔

"دوستی تو ہم نے خوب نبھائی' لیکن اپنے حساب سے... دراصل دوست تو ایک دوسرے کے ساتھ وفادار ہی ہوتے ہیں... ساری بے وفائی ان کے ساتھ عمر کرتی ہے۔ ناسمجھی کے فیصلے... نادانی کے مشورے... ساری وفاداری' سارے خلوص کو بہالے جاتے ہیں اور پرخلوص دوست کھڑے سوچتے رہ جاتے ہیں کہ ایسا ہم نے کیا کر دیا جو حالات یوں تباہی کے رخ پر چل پڑے۔"

"ہاں... لیکن ایسا ہمیشہ' ہر کسی کے ساتھ نہیں

ہوتا۔" شافعہ نے اس کے تجزیے سے بھرپور اتفاق کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھایا۔

"جہاں ہمارے بڑے اپنے بچوں کی دوستیوں، میل جول اور رابطوں پر اپنی بھرپور نگاہ رکھتے ہیں وہاں ایسی غلطیوں اور بے وقوفیوں کے امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں۔ بس ہر کسی کو اپنی ذمہ داری سمجھنے کی ضرورت ہے۔"

"اور ہم دونوں نے تو ہر معاملے میں لاپروائی کا ثبوت دیا۔ نہ ہم نے غیر مردوں کے ساتھ میل جول بڑھانے میں احتیاط سے کام لیا اور نہ ہی ایک دوسرے کو کوئی اچھا اور مناسب مشورہ دے پائے۔۔۔ پھر بھی جانے کس کی نیکی کام آئی کہ خطروں میں کودنے کے باوجود ان سے بچتے چلے گئے۔"

"ورنہ اپنے پلان تو برے ڈوبنے کے تھے۔" شافعہ ہنسی تو بے ساختہ نگین کو بھی ہنسی آگئی اور وہ دونوں ہی دیر تک ہنستی چلی گئیں۔ ایسی ہنسی جس میں برسوں کا غبار تھا۔ پھر نہ جانے کیسے۔۔۔ ہنستے ہنستے دونوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ نگین نے بھیگی پلکیں اٹھا کر شافعہ کو دیکھا۔

"یہ انسان بھی نا۔۔۔ بڑی عجیب مخلوق بنائی رب تعالیٰ نے۔" مسکرا کر اس نے آنکھوں کے کونے صاف کیے۔

"سانپوں۔۔۔ بچھوؤں، ڈاکوؤں، حتیٰ کہ دیوانوں سے گھبرانے، انہیں اپنا دشمن سمجھنے والے ہم کبھی کبھار اپنی ذات کے ساتھ کتنی بڑی دشمنی کر جاتے ہیں۔"

"نہ صرف اپنے بلکہ ان کے ساتھ بھی۔۔۔ جنہیں ہم بہت عزیز، بہت قریب، بہت محبوب رکھتے ہیں۔" شافعہ بھی روتے روتے مسکرائی۔

"تقدیر نے بھلے بربادی سے بچالیا تھا، پھر سولہ برسوں تک جس دکھ کے ناسور کو اکیلے اکیلے اپنے اندر پالتے رہے۔ وہ شاید پاداش تھی اس غلطی کی وجہ جو ہم سے بہرحال سرزد ہوئی۔" نگین نے کھلے بندوں اپنا محاسبہ کیا۔

"عزیز از جان سہیلی کو محض بے خبری اور ناسمجھی کے تحت بربادی کی آگ میں جھونکنے کے پچھتاوے پالتی۔۔۔ ہم نادان سہیلیاں جن کے دکھ بھی ایک ہوتے ہیں اور سکھ بھی۔۔۔"

☆

درِ کسریٰ پہ صدا کیا کرتا
اک کھنڈر مجھ کو عطا کیا کرتا

جس اندھیرے میں ستارے نہ جلے
اک مٹی کا دیا کیا کرتا

ڈھب سے جینا بھی نہ آیا جس کو
اپنے مرنے کا گلہ کیا کرتا

جو نہ سمجھا کبھی مفہومِ وفا
اپنا وعدہ بھی وفا کیا کرتا

نکہت و رنگ کا پیاسا تھا ندیم
صرف اک لمسِ ہوا کیا کرتا

احمد ندیم قاسمی

تجھ پر بھی فسوں دہر کا چل جائے گا آخر
دُنیا کی طرح تُو بھی بدل جائے گا آخر

پھیلی ہے ہر اک سمت حوادث کی کڑی دھوپ
پتھر ہی سہی، وہ بھی پگھل جائے گا آخر

وہ صبح کا تارہ ہے تو پھر ماند بھی ہو گا
چڑھتا ہوا سورج ہے تو ڈھل جائے گا آخر

دل تجھ سے بچھڑ کر بھی کہاں جائے گا اے دوست
یادوں کے کھلونوں سے بہل جائے گا آخر

آوارہ و بدنام ہے محسنؔ تو ہمیں کیا؟
خود ٹھوکریں کھا کھا کے سنبھل جائے گا آخر

محسن نقوی

نین کھلتے نہ تھے نیند آتی نہ تھی، رات آہستہ آہستہ ڈھلتی رہی
سارے اوراقِ غم منتشر ہو گئے، دیر تک دل میں آندھی سی چلتی رہی

گھاس تھی جگنوؤں کو چھپائے ہوئے، پیڑ تھے تیرگی میں نہائے ہوئے
ایک کونے میں سر کو جھکائے ہوئے، درد کی شمع افسردہ جلتی رہی

پہلا دن تھا محبت کی برسات کا، وقت ٹھہرا تھا تجھ سے ملاقات کا
قطرہ قطرہ گزرتی رہیں ساعتیں، سائے لیٹے رہے، دھوپ چلتی رہی

رنج پچھلی مسرت کے سہتے تھے ہم، ایک ہی قریۂ جاں میں رہتے تھے ہم
دن ڈھلے یا کسی صبح کے موڑ پر، اپنے ملنے کی صورت نکلتی رہی

ایک راتوں سے بچھڑی ہوئی رات میں، ہم اکیلے تھے خوابِ ملاقات میں
دونوں اک دوسرے کی طرف چل پڑے، خواب ڈھلتا رہا، رات ڈھلتی رہی

احمد مشتاق

لاعلمی

بیوی نے شوہر سے کہا۔ "تم تو کہتے تھے شادی کے بعد بھی مجھ سے پیار کرتے رہو گے۔"

"مجھے کیا پتا تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہی ہوجائے گی۔" شوہر نے سادگی سے جواب دیا۔

خوبی

"پراپرٹی ڈیلر صاحب! آپ مجھے وہی مکان ولانے کی کوشش کررہے ہیں ناجس کے قریب سے ریلوے لائن گزرتی ہے۔"

"جی ہاں، آپ بالکل ٹھیک سمجھے، آپ تو اس مکان کی اس اہم خوبی سے پہلے ہی واقف ہیں کہ ٹرانسپورٹ کی سہولت اس کے دروازے پرہی دستیاب ہے۔"

ذرا سی خراش

بازار سے واپسی پر بیوی نے شوہر کو بتایا۔

"گاڑی کے بونٹ پر ذرا سی خراش آگئی ہے۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو دیکھ لینا۔ بونٹ ڈگی میں رکھا ہوا ہے۔"

ہمارے اصول

جب دو کاروں میں ٹکر ہو تو فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ کون سا ڈرائیور غلطی پر تھا۔ ہمارے یہاں کے لوگوں نے اس معاملے میں چند اصول بنائے ہیں۔ ممکن ہے ان پر عمل کرنے سے دوسرے ممالک کے لوگوں کو بھی فائدہ ہوجائے۔

غلطی ہمیشہ سیکنڈ ہینڈ اور کم قیمت گاڑی والے کی ہے۔

غلطی ہمیشہ مرد ڈرائیور کی ہے۔ عورت ڈرائیور کی نہیں خواہ وہ بغیر لائسنس گاڑی چلارہی ہو۔

غلطی ہمیشہ معمولی لباس پہننے والے ڈرائیور کی ہے۔ یونی فارم یا سوٹ پہننے والے کی نہیں۔

غلطی ہمیشہ قومی زبان بولنے والے ڈرائیور کی ہے۔ انگریزی بولنے والے کی نہیں۔

جواب

ایک سیمی نار میں شادی شدہ خواتین سے ایک سوال پوچھا گیا کہ آپ نے آخری دفعہ کب اپنے شوہر کو "آئی لو یو" بولا تھا۔

کسی نے کہا آج ہی بولا ہے۔ کسی نے کہا دو دن پہلے بولا تھا۔ سب سے کہا گیا کہ آج ہی اپنے شوہر کو میسج کر کے "آئی لو یو" کہیں۔ جس خاتون کو سب سے اچھا جواب موصول ہوگا۔ اسے دس تولہ سونا انعام میں دیا جائے گا۔

کچھ دیر بعد ان کے شوہروں کے جواب آنا شروع ہوگئے۔ جو اس طرح تھے۔

1۔ آج تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟
2۔ گھر کا خرچا ختم ہوگیا کیا؟
3۔ کہیں تم میکے تو نہیں جارہی ہو؟
4۔ لگتا ہے۔ آج گھر پر کھانا نہیں بنے گا؟
5۔ کیا مطلب؟
6۔ تم خواب میں ہو یا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟
7۔ ہیلو کی شادی میں کسی کی جیولری پسند آگئی کیا؟
8۔ آفس میں اتنا ٹینشن ہے اور تمہیں عاشقی سوجھ رہی ہے۔
9۔ کتنی بار کہا ہے انڈین ڈراما سیریل مت دیکھا کرو۔
10۔ گاڑی پھر ٹھونک دی کیا؟

فائنل جواب جس کو دس تولہ انعام ملا، اس کا

جواب تھا۔

"آئی لو یو ٹو' بٹ ہو آر یو؟"

گواہی

ٹریفک سارجنٹ نے طویل اور طوفانی تعاقب کے بعد ایک صاحب کو روکا جو سگنل توڑ کر تیزی سے فرار ہونے کی کوشش کررہے تھے۔

"تمہیں شرم نہیں آتی۔ پہلے سگنل توڑا اور پھر اس تیزی سے گاڑی بھگائی جس رفتار سے اس سڑک پر گاڑی چلانے کی اجازت نہیں ہے۔" سارجنٹ غصے سے بولا۔

"میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ آپ میری بیگم سے پوچھ لیں۔" وہ صاحب معصومیت سے بولے۔

"کیوں بیگم صاحبہ! آپ گواہی دیں گی کہ آپ کے شوہر نے نہ سگنل توڑا نہ گاڑی تیز چلائی؟"

"میں تو ایک بات جانتی ہوں۔" خاتون نے سر جھکا کر کہا۔ "جب میرے میاں نشے میں ہوں اور ڈرائیونگ لائسنس گھر بھول آئیں تو ان سے بحث نہیں کرنی چاہیے۔"

اگر

ایک صاحب پندرہ سال سے شہر سے باہر نہیں گئے تھے۔ ایک بار چند روز کی چھٹیاں آئیں تو انہوں نے سوچا چلو چھٹیوں کا یہ عرصہ شہر سے باہر چل کر گزار دیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سولہ سالہ لڑکی کو ساتھ لیا اور سفر پر روانہ ہوگئے۔ ابھی ٹرین نے بیس میل سے زیادہ کا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے ٹرین کو جنگل میں روک لیا اور سارے مسافروں کا سامان لوٹ کے لے گئے۔ ڈاکوؤں کے جانے کے بعد وہ صاحب روتے ہوئے بولے۔

"ہائے میں تو لٹ گیا۔ تباہ و برباد ہوگیا۔ میری ہر چیز چھین لی گئی۔"

"روئیے مت ابا جان۔" ان کی بیٹی دلاسا دیتے ہوئے بولی۔

"میں نے سارے زیورات بچالیے ہیں۔ جیسے ہی میں نے ڈاکوؤں کو دیکھا' اپنی انگوٹھیاں' گلے کا ہار' کانوں کے بندے' ہاتھوں کی سونے کی چوڑیاں سب کو اپنے منہ میں رکھ کر چھپالیا۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "مگر ہمارے ساتھ تمہاری امی بھی آئی ہوتیں تو ہم لوگ سوٹ کیس اور بستر بھی بچالیتے۔"

قانونی زبان

پروفیسر وکیل نے شاگرد سے کہا۔

"تم کسی کو سنگترہ دینا ہو تو کیا کہو گے؟"

طالب علم۔ "یہ سنگترہ لو۔"

پروفیسر۔ "نہیں ایک وکیل کس طرح دے گا۔"

"میں گل خان ولد شیر زمان ساکن نیا آباد کراچی اپنے ہوش و حواس کے ساتھ اور بغیر کسی سے ڈرے اور بنا دباؤ' اس پھل کو جو اردو میں سنگترہ کہلاتا ہے اور جس کے میں پورے مالکانہ حقوق رکھتا ہوں' کو اس کے چھلکے' رس گودے' بیج سمیت آپ کو دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ آپ کو پورا حق دیتا ہوں کہ آپ اسے کاٹنے' چھیلنے' فریج میں رکھنے یا کھانے کے لیے پوری طرح آزاد ہیں۔ یہ بھی حق ہے کہ آپ کسی بھی دوسرے شخص کو یہ پھل اس کے چھلکے' رس گودے اور بیج کے بغیر یا اس کے ساتھ دے سکتے ہیں۔"

فضول قصے کہانیاں

ایک صاحب کی شادی ہونے والی تھی۔ انہوں نے عورت کی عادات و فطرت کے بارے میں منفی باتیں سن رکھی تھیں۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ اس بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں کہ عورت کا دل کس طرح جیتا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ کتابوں کی ایک دکان پر پہنچے اور کہا۔

"آپ کے پاس وہ کتاب ہوگی جس کا عنوان ہے۔ "عورت پر حکومت کیجیے۔"

"جی نہیں! ہمارے پاس فرضی قصے کہانیوں والی کتابیں نہیں ہوتیں۔" دکاندار نے منہ بنا کر جواب دیا۔

☆

شگفتہ جاہ

آسمانِ سخن کے کاروان کے پاؤں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مومن مرد اور مومن عورت پر اس کی جان، اولاد اور مال میں آزمائشیں آتی رہتی ہیں (جن سے ان کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں) یہاں تک کہ جب وہ اللہ کو ملتے ہیں (ان کو موت آتی ہے) تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند حسن صحیح ہے)

فائدہ:

اس سے معلوم ہوا کہ مومن بطور خاص آزمائشوں کا ہدف رہتا ہے اور اس میں اس کے لیے بھلائی کا پہلو یہ ہے کہ ان سے اس کے گناہ معاف ہوتے رہتے ہیں بشرطیکہ وہ صبر کا دامن تھامے رہے اور ایمان پر مضبوطی سے قائم رہے۔

اللہ پر یقین،

حضرت زنیرہؓ، حضرت عمرؓ کے گھرانے کی لونڈی تھیں۔ انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ حضرت عمرؓ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جوں ہی حضرت زنیرہؓ نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو حضرت عمرؓ غصے میں آگ بگولہ ہوگئے۔ انہوں نے خود بھی ان کو خوب مارا اور ان کے گھر کے افراد بھی برابر مارتے رہے۔ مکے کے کافروں نے انہیں سر بازار اس قدر مارا کہ ان کی بینائی چلی گئی اور وہ نابینا ہوگئیں۔

اس کے بعد کافروں نے طعنہ دینا شروع کیا کہ اے زنیرہ چونکہ تم ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کو برا بھلا کہتی تھیں، اس لیے ہمارے ان بتوں نے تمہاری آنکھوں کی روشنی چھین لی ہے۔

یہ طعنہ سن کر حضرت زنیرہؓ نے جوش میں آکر کہا۔

"ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم تمہارے لات و عزیٰ میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ میری آنکھوں کی روشنی چھین سکیں۔ میرا اللہ جو واحدہٗ لاشریک ہے، وہ جب چاہے گا میری آنکھوں کی روشنی واپس آجائے گی۔"

ان الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ ان کی آنکھوں کی روشنی واپس آگئی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا،

تم کو دو باتوں سے ڈراتا ہوں۔ ایک خواہش کی پیروی، دوسرے آرزوؤں کا پھیلاؤ۔ خواہشوں کی پیروی انسان کو حق سے روکتی ہے اور خواہشات کا زیادہ ہونا آخرت کو بھلاتا ہے۔

دوسروں کو نصیحت،

ایک بستی میں لوگ گناہوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے احتراز کرتے۔ اس بستی میں ایک بزرگ عبادت گزار تھے۔ وہ اپنے حجرے میں تنہا بیٹھ کر راہبانہ عبادت کرتے رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیلؑ کو حکم دیا کہ پوری بستی کو تباہ کردیا جائے۔ جبرائیلؑ وہاں گئے تو دیکھا کہ ایک بزرگ محو عبادت ہیں۔ وہ بہت حیران ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے استفسار کیا کہ کیا انہیں بھی بستی والوں کے ساتھ شامل کیا جائے۔ وہ تو عبادت گزار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "ہاں، وہ بھی ان میں شامل کیے جائیں گے کیونکہ وہ خود تو عبادت و ریاضت کے پابند ہیں لیکن دوسروں کو تبلیغ و نصیحت نہیں کرتے۔"

چنانچہ جبرائیلؑ نے پوری بستی کو تہس نہس کردیا۔

صحابہؓ کا فقر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں۔
"میں نے اصحاب رضوان اللہ اجمعین میں سے ستر ایسے اصحاب کو دیکھا ہے جن کو پورا لباس بھی میسر نہ تھا۔ کسی کے پاس صرف اوڑھنے کی چادر ہوتی تو کسی کے پاس تہبند اور وہ اس کو لپیٹ کر گلے سے باندھ لیتے تھے۔ تو کسی کے تو نصف پنڈلی تک وہ چادر آتی اور کسی کے ٹخنوں تک اور سامنے سے وہ اسے اپنے ہاتھ سے تھامے رہتے تھے۔"
(بخاری)

آخرت کے عوض

ایک آدمی عامر بن قیسؒ کے پاس سے گزرا۔ وہ نمک اور سبزی کھا رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔
"اے اللہ کے بندے کیا تو اس قدر دنیا پر خوش ہو گیا؟"
انہوں نے کہا۔ "کیا میں تمہیں اس سے بدتر نہ بتاؤں؟"
کہا۔ "ہاں فرمائیے۔"
عامر بن قیسؒ نے کہا۔ "اس سے بدتر وہ ہے جو آخرت کے عوض دنیا پر راضی ہو گیا۔"

دل کا مرنا

ایک بار مالک بن دینارؒ نے حسن بصری سے پوچھا۔
"لوگوں کی خرابی کس بات میں ہے؟"
فرمایا۔ "دل کے مرنے میں۔"
پوچھا۔ "دل کا مرنا کیا ہوتا ہے؟"
فرمایا۔ "دنیا کی محبت۔"

تہجد کی اہمیت

وفات سے قبل حضرت جنید بغدادیؒ نے وصیت فرمائی کہ میری طرف جتنی علم کی باتیں منسوب ہیں اور لوگوں نے انہیں لکھ لیا ہے، وہ سب دفن کر دی جائیں۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو جواب دیا۔
"جب لوگوں کے پاس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا علم (حدیث) موجود ہے تو میری خواہش یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے میری ملاقات اس حالت میں ہو کہ میں نے اپنی طرف سے منسوب کوئی چیز نہ چھوڑی ہو۔"
وفات کے بعد جعفر خلدیؒ نے انہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا۔
"حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟"
حضرت جنید نے جواب دیا۔ "وہ اشارے ختم ہوئے، وہ عبارتیں غائب ہو گئیں، وہ علوم فنا ہو گئے، وہ نقوش مٹ گئے اور ہمیں نفع پہنچایا تو چند رکعتوں نے جو ہم سحری کے وقت پڑھ لیا کرتے تھے۔"

کامیابی کا راز

کامیابی کا راز صرف دو خصوصیات میں پنہاں ہے۔ مستقل مزاجی اور مزاحمت۔ جو کچھ کرنا ہے، اس پر ڈٹے رہو اور جو کچھ نہیں کرنا ہے، اسے کرنے سے خود کو روکے رکھو۔
ہیرو صرف اس وجہ سے ہیرو نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں سے زیادہ بہادر ہوتا ہے۔ وہ اس وجہ سے ہیرو ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے دس منٹ زیادہ بہادر ہوتا ہے۔
(رالف والڈو ایمرسن)

قبولیت کی دعا

قبولیت دعا کے لیے مایوسی، احساس بے چارگی اور اضطراب غم ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی بدکاروں کی دعا بھی قبول ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو غم زدہ دل کی بے تاب دھڑکن مائل بہ کرم کرتی ہے۔
(ابن جوزی)
ہانیہ عمران۔ گجرات

ایثار کا انعام

بہت سال پہلے کی بات ہے دو نوجوان اسٹینفورڈ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ مالی حالات کی خرابی کی وجہ سے انہیں اخراجات پورے کرنا مشکل تھا۔ ایک دن ان کے ذہن میں ایک ترکیب آئی کہ وہ ایک میوزک کنسرٹ کا اہتمام کر کے اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے رقم

اکٹھی کر سکتے ہیں۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مشہور پیانو نواز پیڈرووسکی کے کنسرٹ کا اہتمام کریں گے۔

انہوں نے پیڈرووسکی کے مینیجر سے رابطہ کیا تو اس نے بتایا کہ پیڈرووسکی ایک پروگرام میں شرکت کا معاوضہ دو ہزار ڈالر لیتا ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ لیکن انہوں نے منظور کر لی۔

پیڈرووسکی نے کنسرٹ میں شرکت کی لیکن ان کے پاس صرف سولہ سو ڈالر جمع ہوئے۔ جب پیڈرووسکی کنسرٹ میں شرکت کے بعد روانہ ہونے لگا تو انہوں نے اسے سولہ سو ڈالر نقد اور چار سو ڈالر کا ایک پرومیسری نوٹ دیا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ ان کے پاس اتنی ہی نقد رقم جمع ہوئی ہے۔ باقی رقم وہ جلد از جلد کما کر اسے ادا کر دیں گے۔"

پیڈرووسکی نے پرومیسری نوٹ پھاڑ کر دو ٹکڑے کر دیا اور سولہ سو ڈالر انہیں واپس دیتے ہوئے کہا۔

"ان پیسوں سے اپنے اخراجات پورے کرو اور دل لگا کر پڑھو۔"

اس نے اتنا کہا اور رقم انہیں دے کر چلا گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ پہلی عالمی جنگ ہوئی تو پیڈرووسکی اس زمانے میں پولینڈ کا وزیراعظم بن چکا تھا۔ جنگ کے بعد ملک میں شدید غذائی قلت ہو گئی۔ دنیا میں صرف ایک ہی شخص اس مسئلے کو حل کر سکتا تھا اور وہ تھا امریکی فوڈ اینڈ ریلیف بیورو کا سربراہ رابرٹ ہوور۔

پیڈرووسکی نے اس سے مدد کی درخواست کی تو رابرٹ ہوور نے ہزاروں ٹن خوراک پولینڈ بھجوا دی۔

پیڈرووسکی نے خوراک اپنے عوام میں تقسیم کر دی۔ جب ایک اجلاس میں اس کی ملاقات ہوور سے ہوئی تو پیڈرووسکی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ہوور نے اس سے کہا۔

"شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کے احسان کا بدلہ دیا ہے۔ شاید آپ کو یاد نہیں، آج سے کئی سال پہلے آپ نے میری مدد کی تھی۔"

پھر اس نے واقعہ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"میں ان دو طالب علموں میں سے ایک ہوں۔ جب میں مشکل میں تھا تو آپ نے میری مدد کی تھی۔ اب آپ مشکل میں ہیں تو میں نے آپ کی مدد کی۔"

نادیہ، نجمہ۔ گلستان جوہر

چند باتیں زندگی کی،

- سب سے بڑی خواہش ہر انسان کو خوش کرنے کی ہے اور متاثر کرنے کی اور اس کی سزا یہ ہے کہ انسان نہ متاثر ہوں گے نہ خوش۔
- ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اسے سچ سمجھ لیتے ہیں۔ دوربین اور خوردبین نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ سچ نہیں ہوتا۔ ہم ساکن ہیں لیکن متحرک۔ ہماری عمر بڑھ رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری عمر کم ہو رہی ہے۔

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

دوسروں کی مدد کرنا،

عالمی شہرت یافتہ ماہر نفسیات ڈاکٹر کارل میننگر نے ایک مرتبہ کہا۔

"اگر تمہیں علم ہو کہ کسی شخص کا نروس بریک ڈاؤن ہونے والا ہے تو تم اسے کیا نصیحت کرو گے؟"

سامعین کو توقع تھی کہ ڈاکٹر میننگر کہے گا کہ اسے ماہر نفسیات کے پاس جانا چاہیے لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ اس نے کہا۔

"میں اس شخص کو نصیحت کروں گا کہ وہ شہر کی دوسری جانب جائے۔ کسی ضرورت مند کو ڈھونڈے اور اس کی مدد کرے۔ ایسا کرنے سے اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

نمو، اقرا۔ کراچی

خالدہ جیلانی

سیدہ لوبا سجاد ________ کہروڑ پکا

خاک اڑتی ہے رات بھر مجھ میں
کون پھرتا ہے در بدر مجھ میں
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
تو ہے موجود اس قدر مجھ میں

سیدہ نسبت زہرا ________ کہروڑ پکا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا!

گڑیا شاہ ________ کہروڑ پکا

کوہکن کیا پہاڑ کاٹے گا
پردے میں زور آزما ہے عشق
کون مقصد کو عشق میں پہنچا
آرزو عشق، مدعا ہے عشق

نادیہ، ارم ذوالفقار ________ گلستانِ جوہر

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

صدف عمران ________ کے ڈی اے سوسائٹی

وہ خواب جو دیکھا نہ کبھی، لے اڑا نیندیں
وہ درد جو اٹھا نہ کبھی، کھا گیا دل کو
وہ آئیں تو حیران، وہ جائیں تو پریشان
یارب! کوئی سمجھائے، یہ کیا ہو گیا دل کو

کائنات اصغر لمبردار ________ ڈہرکی

• ڈھونڈتی پھرتی ہے دشت و بیاباں میں ہمیں
زندگی ہم سے بچھڑ کر خود بھی پچھتائی بہت

کنیز فاطمہ ________ جڑانوالہ

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیالِ روزِ جزا گیا

نمرہ، اقرا ________ کراچی

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا
ہم تو سمجھے تھے کہ ہم بھول گئے ان کو
کیا ہوا، آج یہ کس بات پہ رونا آیا

فرزانہ مغل ________ واہ کینٹ

میں پا نہ سکا آج تک اس خلش سے چھٹکارا محسن
وہ مجھے جیت بھی سکتا تھا مگر ہارا کیوں

ایمان فہد، مدیحہ ________ مدینہ کالونی

دہکتی ہے میرے اندر فصل شعلوں کی
تم بات کرتے ہو بارش کی، پھولوں کی
ایک لڑکی، ہنسی بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ
مگر یہ بات ہے جلتے کئی سالوں کی

طہٰ مصطفےٰ ________ فاروق آباد

ہم اپنے آپ میں یوں گم ہوئے ہیں عرصے سے
ہمیں تو جیسے کسی کا بھی انتظار نہیں
کسی کو ٹوٹ کر چاہیں کہ چاہ کر توڑیں
ہمارے پاس تو اتنا بھی اختیار نہیں

فوزیہ ثمر بٹ ________ گجرات

اس اذیت سے کسی طور رہائی تو ملے
اس کے لکھے ہوئے خطوط آج جلا ڈالتے ہیں
روگ تم دل کو لگا لیتے ہو اور لوگ بشیر
ربط کتنا بھی ہو دو دن میں بھلا ڈالتے ہیں

ثنا عبدالقیوم ________ بنگہ چیمہ

سحر بن کے آنکھیں کھلیں تو حقیقت کا پورا سبق داستاں ہو گیا
یہ کیا ہے، محبت میں اک شخص کا اپنا سفر رائیگاں ہو گیا
بساط ہنر سے جنوں طلب تک، میں ٹوٹا ہوں کیسے تمہیں کیا خبر
میں دل کی حدوں سے جو آگے گیا تو مرے ساتھ گم اک جہاں ہو گیا

گیلانی سسٹرز ——— کہروڑ پکا

جو تم نے بخشے ان ہی رتجگوں پہ غور کرو
پھر اس کے بعد میرے حوصلوں پہ غور کرو
سفر کا سب سے کٹھن موڑ اور میں تنہا
بچھڑنے والے میری وحشتوں پہ غور کرو

صدف عمران ——— کے ڈی اے

سب کا احسان اٹھانے کی ضرورت کیا ہے
ساتھ ہو تم تو زمانے کی ضرورت کیا ہے
پھول کو کبھی خوشبو بچاتے دیکھا ہے
تم ہو خوشبو تو بتانے کی ضرورت کیا ہے

گیلانی سسٹرز ——— کہروڑ پکا

کس قدر تکلیف دہ تھا آرزوؤں کا سفر
مسئلہ در مسئلہ، سانحہ در سانحہ

حدین زینب ——— کہروڑ پکا

کبھی ہماری محفلوں میں بھی آ کر دیکھ محسن
کتنا روتے ہیں زمانے کو ہنسانے والے

کائنات اصغر بوزدار ——— ڈیرہ کی

بنے اجنبی سبھی، ہم سفر اور نظر کر کے گزر گئے
کہیں راستوں سے تھا بے خبر، انہیں منزلوں کا شعور تھا
نہ بحثیں اور کوئی رنجشیں، فقط عادتوں کا تضاد تھا
انہیں پسند بہت تھیں شوخیاں، مجھے سادگی پہ غرور تھا

نمو، اقرا ——— کراچی

ہمیشہ ہی نہیں رہتے کبھی چہرے نقابوں میں
سب ہی کردار کھلتے ہیں کہانی ختم ہونے پر

ریحانہ چوہدری ——— مدوکے

نوکِ خنجر پہ ہم نے یوں بھی گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

فرزانہ مغل ——— واہ کینٹ

دہکتی ہے میرے اندر فصل شعلوں کی
تم بات کرتے ہو بارش کی، پھولوں کی
ایک لڑکی ہنستی تھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر
مگر یہ بات پرانی ہے جلنے کتنے سالوں کی

آسیہ جاوید ——— بارہ دری، علی پور چٹھہ

یہ مزا ہے دل لگی کا
نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

ندا، فضہ ——— فیصل آباد

آرزو ہے کہ تو یہاں آئے
اور پھر عمر بھر نہ جائے کہیں

گڑیا شاہ ——— کہروڑ پکا

ان سے ملنے کا کیا سوال عدم
وہ سدا میرے پاس ہوتے ہیں

ثمرہ عبید ——— صدر کراچی

سورج کی زمینوں پر راستے جدا ہوں تو
دور جا نکلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
یہ تو وقت کے بس میں ہے کہ کتنی مہلت دے
ورنہ بخت ڈھلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

ریحانہ چوہدری ——— مدوکے اندھیر

خواب پلکوں سے دریچوں میں سجا رکھے تھے
وقت کی تیز ہوا ان کو اڑا کے چلی

ارم کمال ——— فیصل آباد

ہجر کی دھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
رنگ سے خوشبوؤں کا ناتا ٹوٹا جاتا ہے
پھول سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

مدوا سرفراز ——— فیصل آباد

گھر ڈوب گیا اور انہیں آواز تک نہ دی
حالانکہ میرے سلسلے اس پار بہت تھے

صائمہ جبی ——— کراچی

یہ کناروں سے کھیلنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشا ہو
وقت کی چند ساعتیں ساغر
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو

ثمرہ جاوید ——— بسم اللہ پور

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات، سب باتوں کے بعد

فرق

انضمام الحق پاکستان کرکٹ ٹیم کے چیف سلیکٹرز ہیں، وہ کھلاڑیوں کی موجودہ کارکردگی کو دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر آفریدی ٹی ٹوئنٹی میں واپس آنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنی فٹنس اور کارکردگی دکھانی ہوگی۔ انہوں نے مزید کہا کہ "عمر کوئی مسئلہ نہیں" (جی بالکل.....!) مصباح کی عمر چالیس سال ہے اور وہ پاکستان کے لیے کھیل رہے ہیں۔ (مصباح! انضمام سے کچھ مسئلہ ہے.....؟) تو پھر آفریدی کیوں نہیں کھیل سکتے۔ (جی! جی! پر کھیلیں تو سہی.....؟)

سکون

"اذان کی آواز پریانکا چوپڑا کو سکون بخشتی ہے۔"

ایک پریس کانفرنس کے دوران پریانکا نے کہا کہ انہیں اذان کے وقت کا انتظار رہتا ہے۔ جب وہ شام کے وقت اپنے گھر کے ٹیرس پر بیٹھتی ہیں تو انہیں ہر جانب سے آنے والی اذان کی آواز سن کر بہت اچھا لگتا ہے۔ (سبحان اللہ) وہ وقت انہیں سب سے اچھا لگتا ہے جب غروب آفتاب کے وقت چاروں طرف سے اذان کی آواز آرہی ہوتی ہے (یعنی اذان مغرب) تو انہیں ایک ناقابل بیان سا سکون محسوس ہوتا ہے۔ (کہیں مودی بھارت میں اذان پر پابندی نہ لگادے)

تصویر

اٹھارہ سالہ "ارشد خان" (بھئی چائے والا) سوشل میڈیا پر ایک تصویر کے ذریعے بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکا ہے۔ ماڈلنگ، فیشن شوز، اشتہار کے بعد اب برطانوی میگزین "ایسٹرن آئی" نے ایشیا کے پچاس پرکشش مردوں کی سالانہ فہرست میں ارشد کا نام اکتیسویں نمبر پر شامل کیا ہے۔ جو یقیناً "ارشد خان عرف چائے والا کے لیے ایک اعزاز ہے۔

اپنی زندگی اور کیریئر کے حوالے سے ایک بین الاقوامی رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے ارشد خان کا کہنا ہے کہ میرا ایک خواب تھا کہ میں ایک ایسا مقام حاصل کروں کہ میں غریب بچوں کے لیے اسکول بنا سکوں جہاں وہ مفت تعلیم حاصل کرسکیں۔ (تو پھر بنایا اسکول) میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اپنے مزدور بھائیوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرسکوں۔ (پر کتنوں.....؟)

اعزاز

اداکاری موروثی نہیں ہوتی اس کی آپ کو بہت سی مثالیں نظر آئیں گی۔ اب ایمان علی کو ہی دیکھ لیں۔ ماں باپ دونوں اداکار ہیں پھر بھی وہ انتہائی خوب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

صورت ہونے کے باوجود اتنے خوب صورت ایکسپریشن نہیں دے پاتیں جو کسی فنکار کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ ایمان کہتی ہیں کہ "فلم اور ڈراما میری ترجیحات میں شامل نہیں (آپ بھی ڈائریکٹر کی ترجیحات میں شامل نہیں ہیں) فیشن اور ماڈلنگ نے مجھے شہرت دی اور یہی میری پہلی ترجیح ہے (تو پھر بول اور خدا کے لیے کیا تھا ایمان.....!) ایمان علی نے مزید کہا کہ فلم "ماہ میر" کا آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوجانا ہی میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ (یہ تو ہے ایمان.....!)

پیاز

پیاز ہمارے باورچی خانے میں روزمرہ استعمال کی چیز ہے، لیکن پیاز میں جراثیم کش اور زہریلے اثرات ختم کرنے والی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ اسے اینٹی بایوٹک کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پیاز میں فایبر یا ریشہ، کیلشیم، فاسفورس، پوٹاشیم، وٹامن سی، وٹامن بی 6، سلفر اور اینٹی آکسیڈنٹ کے حصول کا اہم ذریعہ ہے۔ پیاز میں ایک طاقت ور اینٹی آکسیڈنٹ جزو (quereetin) بھی شامل ہوتا ہے جو دل کے امراض اور کینسر سے تحفظ فراہم کرتا ہے اور بلند فشار خون (ہائی بلڈ پریشر) اور خون میں کولیسٹرول کی زیادتی کو بھی کم کرتا ہے۔

اِدھر اُدھر سے

☆ علمائے کرام کی اکثریت غیرت کے نام پر قتل کو قتل ہی سمجھتی ہے۔ اسلام کے مطابق کسی کی بیوی غلط کاری کی مرتکب ہو تو اسے گھر میں بند کردے۔ مذکورہ عورت کا شوہر اسے طلاق دے سکتا ہے یا معاملہ ریاست کے سپرد کرسکتا ہے خود سے قتل نہیں کرسکتا اور ریاست بھی یوں ہی اسے سزا نہیں دے دے گی۔ انصاف کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے الزام کی تحقیق کرے گی۔ قتل کرنے کا تو کوئی ذرا سا تصور

بھی نہیں ہے۔

(عبداللہ طارق سہیل۔ وغیرہ وغیرہ)

☆ پاکستان میں اقتدار سونے کی کان ہے جسے موقع ملتا ہے وہ اربوں کھربوں بنالیتا ہے اور پھر عوامی جلسوں میں اسٹیج پر کھڑے ہوکر سینہ تان کر اپنی ایمان داری کے گن گاتا ہے۔ آخر مشرف بنیادی طور پر 22 گریڈ کا ہی افسر تھا۔ چیف ایگزیکٹو اور صدر بنتے ہی اسلام آباد کے فارم ہاؤس سے لے کر دبئی، لندن، امریکا اور شاید کچھ اور ممالک میں بھی اربوں کی جائیدادیں بنالیں؟ مگر دعوا ہے کہ میں مسٹر کلین ہوں۔

(ڈاکٹر صفدر محمود۔ صبح بخیر)

سیدہ فرحین خورشید.... لاہور

1۔ میں جب 8th کلاس میں تھی اس وقت سے رسالے پڑھ رہی ہوں اور اب اللہ کے فضل سے بی ایڈ کر رہی ہوں۔ ہمیشہ ابو سے چھپ کر رسالے پڑھے پر اب ایسی بات نہیں ہے کیوں کہ اب میں رات کو رسالہ پڑھتی ہوں تب تک ابو سو چکے ہوتے ہیں۔

2۔ آج کل تو بی ایڈ کی ورکشاپ میں مصروف ہوں۔ ویسے میں صبح نماز پڑھ کر سو جاتی ہوں پھر امی کے آواز دینے پر ہی اٹھتی ہوں۔ ناشتا امی بناتی ہیں۔ موڈ ہو تو ہم بھی ناشتا کر لیتے ہیں کبھی کبھار' پھر صفائی کرنا' دوپہر کی روٹی بنانا' میسج کر کے دوستوں سے باتیں کرنا' گیم کھیلنا' چائے یا کافی بنانا شام کا سارا کام کرنا' نماز پڑھ کر اور باجی (اپنی بہن) سے فون پر بات کر کے میں رسالہ لے کر بیٹھ جاتی ہوں اور جب تک ختم نہ ہو جائے یا نیند نہ آجائے میں اس کی جان نہیں چھوڑتی۔

3۔ بہت سی تحریریں ہیں جو مجھے نہیں بھولتیں۔ سب کے نام بتانا تو بہت مشکل ہے' آپ کے رسالے کے صفحات ختم ہو جائیں گے مگر نام نہیں' لیکن "جنت کے پتے" ایسی تحریر ہے جو ہمیشہ میرے ذہن و دل پر نقش رہے گی۔ اگر اسے نمرہ احمد کا ماسٹر پیس کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ "جنت کے پتے" میں حیا اور جہان میں بیک وقت مجھے اپنی جھلک نظر آئی ہے۔

4۔ غصہ بہت آتا ہے۔ تھوڑی سی ضدی بھی ہوں۔ میری کولیگ کہتی ہے کہ مجھ میں مروت بہت ہے۔ اب اللہ جانے یہ خوبی ہے یا خامی' حساس ہوں۔ مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔ صبا کو میرا احجاب کرنا بہت پسند ہے۔ تعریفی جملہ۔

"ایک بار اسکول میں مجھے میری ٹیچر نے آٹو گراف میں فیری فرحین کہا تھا۔" اور میری ایک کولیگ مہرین نے مجھے کہا کہ "آپ تو بالکل باربی لگتی ہو۔"

یہ جملہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اوور آل میں ایک اچھی لڑکی ہوں (یہ میری اپنی ذاتی رائے ہے اگر کسی کو اس سے اختلاف ہے تو.... ہوتا رہے۔)

5۔ بارش کا موسم اچھا لگتا ہے اور ایسے موسم میں امی کے ہاتھ کے بنے پکوڑے تو بہت ہی اچھے لگتے ہیں' مگر کوئی دلچسپ واقعہ یا بات نہیں ہے۔

رقیہ سیف.... ملتان

1۔ شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ گزرا؟ اس حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ ہو تو لکھیں۔

شعاع سے تعلق تو ویسے بڑا پرانا ہے' لیکن باقاعدہ اپنے پیسوں سے شعاع لے کر پڑھنا مئی 2007ء کے شمارے سے شروع کیا۔ پہلے تو فرینڈز سے لے کر پڑھتی تھی' لیکن ضد کر کے بعد میں امی سے کہہ کر ماہانہ لگوا لیا۔ الحمدللہ کسی بھی ظالم سماج کا سامنا بدولت کو نہیں کرنا پڑا' لیکن جب تمام بھائی اپنی چھٹیوں میں گھر آیا کرتے تو اکثر مجھے چڑایا کرتے تھے کہ (امی ابھی تک آپ اس کو پڑھنے دیتی ہیں' نہ لے کر دیا کریں اسے' ہر وقت ان رسالوں میں ہی گھسی رہتی ہے) لیکن بھلا ہو میری پیاری امی اور ابو جان کا کہ انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ بلکہ امی بھی پڑھتی ہیں ڈائجسٹ' لیکن امی کی رفتار ذرا کم ہے کیوں کہ میں تو دو دن میں ہی رسالہ چاٹ لیتی ہوں سارا' لیکن امی تو آہستہ آہستہ اور فرصت کے اوقات میں پڑھتی ہیں۔ اب ان سب باتوں سے آپ مجھے کوئی ہڈ حرام لڑکی مت سمجھ لیجیے۔ ڈیئر قارئین! شعاع کے حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ تو بس یہی ہو سکتا ہے کہ میں 9th کے ایگزامز کے لیے اسکول سے فری ہوئی تو پھر صبح سے دوپہر تک کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی

اور پڑھنے کے بہانے کیمسٹری' فزکس اور بائیولوجی کی کتاب میں شعاع رکھ کے پڑھتی تھی۔ ایک دن جب امی کو پتا چلا تو انہیں صدمہ بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی میری چالاکی پہ' بہرحال جو بھی دن تھے بہت نایاب تھے اور یادگار بھی۔ اب تو میری شادی ہو چکی ہے اور ایک سال کا پیارا سا شہزادہ سا بیٹا بھی ہے تو اس لیے اب میں بھی فرصت کے اوقات میں ہی پڑھتی ہوں رسالے اور وہ بھی امی کے گھر میں آکر۔ شوہر بھی الحمدللہ اچھے ہیں جو منع نہیں کرتے۔

2۔ صبح سے رات تک کتنے کام نمٹاتی ہیں اور ان مصروفیات میں مطالعے کے لیے وقت کیسے نکالتی ہیں؟

شادی سے پہلے تو معمولات اور تھے جیسے کہ نماز' قرآن کے بعد ناشتے کی تیاری میں پیاری امی جان کی مدد اور ناشتے کے بعد گھر کی صفائی اور معمول کے چھوٹے موٹے کام اور پھر فراغت ہی فراغت عصر تک۔ عصر کے بعد شام کے کھانے کی تیاری میں مصروفیت۔ شام کا کھانا بنانا میرے ذمہ تھا۔

شادی کے بعد اب فی الحال تو مزے کے دن ہیں کیوں کہ گھر میں تین چار دیورانیاں اکٹھی ہیں تو کام کے مزے ہیں۔ سسرال اچھا جو ملا ہے۔ بیٹے کے بعد سے ذرا ذمہ داری آئی ہے' کیوں کہ چھوٹے چھوٹے ہزار کام ہوتے ہیں بچوں کے' تو بس اپنے بیٹے کی نوکری میں زیادہ مصروف رہتی ہوں۔ جب شوہر کام سے آجائیں تو ان کی خدمت کرتی ہوں اور بس ایسے ہی دن کا اختتام ہو جاتا ہے اور ہاں ناشتا کھانا بھی میں خود بناتی ہوں اور بقول سیف جی کے "بہت مزے کے کھانے پکاتی ہو اب تمہارے علاوہ کسی اور کے ہاتھ کا بنا اتنا مزے دار نہیں لگتا۔" بس جی ہم تو معدے کے راستے اپنے شوہر کے دل تک پہنچ چکے ہیں اور ان شاءاللہ ہمیشہ رہیں گے ان کے دل میں۔

3۔ شعاع کی وہ کون سی تحریریں ہیں جو دل پر نقش ہو گئیں؟ وہ تحریر جسے پڑھ کر دل الجھا' کسی کردار میں اپنی جھلک نظر آئی؟

ویسے تو شعاع کی تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہیں' لیکن۔۔۔ ہاں جی آپ بالکل ٹھیک سمجھے کہ کوئی کوئی دل پہ نقش ہو جاتی ہیں ایسے جیسے شادی کے بعد لڑکی کے دل پر اس کے شوہر کا نام نقش ہو جاتا ہے۔ بہت سی ایسی تحریریں ہیں' میں کس کس کا نام لوں۔ ڈیئر قارئین۔ "جنت کے پتے" "دیمک زدہ محبت" "زرد موسم" اور بہت کچھ کے تو نام بھی یاد نہیں مجموعی طور پر نمرہ احمد' عالیہ بخاری' ثمرہ بخاری (اب تو کچھ لکھ ڈالیں) صائمہ اکرم' رخسانہ نگار' نبیلہ عزیز' عمیرہ احمد اور تمام بہترین رائٹرز کی ہر کہانی بہترین ہوتی ہے۔ میرے خیال سے کافی ہے دوستو! دراصل جب ضرورت ہو تو بندے کو آسانی سے کچھ یاد نہیں آتا۔۔۔

4۔ اپنی خوبیاں خامیاں لکھیں اور تعریفی جملہ؟

خوبیاں تو پتا نہیں ہیں یا نہیں' لیکن خامیاں تو بہت ہوں گی۔ منہ پھٹ' بدتمیز اور انتہائی غصہ ور لڑکی ہوں کوشش تو بہت کرتی ہوں اپنے آپ کو سدھارنے کی' لیکن بس ناکام کوشش۔

اب آپ سب مجھے کوئی فسادی لڑکی نہ سمجھ لیجیے گا۔ دل کی بہت اچھی ہوں۔ دوستوں کی دوست ہوں اور اپنی فرینڈز کو ہمیشہ خوش رکھتی ہوں۔ امی کی نظر میں بہت اچھی' احساس کرنے والی اور سلجھی ہوئی بیٹی ہوں اور سگھڑ لڑکی ہوں۔ ابو کی نظر میں "میری بیٹی تو مجاہد ہے مجاہد۔"

بھائیوں کی نظر میں۔۔۔؟ اب تمام بھائیوں والی بہنوں کو پتا ہی ہوگا کہ بھائی کس طرح ناک میں دم کیا کرتے ہیں؟ ہاہاہا۔۔۔ جی ہاں میرے چار بھائی ہیں اور چاروں چڑانے میں پی ایچ ڈی کیے ہوئے ہیں۔ بہنیں ہم دو ہیں' ایک میں یعنی رقیہ سیف اور دوسری بہن چھوٹی ہے طوبیٰ ایمن۔ میں اپنی بہن کو بھی کہتی ہوں کہ رسالے پڑھا کرو فی الحال تو لطائف اور احادیث۔ جب بڑی ہو گی تب باقی سب پڑھا کرے گی۔

5۔ بارش پسند ہے؟

جی ہاں بارش تو بہت ہی پسند ہے۔ یقین کریں اب بھی میں تعارف لکھ رہی ہوں اور باہر بارش ہو رہی ہے۔ موسم بہت پیارا ہے اس لیے لکھنے کا بھی دل کیا تو کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔

6۔ پسندیدہ شعر' پسندیدہ اقتباس' پسندیدہ کتاب؟

پسندیدہ کتاب تو قرآن مجید ترجمے کے ساتھ۔ میری دعا ہے سب پڑھا کریں اور اللہ تعالیٰ سب کو توفیق دے پڑھنے کی۔

دوسری کتاب ہے "زاویہ" اور "داستان ایمان فروشوں کی" تو بہت بہت پسند ہے۔ جس نے نہیں پڑھی میری تلقین ہے وہ بھی پڑھے۔ پسندیدہ شعر ویسے تو بہت سارے ہیں' لیکن موسٹ فیورٹ پیش خدمت ہے!

مجھ کو خیال ہے کہ تو میرا خیال ہے
اے مرکزِ خیال تیرا کیا خیال ہے
آتا ہے تو خیال میں کتنے خیال سے
تجھ کو میرے خیال کا کتنا خیال ہے!

پسندیدہ اقتباس: "عورت کوئی موم کی گڑیا نہیں ہوتی کہ مرد اسے جب چاہے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لے۔ اپنی آنکھ کے اشاروں پر چلائے اور اپنے اختیار کے موسم اس پر مسلط کرکے اس کی سانسوں پر بھی پابندی لگا دے۔"

ڈیئر قارئین! امید ہے آپ سب کو میرا تعارف پسند آیا ہوگا۔ آخر میں شعاع کے لیے ڈھیروں دعائیں اور شعاع کی انتظامیہ کے لیے نیک خواہشات۔ اللہ پاک سب کو ہدایت کے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ڈاکٹر ص۔م.... لیہ

س۔ شادی کب ہوئی؟

ج۔ میری شادی 1996ء میں ہوئی۔

س۔ شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟

ج۔ شادی سے پہلے بھی میں ایک بہت پڑھاکو قسم کی لڑکی تھی۔ تعلیم شروع کرتے ہی ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھنے شروع کردیے۔ پھر بس پڑھائی، پڑھائی اور پڑھائی ہی میری زندگی کا واحد مقصد رہ گیا۔ جب میری شادی ہوئی تو میں کے ای ــــ لاہور میں سال سوئم کی طالبہ تھی۔

س۔ رشتے میں مرضی؟

ج۔ جی.... مرضی تھی بھی اور نہیں بھی.... میرے شوہر ہمارے رشتے دار تو نہ تھے، مگر ابو کے بہت اچھے دوست کے بیٹے تھے۔ سو بچپن ہی سے ہمارے گھریلو تعلقات بہت اچھے تھے۔ انہوں نے انجینئرنگ کے بعد سول سروس کا امتحان دیا۔ تب ان کی والدہ ہماری امی کے کان میں رشتے کی بات ڈال چکی تھیں۔ میرا میڈیکل کا دوسرا سال تھا۔ موصوف نہ صرف امتحان میں پاس ہوگئے بلکہ پولیس سروس میں بھی آگئے۔ ان کی کامن ٹریننگ لاہور کی آگئی۔ میرا کالج بھی لاہور میں تھا اور اتفاق سے ان ہی دنوں میرے سسر کی پوسٹنگ بھی لاہور ہوگئی۔ اب میں اپنے ہاسٹل میں رہتی تھی، مگر میری ساس مجھے گھر کا ماحول دینا چاہتی تھیں، سو بس حالات و واقعات ایسے اکٹھے ہوئے کہ تھرڈ ایئر کے فوراً" بعد میری شادی ہوگئی۔

س۔ جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟

ج۔ جی ہم میڈیکل کے بہت سنجیدہ طالب علم سوائے اپنے امتحانات، ٹیسٹوں اور مریضوں کے کسی چیز کا کوئی تصور نہیں بناتے۔ یہ تو ویسے بھی بالکل قریبی فیملی فرینڈز میں سے تھے۔ بہرحال یہ ہر لحاظ سے اس قدر شان دار تھے کہ ان کے علاوہ کوئی اور تصور کبھی نہیں بنایا اور شادی بھی بہت جلدی ہوگئی تھی۔

س۔ منگنی کتنا عرصہ رہی؟

ج۔ منگنی کی کہانی خاصی مختصر ہے۔ دراصل یہ بات تو تقریباً" طے تھی۔ جب یہ پولیس افسر بن گئے تو ہماری ساس کو پہلا خیال ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کا آیا۔ سو سادگی سے ہمارا نکاح کردیا گیا۔ اس وقت تک رخصتی کا ارادہ میرے فائنل کے بعد ہی تھا۔ اب یہ بھی لاہور میں بھی اور سسرال بھی تو ساس نے رخصتی کرنے کو ہی بہترین حل سمجھا۔ میرے والد کا ٹرانسفر بلوچستان ہوگیا تھا۔ سو ان کے لیے بھی یہی بہترین آپشن تھا۔

س۔ شادی کے لیے قربانی؟

ج۔ میں اور میرے والدین سب اسی بات سے ڈر رہے تھے کہ اس شادی کے بعد میری پڑھائی کی قربانی دینی پڑے گی۔ میرا سسرال اپنے رکھ رکھاؤ، سلیقے اور صفائی میں بہت مشہور تھا، میں بھی اندر سے خاصی خوف زدہ تھی کہ جس نے خواب ہی ہمیشہ ڈاکٹر بننے اور علاج کرنے کا دیکھا ہو وہ کیسے زندگی کی اتنی بڑی تبدیلی برداشت کرے گی۔ ان کی لائن بھی مختلف، پولیس افسر، لیکن یقین مانیے شادی کے لیے میں نے کوئی قربانی نہیں دی۔ سب لوگوں نے میرے ساتھ تعاون کیا۔ خصوصاً" میری ساس حقیقت میں میری والدہ بن گئیں اور سسر والد۔ دونوں دیور بھائیوں سے بھی بڑھ کر۔

شادی کے بعد میں نے میڈیکل مکمل کیا۔ فائنل میں گولڈ میڈل کے ساتھ.... میرا بڑا بیٹا میرے ہاؤس جاب شروع کرنے سے پہلے پیدا ہوا، مگر اسے ہر لحاظ سے میری ساس نے سنبھالا اور میں نے ہاؤس جاب

کیا۔ پارٹ ون اور ٹو ہمارے بہت مشکل امتحان ہوتے ہیں۔ میرے چھوٹے دونوں بیٹے ان کے دوران پیدا ہوئے۔ میں نے پلاسٹک سرجری میں اسپیشلائزیشن کی۔ بہترین ڈاکٹرز سے کام سیکھا۔ میرے بچے ساس نے پالے۔ ہمیشہ مجھے آگے پڑھنے پر شاباش دی۔ آج میرے نام کے آگے جو بہت سی ڈگریاں ہیں ان میں میرے شوہر اور ساس سب کی محنت محبت اور حوصلہ افزائی شامل ہے۔

س۔ رسموں کے لین دین پر کوئی جھگڑا ہوا؟

ج۔ میری شادی بہت خوش اسلوبی سے ہوئی۔ میرے خاندان میں لڑکیوں کو خوب جہیز دینے کا رواج ہے اور سسرال میں بہو کا بھاری حق مہر باندھنے اور ان کے نام جائیداد لگانے کا۔ اب ہمارے سسرال والے جہیز سے منع کر رہے تھے اور میرے والدین اس طرح کی کسی رجسٹری اور انتقال کے خلاف تھے۔ بہرحال دونوں طرف سے باہمی رضامندی سے معاملات طے پائے اور دونوں لحاظ سے میرا ہی فائدہ ہوا۔

س۔ شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟

ج۔ تعریف کی اور جیسی پولیس والے کر سکتے ہیں۔ بس ویسی ہی۔

س۔ کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج۔ یہ سب سے دلچسپ سوال ہے۔ میں نے اپنے گھر کا کام آج تک نہیں سنبھالا۔ میری ساس کو بالکل جوانی میں بریسٹ کینسر ہوا تھا۔ اس بیماری کا نام تو آج تک بے حد خوف ناک ہے تو آج سے پینتیس سال پہلے تو یہ مرض ہی موت کا پیغام تھا۔ بہرحال بروقت آپریشن اور علاج سے وہ بالکل صحت مند ہو گئیں مگر اس کرائسس نے انہیں تبدیل کر دیا۔

انہوں نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ اگر آئندہ ان کے ہاں بیٹی ہوئی تو وہ اسے ڈاکٹر بنائیں گی کیوں کہ ایسے معاملات میں مرد ڈاکٹر کے پاس جانا عورتوں کے لیے بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ اللہ نے انہیں تین بیٹے دیے۔ بڑے میرے شوہر ہیں جو اب پولیس میں اعلا عہدے پر ہیں۔ دونوں چھوٹے دیور ڈاکٹر ہیں اور انہوں نے کینسر میں ہی اسپیشلائزیشن کی ہے' میں ان کی بہو ڈاکٹر اور باقی دونوں بہوویں بھی ڈاکٹر ہیں۔ میری ساس اکثر کہتی ہیں کہ میں تو جی ہی اس لیے رہی ہوں کہ میری طرح آئندہ کوئی مریضہ کسی عورت سرجن ڈاکٹر اور فزیشن کی منتظر نہ رہے۔ انہوں نے ہر لحاظ سے اپنا مشن پورا کیا۔ شادی کے بعد میرے آرام اور پڑھائی کا ماؤں کی طرح خیال رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹے سے ناراض ہو جاتی تھیں کہ بہو کو امتحانوں میں تنگ کرتا ہے۔

میرے کمرے میں روایتی نئے شادی شدہ جوڑوں کے کمروں کی طرح بہت فینسی چیزیں نہیں تھیں۔ بلکہ اس میں رائٹنگ ٹیبل' ایک چھوٹا سا فریج جو ہمہ وقت پھلوں' جوس اور گھر کی بنی ہوئی سلاد یا سینڈوچز سے بھرا رہتا۔ میری وارڈ روب میں کپڑے استری کروا کر رکھوا دیتیں۔ میرے بالوں میں خود تیل ڈالتیں۔ میرے کمرے سے ڈرائی فروٹ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ گرمیوں میں اے سی اور سردیوں میں ہیٹر سب سے پہلے میرے کمرے میں لگایا جاتا۔

میں فائنل ایر کے بعد امید سے تھی تب بھی میرا خیال اپنوں سے بڑھ کر رکھا۔ میرے میاں خاصے مصروف رہتے ہیں۔ انہیں اگر کبھی غصہ آ جائے تو میرے لیے ڈھال بن جاتی ہیں۔ وہ اکثر مجھے کہتی ہیں کہ یہ گھر کے کام تو ہر کوئی کر سکتا ہے' مگر مریض کو بیماری میں امید کی کرن ڈاکٹر ہی دکھاتا ہے۔ نئی نئی سرجری سیکھنے کے لیے مجھے "موٹی ویٹ" کرتی ہیں۔ ہر امتحان پاس کرنے پر مجھ سے زیادہ میری خوشی کو سیلیبریٹ کرتی ہیں۔ میرے بھی تین بیٹے ہیں۔ انہیں سنبھالا' پھر اسکول بھیجا اور اب وہ بھی بڑے ہو گئے ہیں' مگر انہیں بہت ہی زیادہ ٹائم دیتی ہیں۔ اسی لیے میرے دل میں کبھی وہ ندامت نہیں رہی کہ میں نے اپنے بچوں کو نظرانداز کیا یا شوہر مجھ سے خوش نہیں۔

س۔ شادی کے بعد کوئی خاص تبدیلی؟
ج۔ جی.... پہلے میں صرف اپنے شوق کے لیے اس شعبے میں آئی تھی، مگر میری ساس نے اس شوق کو میرا عشق بنا دیا۔
س۔ میکے اور سسرال کے ذائقے میں فرق؟
ج۔ میکے اور سسرال کے تو نہیں ہاں ہاسٹل اور سسرال کے ذائقے میں بہت فرق ہے۔ سسرال میں کھانا مزیدار، خوشنما اور اشتہا انگیز ہوتا ہے۔ خصوصاً جب میاں خاص توجہ سے ساتھ بٹھا کر کھلائے اور آپ کی فکر بھی کرے تو اس کا ذائقہ دوچند ہو جاتا ہے۔
س۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کن پر تنقید؟
ج۔ میرے اچھے رزلٹ پر ہمیشہ بہت تعریف ہوئی، میں نے پلاسٹک سرجری میں کینسر کی مریضاؤں کی چھاتی کو دوبارہ نارمل کی طرح بنانے کے لیے ٹریننگ لی اور پھر جب یہ آپریشن شروع کیے تو میری ساس کی خوشی دیدنی تھی۔ ایک مریض کا چہرہ مکمل طور پر جل گیا تھا، بہت سے آپریشن کرکے اسے بہتر کیا جس پر میرے میاں بہت بہت خوش ہوئے۔
بہرحال اچھی ڈاکٹر بننے کے لیے اہل خانہ کا رویہ بہت اہمیت کا حامل ہے میں سرجری سیکھنے مختلف ممالک میں جاتی ہوں۔ نئی ٹیکنکس سیکھ کر آتی ہوں۔ میرے بچے اور شوہر سب میری تعریف کرتے ہیں۔ آج تک میری ساس نے مجھے کچن میں کام نہیں کرنے دیا۔ کپڑے دھونے یا استری نہیں کرنے دیے۔ ذہنی سکون دیا۔ شوہر نے تحفظ کے احساس کے ساتھ ساتھ مجھے خوداعتمادی دی۔
آج میں ایک اسپتال میں سینئر سرجن ہوں اور شام میں ایک پرائیویٹ اسپتال میں سرجری کرتی ہوں۔ میں کتنا کماتی ہوں، کبھی کسی نے نہیں پوچھا، مگر کتنے مریضوں کو ٹھیک کیا، یہ سب پوچھتے ہیں۔ میری ساس کئی مریضاؤں کو بھیجتی ہیں۔ خصوصاً "یہ گھروں میں کام کرنے والی تشدد کا شکار عورتیں" میں انہیں دیکھتی ہوں۔ ٹیسٹ کرتی ہوں اور پھر توجہ سے ان کی بات سن کر دوا دیتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے اس طرح میں اپنی ساس کی محبتوں کا قرض اتار رہی ہوں۔
س۔ سسرال سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟
ج۔ میری امی کا کہنا ہے کہ ان سسرال والوں نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ میری توقعات سے کہیں زیادہ اچھے لوگ ثابت ہوئے ہیں۔
س۔ پہلے بچے کی پیدائش؟
ج۔ فائنل ائیر میں ہمیں گائنی وارڈ کا خاصا مشاہدہ ہو چکا ہوتا ہے۔ سو نارمل ڈلیوری بے حد آسان پروسیجر لگتا تھا، مگر ان نو ماہ اور پھر ڈلیوری نے ہمیں دن میں تارے دکھا دیے۔ خوب شور بھی مچایا اور ڈانٹ بھی کھائی۔ بلکہ میری ایک پروفیسر نے تو تھپڑ بھی لگا دیا۔ پھر اتنا ننھا منا بے بی۔ اسے سنبھالنا ہی خاصا مشکل لگ رہا تھا۔ ساری ڈاکٹری ایک طرف اور ننھا بچہ پالنا اور سنبھالنا ایک طرف۔ میری دادی اور دادا کو ننھا کھلونا مل گیا۔ میاں صاحب کو تو وہ آج تک ننھا بلونگڑا ہی لگتا ہے، میں نے بچے سنبھالے کم، مگر ان کی شاپنگ خوب خوب کی۔ جب بھی بیرون ملک جاتی واپسی پر بس چھوٹے بچے کی شاپنگ ہوتی۔ بہت انجوائے کیا تینوں بیٹوں کا بچپن اور اب لڑکپن بھی....
س۔ سسرال میں مقام؟
ج۔ پورے سسرال میں کوئی بیمار ہو۔ کسی رشتے دار کا کوئی نوکر بیمار ہو۔ سب ہی میرے مریض ہیں۔ ان کو دیکھنا۔ ٹیسٹ کروانے اور پھر متعلقہ ڈاکٹر تک راہنمائی اور دوائیں۔ یہ سب کچھ میرے ذمے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو کوئی دور دراز کا مریض ہمارے ہاں آ کر رہ بھی جاتا ہے۔ جیسے میرے میاں کا ایک سپاہی جو بہت زیادہ جھلس گیا تھا۔ تقریباً ایک سال ہمارے ہاں رہا۔ اس کا چہرہ بہت خراب تھا۔ ناک پگھل گئی تھی۔ ساری سرجریز میں نے کیں، تو معالج کو ہمارے ہاں مقام بہت

بلند ملتا ہے۔ عزت اور محبت اور ہر محفل' تہوار اور ملاقات میں مریض بے شمار۔ چند دوائیں تو میرے ساتھ ہر وقت ہی ہوتی ہیں' لیکن میں کبھی مریضوں کے ہجوم سے گھبراتی نہیں ہے۔ میرے کام کرنے کے اوقات تقریباً" اٹھارہ گھنٹے ہیں۔ میرے شوہر اور بیٹے بھی بہت تعاون کرتے ہیں۔ جب میرے علاج سے ایک اٹھارہ برس کی کینسر کا شکار انتہائی خوب صورت لڑکی ٹھیک ہوگئی تو میں نے اپنے رب کا بے حد شکر ادا کیا جس نے مجھے کسی کو دوبارہ زندگی دینے کا وسیلہ بنا دیا۔ اب وہ لڑکی شادی شدہ ہے۔ دو بچوں کی ماں ہے۔ نارمل زندگی گزار رہی ہے اور میری ساس کی طرح اپنی اولاد کو مسیحا بنانے کی خواہش مند بھی ہے۔

س۔ جوائنٹ فیملی پسند ہے یا علیحدہ؟

ج۔ جی.... مجھے تو جوائنٹ ہی پسند ہے۔ کم از کم ہم ورکنگ ویمن کی تو جوائنٹ ہی ہونی چاہیے۔

س۔ شوہر سے تعلقات؟

ج۔ مجھے اپنی زندگی میں ایک ہی کمی لگتی ہے کہ شوہر کو میں وہ وقت نہیں دے پائی جو ایک عام عورت کو دینا چاہیے۔ گو یا اب وہ بھی بہت سینئر آفیسر ہوگئے ہیں۔ وقت کی قلت ان کو بھی ہے' مگر وہ پھر بھی بھاگتے دوڑتے بچوں اور میرے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ کتنے بھی مصروف ہوں' میرے فون کو پہلی بیل پر ریسیو کرتے ہیں۔ میری ہر پریشانی کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چند سال پہلے میں سرکاری اسپتال میں آپریشن کر رہی تھی۔ مریضہ کے لواحقین اس کی غلط بلڈ رپورٹ ہمارے پاس جمع کرا چکے تھے کہ اس میں خون کی کمی نہیں ہے اور وہ مریضہ آپریشن کے دوران ہی ایکسپائر ہوگئی۔ اس کے لواحقین نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میرے شوہر نے اس صورت حال کو بہت تحمل سے سنبھالا۔

اب ہم دونوں اپنے اپنے پروفیشن کے تقریباً" بیس بیس برس گزار چکے ہیں۔ اب تو ہم دونوں ریٹائرمنٹ لائف میں ایک دوسرے کو وقت دینے کی بات کرتے ہیں جس پر میرے بچے خوب ہنستے ہیں۔ اللہ میرے اس کنبے' میرے بچوں اور ہم سب کو اسی طرح شاد و آباد رکھے۔ آمین۔

امت الصبور
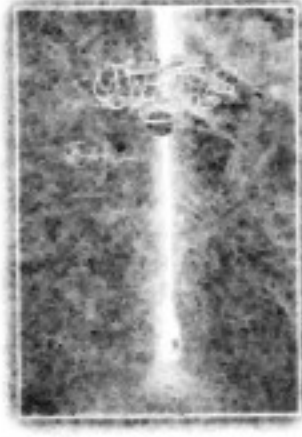
ستارہ

یہ اس وقت کی دلی ہے‘ جب نادر شاہ درانی کی یلغار نے مغل سلطنت کو ہلا کر رکھا ہوا تھا۔

محمد شاہ‘ فرماں روائے ہند کا برا حال ہو چکا تھا۔ اسے تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کہا گیا ہے۔ وہ ایک احمق اور عیاش بادشاہ تھا۔

اس روز نادر شاہ خاصا خوش تھا۔ اس کا لشکر دہلی سے ذرا فاصلے پر خیمہ زن تھا۔ اور وہ فرماں روائے ہند کی جانب سے ان تحائف کا منتظر تھا‘ جس کا وعدہ اس شکست خوردہ حکمران نے کر رکھا تھا۔ ذرا ہی دیر کے بعد اس کے خیمے کا پردہ ہٹا اور اس کے خادم خاص نے بتایا کہ تحائف آگئے ہیں۔

"تفصیل؟" نادر شاہ نے دریافت کیا۔

"ایک ہاتھی‘ ایک درجن گھوڑے‘ پچاس غلام اور درجن بھر حسین و جمیل ہندی دوشیزائیں۔"

یہ تحفے کافی دیر میں پہنچے تھے اور نادر شاہ اس تاخیر پر اندر ہی اندر برہم تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ نادر شاہ نے ان کا معائنہ دوسری صبح تک ملتوی کر دیا‘ لیکن عورتیں.....

نادر شاہ نے ہندی عورتوں کے حسن کی بہت تعریفیں سنی تھیں۔ وہ خیمے سے نکلا اور اس طرف چلا جہاں یہ عورتیں رکھی گئی تھیں۔

جس خیمے میں وہ پہنچا‘ وہاں داخل ہوتے ہی نادر شاہ حیرت سے ششدر رہ گیا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا یہاں معاملہ اس سے بھی سوا تھا۔ لگتا تھا ایک ہی جگہ پر بہت سے چاند نکل آئے ہوں۔ ہر حسینہ دوسرے سے بڑھ کر لگ رہی تھی۔

نادر شاہ انہیں دیکھتا اور تولتا رہا پھر اس کی نگاہیں سب کا جائزہ لینے کے بعد ایک چہرے پر آکر رک گئیں۔ لڑکی نے نادر شاہ کو اپنی جانب گھورتے پایا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

"یہ..... یہ کون ہے؟" نادر شاہ نے خواجہ سرا سے دریافت کیا جو اس کے عقب میں تلوار سونتے کھڑا تھا۔

"عالی جاہ‘ یہ ایک راجپوت دوشیزہ ہے۔" خواجہ سرا نے بتایا۔

"دوشیزہ؟" اچانک اس لڑکی کے گلاب جیسے لب کھلے اور اس کی طنزیہ آواز بلند ہوئی جس میں زبردست بے باکی تھی۔

"غلط!" اس نے کہا۔ "میں دوشیزہ نہیں بلکہ ایک شادی شدہ عورت ہوں۔"

نادر شاہ کو لڑکی کی دلیری اچھی لگی۔ اس نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ستارہ۔" لڑکی نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔

لڑکی‘ جس کا نام ستارہ تھا‘ ابھی تک اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں اسے خواجہ سرا چھوڑ کر گیا تھا۔

"ادھر آؤ..... میرے قریب۔" نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی جھجکی‘ اس کے چہرے پر وحشت اور اداسی نے عجیب سی کیفیت طاری کر رکھی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔ حقیقتاً وہ خوف زدہ تھی۔ اس نے اس ایرانی حملہ آور کی سفاکی کی داستانیں سن رکھی تھیں‘ مگر اب رہا ہی کیا تھا‘ وہ تن بہ تقدیر ہو کر آگے بڑھی۔

"مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔" نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی نے اسے بتایا کہ وہ نسلاً راجپوت ہے۔ وہ چھوٹی ہی تھی کہ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ پھر اس کی شادی

ایک مغل سپاہی سے کردی گئی جس کے گھر سے وہ موقع پاتے ہی بھاگ نکلی۔ اسے ایک تاجر گھرانے نے پناہ دی۔ یہ گھرانہ اسے دلی لایا۔ یہاں بادشاہ کی ایک ملکہ نے اسے پسند کرلیا اور وہ شاہی محل میں پہنچ گئی۔ جہاں وہ اب تک ایک کنیز کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔

نادر شاہ اسے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ وہ اب ایک پکی عمر کا آدمی تھا' فولادی ذہن کا' مگر یہ لڑکی کسی جادو کی طرح اس کے سر چڑھ گئی تھی۔

اچانک اس نے نرمی سے کہا۔

"کیا تم میری ملکہ بننا پسند کروگی؟"

ستارہ کا جسم آہستہ سے لرز اٹھا۔ وہ کسی بوجھ کو محسوس کرتے ہوئے ڈگمگائی اور وہیں فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

یہ تقدیر کا ایک کھیل تھا۔

وہ جو لونڈی بنا کر دشمن کے حوالے کردی گئی تھی۔ ایک دم سے ایک انتہائی باجبروت بادشاہ کی ملکہ بن گئی تھی۔

مگر.... اس جگہ ایک اور عورت بھی تھی۔ اس کا نام شیرازی تھا۔

شیرازی وہ عورت تھی جو اب تک نادر شاہ کی سب سے زیادہ منظور نظر ہونے کا شرف رکھتی تھی۔

ستارہ کی آمد نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی اور وہ کسی ناگن کی طرح غصے سے بل کھا رہی تھی۔

پھر ستارہ کو خبر ملی کہ نادر شاہ کا لشکر اب دہلی کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ اس کے کچھ حصے کو پیچھے ہی رکے رہنا تھا اور اس میں نادر شاہ کا حرم بھی شامل تھا۔

پھر نادر شاہ نے اسے بتایا کہ وہ کچھ دنوں تک شاید اس سے دور رہے گا۔ اس نے کہا "تم پریشان نہ ہونا۔ میں ایک ہیرا تمہیں دے رہا ہوں' یہ ایک خاص نشان ہے۔ اگر تمہیں کبھی میری سخت ضرورت محسوس ہو تو اسے کسی قاصد کے ذریعے میرے پاس بھیج دینا۔ میں فوراً تمہیں اپنے پاس بلوالوں گا۔"

پھر اس نے وہ ہیرا نکال کر ستارہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اس ہیرے کی ضرورت ستارہ کو جلد ہی پیش آگئی۔ اسے خبر ملی تھی کہ نادر شاہ نے دہلی کے شہریوں کے قتل عام کا حکم دے دیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ نادر شاہ کا غصہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی اور موت کا کھیل اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

ستارہ کو دہلی سے پیار تھا۔ اس جگہ اس نے اچھے دن گزارے تھے اور اس کی بہت سی محبوب شخصیتیں یہاں تھیں۔ وہ اس قتل عام کو رکوانا چاہتی تھی۔ جس کی ابھی ابتدا ہوئی تھی۔ اس نے آغا باشی کو طلب کیا اور ہیرا نادر شاہ کے پاس بھجوانے کے لیے قاصد دوڑایا۔

یہ ستارہ ہی تھی جس کی التجا پر نادر شاہ کی تلوار نیام میں گئی تھی۔ پھر بھی اس عرصے میں دلی کے گلی کوچوں میں خون ہی خون پھیل چکا تھا۔ یہ اتنا بڑا قتل عام تھا کہ تاریخ میں اس کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔

نادر شاہ نے دلی کی سلطنت کو اچھی طرح پامال کرنے کے بعد بے شمار مال غنیمت کے ساتھ اپنے ملک واپسی کا سفر شروع کیا تو ستارہ اس کے ساتھ تھی۔

نادر شاہ ہرات پہنچا تو معلوم ہوا نادر شاہ کا بیٹا اور ولی عہد شہزادہ رضا خان استقبال کے لیے آرہا ہے۔

نادر شاہ کو بیٹے سے جدا ہوئے دو سال سے زائد ہوچکے تھے۔ فطری بات تھی کہ وہ بیٹے کو دیکھنے کا متمنی تھا پھر اسے یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ اس عرصے میں شہزادے نے اپنی لیاقت سے ملک کا انتظام بہت عمدگی سے سنبھالا تھا۔

اس جگہ یہ بتانا ضروری ہے کہ شہزادے کی تعریفیں سن سن کر نادر شاہ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا تھا کہ کہیں بیٹا غرور میں بہہ کر کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ کچھ لوگوں کی سازش اس کے پس پردہ تھی اور انہوں نے شہزادے کے اندر بھی یہ خیال ڈال دیا تھا کہ نادر شاہ آتے ہی اسے پھر ایک ادنیٰ عہدے دار میں بدل دے گا۔

پھر ایک روز خلوت میں نادر شاہ نے جب اپنے شبہات کا تذکرہ ستارہ سے کیا تو اس نے شہزادے کی

طرف داری میں اسے سمجھانا شروع کر دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سمجھا یہ عورت شہزادے سے مل گئی ہے۔

بد قسمتی سے ان ہی دنوں نادر شاہ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا جو ناکام رہا۔ شیرازی نے نادر شاہ کو پٹی پڑھائی کہ یہ حرکت شہزادے کی ہے جو اب خود بادشاہ بننا چاہتا ہے۔

ادھر ستارہ نے اس خیال سے کہ باپ بیٹے کی دشمنی طول نہ پکڑے، نادر شاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ بلا تحقیق شہزادے کو مورد الزام قرار نہ دے۔ بات شاید خراب نہ ہوتی اگر شیرازی نے نادر شاہ کے دل میں ایک خیال اور نہ ڈال دیا ہوتا کہ ستارہ شہزادے کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ ستارہ کی اس سفارش نے نادر شاہ کے اندر اور زہر پھیلا دیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"میں رضا خان کو اندھا کرانے جا رہا ہوں تاکہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔"

ستارہ یہ سن کر دہل گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"شاہ! رحم کریں۔ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ اسے اندھا کرا کے کبھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔"

نادر شاہ نے غصے سے ستارہ کو دیکھا اور اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر جا گری۔

آغا باشی نے نادر شاہ کے حکم پر اسے محل سے دوسری جگہ منتقل کر دیا۔

نادر شاہ بے حد چڑچڑا ہو چکا تھا اور ملکی مسائل میں اس طرح دھنس گیا تھا کہ اس نے ستارہ کے بارے میں پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا۔ تب وہ ایک روز خود ہی نکل کھڑی ہوئی۔ وہ نادر شاہ سے ملنے چلی تو آغا باشی سخت پریشان تھا۔ اس نے بہت سمجھایا کہ نادر شاہ اسے مروا بھی سکتا ہے، مگر وہ نہ مانی۔

اسی رات.....!

نادر شاہ کے خیمے میں دشمن کا آدمی گھسا اور اس کے خنجر نے ہمیشہ کے لیے اس شخص کو دنیا سے رخصت کر دیا، جس نے شک و شبے اور حکومت و اقتدار کی لپیٹ میں آ کر نہ صرف اپنے چہیتے بیٹے کو اندھا کرا دیا تھا بلکہ ایک باوفا بیوی پر الزام لگا کر اسے قید تنہائی میں ڈال دیا تھا۔

ستارہ نے نادر شاہ کی لاش کو دیکھا۔ پھر اس نے نہایت سکون سے اپنی پیٹی سے خنجر نکالا اور وہیں اپنے سینے میں گھونپ لیا۔

✡ ✡ ✡

تاریخ آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ ستارہ کیا واقعی نادر شاہ کی ایک باوفا بیوی تھی یا یہ حقیقت ہے کہ وہ ولی عہد رضا خان کے سامنے دل ہار گئی تھی اور اس کے اندھا ہو جانے کے بعد دل برداشتہ ہو کر خود کشی کر لی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسی نیت سے نکلی تھی کہ وہ نادر شاہ کو ختم کر کے خود اپنا خاتمہ کر لے گی، مگر یہ تمام باتیں غیر تصدیق شدہ ہیں۔ محقق نے ستارہ اور رضا خان کے رومان کا ذکر ضرور کیا ہے اور لکھا ہے کہ نادر شاہ کی اس محبوبہ ہی کی وجہ سے رضا خان نے اپنی آنکھیں گنوائی تھیں اور بوڑھے نادر شاہ کی موت میں ستارہ کا بڑا ہاتھ تھا۔

مہابھارت

400 قبل مسیح انکار نتا کے مطابق ہندوؤں کی دیو مالائی نظم اور دنیائے ادب کا نادر شہ پارہ "مہابھارت" مرتب ہوئی۔ مہابھارت کی ترتیب و تشکیل 400ء تک جاری رہی، ہومر کی ایلاڈ اور اوڈیسی (دونوں کو ملا کر) سے سات گنا بڑی یہ داستان دو ہندو خاندانوں کے مابین اختلافات اور جنگ کے بارے میں تھی۔ اس نظم کا یہ حصہ "بھگوت گیتا" کہلاتا ہے جو اخلاقی و مذہبی اقدار سے متعلق ہے، لیکن "بھگوت گیتا" بعد میں تصنیف کر کے اس میں شامل کی گئی۔

مسلم اقوام کا قومی نشان، ہلال و ستارہ

"کیوں ہے؟" "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا" کا بیان ہے کہ ہلال کا نشان مسلمانوں نے بازنطینی حکومت سے لیا

ہے حالانکہ بازنطینی حکومت پر فتح پانے سے قبل ہی ترکوں کے پرچم پر یہ نشان پایا جاتا تھا تاہم یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ ہلال کے بطن میں ستارہ کہاں سے آیا۔ جب کہ بازنطینی پرچم اس سے خالی تھا۔ اس کے متعلق ایک روایت اور ہے۔ جس سے ہلال میں ستارہ کے اضافے کے حوالے سے کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ایک بار الطغول اعظم جو ترک سلطنت کا مورث اعلا ہے کسی درویش سے ملنے گیا اور اس نے پیش گوئی کی کہ تیری قائم کردہ حکومت صدیوں قائم رہے گی۔ یہ خوش خبری سن کر جب الطغول درویش کے حجرہ سے واپس آیا تو شام ہو چکی تھی اور ہلال و زہرہ دونوں کا اجتماع بالکل اسی طرح تھا جس طرح قومی پرچم میں نظر آتا ہے اور طغل نے اسے نیک فال سمجھ کر اپنے پرچم کا نشان قرار دے دیا۔

جالوت کون تھا؟

قرآن کریم میں جالوت کا ذکر آیا ہے۔ "اور داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا۔" (البقرہ 251) جالوت کون تھا اس پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

جالوت حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کا ایک بادشاہ تھا۔ عرب مورخ سعودی کا بیان ہے کہ فلسطین میں بربر قوم آباد تھی اور یہ ان کا بادشاہ تھا۔ اس کے باپ کا نام مولود تھا۔ اس نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور اردن کے علاقے میں لڑائی ہوئی۔ بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت نے اعلان کیا کہ جو کوئی جالوت کو مارے گا۔ اسے آدھی سلطنت انعام میں دی جائے گی اور شہزادی سے نکاح کرا دیا جائے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے گوپھن سے پتھر مار کر اس کو ہلاک کر دیا۔ مورخ طبری کے نزدیک وہ عاد و ثمود کی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اسرائیلیوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ تبرکات اور تابوت سکینہ بھی بنی اسرائیل سے چھین کر لے گیا۔ اسلامی روایات بائبل کے مطابق ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بائبل میں اس کا نام گولیتھ ہے۔ ایک اور کتاب میں آتا ہے کہ یہ بہت قوی الجثہ یعنی قوی ہیکل تھا۔ (عرب مورخ مسعودی اور طبرانی)

طویل ترین عشقیہ خط

عشقیہ خطوط میں سب سے طویل خط وہ ہے۔ جو اس وقت بھی برطانوی عجائب خانے میں محفوظ ہے' یہ خط ملکہ الزبتھ کے ایک درباری کا ہے۔ جو اس نے اپنی محبوبہ کو لکھا تھا۔ یہ خط 400 باریک لکھے ہوئے صفحات پر محیط ہے اور موجودہ سائز کے تین تین سو صفحات کے چھ ناولوں کے برابر ہے۔ اس کی شادی غالباً" اپنی محبوبہ سے نہیں ہوئی ورنہ شاید اس کی بک بک کی تاب نہ لا کر وہ قبل از وقت مرجاتی۔ (از ہفت روزہ چٹان)

مہرین انا قریشی' تابندہ گوہر قریشی' ملتان

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن چائنیز سوپ

ضروری اجزا :

چکن (بغیر ہڈی کا)	آدھا کلو
انڈوں کی سفیدی	دو عدد
کارن فلور	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
ادرک	ایک ٹکڑا
سیاہ مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
سویا سوس	ایک کھانے کا چمچہ
سوئیٹ کارن	ایک کپ
پانی یا یخنی	آٹھ یا دس کپ
انڈے (ابلے ہوئے)	سجاوٹ کے لیے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

برتن میں چکن کٹی پیاز، ادرک کٹی ہوئی، یخنی، نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھک کر پکائیں۔

گوشت گل جائے تو سوپ چھان کر الگ برتن میں ڈالیں، گوشت کی چھوٹی بوٹیاں کرلیں، آدھا کپ ٹھنڈے پانی میں کارن فلور گھول کر سوپ میں ڈالیں، اس میں سوئیٹ کارن (بھٹے کے دانے) اور گوشت شامل کرکے پکائیں، ابال آجائے تو انڈے کی سفیدی پھینٹ کر ڈالیں اور 3-2 سیکنڈ بعد چمچے کی مدد سے مکس کردیں۔

گہرے پیالے میں نکال کر ابلے ہوئے انڈں سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

لوکی کے سیخ کباب

ضروری اجزا :

لمبی ہری لوکی	ڈیڑھ کلو
لال مرچ ثابت	دس عدد
لونگ	چار عدد
سیاہ زیرہ	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
انڈا	ایک عدد
ہری مرچ	تین عدد۔ (باریک کٹی ہوئی)
لہسن کے جوئے	چھ عدد
تیل، گھی	حسب ضرورت
چنے کی دال	ایک پیالی
کالی مرچ ثابت	چھ عدد
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
دھنیا ثابت	ایک چائے کا چمچ
ڈبل روٹی کے سلائس	چار عدد
ہرا دھنیا	ایک گٹھی (باریک کٹا ہوا)
پیاز	دو عدد (باریک کٹی ہوئی)
ادرک	ایک چھوٹا سا ٹکڑا

ترکیب :

سب سے پہلے لوکی کو چھیل کر باریک کدوکش کرلیں پھر اسے اس کے ہی پانی میں بھاپ دے کر خشک کرلیں۔ چنے کی دال میں سوائے ہرے مسالے اور پیاز کے باقی سارے مسالے ڈال کر ہلکی آنچ میں پکنے رکھ دیں۔ پانی اتنا ڈالیں کہ دال زیادہ نہ گل جائے بکھری بکھری رہے۔ جب دال کا پانی خشک ہوجائے تو پیس لیں۔ بھاپ دی ہوئی لوکی کو چھلنی میں رکھ کر دبا دبا کر پانی خشک کرلیں پھر پسی ہوئی دال میں ملائیں۔ انڈا اور سلائس کے چاروں کنارے کاٹ کر درمیان کا حصہ باریک چورا کرکے ملائیں۔ ہرا مسالا

اور پیاز ملا کر گوندھ لیں۔ آدھے گھنٹے بعد ان کے کباب بنا کر سیخوں پر لگا کر چولہے پر سینک لیں۔ برش کے ذریعے ہلکا سا تیل لگا کر سیخ سے نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

گرم گرم پراٹھے اور املی کی کھٹی چٹنی ساتھ میں رکھیں۔

نہاری

ضروری اجزا :

بونگ کا گوشت	ایک کلو
نلی	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
پیاز	ایک عدد
گھی	دو کپ
پسا ہوا ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
آٹا	ایک چمچہ
پسی سونٹھ	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چمچہ
ادرک، ہرا دھنیا	سجاوٹ کے لیے
جائفل، جاوتری	ایک چائے کا چمچہ
سونف	دو چائے کے چمچے

ترکیب :

پتیلی میں گھی گرم کر کے اس میں پسا ہوا لہسن ادرک ڈال کر بھونیں پھر اس میں لال مرچ، نمک، پسی ہوئی سونٹھ، پسی ہوئی سونف، جائفل جاوتری گوشت اور نلی ڈال کر بھونیں۔ گوشت کا پانی بھن جائے تو اس میں تقریباً ایک لیٹر پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر گوشت گلائیں۔ اگر پانی ختم ہو جائے تو گلنے کے لیے مزید پانی ڈال سکتے ہیں۔ گوشت گل جائے تو اس میں تین کپ پانی ڈالیں اور آٹا بھون کر پانی کے ساتھ آمیزہ تیار کر کے گوشت میں شامل کریں اور چمچہ مسلسل چلاتی رہیں۔ اور ساتھ ہی پسا ہوا گرم مسالا بھی ڈال دیں۔

پندرہ منٹ ہلکی آنچ پر ڈھکنا ڈھانپ کر پکائیں۔

دوسرے برتن میں گھی گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر سنہری تل لیں اور نہاری پہ بگھار لگا دیں۔ ہرا دھنیا ادرک کتری ہوئی بڑی ہری مرچیں اور لیموں کے ساتھ پیش کریں۔

پنجیری

ضروری اجزا :

سوجی	ایک کلو
گھی	ایک کپ
چینی	آدھا کلو
پانی	ایک کپ
کٹے ہوئے پستہ، بادام	حسب خواہش

ترکیب :

آدھا کلو چینی میں ایک کپ پانی ڈال کر چولہے پر پکنے کے لیے رکھ دیں، جب ایک تار کا شیرہ ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔

سوجی میں گھی ڈال کر ہلکی آنچ پر بھون لیں، پھر جب سوجی کا رنگ سنہری ہو جائے تو اس میں شیرہ ڈال دیں۔ اور اچھی طرح مکس کر دیں اتنا بھون لیں کہ پھر ایک تھال میں ڈال کر چمچے سے ہموار کر دیں۔ اوپر سے پستہ، بادام اور پسا ناریل چھڑک دیں اور چھری سے ٹکڑوں کی شکل میں کاٹ لیں۔

ادارہ

خوب صورت بنیے

بالوں کی حفاظت

تیز کیمیکل کے حامل شیمپو اور بالوں کی آرائش کے لیے استعمال ہونے والے ہیئر اسپرے' ویکس یا ڈائی وغیرہ کا زیادہ یا بے احتیاطی سے استعمال بالوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ بالوں کی بہترین نشوونما کے لیے انڈہ' دہی اور سرسوں کے تیل یا ناریل کے تیل کو ملا کر بالوں کی جڑوں سے سرے تک اچھی طرح لگا کر ایک گھنٹہ چھوڑ دیں۔

یہ عمل ہفتے میں تقریباً" دو دفعہ دہرائیں۔ آپ کے بال نہایت حسین چمکدار اور مضبوط ہو جائیں گے۔

بالوں کو کنگھا کرنے کے لیے معیاری ہیئر برش خریدیں اور گیلے بالوں میں کنگھا ہرگز نہ کریں کیونکہ گیلے بال کمزور ہوتے ہیں اور آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بالوں کی نشوونما میں اضافہ کرنے کے لیے سر جھکا کر الٹی سمت میں کنگھا کریں۔ اس سے دوران خون بھی بہتر ہوتا ہے اور بالوں کی صفائی بھی ہوتی ہے اور وہ گھنے اور صحت مند بھی ہونے لگتے ہیں۔

امرود کے پتے بالوں کی خوب صورتی کیلئے اکسیر

امرود کے پتے بالوں کو گرنے سے روکتے ہیں۔ سر کی جلد اور بالوں سے خشکی و سر کی جوؤں کا خاتمہ کرتے ہیں۔ آپ امرود کے پتوں کا استعمال مندرجہ ذیل طریقہ کار کے مطابق کر سکتی ہیں۔

مٹھی بھر امرود کے تازہ پتے لے کر اچھی طرح دھولیں تاکہ ان پر لگی ہوئی مٹی صاف ہو جائے جب پتوں پر سے تمام گرد و غبار صاف ہو جائے تو ایک بڑے برتن میں تقریباً" 1 لیٹر پانی گرم کریں اور اس میں ان پتوں کو ڈال کر دھیمی آنچ پر 30-20 منٹ تک پکائیں۔

جب پانی آدھا رہ جائے تو اس پانی کو چھان کر علیحدہ برتن میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ پانی ٹھنڈا ہونے کے بعد اس محلول کو بالوں کی جڑوں اور بالوں میں انگلیوں کی مدد سے اچھی طرح لگائیں یا اس پانی سے سر دھولیں اور 30 منٹ تک لگا رہنے دیں پھر نیم گرم پانی سے سر دھو کر خشک کریں۔ اس عمل کو ہفتے میں ایک دفعہ ضرور آزمائیں۔

آپ کے بال حیرت انگیز طور پر نہایت خوب صورت' لمبے گھنے اور چمک دار ہو جائیں گے۔

بالوں کے لیے ہمیشہ ہلکے شیمپو کا استعمال کریں اور شیمپو کی مقدار ہمیشہ کم لیں۔ سخت قسم کے شیمپو بالوں سے قدرتی تیل کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ سر دھونے کے دوران بہت زیادہ گرم پانی کا استعمال بھی ہرگز نہ کریں۔

شیمپو کرنے کے بعد ہمیشہ کنڈیشنر کا استعمال کریں یا ایسے شیمپو کا انتخاب کریں جس میں پہلے سے کنڈیشنر شامل ہو۔

ہفتے میں دو مرتبہ تیل سے سر کی جلد اور بالوں کا مساج کریں اور رات بھر کے لیے چھوڑ دیں۔

ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ اپنے بالوں کو کنڈیشنر کریں' دہی یا انڈے کی زردی خشک بالوں کی کنڈیشننگ کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس کو بالوں میں لگا کر آدھا گھنٹہ چھوڑ دیں۔ اس کے بعد اچھی طرح دھولیں۔

مہندی بھی بالوں کے لیے ایک بہترین کنڈیشنر ثابت ہوتی ہے۔ مہندی میں ایک چائے کا چمچہ تیل اچھی طرح مکس کر کے بالوں میں لگائیں۔

سورج کی روشنی کا سامنا اگر زیادہ دیر تک کرنا ہو تو اپنے سر کو اچھی طرح ڈھک لیں۔

اونی مصنوعات جیسے اونی ٹوپیوں' اسکارف اور گردن کے گرد لپیٹے جانے والے مفلروں کا استعمال آپ کی ہیئر لائن کو متاثر کرنے کا سبب بن سکتا ہے یا بالوں کے ٹوٹنے کی وجہ بھی بن سکتے ہیں' موسم سرما کی ایسی مصنوعات کے استعمال سے قبل اپنے بالوں کو لان کے اسکارف سے ڈھک لیں۔

اپنے بالوں کو آزادیا بالکل نہ چھوڑیں۔ چٹیا' پونی ٹیل یا کسی بھی انداز سے باندھ کر رکھیں۔ کھلے ہوئے بالوں پر ٹھنڈی اور گرم ہوا بہت تیزی سے اثر انداز ہوتی ہے۔

بالوں کو جلدی جلدی رنگنے' اسٹریکنگ یا الیکٹرک آئرن جیسے عوامل بالوں کی نمی چھین لیتے ہیں' بالوں کو حرارت دے کر ان کو نیا انداز دینے سے ممکنہ حد تک گریز کریں۔

✡